
ماہنامہ
دسمبر 2016

سسپنس ڈائجسٹ

مدیراعلیٰ: معراج رسول

جلد 46 • شمارہ 12 دسمبر 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: نیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ہمہ رُخ

ازل سے زمانے پر ایک ابدی استغراق مسلط ہے۔ لمحے اس ابدی استغراق میں گزر رہے ہیں، ساعتیں تمام ہو رہی ہیں اور وقت ہے کہ بہہ رہا ہے۔ زندگی نے دنوں اور راتوں کی ایک اور میعاد پوری کر لی۔ ہاں، ایک سال اور تاریخ کے وجود نے نگل لیا ہے۔

قوموں نے تجربات و مشاہدات کا کچھ زہر اور اکٹھا کر لیا ہے۔

لمحوں کے بے زنہار ریلے میں وجود کے کھوے چھل گئے ہیں مگر حیات کی تیزگامی برقرار ہے۔

میں ماضی کے راہ جو، کرسٹوفر کولمبس کی دریافت عظیم امریکا میں نئے سال کے حاشیے پر کھڑا ہوں۔ منفعت اور خسارے کی فردِ حساب لیے۔ دنوں اور راتوں سے میری اب تک کی جو معاملت رہی ہے، اس میں منافع کم اور خسارہ زیادہ ہے بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کیا، میں اس خوش گمانی میں رہوں کہ یہ آنے والا سال تلافی کی کوئی صورت مجھے دکھائے گا؟ کیا میں اس سے کچھ امیدیں وابستہ کر لوں؟

لگتا یوں ہے کہ آنے والے دن بھی بہت واقعہ انگیز ہوں گے۔ یہ واقعات مہربان ہوں گے یا نامہربان؟ میں خود ہی جواب طلب ہوں اور خود ہی جواب دہ۔

سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ ہر قدم پر یقین اور اعتماد کو ٹھیس کیوں لگتی ہے؟ اس قحط الرجال اور بے یقینی کی اس گرم بازاری کا کوئی تو سبب ہوگا۔ کیا انسان فطرتاً اچھے اور فطرتاً بُرے ہوتے ہیں۔ تاریخ کی درس گاہ نے جو علم ارزاں کیا ہے، اس کی روشنی میں سماجی قدروں اور رشتوں کا مسئلہ کچھ یوں ہی ہے۔

میں جس سماج میں ہوں، خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور اور حق تلفی وہاں کا رواج ہے۔ ایک شخص اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا دل چیر دیتا ہے، اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو مبتلائے فریب کرتا ہے اور ایک شخص پر ہی کیا موقوف! یہاں تو گروہ کے گروہ ایسے ایسے افعال میں ہمہ وقت و ہمہ رخ مصروف ہیں۔ شاید یہ میدان تیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں دوڑنے والے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے، پاؤں تلے روندتے آگے بڑھیں۔ اب کون سلامت روی اختیار کرے۔ نہیں، اب کوئی سلامت روی اختیار نہیں کرے گا، کوئی اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کرے گا۔

یہاں جو برا نہیں، بے وقوف ہے۔ ”بڑے ہشیار“ کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں، وہ اپنی برائی میں ایک تہائی کا ہی ذمے دار ہے۔ باقی ذمے داری اس سماج کی ٹھہری جس کی بنیاد ہی شر پر رکھی گئی ہے۔ اب یہاں جو ہے، وہ ہونا تھا۔

برف و باراں کی شام کو اگر کوئی خستہ حال مسافر کپکپاتا، کھانستا تمہارے مسکن کے پاس سے گزرے تو اسے پناہ دو، اپنا کمبل اسے اڑھا دو، اس کی مدارات کرو اور میری جان، اس کے لیے بھی تیار رہو کہ جب وہ واپس ہوگا تو تمہارے سینے میں چاقو اتار کے کُل اسباب میزبان ہی کے کمبل میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اسے آنے والی زمہریری شام کا خوف ستا رہا ہے اور آج شام جس کمبل نے اسے سردی سے پناہ دی ہے، وہ تمہارا ہے۔ اب اگر چلتے وقت وہ کچھ زادِ راہ اور یہ کمبل تم سے مانگتا ہے یا تم خود ہی یہ چیزیں اسے بخش دیتے ہو تو یہ احسان ہوگا۔

ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ انسانوں میں ابھی اتنی اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ احسان کا بوجھ سہار سکیں۔ وہ جو بولنا نہیں جانتا، اسے بولنا سکھاؤ، پر اس توقع کے ساتھ کہ جب وہ پہلی بار روانی سے بولے گا تو تمہیں گالی دے گا۔ جسے لکھنا نہیں آتا، اسے لکھنے کی مشق کراؤ، پر نفس کی اس آمادگی کے ساتھ کہ جب وہ اپنا نام لکھنا سیکھ لے گا تو سب سے پہلے تمہارے قتل کے محضر پر دستخط کرے گا۔

مگر یہ بددل ہونے کی بات نہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مایوس ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ ہے..... تو اب کہ جب ہم نئے سال کے حاشیوں پر کھڑے ہیں اور منفعت اور خسارے کی فردِ حساب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو ہم انسانیت کے بارے میں سوچیں جو زمانوں میں زندہ تھی اور زندہ رہے گی۔

عزیز قارئین!

السلام علیکم!

دسمبر 2016ء...... سال کا آخری شمارہ اس خیال کے ساتھ حاضر ہے کہ ایک طائرانہ نگاہ ہمیں بھی گزرے ہوئے سال پر ڈال لینی چاہیے یہ سوچ کر کہ ہم نے کیا پایا، کیا کھویا...... ہر سال دسمبر دلوں کو اداس کر جاتا ہے اور آنے والے سال کے لیے نئی امیدیں ذہن میں بو جاتا ہے، بہر حال 2016ء اس حوالے سے بھی یاد رہے گا کہ ہمارے دو پیارے اور ہر دلعزیز مصنفین محی الدین نواب اور کاشف زبیر ہم سے بچھڑ گئے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے (آمین) اس بار ہم نہ سیاست پر بات کریں گے نہ ریاست پر بلکہ ریاست کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں بات کریں گے جن کے حوالے سے 25 دسمبر کا دن پاکستان کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر پوری قوم کو طبقات میں تقسیم کر دیا جائے تو قائد کے نزدیک طالب علموں کا طبقہ سب سے اہم بلکہ کسی بھی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے مگر افسوس...... ہمارا تعلیمی نظام...... جسے ترتیب دینے والے خود جداگانہ نظام کا شکار ہو کر نظریات کی جنگ تو لڑتے ہیں مگر کسی بھی نظریے پر نہ تو اتفاق کے لیے راضی ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے نظریات کو حقائق کی بنیاد پر تسلیم کرانے کی اہلیت رکھتے ہیں، لہٰذا ہمارا تعلیمی نظام بھی جتنے درجات میں تقسیم ہو کر بکھر گیا ہے اتنی ہی تیزی سے طالب علموں کی ذہنی استطاعت اور اتحادی قوت بھی تقسیم ہو کر بکھرتی جا رہی ہے۔ جداگانہ تعلیمی نظام طبقاتی فرق کے ساتھ کچھ طالب علموں میں احساسِ برتری اور کچھ میں احساسِ کمتری پھیلانے کا سبب بن رہا ہے اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ بعض اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں امیر گھرانوں کے بچوں میں منشیات کا استعمال ہمارے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان بنا رہا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اسکولز کالجز کی کینٹین میں بھی منشیات کی ملاوٹ زدہ اشیا فروخت کر کے معاشرے کو مکمل تباہی سے ہمکنار کرنے کی خاموش سازشیں کی جا رہی ہیں۔ والدین کو بھی اس معاملے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ سوال ہر طبقے کو دعوت فکر دے رہا ہے کہ ایسی تفریق سے ہم کس طرح ایک مثالی اور منفرد نظام پر مستقل معاشرہ ترتیب دے سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال بعض اوقات ذہن میں پھانس کی طرح چبھتا ہے کہ اگر بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو زندگی تھوڑی سی مہلت اور دے دیتی تو شاید نہ صرف تعلیم بلکہ دیگر شعبہ جات بھی مضبوط اور مستحکم ہوتے۔ جن اداروں میں مفت تعلیم دینے کا نعرہ لگایا جاتا ہے وہاں بھی تعلیم کا معیار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ درسی کتب کو کیڑوں کی غذا بنا کر الماریوں کی زینت بنا دیا جاتا ہے جبکہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتوں پر غیر متعلقہ با اثر افراد کا تسلط بھی دیکھا گیا ہے۔ شیکسپیئر کا قول ہے کہ ”تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔“ تو جناب سیدھا سادہ فارمولا ہے کہ بہترین اساتذہ مضبوط مستقبل کی ضمانت ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں عمارتوں کی آرائش سے زیادہ اساتذہ کی بہترین تربیت کی ضرورت ہے۔ ہمیں ٹریننگ سینٹرز کا اعلیٰ معیار مقرر کرتے ہوئے ایجوکیشن کے سلسلے میں درپیش مسائل کو سنجیدگی سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا سوال ہے کہ قوم کے سدھارنے والوں میں سے کون ہے جو اس جانب بھی توجہ دے...... اور مثبت عملی قدم اٹھائے...... فکر کے لیے سوچ کے در وا کر کے ہم تو قدم اٹھاتے ہیں اپنی ہنستی مسکراتی محفل کی جانب۔

✠ **محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال** سے محفل کی زینت بن رہے ہیں ” آہ، 20 ستمبر 2016ء بروز منگل کو ہمارے پیارے ابو جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہماری آہیں سسکیاں کرب ہمارے کچھ کام نہ آیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کیا۔ ایک ابو کے جانے سے کئی رشتے کھو بیٹھا میں کہ ابو نے ماں کا پیار بھی دیا، وہ میرے دوست بھی تھے کہ ہر بات شیئر کر لیتا تھا ان کے ساتھ۔ وہ ہمارے محسن بھی تھے کہ خود کٹھن اور مشکل وقت گزار کر ہمیں اچھی تعلیم و تربیت دی۔ ہماری بدقسمتی کہ جگر کا کینسر ہو گیا اور پتا اس وقت چلا جب آخری اسٹیج پر بیماری پہنچ چکی تھی۔ دوستوں سے اپیل ہے کہ ان کے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ پاک ان کو جنت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ (آمین ثمہ آمین...... ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں) نومبر کا ماہنامہ 16 کو سرور بیں کراچی میں ملا۔ سرورق سے نظر چراتے ہوئے آئے آگے جون ایلیا کے پاس تو وہ بھی کرب میں محسوس ہوئے۔ آپ کے اداریے تک آئے، آپ کچھ ملکی حالات کا درد بتاتے نظر آئے۔ مجھے لگتا ہے کہ بھارت ابھی تک ہم سے واقف نہیں کہ ہم وہ قوم اور وہ امت ہیں کہ کبھی کسی کی گیدڑ بھبکیوں میں نہیں آتے۔ امریکا کے ایما پر معصوم شہریوں پر فائرنگ کہاں کی انسانیت ہے۔ پاکستان کبھی خودکفیل ہو جائے، وہ کیسے چاہیں گے کہ سی پیک منصوبہ پورا ہو۔ وہ ہمیں آئی ایم ایف کے قرضوں تلے ہی دبا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی محفل میں آئے، بینش صدیقی کو سردار پایا۔ بہت عمدہ تبصرہ آپ نے آوجگت امی کہہ کر طنز کیا ہے۔ یہ بہت قیمتی رشتہ ہے۔ ماں جی، شکریہ کہ آپ نے مجھے میری ماں ہونے کا شرف بخشا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو لمبی عمر صحتِ کامل کے ساتھ عطا فرمائے۔ مرحا گل صاحبہ بھی بہت اچھے تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بنیں۔ اشفاق شاہین کا تبصرہ بھی عمدہ۔ محمد خواجہ صاحب جامع اور بہترین تبصرے کے ساتھ موجود۔ ادریس احمد خان کی عمدہ تبصرہ نگاری، تحریم شاہ بھی کیوٹ سے تبصرے کے ساتھ محفل کا حصہ بنیں۔ وارث علی اور روحی بھائی کے تبصرے بہت بہترین رہے۔ رضوانہ بہن آپ کا بہت شکریہ اور گھر والوں کا بھی کہ ہمیں دعاؤں سے نوازا۔ کہانیوں میں غلام

بادشاہ سے شروعات کیں۔ اب منگولوں کو بیبرس نے وہ شکست دینی ہے کہ وہ یاد رکھیں گے کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ تنویر ریاض کی جھوٹا خواب عمدہ تحریر رہی۔ پادری بڑے طریقے سے انہیں لوٹتا رہا پر آخر میں پادری کو جان کی بازی ہارنی پڑی۔ شیش محل تک گئے، یہ قسط خاصی دھواں دار رہی۔ فاروق اور بملا کی ملاقات، نواب خاندان کے رازوں سے پردہ اٹھا۔ جولیٹ کی بہت عمدہ پرفارمنس اور فاروق کو کس نے اغوا کیا ہوگا یا ہو گئے؟ کافی انٹرسٹنگ رہی یہ قسط۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ماما لوسی پوسی مریا لے کر آئے بہت نائس تحریر۔ یہاں غریب انسان کی کوئی قیمت نہیں ان بے چاروں کو کون پوچھے گا ہمارے ملک میں۔ سلیم انور کی چوک مختصر پر اچھی رہی۔ مرزا امجد بیگ آہنی گرفت کے ساتھ وارد ہوئے۔ ہمیں کیس کے شروع میں ہی نذیر خان کا پتا چل گیا کہ وہی قاتل ہے۔ کیس سیدھا سادہ تھا اتنا ٹیڑھا نہیں تھا۔ منظر امام چراغ لے کر آئے مختصر لفظوں میں بہترین سبق دیتا آتا ہے ... ایسے کئی چراغ ہوں گے میرے پاکستان میں پر کوئی فائدہ اٹھانے والا تو ہوتا۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ ثمر عباس کی چکھا بھی اچھی تھی کہ ہیرل کو ہیر بنانے پکڑلیا ہمجاد سے کر۔ محی الدین نواب کی ماروی بہت عمدہ: جارہی ہے۔ کہانی کافی انٹرسٹنگ موڑ پر آگئی ہے۔ علی اختر کی کوئل بھی اچھی تحریر رہی۔ یہی مکروہ چہرے تو معاشرے پر داغ کے مانند ہیں جو دوہرا طریقہ زندگی اپنا کر کئی لوگوں کو برباد کردیتے ہیں۔ امیر خسرو، بلگرامی کے قلم سے ہی امیر خسرو کی زندگی کے بارے میں جاننا اچھا لگا۔ ان کی اپنے مرشد کے ساتھ محبت بھی اچھی لگی۔ فرحت جمیلہ مانوس اجنبی لے کر حاضر ہوئیں۔ اچھی تحریر تھی۔ دلکش اور بار بار ... پہلے ہی مکمل کرایا ہوگا اس لیے پہچاننے سے انکاری رہا۔ نشور بادی کے قلم سے بے اختیار آگئی۔ کافی سبق آموز تحریر تھی کہ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت والدین کا فرض ہے۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے تو دوسرے کو آگے شادی کا حق حاصل ہے لیکن پہلے اپنی پہلی اولاد کا مکمل دھیان رکھ پائے، یہ نہ ہو کہ سوتیلی ماں یا سوتیلا باپ آجائے تو پہلی اولاد کی چڑی ادھیڑ رہے ہوں۔ آگے جاکر خدا کو اس کا حساب دینا ہوگا کہ اولاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ آخر میں دوستوں سے التماس ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کیجیے گا کہ مجھے دل اور جگر میں کافی درد اور تکلیف رہتی ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کا غم دور کرے اور آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین)

✠ **محبوب مصور سومرو،** لاڑکانہ سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں'' آپ کی اس پیاری سی بزم میں پھر دوبارہ حاضر ہوں۔ پیاری سی دعاؤں کے ساتھ ماتھ دعا ہے کہ آپ کا ہمارا یہ پیارا ساسسپنس یوں ہی مہکتا چہکتا ہوا کھلتا ہوا ہمارے ہاتھوں میں وقت پر پہنچتا رہے۔ آمین۔''

✠ **اشفاق شاہین،** لاہور سے محفل میں شرکت کررہے ہیں'' سرورق بہت عمدہ تھا۔ انشائیے پر پہنچے جہاں جون ایلیا نے زبان و تہذیب کے درمیان فرق کے مرض کو موضوع بنایا ہے۔ ایسی گنجلک باتیں مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ محفل میں پہنچے، میر حاصل تبصرے کے ساتھ بینش صدیقی صدر محفل ٹھہریں، گڈ۔ مرحاگل بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ محمد خواجہ، ادریس خان، تحریم شاہ، وارث علی، جبار روی بہترین خطوط کے ساتھ رونق محفل تھے۔ رمضان پاشا، طاہر بیگ، طاہر منیر، محمد شہباز کے خطوط بھی شامل بزم تھے۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے شیش محل کی طرف لپکے۔ فاروق نے بملا سے بدلہ تو چکا دیا، جولیٹ کی تلاش ہنوز جاری۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ فاروق کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ چاند بانو کا کردار دلچسپ اور بہترین اور پھر فاروق کا اغوا۔ اب جانے کونسا دشمن سامنے آتا ہے اور کیسے فاروق کی رہائی عمل میں آتی ہے۔ ماروی اپنی جگہ بہت اچھی جارہی ہے۔ دو دشمن کم ہوئے، اب عالی اور منصوبہ بندی سے مراد کے ساتھ مل کر دشمن کو ٹھکانے لگانے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔ تاریخی کہانی بھی بہترین تھی۔ آہنی گرفت، مرزا امجد بیگ کی تحریر پر بھی گرفت مضبوط تھی، بہترین تحریر تھی۔ امیر خسرو کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ نشور بادی کی آخری صفحات کی تحریر بے اختیار بلاشبہ ماہ نومبر کی بہترین تحریر ٹھہری۔ بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں البتہ چکھا بہترین لگی ثمر عباس کی۔ شعروں کا انتخاب بھی بہترین تھا خصوصاً میمونہ نفیس، ریحانہ افتخار، ریاض بٹ کا انتخاب لاجواب تھا۔''

✠ **رانا بشیر احمد ایاز،** احسان پور، ضلع رحیم یار خان سے تبصرہ کررہے ہیں'' ایک ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد پھر سے ہم اپنی بزم دوستاں میں حاضر خدمت ہیں۔ فیروزی رنگ کا دوپٹا اوڑھے، سیاہ زلفیں ہلکی سی بکھرائے، ہاتھوں میں میچنگ چوڑیاں پہنے سرورق کی دوشیزہ کمال لگ رہی تھی۔ پنک کلر کا بیک گراؤنڈ اور ساتھ میں ایک اسکیچ بنا ہوا۔ گویا صاف دیکھتے بھی نہیں اور چھپتے بھی نہیں۔ ٹائٹل اس دفعہ ذاکر انکل نے بہت خوب صورت بنایا۔ ویلڈن۔ سب سے پہلے فہرست دیکھنے کے بعد بزم دوستاں میں پہنچے جہاں اس دفعہ کرسیِ صدارت پہ حیدر آباد سے بینش صدیقی کسی ملکہ معظمہ کی شان سے براجمان تھیں۔ بینش جی بہت عمدہ تبصرہ رہا آپ کا اور جون ایلیا کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی اور اللہ پاک زرین آفریدی کو جلد شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ وزارت عظمیٰ کی مسند پہ مرحاگل فائز رہیں۔ کافی دلکش اور جامع تبصرہ تھا۔ جناب محمد خواجہ صاحب بہت شکریہ آپ نے اتنے خوب صورت انداز میں تبصرے کو پسند کیا اور سراہا۔ یہ تو آپ کا حسنِ نظر ہے۔ تحریم شاہ پہلے سال میں پاس ہونے پر مبارک قبول کریں اور مٹھائی کے ٹوکرے بھیج کر شکریہ کا موقع دیں۔ باقی تبصرہ نگاروں میں خواجہ نعیم جاوید، طاہر منیر، رمضان پاشا بھی محفل میں جاندار تبصروں کے ساتھ موجود رہے۔ میڈیکل کی مصروف ترین فیلڈ سے چند لمحات فرصت کے نکال کر تبصرہ لکھ رہا ہوں۔ (یہ آپ کی محبت ہے) سارا دن کام میں مصروف رہنے کے بعد رات کو سسپنس سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر تبصرہ کرنا بھی تو ضروری ہے۔ شمارے کا آغاز شیش محل کی سیر سے کیا۔ گنیش کے اتفاقی قتل سے فاروق کو جان بچا کر بھاگنا پڑا تو منو اور اکبر کی مداخلت سے میر صاحب کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ بعد میں اشوک بچن دونوں کو تھانے سے مکھن کے بال کی طرح نکال لایا۔ آصف خان جولیٹ میں دلچسپی لے رہا ہے اور اپنی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔ فاروق بملا کو ہوٹل تک لانے میں کامیاب رہا اور ایک ہی دفعہ میں اس کا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اپنے شوہر کے قتل سے چاند بانو پر حتمی تک لیکن پھر بھی بملا کو اپنی ازلی نفرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر چھوڑ دیا۔ دین داد کی اس دفعہ ماضی سے پردہ اٹھتا ہوا نظر آیا۔ باپ کی بے پروائی اور سوتیلی ماں کے ظلم کے سبب سے گھر چھوڑ کر زمانے کے تھپیڑے سہہ کر رب نواز

رہن داوا بن گیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید بلیوں کی کہانی لے کر آئے۔ پہلے تو کہانی کا نام کچھ عجیب سا لگا۔ اسکول دور کی یادیں بھی کیا خوب ہوتی ہیں۔ اپنے اسکول کا دور یاد آ گیا۔ زاہد بلیوں کی تنظیم کا علمبردار تو بن گیا مگر لاکھوں ڈالرز، پرتعیش بنگلے، آسائشیں حاصل کرنے کے باوجود بھی اس کے اندر کا انسان نہ جاگ سکا اور جانوروں والا سلوک پالتو بلیوں سے روا رکھا۔ قول و فعل کا تضاد اب اس معاشرے کا مستقل روگ بن چکا ہے۔ مرزا بیگ صاحب آہنی گرفت کے ساتھ ان ایکشن نظر آئے۔ کامران ثمرین کے چکر میں قتل کے کیس میں پھنس گیا تو بیگ صاحب مدد کے لیے آگے بڑھے۔ فرید خان ایک نمبر کا چالباز اور مکار شخص نکلا تو کامران کا دوست بھی لالچی نکلا اور ساڑھے تین لاکھ کا مکان دو لاکھ میں بکوا کر ستر ہزار روپے کا چونا لگانے کے چکر میں تھا۔ مہر النسا کی قسمت اچھی تھی کہ پرنٹنگ پریس کے مالک سلیم اقبال کے پاس معاملہ پہنچ گیا۔ چراغ سے چراغ جلتا رہے تو ایک دن اندھیرا ختم ہو جائے گا۔ منظر امام اس دفعہ روایت سے ہٹ کر کہانی لے کر آئے اور دل کے تار ہلا دیے۔ امجد اور ارشد نے اپنے باپ کو انکار کر دیا مگر وہیں ایک نوجوان نے بھرے ہوئے ہوٹل میں بوڑھے باپ کی خدمت کر کے سب کو ایک سبق دے دیا کہ اگر دونوں جہاں میں بھلائی چاہتے ہو تو والدین کی خدمت کرو۔ چوک میں ماہر ترین فراڈی اور چور یعنی سانتا سے بھی بس ایک چوک ہوئی اور وہ دھری گئی۔ بر نانس اسٹرج کا کریڈٹ کارڈ تو چوری کرنے میں کامیاب ہوگئی مگر شامتِ اعمال اسے اسٹرج جیولرز اسٹور پہ لے گئی۔ پھر چوروں کو پڑ گئے مور والی بات ہوگئی۔ علی اختر کا نام پہلی دفعہ نظر سے گزرا ہے۔ شاید نئے رائٹر ہیں مگر بہت ہی بہترین کاوش رہی موصوف کی۔ ازیہ قیصر نے عالمی کانفرنس میں شرکت کر کے مردوں کو ظالم اور جابر تو قرار دے دیا مگر اپنی بہو شائلہ کا اپنے بیٹے سرمد سے ذلت آمیز سلوک دیکھ کر بھی کچھ نصیحت نہ حاصل کی۔ دوسری طرف اپنا ذاتی کردار یہ ہے کہ محترمہ Homo ہیں۔ واہ بہت خوب اور تیسرے دھندے میں ٹانگیں اڑا رکھی ہیں۔ دوہرے کردار اور دوہرے چہرے والوں کا اس معاشرے میں رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کا نام ہی کافی ہے۔ ان کا نام پڑھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تحریر جاندار ہوگی۔ امیر خسروؒ اور محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کا پیار اور تعلق کے بارے میں پڑھ کر ان کے ایمان کی پختگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ حسن سنجری اور امیر خسروؒ کے عشق کا پڑھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ شہزادے نے کوڑے حسن سنجری کو مارے لیکن نشان اور زخم امیر خسروؒ کے ہاتھ پر بھی لگ گئے۔ بہت زبردست اور معلوماتی کہانی رہی۔ آخری صفحات پہ اس دفعہ کافی عرصے بعد نشور ہادی کا نام سامنے آیا۔ حماد نے صبیحہ کا کھلونا بننے سے انکار کر کے فرح کو پا لیا تو صبیحہ اپنی نفسیاتی بیماری کے سبب ہر کسی کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ سگی ماں کی ممتا سے محروم صبیحہ سگی ماں کے ظلم و ستم سہہ کر پھر وہی ستم دوسروں کو لوٹانے لگی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اولاد والدین میں سے کسی بھی ایک فریق کی عدم موجودگی اور دوسرے سوتیلے رشتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کارلوس کا کردار بھی ٹھیک رہا اور مالک پہ وفاداری میں جان قربان کر دی۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی رہی۔ محفل شعر و سخن بینش صدیقی، محمد خواجہ، مرحا گل اور اطہر حسین کے اشعار کافی دل کش رہے۔ ماروی فی الحال زیرِ مطالعہ ہے۔ ادارے سے ایک دفعہ پھر گزارش ہے، آئندہ ماہ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی تحریر شامل کی جائے۔'' (پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ)

✠ دوست محمد، چارسدہ روڈ، پشاور سے حاضر ہیں'' میں گزشتہ 22 سال سے سسپنس ڈائجسٹ کا قاری ہوں لیکن یہ میرا پہلا خط ہے (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) اکتوبر کے رسالے کا ٹائٹل دیکھ کر بے اختیار جی چاہا کہ خط لکھ دوں۔ ٹائٹل میں حسینہ پھولوں کے گجرے کے ساتھ شرماتی ہوئی نیچے دیکھ رہی ہے۔ بہت ہی اچھی لگی۔ میں نے تقریباً ہر رسالہ پڑھا لیکن سسپنس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک ایک کہانی کو میں اتنے غور سے پڑھتا ہوں کہ میرے بھائی مجھ سے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی انہونی بات ہے۔ میں نے ان کو پڑھنے کے لیے دیا تو وہ بے اختیار بول اٹھے کہ یہ رسالہ تو واقعی لاجواب ہے۔ تاریخی کہانیاں لکھنے میں تو الیاس سیتاپوری صاحب کا جواب نہیں۔ اس لیے آپ ضرور الیاس سیتاپوری کی تمام تاریخی کہانیاں شائع کرتے رہیں۔ باقی مصنف صاحبان میں کاشف زبیر صاحب کا کوئی جواب نہیں۔ خاص کر مغربی کہانیاں لکھنے میں اس کے علاوہ ڈاکٹر عباس صاحب بھی اچھا لکھتے ہیں۔ باقی صاحبان بھی اچھا لکھتے ہیں۔ معراج انکل آپ سے گزارش ہے کہ جتنے بھی مصنف صاحبان ہیں مہربانی کر کے ان کی لکھی ہوئی کہانی کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کریں۔''

✠ مرحا گل، ورا ابن کلاں سے محفل کی زینت بنی ہیں'' سسپنس نہایت تاب و تمکنت کے ساتھ 19 اکتوبر کو شہر دل میں جلوہ گر ہوا۔ میرے ہاتھوں کے گلدستے میں تازہ گلاب کے مانند اپنی خوشبو سے فضائے ذہن و دل کو مہکا رہا ہے۔ سرورق ہر لحاظ سے پرفیکٹ لگا مجھے۔ آپ کا شمارہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ اس میں ہر بات ہوتی ہے چاہے دین ہو یا دنیا۔ ہر ٹاپک پر معلومات ملتی ہیں۔ ماشاء اللہ سسپنس کا معیار روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اس جدید اور سائنسی دور میں بھی سسپنس کی اس قدر مقبولیت یہی معیار ہونا چاہیے...... اللہ تعالیٰ اسے یونہی قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ وڈی کرسی تے بیٹھی باجی بھنگڑا ڈال رہی تھیں زبردست...... سسپنس کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے بہت سے نئے ساتھی متوجہ ہو رہے ہیں۔ قابلِ داد ہے، سب کو خوب صورت نگری میں ویلکم...... دوسرے نمبر پہ ہم کو اعزاز بخشا شکریہ جناب...... آپ کے کمنٹس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ کورنگی صاحب کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ باقی سب بہن بھائیوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اپنا موسٹ فیورٹ ناول شیش محل پڑھا۔ اسما آپی ون ڈی گریٹ بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ جولیٹ کا باب پڑھ کر بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ اب فاروق کب یہ موقع دیتا ہے، انتظار ہے۔ اس کے بعد مرحوم محی الدین کی ماروی کی جانب لگا ہیں چار کیں جہاں ہم ڈوبتے ابھرتے اور گولیاں کھاتے رہے۔ نواب صاحب کی بہت سی شاہکار کہانیاں جو آج بھی دل پر نقش ہیں، ماروی بھی ویسے ہی نقش چھوڑ رہی ہے۔ آخری صفحات نے بے اختیار اپنی جانب متوجہ کیا جہاں نشور ہادی کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ نے ہم پر گہرا اثر کیا۔ واقعی ایک عبرت ناک کہانی تھی۔ صبیحہ سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ بس یہ تحریر اس ماہ اپنا حق ادا کر گئی۔ بیگ صاحب کی کہانی سے انصاف کیا۔ جہاں آخر میں بیگ صاحب نے بھی خوب صورت انداز میں انصاف کر دیا۔ منظر امام صاحب ایک مرتبہ پھر انوکھے انداز کے ساتھ آئے اور

چھا گئے۔ سلام ہو آپ پر انکل۔ مانوس اجنبی ایک محسوس کی جانے والی تحریر تھی۔ انداز تحریر زبردست تھا۔ ابتدائی صفحات پر عظیم رائٹر الیاس سیتاپوری کی نہایت مہارت و مشاقی کے ساتھ...... کتب تواریخ کی ورق گردانی کی اور حق ادا ہو گیا۔ تاریخ کی معتبر و نامور شخصیت کی سرگزشت نے معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں ایکشن و سسپنس سے بھرپور۔ انکل جی! سسپنس کی رونق دوبالا کرنے کے لیے بھی تو مریم کے خان کو لائیں نا یا مثل انکل سے کوئی قسط وار ناول لکھوائیں۔ سسپنس کی ساری شاعری بیسٹ رہی۔ اس دفعہ بہت سارے چٹکلوں نے مزہ دیا۔ بس یہی مزہ سدا قائم رہے۔ اس دفعہ ساری کہانیاں اپنا رنگ جمانے میں کامیاب و کامران رہیں۔"

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے شرکت کر رہے ہیں "نومبر کا سسپنس جون صاحب کی تحریر مرض دلچسپ خطوط اور بڑی ہی پُراثر اور لاجواب کہانیوں کو لے کر آیا اور خوب آیا۔ خطوط کی طرف چلتے ہیں تو جناب اوپر سب سے بینش صدیقی صاحبہ حیدرآباد سے اپنے زبردست تبصرے کے ساتھ بہت خوب، مبارک ہو آپ کو۔ مرحا گل کا تبصرہ بھی قابل ستائش، خواجہ صاحب کورنگی سے زبردست رنگ بکھیر گئے۔ بہت ہی عمدہ تبصرہ تھا۔ عبدالجبار رومی صاحب کا تبصرہ بھی داد کا مستحق ہے۔ اس دفعہ کہانیوں کا جواب نہیں، سب ہی نہلے پہ دہلا۔ غلام بادشاہ خوب رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب مالالوبی لے کر خوب ہی آئے اور انجام کا بھی خوب رہا امیر اور غریب سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ سلیم انور صاحب چور بہت خوب، چوری کرنے کے دلچسپ سلسلے مگر آخر میں مس سامنتھا پھنس ہی گئیں۔ مرزا صاحب کی آہنی گرفت واہ مرزا صاحب! خوب جال بنا اور مجرم دھڑام سے قانون کی گرفت میں۔ خالق اور ثمرین بے چارے کیا بیچتے ہیں اپنے مرزا صاحب نے تو بڑوں بڑوں کا تختہ کر دیا۔ بدلی رنگت کو دلی رنگ میں دونوں کہانیاں اچھی تھیں۔ آخری صفحات پر نشور ہادی نے نفرت کی انوکھی داستان رقم کی ہے اور خوب کی۔ خاص طور پر صبیحہ اور کارلوس یہ دونوں کردار خوب رہے۔ صبیحہ کا انداز انتقام ہادی صاحب نے کہانی کا تانا بانا انداز زبردست جوڑا۔ کہانی پڑھی اور دل نے کہا نشور ہادی خوب رہیں۔ منظر امام صاحب سب پر بازی لے گئے۔ کیا بات ہے منظر صاحب بھی ایسی کہانی لکھ کر سسپنس کے صفحات پر بکھیر دیں گے کہ یہ کہانی عرصہ دراز تک ہم بھول نہیں پائیں گے چراغ کہانی بہت ہی اثر انگیز معاشرتی اور سبق آموز ہے۔ اسے پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے کہیں ہم بھی تو......"

✠ فضا شاہ، لاہور سے محفل میں حاضر ہیں "نومبر کے شمارے کے لیے تحریر شدہ خط کے پراسرار غیاب نے بہت افسردہ کر دیا۔ اشاعت بعید، بلیک لسٹ میں بھی نام تک نہ تھا۔ (غلط فہمیاں ذہن کو تھکا دیتی ہیں لہٰذا پرہیز علاج سے بہتر ہے...... اگر نام مل جاتا تو شاملِ محفل بھی ہوتا) ہم کچھ روز تو شمارے سے دور ہی رہے تاہم شیش محل کی کشش غالب آ گئی اور کنارہ کشی سے کنارہ کرتے ہوئے شمارہ اپنے مقدس ہاتھوں میں لینا پڑا۔ سرورق پر موجود ستی بھی ہمارے تبصرے کے غیاب پر افسردہ اور غمگین نظر آئی۔ شیش محل میں گنیش کے غیر ارادی قتل سے فاروق کو مشکل سے دو چار دیکھا تو فوراً اور منو کو اس کی مدد کے لیے دوڑایا۔ دونوں نے اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی۔ بھلا کو اس کے کیے کی سزا دینے کے بجائے اسے چھوڑ دینا اچھا نہیں لگا کہ دشمن سے بے موقع نرمی کرنا اسے شیر بنا دیتا ہے۔ چاند بانو کو شادی کی پیشکش غیر متوقع تھی۔ آخر میں مسٹر فاروق برے پھنسے ہیں۔ مارومی دیوتا کا پارٹ بنتی جا رہی ہے البتہ تاریک دنیا کا تصور نیا ہے۔ قارئین جو بھی کہیں ہمیں تو مارومی اچھی لگتی ہے۔ سسپنس کے آخری صفحات پر ہمیشہ اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس بار نشور ہادی نے انسان کی طبیعت اور مزاج پر بچپن کے حالات کے اثرات بیان کیے۔ صبیحہ جیسی ضد بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ضد نے ہی اسے بد انجام سے دوچار کیا۔ کارلوس کی تسکین کا انداز عجیب و غریب رہا۔ ردی کی ٹوکری یا کالی فہرست سے بچنے کے لیے محفل اور بقیہ کہانیوں پر تبصرہ ادھار رہا۔" (یہ تو سراسر بے ایمانی ہے بھئی)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "فہرست حسب منشا تھی، سادہ اور پروقار۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ بینش صدیقی صاحبہ کو مبارکباد۔ موصوفہ کا طویل و عریض تبصرہ بہت ہی شاندار اور جاندار تھا۔ دیگر تبصروں میں مرحا گل کا تبصرہ اچھا لگا۔ موصوفہ نے اس عاجز کے تبصرے کو پسند کیا، ان کا شکریہ۔ انشائیہ، جون صاحب کا مرض دیکھا، ہائے یہ تو لاعلاج ہے۔ اشعار کی محفل میں ماہا ایمان، زرین آفریدی اور محمد خواجہ کے اشعار قابلِ داد تھے۔ شہباز ناز کا شکریہ انہوں نے میرے منتخب کردہ شعر کو پسند کیا اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ جھوٹا خواب جھوٹا ہی ثابت ہوا یعنی لطف نہیں آیا۔ چوک کہانی مزیدار تھی، آخر میں خوب مزہ آیا۔ شیر شاہ صاحب یہ تیسری بار منفرد عنوان کی کہانی لے کر آ گئے۔ کہانی پُر لطف تھی، اختتام فکر انگیز تھا۔ آہنی گرفت بیگ صاحب کو اس بار بڑا اچھا کیس ملا، عبدالحق کی کارروائی میں بڑا مزہ آیا۔ اس دفعہ شیش محل اور بدلی میں سسپنس ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا۔ یہ دو کہانیاں بھی نہیں بھول سکتے۔ چکما اور کول کہانیاں تو اچھی تھیں لیکن ان میں وہ لطف نہیں آیا جو آنا چاہیے تھا۔ امیر خسرو کے بارے میں کچھ پہلے بھی پڑھ رکھا ہے لیکن اس مضمون سے تفصیلات اور اندر کی باتیں بھی معلوم ہوئیں، لطف آ گیا۔ مانوس اجنبی ڈگلس کاربر کا ساتھی تھا، کاربر صاف بچ نکلا۔ بے اختیار یہ کہانی بھی مدتوں یاد رہے گی، کہنا چاہیے، یہ کہانی ہے دی اسٹوری آف منتھ۔"

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "ہمیشہ کی طرح سرورق خوب صورتی اور سادگی کا امتزاج لیے سسپنس ڈائجسٹ بروقت موصول ہوا۔ انشائیے میں جون ایلیا کی دانشوری سے بھری باتیں پڑھ کر دل مسرور ہوا۔ اداریے سے فارغ ہوئے تو ناموں کی محفل میں بینش صدیقی نظر آ رہی تھیں۔ سو مبارکباد۔ الیاس سیتاپوری کی غلام بادشاہ پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت تحریر، ان کی ہر تحریر کے دل سے معترف ہیں۔ پڑھ کر تاریخ کے دور میں پہنچ جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے ہر واقعہ چشم دید ہو۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر مالالوبی پوسی مریا بے مثال تحریر تھی۔ چوک بھی سلیم انور کی اچھی کہانی تھی۔ چراغ منظر امام کی بہت ہی پرکشش اور پراثر تحریر تھی اور ہر حساس دل کو جھنجوڑ دینے والی سبق آموز کہانی تھی۔ آج یہ دم توڑتی قدریں ہمارے معاشرے کا حقیقی المیہ ہیں۔ یہ کتنے بڑے ستم ظریفی کے لمحات ہوتے ہیں جب ایام پیری میں بوڑھے ماں باپ جن

کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، وہ اپنی عمر کا سارا سرمایا اپنی اولاد پر صرف کر دیتے ہیں اور اولاد ان کو کیا دے، زمانے بھر کی دربدری اور اس دنیا کی ٹھوکریں کھانے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ یہی دوران کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ بہت خوب منظر امام صاحب دلوں کو پیغام دیتی آپ کی ہر تحریر اچھوتی اور لازوال ہوتی ہے مگر اس کو سمجھنے کے لیے بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ کترنوں نے بھی آگہی کے در وا کیے۔ شعروں کا انتخاب برملا رہا۔ چکھا، کول، مانوس اجنبی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ امیر خسرو بھی کی۔۔۔ پہیلیاں رہتی دنیا تک قائم و دائم رہیں گی۔ وہ موسیقی سے بھی باخبر تھے اور بلند پایہ صوفی دل کامل شاعر ان جیسا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیا کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور امیر خسرو بھی اپنے پیر سے لازوال محبت کرتے تھے۔ یہ ان کی محبت کی انتہا ہے کہ ان کو اپنے پیر کے قدموں میں جگہ ملی۔ آخری صفحات کی کہانی بے اعتنا بھی بے حد پسند آئی۔''

✠ **محمد شہباز ناز،** اکبر کالونی سرگودھا سے چلے آرہے ہیں ''ٹائٹل گرل دیکھنے میں دیہاتی معلوم ہوئی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا جس میں انہوں نے بیماریاں کے بارے میں بتایا۔ سب سے پہلے منظر امام صاحب کی کہانی چراغ پڑھی جس میں انہوں نے اپنی زندگی کی تلخ حقیقت بیان کی کہ ان کے اپنے ہی بچے امجد اور ارشد ان کا اچھی طرح خیال نہیں رکھتے۔ جس طرح ہوٹل میں اس ڈرائیور نے اپنے بوڑھے بابا کا خیال رکھا اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی کہانی آہنی گرفت پڑھی۔ کہانی پڑھتے ہوئے میری تو آنکھیں بھیگ گئیں لیکن بیگ صاحب کا ڈرامائی انداز دیکھا تو چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس طرح سلیم اقبال نے مہر النسا کا مشکل وقت میں ساتھ دیا اس کا مکان فروخت ہونے سے بچایا آج کل ایسے انسان بہت کم ہی ملتے ہیں کہ بغیر لالچ کے دوسرے انسان کی مدد کریں۔ اگر سب انسان سلیم اقبال جیسے ہو جائیں تو زمانہ یوں ہی سدھر جائے۔ بہت ہی قابلِ تعریف کہانی تھی۔ الیاس سیتاپوری صاحب کی کہانی غلام بادشاہ پڑھی۔ پہلے کی طرح اس بار بھی شاندار تھی۔ نشور ہادی کی کہانی بے اعتنا پڑھی۔ ایک سبق آموز کہانی تھی۔ اگر صبیحہ کو بچپن سے پیار ملتا تو وہ اتنی قدر خود غرض نہ بنتی کہ جس چیز کی خواہش کرتی اسے ہر قیمت پر حاصل کر لیتی۔ آخر کار اپنے باپ اور ماں کو بھی مار دیا تب جا کر اس کو سکون آیا۔ ماروی کہانی ہمیشہ کی طرح ہی ادھوری رہ جاتی ہے جس سے سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ماروی کی آخری قسط کا انتظار رہے گا۔ تنویر ریاض کی کہانی جھوٹا خواب پڑھی جس میں پادری اپنے ہی لالچ میں رہتا تھا۔ اچھی کہانی تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے اور اس ادارے کو مزید ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔'' (بہت شکریہ)

✠ **ہینش صدیقی،** حیدرآباد سے تبصرہ کر رہی ہیں ''زندگی ایسے جیو کہ اپنے اللہ رب العزت کو پسند آجاؤ کیونکہ دنیا والوں کی پسند تو پل بھر میں بدل جاتی ہے۔ نومبر 2016ء کا شمارہ میرے سامنے تھا اور مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا تبصرہ صدارت پر آگیا۔ پھر اپنے آپ کو چٹکی کاٹ کر شاباشی دی، بہت بہت شکریہ اسٹاف سسپنس ڈائجسٹ۔ اس وجہ سے تو آپ کا یہ ڈائجسٹ پورے پاکستان بلکہ دنیا میں نمبر ون کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ نظر شناسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اب تو مبارکیں بھی مجھے ملنے والی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی کو سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ اس بار مرض کی سمجھ آ ہی گئی۔ اداریہ سب سے زیادہ زبردست ہوتا ہے، جو حالات و واقعات پورے ماہ پاکستان میں وقوع پذیر ہوتے ہیں، وہ یکمشت ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ ویلڈن۔ سر حاکل کافی سیانی باتیں کر لیتی ہیں۔ تبصرہ بھی بہت اچھا ہے۔ محمد خواجہ سر، اشفاق شاہین سر اور عبدالجبار رومی سر آپ سب پرانے تبصرہ نگاروں سے تو بہت کچھ سیکھا ہے۔ قدرت اللہ نیازی سر اور طاہرہ گلزار میڈم بھی بہترین تبصرے دیتے ہیں۔ رمضان پاشا سر آپ خوش رہا کریں۔ نشور ہادی کی بے اعتنا بس ٹھیک ہی رہی۔ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے امیر خسرو کے حالات زندگی پیش کر کے دل خوش کر دیا۔ چکھا، ثمر عباس جی نے دائمی دوست اور آستین کے سانپ کی صحیح عکاسی کی۔ بیزل میرینا کے گھر چوری کر کے پکڑی گئی۔ جیسے کو تیسا اچھی اسٹوری تھی۔ مانوس پوکی مریا، ڈاکٹر شیر شاہ سید بہت اچھے سر جی، نام بھی منفرد کام بھی منفرد۔ دولت کی ہوس انسان اور جانور بے زبان کو نہیں دیکھتی، جیسے مسٹر زاہد نے فائدہ اٹھایا۔ جھوٹا خواب تنویر ریاض جی اچھے رائٹر ہیں۔ روز ینڈر کو خوب بے وقوف بنا کر یونانی پادریوں نے بہت لوٹا، مذہب کے نام پر لوٹنے والے تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ چراغ میں منظر امام کافی سیریس نظر آئے، بہت سبق آموز تحریر جس نے نوجوان نسل کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن انسانیت ابھی باقی ہے۔ چراغ سے چراغ جل ہی سکتا ہے۔ کول میں علی اختر صاحب نے کچھ عورتوں کی مجبوری اور کچھ کا دوغلا پن ظاہر کیا، یہ دہرا معیار پوری دنیا میں دکھایا گیا۔ آزیہ قیصر ایسے کرداروں کا سمبل تھی اور غیرت کے نام پر مارنے والے خود کیا کرتے ہیں۔ آہنی گرفت اور مرزا امجد بیگ جی کے سامنے اس بار کافی شاطر مجرم تھے، پھر بھی وہ ان کو بے نقاب کرنے میں کامیاب رہے۔ جیسے فرید اور شہرین کو بے نقاب کیا اور عمران کو بچا لیا۔ یہ ہوتی ہے ذہانت کے ساتھ وکالت۔ غلام بادشاہ، الیاس سیتاپوری کی بہترین داستان، اتنے خوبصورت انداز میں لکھتے ہیں کہ ہم اس دور میں پہنچ جاتے ہیں۔ کمان دار جبریس کا داستان میں آنا، اس کو مزید دلچسپ بنا گیا۔ منگولوں کی یلغار کب اور کیسے رکتی ہے اب یہ دیکھنا ہے۔ نواب صاحب کی ماروی کا پتا نہیں کس نے شوشہ چھوڑا کہ ختم ہو رہی ہے حالانکہ یہ داستان تو پھیلاؤ کی طرف جا رہی ہے... ابھی تو یہ ڈرابا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ شیش محل نے تو ہمارے قلب پر واردات کی ہوئی ہے۔ بہت ہی زبردست داستان جس نے سب کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور جولیٹ، نواب اسد اللہ کی نظروں میں اپنا مقام پا ہی گئی اور اپنی بیٹی تسلیم کرا لیا۔ محفل شعر و سخن میں بھی اپنا شعر نمبر ون پر دیکھ کر دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اللہ سائیں جب بھی دیتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اور عزت و دولت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ باقی محفل کے اراکین کے اشعار بھی بہت شاندار اور لاجواب تھے۔ میری بھی ایک گزارش ہے کہ ایک پُر مزاح کہانی شمارے میں رکھا کریں۔'' (کوشش تو کرتے ہیں آپ کی فرمائش پوری کر سکیں)

✠ **زرین آفریدی،** حیدرآباد سے محفل میں شامل ہو رہی ہیں ''سرورق دیکھ کر چترال کی حسینہ کا گمان ہوا۔ میں تہِ دل سے محفل کے تمام

ساتھیوں کی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرے تبصرے کو سراہا۔ بس یہ ہماری آپ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے اور آپ کی محنت کا خراج تحسین، کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔ ایلیا جی نے انسانی مرض کی صحیح تشخیص کی ہے۔ ان کی باتیں دل و دماغ پر اثر کرتی ہیں۔ اداریہ لاجواب اور بولڈ ہوتا ہے۔ اپنوں کی محفل میں انٹری دی تو واقعی صدارت پر اپنی بہنش صدیقی کو پایا، بہت خوشی ہوئی، مبارک باد ڈیئر۔ مرحا گل بھی صدارت سے بس ایک قدم دور رہیں۔ پاشا جی آپ کی زبان مبارک میں دوبار صدارت پر آ گئی ہوں۔ غلام بادشاہ، نومبر کی قسط میں پوری داستان دردانہ کے گرد گھومتی رہی۔ جبرئیل کی انٹری سے کہانی مزید دلچسپ ہو گئی۔ علیہ اور صفیہ بھی دردانہ کے سامنے آ گئیں۔ بہت ہی بہترین داستان ہے۔ جھوٹا خواب، تنویر ریاض صاحب کے کیا کہنے۔ مذہب کے نام پر ڈھونگ رچانے والے پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یونانی تو کئی ہاتھ آگے نکلے۔ یقین واعتقاد سے کھیلنے والے لوگوں کا انجام برا ہوتا ہے۔ آہنی گرفت مرزا امجد بیگ کا یہ کیس کہاں سے کہاں ختم ہوا۔ جب کسی بے گناہ کو بچانا ہوتا ہے تو اللہ پاک ایسے ہی وسیلہ بنا دیتا ہے۔ چراغ، اف منظر امام صاحب کی ایک عام سادہ سی کہانی لیکن سبق بہت گہرا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کی کچھ جنریشن بوڑھے لوگوں سے ایسا ہی سلوک کرتی ہے جیسے امجد اور ارشد نے اپنے والد سے کیا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اپنے بزرگوں کی خدمت کر کے اپنے لیے صلہ پاتے رہیں گے۔ علی اختر ہمارے تیکھی تحریر والے رائٹر ہیں۔ آئینہ دکھانے والی اسٹوری کول، اف! نظریں جھک گئیں، کول پڑھ کر...... این جی اوز اور دوسرے مفاد پرست اداروں نے عورتوں کو مظلوم بنا بنا کر ان کے دماغ خراب کر دیے ہیں۔ گندے، بے ضمیر اور مردہ ضمیر انسانوں کا دوہرا معیار پوری دنیا میں رائج ہے۔ شیر شاہ سید صاحب کی اسٹوریز کے نام آج کل بہت منفرد اور خوب صورت ہوتے جا رہے ہیں، کہانیاں بھی زبردست ہوتی ہیں۔ مالوی پوی مریا، ایک پُر فکر تحریر۔ ہم پاکستانی بھی کمال کے بندے ہیں۔ مار دی بہت اچھے ڈگر پر رواں دواں ہے، کالیا اور بن زیان کا اضافہ بہت خوب۔ بے اعتنا، نشور ہادی کی اوسط درجے کی اسٹوری ٹھہری۔ محفل شعر و سخن بہت دلنشین انداز لیے ہوئے ہے۔ بہنش صدیقی کے شعر نے محفل لوٹ لی۔ مرحا گل، اظہر حسین، آریز ملک اور ہاذیہ، ماہا کے اشعار بہترین تھے۔ مزاسلے بھی بہت شاندار رہے۔ کیا تنگ دیلوٹ پر مصطفین نے کہانیاں لکھنی چھوڑ دیں؟"

✠ طاہر منیر، چکوال سے شریک محفل ہیں "نومبر کا سسپنس اپنی گوناگوں کہانیوں اور دلچسپیوں سے مرصع نظر نواز ہوا۔ بزم دوستاں میں بندے کی پہلی حاضری کو پذیرائی بخشنے کا شکریہ۔ مصور پاکستان کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے ایک خوشگوار یاد کا تذکرہ برمحل تھا جس نے روح کو سرشار کیا۔ قوم کی راہنمائی قوم کے بانیوں کے کارناموں سے ہی چلا پاتی ہے۔ قوم کو ایسے ہی راہنماؤں کی ضرورت ہے۔ جون ایلیا کی تحریریں ادب برائے زندگی کی حامل ہوتی ہیں۔ عمل پا کساتی ہیں۔ تحریر جو صرف ذوقی تسکین و آسودگی کی حامل ہو وہ تو ایک بیماری بن جاتی ہے۔ تحرک ہی زندگی کی علامت ہے۔ ایلیا کی تحریریں اپنے دامن میں علم و ادب کے وہ موتی اور جواہر رکھتی ہیں جنہیں ہم فخر سے عالمی ادب کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ امیر خسروؒ کے متعلق آ گئیں تذکرے نے روح کو جھنجھنا کے رکھ دیا۔ ان کی شاعری نے بہت مسرور کیا۔ نیک لوگوں کی ذات ہی نہیں ان کی باتیں بھی بابرکت ہوتی ہیں۔ نفرت سے نفرت اور دلوں میں محبت انہی لوگوں کا کام تھا، ہے اور ہوگا۔ مالوی پوی مریا، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر انسانوں اور جانوروں کے نام نہاد ہمدردوں کے اندر کی کہانی ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ مختصراً لکھ رہا ہوں، زیادہ تعریف کا قائل نہیں۔ ایک تو نظر لگ جاتی ہے اور دوسرے بدگمانی کا خدشہ بھی...... روحی، بہنش، محمد خواجہ، مرحا گل صاحبہ کے پُر مغز تبصرے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ زرین آفریدی کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔"

✠ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں "نومبر کا شمارہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ خوب صورت اور مزے دار کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ سرورق ایک مشرقی دوشیزہ جس کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں پر مشتمل ہے۔ انشائیہ ہمیشہ دل سوز اور حساسیت کا مرقع رہا ہے۔ واقعی نفرت جیسا مرض ہم میں سرایت کر چکا ہے۔ خون بہہ رہا ہے، کون مر رہا ہے، کون مار رہا ہے۔ نفرت نے بینائی چھین لی ہے۔ حتیٰ کہ ایک گھر میں رہنے والے بھائی بہنوں میں نفرت، گھر اجڑ رہے ہیں، شہر اجڑ رہے ہیں۔ کیا ہم نے اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا ہے۔ دوست اور دشمن کی تفریق نہیں رہی۔ دوستوں کی محفل میں بہنش صدیقی حیدر آباد سے میر کارواں میں مبارک ہو۔ غلام بادشاہ، الیاس سیتاپوری نے ایک دفعہ پھر قلم کا جادو جگایا۔ ایسا تاریخ میں لے جاتے ہیں کہ بے خود کر دیتے ہیں۔ شیش محل بہت دلچسپ داستان۔ اس دفعہ کہانی کی اٹھان بڑی بھلی لگی۔ رہن دادا کی سوانح حیات کا پہلی بار علم ہوا۔ فاروق بھی ایکشن میں آ گئے۔ حیدر آباد کے نوابین کے اندرونِ خانہ حالات کا بالکل صحیح اور عمدہ جائزہ پیش کیا گیا۔ آہنی گرفت بیگ صاحب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بازی جیت گئے۔ اس دفعہ ایک فلاحی ادارے کے توسط سے اور ایک نیک دل شخص سے بے چاری سیرالنسا کو چال بازوں سے نجات دلوائی۔ چوک ایک چالاک چور حسینہ کی داستان، لیکن چور کا ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ ایک مختصر لیکن اچھی داستان۔ مالوی پوی مریا بڑی حیرت انگیز کہانی۔ یورپ میں جانوروں کی انسانوں کی قدر کا احوال پڑھنے اور دیکھنے میں آیا لیکن اس کا ناجائز فائدہ ہمارے پاس اٹھانے والوں کا حال اس کہانی میں پڑھ کر حیرت زدہ ہو گیا ہوں۔ چراغ بوڑھوں کی بے بسی ہمارے ہاں ہر طرف نظر آتی ہے۔ ہم بھی بوڑھے ہو رہے ہیں۔ خدا ایسی بے بسی اور اولاد کی نافرمانی سے بچائے۔ چکما یہ بھی ایک بہترین چور عورت کی کہانی لیکن وہ بھول گئی تھی کہ ایک دن چور کو پڑ گئے مور۔ ساری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ امیر خسروؒ اس لافانی شاعر، موسیقار اور محبوب الٰہی کی محبت کا حال تو سنا۔ ان کی پہیلیاں، گیت بہت سنے لیکن اس قصے میں ان کی ساری زندگی کا احوال پڑھ کر اس قدر معلومات ہوئیں کہ اس کورٹ لیا۔ بے اعتنا انسانی نفسیات میں ابھی ایک خوفناک کہانی۔ بچپن کے عذاب سے بہت بڑے بڑے لوگ گزرے۔ بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ دنیا میں کئی آدمی ابتدا میں سخت مشکلات اور مشقتیں جھیل کر بہت بڑے اداکار، صحافی، ناول نگار بنے لیکن غضب خدا کا اس لڑکی کو بچپن کی محرومی کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر دولت ملی لیکن نفرت کی آگ نے اس کو اتنا خطرناک مجرم بنا دیا کہ اس کی تباہ کن فطرت

سے مردوزن محفوظ نہیں ہے۔ آخری کہانی نے اس ماہنامہ کو چار چاند لگا دیے۔ اشعار کی محفل تو کہکشاں ہے۔ اوپر سے حکایتیں، چٹکلے، لطائف اور کہاں ایک ساتھ ملیں گے..... صرف سسپنس میں اور کہاں۔" (شکریہ جناب)

✠ خواجہ نعیم جاوید، بھلوال سے تشریف لائے ہیں "جس طرح انٹرنیٹ نے آکر ٹیلی فون کو دوبارہ زندہ کیا ہے، اسی طرح آپ کے رسالے میں شمولیت کے لیے ڈاک خانے والوں نے دوبارہ ہمیں پرانے دور میں داخل کیا ہے۔ ماہ نومبر کا شمارہ 26 اکتوبر کو موصول ہوا۔ سرورق اس دفعہ کوئی خاص نہیں تھا۔ خطوط کی محفل میں آپ کے اداریے پر تبصرہ اس لیے نہیں کرتا کہ سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ ہم تو خود ابھی لکھنا سیکھ رہے ہیں۔ اس دفعہ کوئٹہ میں ایک بار پھر خون کی ہولی کھیلی گئی اور 62 قیمتی جانیں گئیں۔ میرے ملک میں خون بہت سستا ہو گیا ہے شاید۔ ان حکمرانوں کی اولادوں کو کوئی کیوں نہیں کچھ کہتا۔ اپنی محفل میں بینش صدیقی بہت زبردست تبصرے کے ساتھ جلوہ گر ہوئیں اور کرسی صدارت پر قبضہ جما گئیں۔ مبارک باد قبول کریں۔ تبصرہ نگار سب ہی اچھا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں' تعریف کسے اچھی نہیں لگتی لیکن سینئر تبصرہ نگاروں کا تجربہ ہم نئے لکھنے والوں سے زیادہ ہے۔ جون ایلیا اس دفعہ مرض کے ساتھ حاضر ہوئے۔ میرے تو پورے ملک کو یہ تمام امراض دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں جن کا ذکر جون ایلیا نے کیا ہے۔ انسان ہی انسان کو ڈس رہا ہے۔ یہاں تو سانپوں کا کام ہی ختم ہو گیا ہے۔ غلام بادشاہ بلا کو خان اب مصر کی طرف جانے کے لیے قطز لوغا کو کمان دے رہا ہے تو ادھر بن بھی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا ہے اور درمیان میں برقائی خان بھی آ گیا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ شیش محل میں اس دفعہ دھماکا ہو ہی گیا اور جولیٹ نے اپنے آپ کو متعارف کروا دیا۔ دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کہ اسد اللہ جولیٹ کا دفاع کر پاتے ہیں کہ نہیں۔ مرزا امجد بیگ کی آہنی گرفت کافی اچھی کاوش رہی اور مرزا صاحب کی محنت سے فرید خان حوالات کے اندر جا پہنچا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہر دفعہ منفرد انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس دفعہ مالالوی پوسی مریا کے ساتھ نظر آئے۔ بہترین کہانی اور بہترین رائٹرز ویلڈن۔ ثمر عباس چھکا لے کر آئے، وہ بہت شارٹ، شارٹ کہانیوں کے ساتھ آتے ہیں۔ نشور باری کافی عرصے بعد نظر آئیں بے اعتنا کے ساتھ اور کیا خوب نظر آئیں۔ احساب کمتری اور ناپختہ ذہن، ساری عمر کا روگ بن جاتا ہے جو اس کہانی کا لب لباب رہا۔"

✠ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے محفل میں شریک ہیں "سرورق کی پیاری سی دوشیزہ پلو اٹھائے کسی راجے کی ہیر ہی لگ رہی تھی۔ اس دفعہ بھی جون ایلیا مرض کے ساتھ ساتھ دانش مندی سکھا رہے ہیں اور اس کا تعلق ایک فرد سے ہو تو بندہ مرض کو کنٹرول کر کے دانش مندی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہے ایک معاشرے کا، پورے ملک کا جسے ایک نہیں کئی امراض کھوکھلا کر رہے ہیں۔ صدر محفل بینش صدیقی آئیں اور چھا گئیں۔ مبارک ہو جی لیجیے ہم بھی پرانے تبصرہ نگاروں کی لسٹ میں آ گئے اور سیکنڈ پہ مرحا گل بھرپور تبصرے کے ساتھ بیسٹ رہیں۔ اچھی بات ہے، اشفاق شاہین کی رونق خوب لگی۔ محمد خواجہ کا انداز بھی خوب بھایا۔ دیکھو تو شیش محل میں فاروق بھلا سے بدلہ بھی نہ لے سکا اور بھلا کی دوشیزگی آڑے آ گئی۔ کوئی مرد مقابل ہوتا تو چنگیز کی طرح اوپر سدھار جاتا، جولیٹ نے رات کی تاریکی میں مرزا اختر سے خود کو بچا لیا اور ضبط کے سب بند ٹوٹ گئے۔ آخر اس نے خود کو ظاہر کر دیا۔ کیا غفلت اور گمراہی کو دور کرنے کے لیے بغداد کی تباہی کافی نہیں؟ یہی سوچ ہوتی ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور پھر کامیابیاں بھی ان کا مقدر بنتی ہیں۔ غلام بادشاہ غلام ہی سہی لیکن بغداد والوں سے بہتر رہا۔ سٹپٹاتے ہوئے درواغ کی حالت پہ بہت ہنسی آئی۔ چوک پر حیرت ہوئی۔ بڑا خیال رکھتی تھی چوری شدہ کارڈ استعمال کرنے میں لیکن بکرے کی ماں ثابت ہوئی۔ آخر کب تک خیر مناتی۔ پھر مردوں سے نفرت کرنے والی سوتیلی ماں کی زیادتی کا شکار صبیحہ نے حشمت اللہ اور رابعہ کو گولیاں مار دیں۔ کہانی تو اچھی تھی لیکن ایک لڑکی میں اتنی دیدہ دلیری اور جاسوسی طور طریقے حیرت کا باعث رہے۔ بے اعتنا صبیحہ کی بے اعتنائی حد درجہ عجیب رہی اور پھر بیگ صاحب کی آہنی تفتیش نے انہیں گھیر کر آہنی گرفت میں لے لیا۔ دھوکے باز جرائم پیشہ افراد بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان کی رسی دراز کی ہوئی ہے اور جب وہ کھینچے گی تو اگلا پچھلا سب حساب چکا دے گی لیکن پرنس عالی پہ اتنی جلدی زوال کیوں؟ ابھی تو اس نے بڑے کشٹ راگ کرنے ہیں۔ دوسری طرف یہودیوں نے نقلی پرنس عالی کو اسپیشل چینل پر متعارف کروا دیا ہے۔ اب یہ مارو اینڈ کمپنی کے لیے نیا چیلنج سامنے آیا ہے...... چراغ ایک ہی جل جائے تو کافی ہے...... ہمارے ملک میں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید مالالوی پوسی مریا میں بہت کچھ کہہ گئے۔ کیا خیال ہے ہمارے ملک میں اس کی کمی ہے؟ محفل شعر و سخن سے اظہر حسنین، محمد عارف خانیوال، ہما زبیر کراچی زبردست رہے۔"

✠ بابر عباس، ماہین بابر، ہگیانہ روڈ کھاریاں سے حاضر ہیں "سسپنس کا نیا شمارہ ماہ نومبر کی صورت میں اٹھارہ اکتوبر کو اس طرح ہاتھ میں آیا جیسے موٹروے پولیس کے ہاتھ کوئی تیز رفتار ڈرائیور آتا ہے۔ سرورق پر سجی ہوئی حسینہ بالکل بشریٰ افضل ثانی لگی جبکہ عقب میں جو پرچھائی ہے وہ غالباً بشریٰ افضل کا بڑھاپا ہے۔ فہرست کو سرسری سا چیک کر کے جون ایلیا مرحوم صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جون ایلیا صاحب درویش صفت انسان تھے۔ ان کی باتیں آنے والے وقت کا پتا دیتی تھیں۔ جون ایلیا صاحب سے ملاقات کر کے میں سید عادل اسٹاپ اپنی خوب صورت محفل میں پہنچا تو حسب معمول اپنی اسپیکر والی کرسی سنبھال رکھی تھی اور اپنی باتوں سے ہمیں فکر کی دعوت دے رہے تھے۔ کرسی صدارت پر اس بار بینش صدیقی تشریف فرما ہیں۔ اشفاق شاہین صاحب ہم پاکستانی چھٹیوں پر زیادہ خوش رہتے ہیں۔ میرا تعلق ٹرانسپورٹ کے محکمے سے ہے۔ چھٹیوں کے دوران جب سواریوں کی حالت دیکھتا ہوں تو یقین کریں بڑا افسوس ہوتا ہے۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں سسپنس بہت سے چہروں پر خوشی بکھیر دیتا ہے۔ تحریم شاہ جی پسند اپنی اپنی، کسی کو سرورق پسند آتا ہے اور کسی کو نہیں اور آپ کو بھی پسند نہیں آیا تو یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ کے زریں خیالات جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ محمد شہباز ناز صاحب نازنہ کر سب خاک ہے۔ جون ایلیا صاحب پیاری پیاری باتیں تو کرتے ہی ہیں، آپ بھی کسی سے کم نہیں۔ مرحوم نے خالی شعور دانائی اور دانش ہی نہیں لکھا تھا بلکہ ایک پورا صفحہ اپنی دانش مندانہ باتوں سے بھرا تھا اور آپ غالباً اس سے محروم ہیں' ذکر چند عزیز دوستوں کا جو میری طرح کافی عرصے سے اپنی پیاری سی

محفل سے دور ہیں۔ رضوان تنولی، حکیم رضا شاہ، اعجاز احمد راحیل، ہمایوں سعید براج، قدرت اللہ نیازی، قیصر اقبال گچ حاضر ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آل ٹائم گریٹ رائٹر اور لفظوں کے کھلاڑی جناب محی الدین نواب مرحوم کی زبردست تحریر بارودی جولوں کو گرماتی ہوئی ان کی یاد کو تڑپاتی ہوئی سسپنس کی فسوں کار کہانی جو حسب معمول نواب صاحب کی ایک خوب صورت تحریر جس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہوگی۔ دوسرے نمبر پر اسما قادری صاحبہ کی شیش محل پڑھی۔ شیش محل بھی اچھی جارہی ہے۔ اسما قادری صاحبہ بہتر سے بہتر ہوتی جارہی ہیں۔ اس بات کا منہ بولتا ثبوت شیش محل ہے۔ آخری صفحات پر ہمیشہ اچھی اور معیاری کاوش کو پیش کیا گیا۔ بہت ہی زبردست کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ اس بار آخری صفحات پر نشور ہادی نے بے اعتنائی لکھی۔ اس بار حسام بٹ صاحب مرزا امجد بیگ صاحب کی ڈائری سے آہنی گرفت لے کر آئے۔ حسام بٹ صاحب کا اپنا ایک انداز ہے۔ بہرحال آہنی گرفت کو حسام بٹ صاحب نے اچھے انداز میں پیش کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی اس بار امیر خسروؒ کو لے کر آئیں۔ کیا خوب لے کر آئیں اور ہمیں امیر خسروؒ کے حالات زندگی سے روشناس کروایا۔ ویل ڈن۔ غلام بادشاہ الیاس سیتاپوری کی تحریریں ہمیں تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرواتی ہیں، بندہ کھو سا جاتا ہے۔ منظر امام صاحب اس بار اپنی مختصری کہانی چراغ لے کر حاضر ہوئے اور پھر چراغ جلتا رہا یعنی چراغ ایک خوب صورت اور پُراثر کہانی تھی جبکہ باقی کی کہانیاں بھی سسپنس کے معیار کے عین مطابق تھیں اور یہی سسپنس کا خاصہ رہا ہے۔"

✠ **بلقیس خان**، واہ کینٹ سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "اوراق سے گزرے، پڑھا پھر سوچا کاش...... ہم سبق سیکھنے والے لوگ ہوتے۔ صدارت اور پھر وزارت کے منصب پر اپنی برادری کو دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ مرحا گل حسب سابق چھائی رہیں۔ مرحا، کاشف زبیر تو ایک ہی تھا۔ ان جیسا کہاں سے لائیں؟ کچھ دوست بھی ہیں جو غائب ہیں، خود ہی تشریف لے آئیں تو انہیں کیا فرق پڑے گا۔ ابتدا شیش محل سے کی۔ سب ہی کرتے ہوں گے، کوئی اقرار کرے یا نہ کرے۔ اسما قادری کی اس کہانی کے لیے میں اپنے پاس لفظوں کی بے حد قلت محسوس کرتی ہوں۔ اسٹوری بہت زبردست پھر لفظوں کی جادوگری، اس پر ربن داد اور فاروق جیسے صاحب کردار لوگ۔ معاشرے کے نبض شناس ڈاکٹر شیر شاہ سید کی نامالونی پوری ہماری قومی بے حسی کی غماز تحریر ہے۔ زاہد نے نیلی کے ساتھ جو کیا، وہی ہمارے مقتدر لوگ عوام کے ساتھ کررہے ہیں۔ سلیم انور کی نادانستہ چوک نے محظوظ کیا۔ مرزا امجد بیگ حسام بٹ کے ذریعے ہمیں اچھی اور سبق آموز کہانیوں سے فیض یاب رکھتے ہیں۔ چراغ، ضمیر جھنجھوڑتی وید کا احساس جگاتی الم ناک کہانی ہے۔ فرحت جمیلہ کی مانوس اجنبی اس ماہ کا تحفہ تھی۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی بے اعتنائی نے بہت الجھایا۔ سوتیلی بیٹی نے تو حد ہی کردی۔ علی اختر کی کوشش مردوں کو پارسا اور مظلوم اور عورتوں کو بے راہ اور سنگدل ثابت کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ اشعار سارے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اس دفعہ بینش، وردا، نادیہ ابنِ ماہا ایمان، محمد خواجہ، ریاض بٹ، اظہر حسین بچیار، فرقان احمد اور خاص کر مرحا ابنِ رمنا گل کے شعر پسندیدہ رہے۔ کترنوں میں روبی انصاری، وزیر محمد خان اور ریاض بٹ بازی لے گئے۔"

✠ **مسافر بے خانماں**، خوشاب کی گزشتہ شمارے پر رائے "ارے واہ...... اس مرتبہ تو شمارہ عیدالاضحیٰ کی شاپنگ میں ہی شامل ہوگیا اور دل باغ باغ ہوگیا۔ زرین آفریدی صاحبہ کرسی صدارت پر قدرت کی رنگینیوں کے پھول بکھیرتی نظر آئیں۔ مبارکاں جی...... ! صادق معاویہ بھائی! نا ہے کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ مہتاب احمد، محمود معاویہ، بینش صدیقی خوش آمدید...... جی آیاں نوں! حسب سابق سب سے پہلے شیش محل پڑھی اور سب سے عمدہ پایا۔ جولیٹ، ذی شعلہ جوالہ بھڑک چکا۔ سرکاری درباری پرانی کہانی تھی۔ (کرداروں کی مماثلت بعض اوقات ہوجاتی ہے مگر یہ الزام درست نہیں ہے) اللہ معافی آج کے معاشرے پر گہرا طنز تھی۔ نگے دم طنز اور آج کے حالات کا گہرا امتزاج منظر امام کے قلم سے...... بھئی واہ! محبوب الٰہی کا دوسرا حصہ بھی معلومات افزا اور ایمان افزا رہا۔ اللہ ہمیں بھی اولیاء اللہ کی عزت و تکریم کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بھرم بھی اپنے لحاظ سے محیرالعقول داستان رہی۔ سرحامد بھی انتقام کی آگ میں اندھے ہوئے رہے۔ اللہ عزوجل سب کو حسد، کینہ، بغض کی بیماری سے محفوظ فرمائے۔ کترنیں بھی چہروں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب رہیں۔ محفل شعروسخن میں تمام اشعار بہتر رہے البتہ سیدہ ثانیہ کاظمی صاحبہ کا شعر قریب از قلب رہا، بہت پسند آیا۔ تمام تحریر یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بیٹھا ہوں، چند لمحات پیارے سسپنس کے پیارے دوستوں کے نام کررہا ہوں۔ خوش رہیں، آباد رہیں۔"

✠ **مسز صدیقی گلشن اقبال**، کراچی سے اکتوبر کے شمارے پر تبصرہ کررہی ہیں "میرے ہاں پنجاب سے ایک ہفتے کے لیے مہمان آئے ہوئے تھے، اس وجہ سے ابھی بہت کم پڑھا ہے سسپنس مگر محبوب الٰہی تو شان ہی بڑھا دیتی ہے رسالے کی۔ دل و دماغ منور ہوجاتے ہیں کیا کہنے پھر یہ خیال آتا ہے کاش آج کے دور میں بھی کوئی بڑی ہستی ہوتی تو یوں پاکستان کی حالت نہ ہوتی۔ گورکن پڑھ کر روح کانپ گئی۔ خدا نہ کرے کسی کے ساتھ ایسا ہو۔ تقدیر کے آگے بندہ بڑا بے بس ہے۔ نہ خدا ہی ملا ڈاکٹر صاحب نے بہترین لکھی، خوب صورت کہانی ہے۔ کاردفتہ چونکا دینے والے انجام کی بہترین کہانی بہت اچھی لگی۔ اللہ معافی نے مزہ دیا۔ انوکھے انداز کی پرلطف کہانی، بہت خوب۔ سسپنس ہمیشہ کی طرح شاندار ماشاء اللہ...... اب صادق معاویہ بیٹے سے کہنا ہے آپ شوق سے مجھے امی کہیں، مجھے خوشی ہوگی۔ یہ تو اللہ کی نعمت ہے وہ گھر بیٹھے ایک اور بیٹے سے نواز رہا ہے۔ اس مالک کا لاکھوں بار شکر ہے کرم ہے۔ خدا تم کو صحت و تندرستی اور خوشیاں دے۔ پریشانیاں دور کرے۔ ماں ایک سایہ دار درخت کی طرح ہوتی ہے اس کے بغیر لگتا ہے تپتی دھوپ۔ اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرتا رہے آمین۔ وہ بڑا ہی رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ سب کے لیے دعائیں۔" (بہت شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

امتیاز احمد، منڈی بہاؤالدین۔ ظہیر الدین، کراچی۔ مدثر علی، سیالکوٹ۔ یاسمین کنول، اسلام آباد۔ جنید احمد ملک، کراچی۔ شائستہ جہانزیب، حیدرآباد۔ شہزاد علی، لاہور۔ محمد خالد، کوئٹہ۔ فیصل علی، ملتان۔

غلام بادشاہ

الیاس سیتاپوری

زیرِ نظر صفحات ماضی کا ایسا تسلسل جو اپنی مخصوص شناخت اور منفرد حالات و واقعات کی روشنی میں ترتیب دیے گئے... منگولوں کا بغداد میں طوفان برپا کرنے کے بعد مصر کی جانب اٹھنے والا قدم انسانیت اور تہذیب کو بہاتا چلا گیا۔ بڑی بڑی قوتیں خس و خاشاک ہوگئیں۔ بغداد میں خون کی بارش، اونچے اونچے سروں کے مینار اور آبادیوں کو راکھ میں منتقل کر دینے والوں کو کامیابی کے نشے میں شکستگی کا خیال تک نہ آیا... انسان کو چیونٹی کے مانند مسلنے والے ہاتھیوں کو اپنے انجام کی ذرا خبر نہ تھی... حتیٰ کہ مصر میں جب فاتح بادشاہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو نہ صرف منگول خود حیران ہوئے بلکہ تاریخ بھی ششدر رہ گئی۔ خونخواروں کا وہ سیلاب جو قراقرم سے اٹھا تھا رفتہ رفتہ بلندی سے پستی کی جانب گامزن ہوگیا کیونکہ قدرت کبھی کسی ظالم کو معاف نہیں کرتی۔ کئی محاذوں پر لڑی جانے والی یہ جنگ کہیں حرص و طمع اور کہیں بغاوت کے ہاتھوں بالآخر تاریخی صفحات پر بے شمار داستانیں رقم کر گئی۔

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت انگیز واقعات





قاہرہ میں منگولوں کے خلاف جنگی تیاریاں عروج پر تھیں۔ بیبرس کا حکم تھا کہ صحت مند نوجوانوں کو جبری بھرتی کیا جائے۔ جگہ جگہ حکومت کے کارندے نوجوانوں کو گھیر کر چھاؤنی میں پہنچا رہے تھے۔ مصر بھر میں تجربہ کار لسان اور دیندار علماء اپنی تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو یہ بتا رہے تھے کہ اسلام سخت خطرے میں ہے اور اگر وحشی اور جاہل منگولوں کو قاہرہ کے باہر نہ روک دیا گیا تو بغداد کی طرح قاہرہ بھی برباد ہو جائے گا اور مسلمانوں کو یہاں سے بھی نکال باہر کیا جائے گا۔ مصر کے مغرب میں افریقہ تھا۔ صحارا تھا۔ دنیا کا سب سے بڑا ریگستان، افریقہ کا ریگستان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے نگل سکتا تھا۔ مسیحی قوتیں مسلمانوں کو ورغلانے میں مشغول تھیں۔ وہ اسلام کو نفاق اور انتشار میں مبتلا کرنے کی بھرپور کوششیں کر رہی تھیں۔ عیسائیوں کو خوب معلوم تھا کہ اگر منگولوں کا سیلاب رک گیا تو مسلمان ایک بار پھر استقلال پکڑ لیں گے اور یروشلم کی آزادی کا خواب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

مغربی قاہرہ کا ایک قافلہ سامانِ تجارت لیے عرب جا رہا تھا۔ اس قافلے میں بیس بائیس نوجوان بھی تھے۔ حکومت کے آدمیوں نے اس قافلے کو روک لیا۔ ایک عالم آگے بڑھا اور نہایت دل نشین انداز میں نوجوانوں کو جہاد کی تلقین کی۔ اس عالم نے ان نوجوان تاجروں کو بتایا۔

''دوستو! اگر تمہیں تجارت ہی کرنا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتا بتاؤں گا جس کے نفع میں جنت اور اس کی خوشیاں مل جائیں گی۔''

اس قافلے میں اسکندریہ کا ایک راہب بھی تھا۔ اس نے قافلے والوں کو سمجھایا۔ ''دوستو! تم مال کماؤ اور اپنے نفع میں ناداروں اور حاجت مندوں کو بھی شامل کر لو۔ اس طرح تم زیادہ نفع میں رہو گے اور اوپر کی بادشاہی میں تمہیں بھی داخل کر لیا جائے گا۔''

مسلمان عالم نے راہب کو ٹوک دیا۔ ''بزرگوار! یہ سب مسلمان ہیں، آپ انہیں ورغلانے کی کوشش نہ کریں۔''

راہب بہت گرم مزاج تھا، وہ کھڑا ہو گیا اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ان کی بربادی کے درپے نظر آتا ہے..... تو انہیں کہاں میدانِ جنگ میں لے جائے گا، انہیں اسی طرح کھانے کمانے دے۔''

عالم نے قہر آلود نظروں سے راہب کو گھورا۔ ''بزرگوار! یہ مسلمان ہیں اور جہاد ان پر فرض ہے۔ میں اپنے غافل اور سوئے ہوئے بھائیوں کو ان کا ایک فرض یاد دلانا چاہتا ہوں، براہ کرم آپ اس میں مداخلت نہ کریں۔''

راہب مشتعل ہو گیا۔ اس نے مسلمان عالم کو ڈانٹ دیا۔ ''تو ان بھولے بھالے نوجوانوں کو ورغلا رہا ہے؟ کیا مائیں اپنے بچوں کو پال پوس کر اس لیے جوان کرتی ہیں کہ تم انہیں جہاد کے نام پر ورغلا کر میدانِ جنگ میں لے جاؤ اور ان کی گردنیں کٹوا دو۔''

مسلمان عالم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''افسوس کہ اس وقت اپنے آس پاس بیبرس نہ ہوا۔ تیری ان ہرزہ سرائیوں کا وہی جواب دے سکتا تھا۔ بوڑھے راہب! میں کہتا ہوں تو ہمارے دین میں دخل نہ دے۔ تو ہمارے ملک میں رہتا ہے تو ذمی ہے، ہم نے تیرے جان و مال کا ذمہ لے رکھا ہے۔ تو ہمیں اتنا مجبور نہ کر کہ ہم تجھے.....''

دو نوجوانوں نے راہب کا ساتھ دیا۔ ایک نے پوچھا۔ ''مقدس باپ! ہم اپنا کاروبار داؤ پر لگا کر جہاد پر نہیں جانا چاہتے۔ آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟''

مسلمان عالم نے کہا۔ ''نوجوان! اس گم کردہ راہ بوڑھے کی باتوں میں نہ آ۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہی کر۔ ورنہ خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جائے گا۔''

دوسرے نوجوان نے عالم کا مذاق اڑایا۔ ''اگر ہم آپ کی بات نہ مانیں تو؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''تو میں تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

بوڑھے راہب کے ساتھ دونوں نوجوان بھی کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ایک نے کہا۔ ''عالم دین صاحب! ہماری جگہ آپ جہاد پر کیوں تشریف نہیں لے جاتے۔ آپ ثواب لوٹیں جا کر۔''

عالم نے نوجوانوں سے پوچھا۔ ''نوجوانو! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کیا جواب دے رہے ہو؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''میری ماں نے مجھے جہاد کے لیے نہیں پالا تھا۔''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''ہم تاجر لوگ، ہمیں کیا پتا کہ تلوار کس طرح چلائی جاتی ہے۔''

کوئی تیسرا نوجوان بولا۔ ''دین دار صاحب! بادشاہ اس کام کے آپ کو کتنے دینار دیتا ہے؟''

اس سوال پر سبھی قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ اسکندریہ کا راہب بھی مسکرا رہا تھا۔

ایک نوجوان نے کہا۔ ''عالم دین صاحب! ہم لوگ آپ کی بات نہیں مانیں گے، آپ ہمیں اپنے ساتھ زبردستی

لے جائیں۔"

عالم نے غصے میں اس نوجوان کو پکڑلیا اور کھینچ کر خیمے سے باہر لے گیا۔ بیس اکیس نوجوان ان دونوں کے پیچھے دوڑے اور باہر انہیں پکڑلیا۔ عالم تنہا تھا اور بائیس نوجوان ایک طرف۔ انہوں نے نوجوان کو چھڑالیا اور اس عالم کی پٹائی شروع کر دی۔

عالم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ سامنے ذرا فاصلے پر ایک گڈریا اپنے مویشی چرا رہا تھا۔ وہ عالم کی چیخ پکار سن کر اس کی مدد کو آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا، اس نے اس ڈنڈے سے نوجوانوں کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "خدا سے ڈرو نوجوانو! اس ایک پر تم میں بائیس پل پڑے، تمہیں شرم نہیں آتی۔"

ڈنڈے نے ان سب کو پیچھے ہٹا دیا۔ عالم کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ وہ اب بھی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ان نوجوانوں نے جہاد میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے، میں انہیں زبردستی لے جاؤں گا اپنے ساتھ اور یہ راہب، بجز اہم نے اسے بڑی آزادی دے رکھی ہے۔ یہ ان مسلم نوجوانوں کو جہاد پر لے جانے سے روک رہا ہے۔ میں اسے بھی معاف نہیں کروں گا۔"

گڈریا اچھا خاصا مسخرا لگ رہا تھا، اس نے نوجوانوں سے پوچھا۔ "کیا یہ عالم صحیح کہہ رہا ہے؟"

ایک نوجوان نے سینہ تان کر جواب دیا۔ "ہاں، یہ صحیح کہہ رہا ہے مگر تو کون ہے جو ہم سے حاکمانہ انداز میں سوال کر رہا ہے؟"

گڈریے نے اپنے مویشیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں ان کا مالک گڈریا ہوں اور میں یہ خوب جانتا ہوں کہ ایک تنہا انسان بہتوں پر کس طرح قابو رکھے۔"

ایک دوسرا نوجوان تیوریوں پر بل ڈالے گڈریے کی طرف بڑھا اور اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کرنا چاہا لیکن گڈریے نے اس کے مکے کو بیچ ہی میں روک دیا، بولا۔ "ابھی تو باتوں کا سلسلہ جاری ہے، یہ مکے بازی بعد میں بھی تو ہو سکتی ہے۔"

مکے باز نوجوان نے جواب دیا۔ "اب تم دونوں یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ تم دونوں ہی جان سے مار دیے جاؤ گے۔"

گڈریے نے اپنے کندھے پر پڑی ہوئی چادر اتار کر کمر سے باندھ لی اور ان نوجوانوں کو حکم دیا۔ "براہِ کرم آپ صاحبان ہیرس کے پاس چلیں کیونکہ آپ نے ہیرس اور خدا دونوں ہی کے فرمان کا مذاق اڑایا ہے۔ آپ کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔"

کئی نوجوانوں نے بیک وقت جواب دیا۔ "ہم نے اس شخص کی شکل نہیں دیکھی جو ہمیں ہیرس کے پاس لے جائے۔"

گڈریا سینہ تان کر ان سب کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں موجود ہوں، میری شکل دیکھ لو۔ میں تم سب کو ہیرس کے پاس لے جاؤں گا اور تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دلوا کے رہوں گا۔"

ایک تندخو نوجوان گڈریے پر حملہ آور ہو گیا لیکن چالاک گڈریا اس سے پہلے ہی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ وہ حملہ آور نوجوان کو چھلانگ لگا کر دبوچ چکا تھا۔ گڈریے نے چند مکوں اور ٹھوکروں سے اس نوجوان کی سٹی گم کر دی۔ ان کے سارے کس بل نکال دیے۔ دوسرے نوجوان اس سفاک اور بہادر انسان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ گڈریے نے سبھی نوجوانوں کو حکم دیا۔ "نوجوانو! تم سب کو میرے ساتھ چل کے ہیرس کی خدمت میں پیش ہونا ہے۔"

ان نوجوانوں نے ایک بار پھر گڈریے کو دھمکی دی۔ "جا جا اپنا راستہ لے، ہم نہیں جائیں گے ہیرس کے پاس۔"

گڈریے نے عالم کی طرف بامعنی نظروں سے دیکھا اور اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کے مویشیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، بولا۔ "بھاگیے عالم دین صاحب...... بھاگیے۔"

نوجوانوں کو ان دونوں پر ہنسی آ گئی۔ اسکندریہ کا راہب بھی زور زور سے ہنس رہا تھا۔

جس نوجوان کی مکوں اور لاتوں سے پٹائی ہو چکی تھی وہ کھڑا دانت پیس رہا تھا۔ "بھاگ گئے۔ اگر کچھ دیر اور رک جاتے تو ان دونوں کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا۔"

جملہ نوجوان ایک طویل و عریض خیمے میں ایک بار پھر یکجا ہو گئے۔ اسکندریہ کا راہب ان سب کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ اس نے ان نوجوانوں کو تسلی دی۔ "افسوس کہ تم سب مسلمان ہو اور میں سچی بات کہہ نہیں سکتا۔"

ایک پرجوش نوجوان بولا۔ "آپ سچی بات کیجیے۔ ہم سچی بات سنیں گے۔"

راہب نے کہا۔ "اسلام تلوار کا مذہب ہے جبکہ مسیحیت رحم اور عدم تشدد کا دین ہے۔ آپ لوگ حضرت مسیح کے دامن میں آ جائیں اور دین و دنیا کی آشتی حاصل کریں۔"

ایک نوجوان نے سختی سے راہب کو منع کیا۔ "جناب والا! ہم مسلمان ہیں اور زندگی کی آخری سانسوں تک مسلمان ہی رہیں گے۔ آپ نے کس طرح سمجھ لیا کہ ہم

اسلام سے دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔"

راہب نے نہایت نرمی سے کہا۔ "میرے بچے! میں نے یہ کب کہا ہے کہ تو یا کوئی اور اسلام سے دل برداشتہ ہے۔ اسلام بھی ایک اچھا مذہب ہے مگر مسیحیت بہت اچھا مذہب ہے۔"

اسی دوران خیمے میں چند عمر رسیدہ تاجر داخل ہوئے۔ ان کی لمبی لمبی عبائیں پٹکوں سے کمر پر کسی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے نوجوانوں سے پوچھا۔ "تھوڑی دیر پہلے یہ ہنگامہ سا کس بات پر ہوا تھا؟"

اس سوال کا جواب ہر کسی کے پاس تھا مگر جواب کوئی بھی نہیں دے سکا۔

اس شخص نے راہب کو مخاطب کیا۔ "پدر محترم! آپ کہیں اور جا کے مسیحیت کی تبلیغ فرمائیں۔ مجھے تو آپ کی ان مساعیِ جمیلہ پر بڑا رونا آرہا ہے۔"

راہب نے اس ادھیڑ عمر تاجر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "برادر عزیز میرے بچے! نیکی کا آغاز گھر سے ہونا چاہیے۔ میں نے مسیحیت کی تبلیغ نہیں کی۔ میں تو دو دینوں کا مقابلہ، موازنہ کر رہا تھا۔"

اس ادھیڑ عمر تاجر نے کہا۔ "مقدس باپ! آپ کو اپنا دین اور ہمیں اپنا دین مبارک۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ عالم تم لوگوں سے کیا کہہ رہا تھا؟"

اس بگڑے دل اور تنک مزاج نوجوان نے جواب دیا۔ "وہ ہم نوجوانوں کو جہاد پر لے جانا چاہتا تھا مگر ہم سب نے انکار کر دیا۔"

اس ادھیڑ عمر تاجر نے کہا۔ "انکار کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔"

اچانک باہر سے آواز آئی۔ "نوجوان تاجرو! تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ خیمے سے باہر نکل کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ کیونکہ تم سب جہاد کے منکرین میں شامل کیے جا چکے ہو...... اور ہاں، اپنے مقدس باپ کو اپنے ساتھ ضرور لانا۔"

ایک تاجر نے خیمے کے پھٹے ہوئے حصے سے باہر کی طرف دیکھا۔ وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ مصری سپاہ نے خیمے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ "دوستو! اب کیا ہوگا؟ ہمیں مصری سپاہ نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

راہب کو اس خبر نے بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ دبی زبان میں کہا۔ "یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

ادھیڑ عمر تاجر نے درشتی سے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ تمہاری حماقتوں کا تمہیں نقصان نہ پہنچے لیکن اگر میں ناکام ہو جاؤں تو تم سب مجھے معاف کر دینا۔"

ایک بار پھر باہر سے آواز آئی۔ "میں کہتا ہوں تم سب باہر آجاؤ اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

ادھیڑ عمر تاجر خیمے سے باہر نکلا، شکست خوردہ سپاہی کی طرح...... اس نے پوچھا۔ "آپ لوگ ہمارے چند نوجوانوں کی حماقتوں سے مشتعل ہو گئے ہیں لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں کیا ہمیں اسلام کی رعایت نہیں ملے گی؟"

گڈریا سب سے آگے تھا اور اس سے دو قدم پیچھے عالم تھا۔ گڈریے نے جواب دیا۔ "آپ کو اسلام کی رعایت ضرور ملے گی مگر ہم سے نہیں۔ ابھی تو آپ لوگوں کو قاضی کے سامنے پیش کیا جائے گا اور جن لوگوں نے شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا ہے ان پر مقدمہ چلے گا پھر جو گناہ گار ہوگا، سزا پائے گا اور جو بے گناہ ہوگا چھوٹ جائے گا۔"

ادھیڑ عمر تاجر نے اپنی گدی سہلائی، پوچھا۔ "کیا یہ زیادتی نہیں ہے؟"

گڈریا بہت برہم تھا، جواب دیا۔ "کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ مسلمان جہاد کا مذاق اڑائے۔"

ادھیڑ عمر تاجر نے خیمے میں واپس جاتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے، میں سب کو تمہارے حوالے کیے دیتا ہوں اور قاضی کی عدالت میں ایک مقدمہ ہم بھی دائر کریں گے۔ اس بات کا کہ ہم نے جہاد کا مذاق نہیں اڑایا۔ ہم پر یہ جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔"

گڈریے نے کہا۔ "میں اس بات کا گواہ ہوں، یہ عالم بھی اس بات کا گواہ ہے کہ بعض نوجوانوں نے جہاد کا مذاق اڑایا ہے۔"

ادھیڑ عمر تاجر اندر گیا اور نوجوانوں کو مطلع کیا۔ "معاملہ بگڑ چکا ہے۔ ہم سب کو قاضی کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ کیا تم میں سے کسی نے جہاد کا مذاق اڑایا تھا؟"

پُرجوش نوجوان سینہ تان کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ "ہاں میں نے اڑایا تھا مذاق۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں قاضی کے سامنے بھی جہاد کا مذاق اڑاؤں گا، وہ میرا کیا کر لے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند درے لگوا دے گا یا پھر سزائے موت کا فیصلہ سنا دے گا۔ اس سے بڑی تو سزا نہیں دے سکتا وہ۔"

ادھیڑ عمر تاجر نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ "تو بہت بہادر ہے۔ یہ تو نہیں، تیری نوجوانی بول رہی ہے۔ عاقبت نااندیش نوجوانی...... لیکن برخوردار! دنیا میں جوش سے

زیادہ ہوش کی ضرورت رہتی ہے۔ تُو تو مارا جائے گا ہی مگر تیرے ساتھ ہمارا بھی برا حشر ہوگا۔''

ابھی ان میں بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ گڈریا اور عالم، مصری سپاہ کے ساتھ خیمے میں داخل ہوگئے۔ پرجوش نوجوان نے گڈریے اور عالم پر ایک ساتھ حملہ کردیا۔ وہ غصے میں چیخ رہا تھا۔ ''میں تم دونوں کو جہنم واصل کردوں گا۔''

لیکن گڈریے کے ایک بھرپور مکے نے نوجوان کو گرادیا۔ وہ گرکر تڑپنے لگا۔

گڈریے نے چیختے ہوئے کہا۔ ''خبردار جو کسی نے مزاحمت کی۔''

سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ اسکندریہ کا راہب اب بھی آزاد تھا۔ گڈریے نے اس سے درخواست کی۔ ''نصرانیوں کے مقدس باپ! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔''

راہب نے انکار کیا۔ ''میں تیرے ساتھ کیوں جاؤں گا؟ میرا قاضی کی عدالت میں کیا کام؟''

گڈریے نے جواب دیا۔ ''متنازعہ معاملے میں آپ کی شہادت بہت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے آپ جھوٹ نہیں بولیں گے۔''

راہب نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔ ''میں اس مقدمے میں گواہی نہیں دوں گا کیونکہ یہ تم لوگوں کا دینی مسئلہ ہے اور چونکہ میں خود بھی جہاد کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں اس نوجوان کے خلاف گواہی دے کر اس کی سزا کا ذمے دار نہیں بنوں گا۔''

گڈریے نے جواب دیا۔ ''لیکن میں آپ کو قاضی کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوں۔''

سارے خیمے اجڑ گئے، تاجروں کی اشیائے تجارت سرکاری تحویل میں چلی گئیں۔ قاہرہ میں ایک تہلکہ مچ گیا کہ چند نوجوانوں نے جہاد میں حصہ لینے سے انکار کردیا، اس جرم میں ان پر مقدمہ چلے گا۔

کئی دن بعد ان سب کو قاضی کی عدالت میں پیش کردیا گیا۔ تماشائیوں کے ہجوم میں اسکندریہ کا راہب الگ ہی نظر آرہا تھا۔

اس دوران نوجوانوں کا جوش سرد پڑ چکا تھا۔ ادھیڑ عمر تاجر نے ان سب کو شب و روز سمجھا کر اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ عالم نے استغاثہ پیش کیا مگر ادھیڑ عمر تاجر نے یہ کہہ کر استغاثے کو جھٹلا دیا۔ ''یہ جعلی مقدمہ ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان شعائر اسلامی کا کس طرح مذاق اڑا سکتا ہے۔ کیا محترم قاضی ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جہاد کا مذاق اڑا سکتے ہیں؟ اگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تو کوئی اور مسلمان کیونکر کرسکتا ہے؟''

قاضی نے عالم سے پوچھا۔ ''آپ کا کوئی گواہ؟''

عالم نے راہب کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا سب سے معتبر گواہ نصرانیوں کا مقدس باپ ہے۔''

قاضی نے راہب کو اپنے قریب آنے کا حکم دیا۔ جب وہ قریب پہنچ گیا تو پوچھا۔ ''محترم بزرگ! آپ اس سلسلے میں گواہی دیں گے؟''

راہب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

قاضی نے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟ آپ بولتے کیوں نہیں؟''

راہب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قاضی نے کہا۔ ''جناب! میں آپ سے مخاطب ہوں، آپ بولتے کیوں نہیں؟''

اب راہب قاضی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں عدالت کی چھت پر لگی ہوئی تھیں، گویا وہ چھت کے شہتیر گننے میں مشغول تھا۔

قاضی نے عالم سے کہا۔ ''اس کو جھنجوڑو اور اس کا چہرہ ہمارے سامنے کرو۔ میں اس سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔''

راہب کا چہرہ زبردستی قاضی کی طرف کردیا گیا مگر اسے جیسے ہی چھوڑا گیا، وہ پھر چھت کے شہتیر گننے لگا۔

قاضی نے راہب کا چہرہ دو طاقتور آدمیوں کی مدد سے زبردستی اپنی طرف کرلیا۔ قاضی نے اس کو ڈانٹ دیا۔ ''تو بولتا کیوں نہیں، یہ تجھ کو ہوکیا گیا ہے؟''

راہب نے گونگوں کی طرح ہاتھ کے اشارے سے قلم اور کاغذ طلب کیا۔ جب یہ دونوں چیزیں اس کو فراہم کردی گئیں تو اس نے کاغذ پر موٹا موٹا لکھ دیا۔ ''جناب والا! میں نے حضرت مریم کی طرح چپ رہنے کا روزہ رکھا ہوا ہے اس لیے میں قاضی کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔''

ادھیڑ عمر تاجر بہت خوش تھا، نوجوان بھی بشاش نظر آتے تھے۔

قاضی نے عالم سے پوچھا۔ ''تو اور کوئی گواہ پیش کرسکتا ہے یا میں اس مقدمے کو خارج کردوں؟''

عالم نے عالم یاس میں ادھر ادھر دیکھا اور قاضی سے کہا۔ ''میرا ایک گواہ اور ہے، گڈریا۔ وہ پتا نہیں کہاں رہ گیا مگر وہ یہاں.....''

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ قاضی کی عدالت میں ہیرس داخل ہوا۔ لوگ احتراماً ادھر ادھر دبک

گئے۔ ادھیڑ عمر تاجر اور نوجوانوں نے اس مشہور و معروف شخص کو نہایت اشتیاق اور غور سے دیکھا۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ اس شخص کو گڈریے کے روپ میں بھی دیکھ چکے تھے۔ خود راہب بھی ہکا بکا بیبرس کو دیکھ رہا تھا۔

بیبرس قاضی کے روبرو جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''قاضی محترم! میں اس مقدمے کا چشم دید گواہ ہوں۔ آپ مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔''

ادھیڑ عمر تاجر نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''قاضی محترم! مجھے یقین ہے کہ اب ہم سب یہ مقدمہ ہار گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بیبرس سے گڈریے کے روپ میں پہلے ہی مل چکے ہیں۔''

بیبرس نے گستاخ نوجوان کو اپنی طرف کھینچ لیا، پوچھا۔ ''بتا جہاد کی بابت تیری کیا رائے ہے؟''

اب نوجوان کی ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ وہ نظریں بھی نہ ملا سکا۔ اس پر کپکپی طاری ہو چکی تھی، جواب دیا۔ ''میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔''

بیبرس راہب کی طرف متوجہ ہو گیا، طنزیہ سوال کیا۔ ''نصرانیوں کے مقدس باپ! آپ کیا فرماتے ہیں؟''

قاضی نے راہب کی تحریر بیبرس کے سامنے کر دی۔ بیبرس اس کو پڑھ کر مسکرایا، بولا۔ ''خدا آپ کو زندگی بھر چپ کے روزے میں جکڑا رکھے، حالانکہ یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔''

اس کے بعد بیبرس نے قاضی سے درخواست کی۔ ''قاضی محترم! آپ ان سب کو معاف فرما دیں کیونکہ مجھے آدمیوں کی ضرورت ہے اور میں ان سب کو اپنی فوج میں شامل کر لوں گا۔ ان کا سامانِ تجارت ضبط اور یہ سب ہماری فوج کی تحویل میں رہیں گے۔ ہماری سپاہ انہیں جنگی تربیت دے گی۔''

سب کے چہرے فق پڑ گئے۔ راہب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''خداوند! اپنے بندوں پر رحم فرما۔''

تماشائیوں نے قہقہہ لگایا لیکن بیبرس کی قہر و غضب میں ڈوبی نظروں نے سب کو خاموش کر دیا۔

☆☆☆

سرکش اور گستاخ نوجوان کو درواغ کے حوالے کر دیا گیا۔ بیبرس نے درواغ کو ہدایت کی کہ اس تاجر زادے کو فنِ سپاہ گری میں طاق کیا جائے اور کسی رو رعایت کے بغیر اسے کارآمد بنایا جائے۔

بقیہ کو بھی اسی طرح فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسکندریہ کا راہب قاہرہ میں رہ پڑا۔ اس نے شہر کے مغربی سرے پر ایک کٹیا ڈال لی تھی اور اس میں رہنے لگا۔ اس کو تاجروں سے بڑی ہمدردی تھی اور اب وہ ان کے حق میں شب و روز دعائیں کیا کرتا تھا۔

درواغ نے اس نوجوان سے اس کا نام پوچھا تو پتا چلا، اس کا نام ذاکر ہے اور وہ طرابلس کے ایک نامور تاجر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔

ذاکر بیبرس سے بہت ناراض تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب جہاد میں اس کی مرضی شامل نہیں ہے تو اس کو فوج میں زبردستی کیوں شامل کیا گیا ہے۔

لیکن درواغ نے اس کو سمجھایا۔ ''ذاکر! تو نہیں جانتا کہ منگولوں کی وجہ سے قاہرہ اور پورے مصر کا وجود کتنا خطرے میں پڑ گیا ہے اور قاہرہ اور مصر تو دوبارہ بھی آباد ہو سکتے ہیں لیکن نصرانیت کی شہ پر منگول، اسلام پر جو فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتے ہیں اس کے نتیجے میں اسلام اور مسلمان یہاں سے فرار ہو کر صحارا کے ریگستان میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں گے۔ ان حالات میں ہم سب کا فرض ہے کہ اس جہاد میں حصہ لیں اور منگولوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو توڑ دیں۔''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا دل جہاد کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا۔ اس کا میں کیا کروں؟''

اس وقت بیبرس بھی اندر داخل ہو گیا، بولا۔ ''اس کا علاج میں کروں گا اور اللہ نے چاہا تو تیری طبیعت بھی جہاد پر راغب ہو جائے گی۔''

ذاکر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ بیبرس سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ بیبرس کے سرخ بال اور زخمی آنکھ خاصا رعب ڈال رہی تھی۔ بیبرس کے ہاتھ میں چمڑے کا درّہ تھا۔ اس نے درّے کو ہوا میں لہرایا، بولا۔ ''نرمی اور مروت سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔'' پھر ذاکر سے پوچھا۔ ''کیوں، تیرا کیا حال ہے؟ میرے شیر! میری فوج میں رہ کر تو کارآمد ہو جائے گا، ابھی تو تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

ذاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جل بھن کر کباب ہو چکا تھا۔ بیبرس نے درواغ کو سمجھایا۔ ''درواغ! اس نوجوان کو سیدھا اور قابلِ اصلاح نہ سمجھ لینا۔ اسے جب بھی موقع ملے گا، وار کرے گا۔''

درواغ نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ اسے کارآمد بنا دوں۔ ویسے خدا قادرِ مطلق ہے، وہ اس کی [illegible] ہدایت قبول کر سکتا ہے۔''

بیبرس زیادہ دیر نہیں رکا، فوراً ہی واپس چلا گیا۔
درداغ نے ذاکر کو سمجھایا۔ "ذاکر! تو مسلمان ہے، خدا کے لیے اپنے عقائد کو رسوا نہ کر۔ تو بیبرس کو نہیں جانتا۔ میں اس سے واقف ہوں۔ وہ بہت سخت اور لائق انسان ہے۔ مجھ کو اس شخص کی نیابت پر فخر ہے۔"

درداغ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا، وہ ذاکر کو اپنے گھر لے گیا اور ایک کمرا اس کے حوالے کر دیا۔ درداغ کو ذاکر پر اعتبار نہیں تھا مگر وہ اسے ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ذاکر کو یہ بات بتا دی کہ کوئی بھی شخص بیبرس کی دستبرد سے بھاگ نہیں سکتا۔ وہ آخر کار پکڑا جائے گا اور بیبرس سے سخت سزا پائے گا۔

ان دنوں بیبرس پر اس بات کا جنون سا طاری تھا کہ جو بھی صحت مند اسے نظر آتا، اس کو جبراً فوج میں شامل کر لیتا تھا۔ چند ماہ میں ایسے ہزاروں افراد فوج میں داخل کیے جا چکے تھے۔ انہیں نہایت لگن اور ہوشیاری سے فوجی تربیت دی جا رہی تھی۔ مصر کا مملوک بادشاہ سیف الدین قطز بیبرس کی اس ادا پر خوب خوب ہنستا رہتا تھا۔ اس کو اپنی فتح مندی کا اتنا یقین نہیں تھا جتنا خود بیبرس کو تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ ناتجربہ کار نوجوان منگولوں کو کس طرح شکست دیں گے؟

لیکن بیبرس کا کہنا یہ تھا کہ میں انہی ناتجربہ کاروں سے منگولوں کو پٹوا دوں گا۔

قاہرہ بھر میں بڑے جوش و خروش سے جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سامانِ جنگ تیار کرنے والے آہن گر اور لوہار شب و روز تلواریں ڈھالنے اور تیر بنانے میں مشغول تھے۔ دبابے اور منجنیقیں بھی تیار ہو رہی تھیں۔ مصری سپاہ اپنی اپنی تلوار اور شمشیر پر باڑھ خود رکھ رہی تھی۔ سانوں کے پہیے گھوم رہے تھے اور تلوار، خنجر، شمشیر اور دوسرے دھار دار ہتھیاروں کی دھاروں کو سانوں کے پہیوں سے چھوا کر چنگاریاں اڑائی جا رہی تھیں۔ سائیس گھوڑوں کی مالش میں مشغول تھے۔ ذرا عمر رسیدہ مسلمان پانچوں وقت کی نمازوں میں خدا سے گڑگڑا کر اپنی فتح مندی اور کامرانی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

بیبرس سلطان سیف الدین قطز کو جنگی تیاریوں کے مناظر دکھاتا پھر رہا تھا اور سلطان قطز کسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیبرس نے بڑی جلد ہی یہ بات محسوس کر لی کہ سلطان قطز ذہنی طور پر اس کے ساتھ نہیں ہے۔ بیبرس نے پوچھا۔
"کیا بات ہے سلطانِ والا شان!"
قطز نے جواب دیا۔ "بیبرس! میں سوچ رہا ہوں کہ منگولوں کے وفد کو قتل کر کے کیا ہم نے سنگین غلطی نہیں کی ہے؟"

بیبرس کو غصہ آ گیا لیکن اسے ضبط کر گیا، بولا۔ "سلطان! میں شک و شبے کو ذرا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آخر کار فتح ہماری ہی ہو گی اور فتح مندی کی خوشی کے صلے میں حلب کی حکومت مجھے بخش دی جائے گی۔"

قطز نے آہستہ سے جواب دیا۔ "خدا کرے تو اپنے یقین پر پورا اترے۔"

یہیں اس نے منگولوں کے ایک وفد کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت سلطان قطز اور بیبرس اپنے اپنے چہروں کو خود میں چھپائے ہوئے تھے۔ منگولوں کے اس وفد میں کل پانچ آدمی تھے۔ سلطان قطز نے بیبرس سے سرگوشی میں کہا۔ "بیبرس! خبردار جو اپنی پہلی غلطی دہرائی۔ وفد کے کسی بھی آدمی کو خراش بھی نہیں آنی چاہیے۔"

بیبرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منگولوں کے وفد کو سلطان قطز کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔

سلطان قطز نے پوچھا۔ "اب تم لوگ کیا کہتے ہو؟"
وفد کے سردار نے کہا۔ "وہ جس کا حکم معلوم دنیا پر چلتا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ آپ لوگ اپنی چوکیاں برباد کر دیں۔ شہر کے دروازے کھول دیں اور باہر نکل کر ہمارا استقبال کریں اور مقتول منگولوں کا تاوان ادا کریں۔"
سلطان قطز گھبرا گیا اور اس نے پینے کا پانی طلب کیا۔

بیبرس نے جواب دیا۔ "میرا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ اللہ کا ہے، اگر اللہ یہ چاہے گا کہ ہم اپنی چوکیاں برباد کر دیں، تو ایسا ہو کر رہے گا۔ وہ اگر یہ چاہے گا کہ ہم قاہرہ کے دروازے کھول دیں تو قاہرہ کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔ اسی طرح مرنے والے منگولوں کا تاوان بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اس وقت جب میں یہ دیکھوں گا کہ سب کچھ تائید ایزدی کے مطابق ہو رہا ہے۔"

وفد کے سردار کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں، پوچھا۔ "کیا مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس بار منگولوں کو شکست دے لیں گے؟"

بیبرس نے جواب دیا۔ "پتا نہیں کون کس کو شکست دے گا اور کون جیتے گا۔"

وفد کے سردار نے سلطان قطز سے پوچھا۔ "سلطان! یہ کون ہے جو ہم دونوں کی باتوں میں مخل ہو رہا ہے؟"
سلطان قطز نے جواب دیا۔ "یہ ہمارا سپہ سالار ہے۔"

وفد کے سردار نے کھسیاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پھر تو، تُو بول سکتا ہے۔“

بیبرس نے جواب دیا۔ ”میں، اللہ نے چاہا تو میدانِ جنگ میں بات کروں گا، فیصلہ کن بات۔ ہتھیاروں کی زبان میں۔“

وفد کے سردار نے ان دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر آپ لوگ اپنی سرحدی چوکیاں برباد کر دیں گے اور قاہرہ کے دروازے بھی کھول دیں گے تو میں آپ دونوں سے یہ وعدہ کر لوں گا کہ مصر یا قاہرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور آپ دونوں کا اقتدار بھی برقرار اور قائم رہے گا۔“

بیبرس نے سخت لہجہ اختیار کیا، بولا۔ ”وفد کے سردار! اب تو اپنی بکواس بند کر اور اپنے سردار قط بوغا سے کہہ دینا کہ آئندہ جنگیں ہمارے شہروں کے در پر نہیں، دشمنوں کے دروں پر لڑی جائیں گی۔“

وفد کا سردار اس لب و لہجے میں بات سننے کا عادی نہیں تھا، بولا۔ ”میں شامتوں کو تیرے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔“

بیبرس غصے میں ٹہلنے لگا، اس نے سلطان قطز سے کہا۔ ”اس وفد کو حکم دیجیے کہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے ورنہ میں وفد کے ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔“

سلطان قطز وہاں سے وفد کو ہٹا کر لے گیا اور کہا۔ ”افسوس کہ یہ جنگ ناگزیر ہے۔ آپ لوگ اسی وقت واپس چلے جائیں۔ یہ سرپھرا سپہ سالار تم سب کو قتل کر دے گا۔“

وفد کے سردار نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم لوگوں کی بربادیاں اور ہلاکتیں تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہیں۔“

سلطان قطز نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔ ”بس آپ لوگ اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔“

وفد کے سردار نے جاتے جاتے کہا۔ ”اعلانِ جنگ۔ میں تمہارا اعلانِ جنگ قط بوغا تک پہنچا دوں گا۔“

☆☆☆

منگولوں کے وفد نے بیبرس کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ وہ کئی دن تک غصے میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔

شام کی سرحدوں کے سامنے مصری چوکیاں نہایت مستعدی سے اور ہوشیاری سے اپنا کام انجام دے رہی تھیں۔ انہیں حکم تھا کہ شام کی طرف سے اٹھنے والا گرد و غبار جیسے ہی نظر آئے، وہ بیبرس کو اس کی اطلاع دیں۔ بیبرس کو ان دنوں پہلی فرصت ...

مشغول تھا۔ وہ فوج کی تیاری اور تربیت میں اپنا کھانا پینا اور سونا تک بھول چکا تھا۔ درداغ نے بغداد میں تن آسانیاں دیکھی تھیں، بے پروائیاں، اطمینان اور سکون دیکھا تھا، خوش فہمیاں دیکھی تھیں لیکن قاہرہ میں ایک تڑپ، ایک بے چینی اور شوقِ جہاد دیکھا تھا۔ بیبرس نے کتنے ہی تاجروں اور دوسرے غیر فوجی جوانوں کو جبراً فوج میں شامل کر لیا تھا۔

لیکن دوسری طرف مصر کے مقامی مسیحی اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں میں نفاق کا بیج بو دیا جائے۔ ان کی نظریں ہلاکو خان اور دوقوز پر لگی ہوئی تھیں لیکن اب دونوں کی عدم موجودگی میں عیسائیوں کی نظریں منگول سپہ سالار قط بوغا پر لگ گئی تھیں۔

مسیحی کمزور اور جاہل مسلمانوں کو یہ کہہ کر احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے کہ ان کے مذہب میں جہاد جیسی ظالمانہ چیز پائی جاتی ہے۔ بیبرس اور بعض دوسرے ذہین مسلمان جاہل اور کم علم مسلمانوں کو یہ بتاتے پھر رہے تھے کہ جس طرح فصلوں کی تیاری کے لیے زمینوں کو جوتنا اور کوڑنا پڑتا ہے، اسی طرح حق کی اشاعت اور فروغ کے لیے کفر کی زمین پر ہتھیاروں کے ہل چلانا پڑتے ہیں۔

جب یہی دلیل ذاکر کے سامنے پیش کی گئی تو وہ چکرا سا گیا۔ اس نے درداغ سے پوچھا۔ ”جہاد کی بابت ایسی دلیل آج تک کسی نے بھی نہیں دی تھی۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”کوئی ایسی دلیل دے بھی کیسے سکتا تھا۔ مسیحی تو مسلمانوں کو شرمندہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور یہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر نادم و شرمسار ہو جاتے ہیں۔“

ذاکر پر اسلامی اخلاقیات اور اثرات بہت زیادہ نہیں تھے۔ وہ جس تاجر گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اس میں مذہب کا چرچا بہت زیادہ نہیں تھا۔ اس کے آس پاس یہودی رہتے تھے جنہوں نے اپنے قول اور فعل سے بس یہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ اگر یہ کسی کے پاس ہے تو گویا اس کے پاس سب کچھ ہے اور جس انسان کے پاس یہ نہیں، گویا اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔

ذاکر حیران تھا کہ مصری حکومت اپنی فوج میں اضافہ کیوں کر رہی ہے اور کیا مسلم سپاہ ظالم اور سفاک منگولوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گی؟ یہ سارے سوالات ایسے تھے جن کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا لیکن درداغ نے اس کو بہت زیادہ بدل دیا تھا۔ درداغ نے اس کو سمجھاتے

"ذاکر...... میرے دوست! اپنے عقیدے، اپنے مسلک، اپنے مذہب، اپنے تمدن اور روایات پر شرمانا چھوڑ دو کیونکہ اس کمزور حصے پر دشمن حملہ آور ہو جاتا ہے اور انسان کو کہیں کا بھی نہیں رکھتا۔"

ذاکر نے پوچھا۔ "دوست! تم تو منگول ہو پھر تم نے اپنے عقیدے، اپنے مسلک، اپنے مذہب اور اپنے تمدن اور اپنی روایات کو چھوڑ کر اسلام کو کیوں قبول کرلیا؟ تم نے بھی تو وہی کیا جو میں کرنا چاہتا ہوں، میں عیسی ہو جانا چاہتا ہوں۔"

دروداغ نے جواب دیا۔ "بے شک انسان کو اتنی آزادی تو ہونی ہی چاہیے کہ وہ جس مذہب اور جس عقیدے کو چاہے اختیار کرے۔ میں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھایا اور مسلمان ہو گیا لیکن جب میں مسلمان نہیں تھا تو میرا مذہب اور تمدن انتہائی کمزور تھا۔ اسلام طاقتور تھا۔ طاقتور نے کمزور کو مغلوب کرلیا۔ یہی قانونِ قدرت ہے کہ کمزور مغلوب ہو جائے اور طاقتور غالب ہو جائے۔ منگول طاقتور تھے، انہوں نے کمزوروں کو مغلوب کرلیا۔ اب اسلام طاقتور ہے اور اللہ نے چاہا تو منگولوں کو مغلوب کرلے گا۔"

دروداغ کا یہ فلسفہ ذاکر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا تمہارے خیال میں منگول مسلمان ہو جائیں گے؟"

دروداغ نے جواب دیا۔ "ایسا ضرور ہوگا۔ آج نہیں تو کل ایسا ہوگا۔ سال دو سال، دس بیس سال بعد...... لیکن ایسا ہوگا ضرور۔"

ذاکر لاجواب ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "دوست! میں تاجر ہوں۔ جنگ نہیں تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ تم بیبرس سے مجھے رہائی دلا دو۔"

دروداغ نے جواب دیا۔ "ذاکر دوست! تجارت کے لیے امن ضروری ہے اور جب تک منگول ہمارے آس پاس موجود ہیں، امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ذاکر نے پوچھا۔ "پھر...... پھر؟"

دروداغ نے جواب دیا۔ "پھر یہ کہ امن کا قیام اسی وقت ممکن ہوگا جب ان منگولوں کو ہمیشہ کے لیے دفع کر دیا جائے۔ بیبرس نے اس کام کا عہد کر رکھا ہے کہ وہ منگولوں کو ایسا دفع کرے گا کہ وہ پھر ادھر کا رخ بھی نہ کر سکیں گے۔ ان حالات میں ہمیں تاجر نہیں، سپاہی درکار ہیں اور اسی لیے تم سب کو بھی سپاہی بنا دیا گیا۔ یہ تاجروں کا زمانہ نہیں، سپاہیوں کا دور ہے۔"

ذاکر نے کہا۔ "اچھا چلو میں تمہارے کہنے سے سپاہی بنا جاتا ہوں لیکن میرا دل سپاہی نہیں بن سکتا۔ میں ایسا چاہوں تب بھی ایسا نہیں ہوگا۔ میں میدانِ جنگ میں کسی کو قتل کرنے کے بجائے خود قتل ہو جاؤں گا۔" وہ رونے لگا۔ "لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں دروداغ! تم مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح زندہ رہوں؟ میدانِ جنگ سے کس طرح صحیح سلامت واپس آؤں گا؟"

دروداغ کے پاس اس کم ہمتی اور بزدلی کا کوئی علاج نہ تھا، اس نے جواب دیا۔ "میدانِ جنگ میں تم میرے آس پاس موجود رہنا، میں تمہیں بچانے اور زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

ذاکر نے کہا۔ "اور اگر پھر بھی میں مارا گیا تو؟"

دروداغ نے جواب دیا۔ "اگر پھر بھی مارے گئے تو صبر کر لینا۔"

ذاکر بدک کر کھڑا ہو گیا۔ "یعنی؟ جب میں مر ہی جاؤں گا تو صبر کس طرح کروں گا؟"

دروداغ نے اس کو دلاسا دیا۔ "ذاکر! تمہیں سپاہی بننا پڑے گا۔ میدانِ جنگ میں تاجر مارا جائے گا اور سپاہی مارے گا۔ اسلام میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ مسلمان زمانہ امن میں تاجر، خریدار، قاضی، دستکار، ہنرمند بھی کچھ ہو سکتا ہے مگر زمانہ جنگ میں یہ صرف سپاہی ہوتا ہے۔"

ذاکر نے کہا۔ "دوست! میں کوشش کروں گا کہ اچھا سپاہی بن جاؤں اور اگر اس میں ناکام رہا تو میں تم سے درخواست کروں گا کہ مجھے بچاؤ، زندہ رکھو کیونکہ میں بہر قیمت زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

دروداغ نے وعدہ کرلیا کہ میں کوشش کروں گا کہ تم زندہ رہو مگر اس کوشش میں تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔

دروداغ نے بیبرس کو ذاکر کی بابت سب کچھ بتا دیا، اس نے کہا۔ "ذاکر کو یہودیوں کی صحبت اور پڑوس نے بگاڑا ہے اور رہی سہی کسر اسکندریہ کے راہب نے پوری کر دی۔ ہمارے علماء نے بے پروائی برتی اور ذاکر یا اس جیسے دوسرے مسلمانوں کو ان کا خاندانی مسلمان ہونا ہی کافی سمجھا۔"

بیبرس نے حکم دیا۔ "ذاکر یا اس جیسے بزدلوں کو شام کی سرحدی چوکیوں میں پہنچا دیا جائے اور انہیں خطرات میں پھنسا کر زندہ رہنے کا ہنر سکھایا جائے۔"

دروداغ گھر واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا

کہ ذاکر اس لڑکی سے باتیں کر رہا ہے جسے درداغ نے مصری دولت مند کے قصر سے حاصل کیا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ اس نے سنا، ذاکر کہہ رہا تھا۔ ''رمان! یہ میرا وعدہ ہے کہ جب یہ جنگ کے بادل چھٹ جائیں گے اور میں اپنا آبائی پیشہ تجارت سنبھالوں گا تو تجھے بہر قیمت حاصل کرلوں گا۔''

رمان نے کوئی جواب نہیں دیا اور ذاکر کو تنہا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ درداغ اچانک ذاکر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ذاکر گھبرا گیا، پوچھا۔ ''کب آئے دوست؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اس وقت جب تم رمان کو بہر قیمت حاصل کرنے کی بات کر رہے تھے۔''

ذاکر گھبرا گیا، آہستہ سے کہا۔ ''تم نے میری بات سن لی؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں سن لی اور سن کر اس بات کا افسوس ہوا کہ تم نے میری نظر میں اپنا اعتماد کھو دیا۔ تم کو رمان سے اس قسم کی بات نہیں کرنا تھی۔''

ذاکر نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''دوست! میں نے جو کچھ کیا، شاید وہ غلط ہے لیکن تم نے بھی اچھا نہیں کیا۔ اس وقت تم تین عورتوں یا لڑکیوں کے مالک ہو جبکہ میں ایک سے بھی محروم ہوں۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ کیوں نہ میں تمہارا ایک کا بوجھ کم کردوں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''بہرحال تم نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ ہیرس نے تمہارے سپرد ایک کام کیا ہے اسے انجام دینا ہے۔''

ذاکر نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کون سا کام؟ کیسا کام؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہیرس شام کے ایک صوفی بزرگ کے نام ایک خط بھیجنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں، میں بھی تمہاری مدد کروں گا مگر یہ خط تم ہی کو پہنچانا ہوگا۔''

ذاکر نے سہم کر کہا۔ ''شام کے کسی صوفی بزرگ کے نام ہیرس کا خط...... یہ خط میں تنہا لے جاؤں گا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''تمہارے ساتھ میں چلوں گا لیکن میں چونکہ اپنے خدوخال سے دور ہی سے پہچان لیا جاتا ہوں، اس لیے میں ذرا دور دور رہوں گا۔''

ذاکر کچھ سوچنے لگا پھر جماہی لی اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ خط کہاں ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہیرس کے پاس۔ ہیرس یہ خط خود دے گا تمہیں۔''

ذاکر نے کہا۔ ''تب میں اس غیر معمولی خدمت کے عوض کچھ پانے کا حقدار بھی ٹھہروں گا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ذاکر! میرا مشورہ ہے کہ تم ہر معاملے میں اپنی تاجرانہ ذہنیت کا مظاہرہ مت کرو کیونکہ ہیرس کو یہ بات گراں گزرے گی۔''

ذاکر نے بے پروائی سے کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔ بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔''

ذاکر اچانک گھر سے غائب ہوگیا۔ وہ سیدھا راہب کی کٹیا میں پہنچا۔ اس وقت راہب کے پاس دو معمر آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے۔ وہ دونوں راہب سے پوچھ رہے تھے۔ ''مقدس باپ! ہیرس نے ہمیں زبردستی فوج میں بھرتی کرلیا ہے لیکن میں اس سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔''

ذاکر نے درمیان میں مداخلت کی۔ اس کے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، بولا۔ ''ہمیں مصر میں رہنا ہے تو ہیرس کی بات بھی ماننی ہوگی۔ مجبوری ہے۔''

بوڑھا راہب ہاتھ کے اشارے سے ذاکر کو خاموش کرنے لگا، بولا۔ ''نوجوان تاجر! زیادہ باتیں نہ کر، تو بہت زیادہ بولتا ہے۔''

ذاکر نے راہب کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، بولا۔ ''میں لوگوں سے چھپ چھپا کر تو آپ کے پاس آیا ہوں اور آپ بھی مجھے بولنے سے منع کر رہے ہیں۔''

بوڑھے راہب نے پہلے سے موجود معمر آدمیوں سے کہا۔ ''دوستو! جنگ بہرحال بری چیز ہے۔ میں تمہیں کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ تم دونوں محاذِ جنگ پر جاؤ، اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

ایک معمر نے پوچھا۔ ''اگر میں، اگر میں سپاہی بننے سے انکار کردوں تو؟''

راہب نے کہا۔ ''ایسا نہ کرنا میرے بچے۔ تو سپاہی بن جا لیکن جب ہر طرف میدان کارزار گرم ہو اور دشمن تیری زد میں بھی ہو تو، تو اس کو معاف کردے گا۔''

حاضرین کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔

دوسرے معمر نے پوچھا۔ ''کیا میں عین دوران جنگ راہِ فرار اختیار کرسکتا ہوں؟''

راہب نے جواب دیا۔ ''خون خرابا بہرحال بری چیز ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

راہب اچانک ذاکر کی طرف متوجہ ہوگیا، بولا۔ ''میرے بچے! تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

ذاکر نے دونوں معمر حضرات کی طرف دیکھا اور سر جھکالیا۔ راہب اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے دونوں معمر

حضرات کو چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ دونوں چلے گئے تو ذاکر نے پوچھا۔ "مقدس باپ! ہیرس مجھ سے کوئی ذاتی اور اہم کام لینا چاہتا ہے، میں کیا کروں؟"

راہب نے پوچھا۔ "کام کی نوعیت؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ہیرس شام کے کسی مسلمان صوفی کو ایک خط میرے ذریعے بھیجنا چاہتا ہے۔"

راہب نے کہا۔ "تو وہ خط ضرور لے جا مگر وہ خط پہلے میرے پاس لانا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں کہیں ہیرس تجھ سے بڑا گناہ تو نہیں کرانا چاہتا۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "بہتر ہے، میں وہ خط پہلے آپ کی خدمت میں لاؤں گا مگر مقدس بزرگ! میں ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو چکا ہوں۔"

راہب نے کہا۔ "اسے بھی جلد از جلد بیان کر دے۔"

ذاکر نے کہا۔ "بابا! میں جس شخص کے ساتھ رہتا ہوں ان کے پاس تین عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے۔"

راہب نے ناگواری سے ذاکر کی طرف دیکھا۔ "معصیت، معصیت...... اس گناہ سے دور رہ۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "بابا! میں آدمی ہوں، گناہوں سے کس طرح بچوں گا؟"

راہب کے چہرے کا کھنچاؤ اور پیشانی کی سلوٹیں اس کے اندرونی کرب اور ناگواری کو ظاہر کر رہی تھیں۔ "بدترین گناہ تو تیرے میزبان نے کیا کہ تین تین عورتوں سے حظ اٹھاتا ہے، لطف اندوز ہوتا ہے اور دو گناہوں کا مرتکب تو ہوا۔ پہلا گناہ یہ کہ تو نے عورت کو بری نظر سے اور بری نیت سے دیکھا، دوسرا گناہ یہ کہ میزبان کی عورت سے عشق کیا۔"

ذاکر روہانسا ہو گیا، پوچھا۔ "اب میں کیا کروں؟"

راہب نے جواب دیا۔ "اس گھر سے نکل جا۔"

ذاکر نے کہا۔ "میں اس گھر میں رہنے پر مجبور ہوں۔"

راہب نے کہا۔ "تب پھر اس عورت سے اپنا تعلق ختم کر دے۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں۔"

راہب نے اپنی تیز اور پُراثر نظریں ذاکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "تب پھر اسلام کو چھوڑ دے اور دامنِ مسیح میں پناہ حاصل کر لے۔"

ذاکر نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اگر میں ایسا کروں گا تو قتل کر دیا جاؤں گا کیونکہ اسلام میں مرتد کو قتل کر

دیا جاتا ہے۔"

راہب بھنا سا گیا، بولا۔ "ظلم ظلم، بدترین ظلم۔ آزادیٔ رائے آزادیٔ عقیدہ مفقود ہے۔ اگر تو پسند کرے تو میرے ساتھ اسکندریہ چل۔ وہاں میں تجھے اس طرح روپوش کروں گا کہ ہیرس تجھے نہیں پا سکے گا۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "بابا! میں رمان کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

راہب نے افسوس کیا۔ "معصیت میں دل کشی بھی ہے اور لذت بھی۔ خدا تجھے پاک و صاف کرے۔"

ذاکر چپ چاپ اٹھا اور کلیسا سے باہر آ گیا۔ وہ بے مقصد بازار میں گھومتا رہا۔ اس نے جگہ جگہ لوگوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ بازاروں میں منگولوں کا ذکر عام تھا۔ وہ ہیرس کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ انہیں ہیرس کی بھیس بدل کر دوسروں کو حیران کر دینے کی باتیں بہت پسند تھیں۔ بازار میں سابقہ جوش و خروش بھی نہیں تھا۔ لوگ پریشان اور خوفزدہ نظر آتے تھے۔

یہیں بازار میں دردارغ سے ملاقات ہو گئی۔ جب دردارغ نے یہ کہا کہ میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تو ذاکر ہنسنے لگا، بولا۔ "دوست! میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں جو گم ہو جاؤں گا۔ بہرحال اس خصوصی التفات کا بہت بہت شکریہ۔"

دردارغ اس کو لیے ہوئے ہیرس کے پاس چلا گیا۔ اس وقت ہیرس اپنی فوج کے ہتھیار دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ دونوں اس وقت تک کہیں اور نہ جائیں جب تک ان کی ہیرس سے ملاقات نہ ہو جائے۔

ہیرس نے ان دونوں کو ہلکان اور پریشان کر دیا۔ انہیں ہیرس کا تقریباً چار گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

ہیرس ان دونوں کو لے کر اپنے محل میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی اس نے بات چیت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا پھر وہ انہیں دریائے نیل کے کنارے لے گیا اور یہاں بھی خاموش رہا۔ آخر میں وہ ان دونوں کو راہب کے پاس لے گیا اور ذاکر سے پوچھا۔ "ابھی مجھ سے ملنے سے پہلے تو یہاں آیا تھا؟"

ذاکر انکار نہیں کر سکا، جواب دیا۔ "میں یہاں آیا تھا۔"

ہیرس کو غصہ آ گیا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو یہاں کیوں آیا تھا؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "میں بہت زیادہ پریشان تھا، سکون کی خاطر یہاں آیا تھا۔"

ہیرس نے تلخی سے کہا۔ "[illegible] خاطر؟ یہاں

اس کنیا میں سکون کہاں؟'' اس کے بعد بیرس اچانک راہب پر برس پڑا، بولا۔ ''بوڑھے راہب! میں نے تیرے ساتھ کون سا ظلم کیا ہے؟ آخر میں نے کیا زیادتی کی تجھ سے؟ تو ذاکر سے میرا خط کیوں لینا چاہتا ہے؟ آخر کیوں؟ اور تو مسلمانوں کو دین مسیحی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، آخر کیوں؟ کیوں؟ تو چپ کیوں ہے؟ میرے سوال کا جواب دے۔''

راہب اس کے غصے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر کنیا کے سب سے اندرونی حصے میں چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں سے درخواست کی کہ اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ بیرس نے غصے میں کہا۔ ''آئندہ میں یہ نہیں سننا چاہتا۔''

وہ چلتے چلتے مڑا اور کہا۔ ''بوڑھے راہب! اب تو اسکندریہ واپس چلا جا ورنہ میں سختی کروں گا اور تو دنیا بھر میں میرے خلاف واویلا کرتا پھرے گا۔''

راہب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بیرس نے راستے میں درواغ کو حکم دیا۔ ''کل تک اسے کہیں بھی نہ جانے دیا جائے۔ اب میں اس کو شام کے ایک صوفی کے پاس بھیجوں گا۔''

جب درواغ اور ذاکر بیرس سے الگ ہونے لگے تو جیسے اس کو اچانک یاد آ گیا وہ مڑا اور کہنے لگا۔ ''تیرا کیا نام ہے؟ ذاکر... ہاں تو ذاکر! میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ رمان کون ہے جس پر تو عاشق ہو گیا؟''

اس بار ذاکر کوئی جواب نہ دے سکا۔

بیرس نے ایک بار پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ ''ذاکر! میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ رمان کون ہے؟''

ذاکر نے درواغ کی طرف دیکھا، وہ نظروں ہی نظروں میں درواغ سے التجا کر رہا تھا کہ خدا کے لیے اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دو۔

بیرس بڑبڑایا۔ ''جس کے مہمان ہو گے اسی کی محبوبہ سے عشق کرو گے۔ خوب! شرم کر شرم۔ رمان درواغ کی محبوبہ ہے اور تو...'' اس کے بعد بیرس نے درواغ کو حکم دیا۔ ''اس کو اپنے ساتھ ہی رکھ اور جہاں بے اعتدالی نظر آئے اس سے مجھے مطلع کر۔''

درواغ ذاکر کو اپنے ساتھ لیے گھر چلا گیا۔ ذاکر کو اس بات نے خوفزدہ کر رکھا تھا کہ اب اسے بیرس کا خط شام کے کسی صوفی کو پہنچانا تھا۔ دوسری طرف رمان کی محبت تھی۔ رمان اسے واقعی بہت پسند آئی تھی۔ وہ سوچتا، اسے

کاش میں سپاہی ہوتا کیونکہ بیرس، درواغ اور دوسرے بااثر لوگ سپاہی تھے۔ تاجر کی ان کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

درواغ نے اس کو جو کمرا دیا تھا، وہ پورے مکان سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ صدر دروازے کے فوراً بعد تھا۔ اس کے بعد صحن تھا۔ صحن میں دائیں بائیں درخت لگے ہوئے تھے۔ اس کے کمرے کے سامنے صحن کے دوسرے کنارے پر درواغ علیہ، صفیہ اور رمان کے ساتھ رہتا تھا۔ علیہ اور صفیہ رمان کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان دونوں نے آہستہ آہستہ رمان کے خلاف سازشوں کا جال بننا شروع کر دیا تھا۔ رمان ان حالات میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ علیہ اور صفیہ درواغ کو رمان کے خلاف ورغلاتی رہتی تھیں لیکن درواغ ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا تھا کیونکہ وہ علیہ اور صفیہ کے حسد سے واقف تھا۔ ان اذیت ناک حالات میں رمان نے ذاکر کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف رجوع ہوتی چلی گئی۔

درواغ نے جب سنا کہ ذاکر اور رمان رسوا ہونے لگے ہیں تو اسے بڑی فکر ہوئی۔ یہ بات اس کے لیے شرمناک تھی۔ وہ ان دونوں کو نظر میں رکھنے لگا۔ وہ ان افواہوں کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ گھر سے باہر ہوتا اور ذاکر گھر میں، تو بہت بے چین اور مضطرب رہتا۔ کیونکہ وہ تصور میں ذاکر اور رمان کو ناشائستہ حالت میں یکجا دیکھتا۔ اس پریشانی نے اس کی کارکردگی اور مستعدی کو متاثر کیا۔

دوسری طرف ذاکر پریشانی اور خلجان میں مبتلا اپنی زندگی کے پھیکے شب و روز گزار رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کے صحن میں کھلنے والے دروازے کو ذرا سا کھول کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ یہاں سے رمان کا دیدار ہوسکتا تھا لیکن گھنٹوں گزارنے کے بعد بھی وہ مایوس اور نامراد رہتا۔ اب وہ اس پرندے کی طرح تھا جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں اور پنجرے کا در کھول دیا گیا ہو۔ رمان کی محبت نے اس کی قوت پرواز سلب کر لی تھی۔

کئی بار درواغ اچانک اس کے کمرے میں داخل ہوا اور ذاکر کو صحن کی طرف منہ کیے بیٹھے دیکھا۔ ذاکر گھبرا کر کھڑا ہوجاتا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتا۔

جب کئی بار اس حال میں ذاکر کو دیکھا تو وہ جھنجلا گیا، بولا۔ ''ذاکر! یہ تو صحن کی طرف کیا دیکھتا رہتا ہے؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''دوست! میں اس کمرے کی

محدود فضا سے تنگ آکر صحن کے درختوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔''
درداغ نے ناگواری سے منہ بنایا۔''کیا تجھ کو یہ معلوم ہے کہ صحن کے اس پار میری ناموس کے کمرے ہیں؟''
ذاکر نے جواب دیا۔''معلوم ہے لیکن ان کمروں کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں۔''
درداغ ایک دم گرم ہوگیا۔''آج میں نے ہیرس سے کہہ دیا ہے کہ اب میں یہ اذیت ناک زندگی نہیں بسر کرسکتا۔میں تجھے مزید برداشت نہیں کرسکتا۔''
ذاکر نے کھڑے ہوکر درداغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پوچھا۔''کیسی اذیت ناک زندگی؟ میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب؟''
درداغ نے جواب دیا۔''اب تو اتنا سادہ لوح اور ناسمجھ بھی نہیں ہے۔''
ذاکر نے کہا۔''بے شک میں نہ تو اتنا سادہ لوح ہوں اور نہ ہی ناسمجھ۔ اگر تم چاہو تو میں اس سلسلے میں چند باتیں کرلوں۔''
درداغ نے شک وشبے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کس قسم کی باتیں؟ میں تیار ہوں۔''
ذاکر نے جواب دیا۔''دوست! میں ایک پریشان حال انسان ہوں۔ میرا آبائی پیشہ کچھ اور ہے اور ہیرس کی مہربانی سے میں میدانِ جنگ میں منگولوں سے لڑنے جاؤں گا۔ظاہر ہے کہ میں مارا جاؤں گا اور اس دنیا سے مایوس اور نامراد جاؤں گا۔ اگر تم چاہو تو میں اپنے دامن میں خوشیوں کے چند پھول ڈال لوں۔''
درداغ نے بے دلی سے پوچھا۔''بات صاف کر۔ پہیلیاں نہ بجھوا۔''
ذاکر نے جواب دیا۔''دوست! میں پیچیدہ باتیں نہیں کرسکتا۔صاف صاف بات کررہا ہوں۔ مجھے یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ رمان آپ کو کس طرح ملی ہے۔آپ کے پاس دو اور بھی ہیں۔آپ ان دو پر قناعت کرکے ایک کو میرے حوالے کردیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اور شکریہ پیشگی ادا کروں گا۔''
درداغ کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی لیکن تحمل سے کام لیا اور غصے کو پی جانے کی کوشش کی۔''ذاکر! میں خود حیران ہوں کہ تیری یہ بات میں نے تحمل اور برداشت سے سن کس طرح لی؟ تو ہوش میں تو ہے؟''
ذاکر نے پوچھا۔''میری درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا آپ نے۔''
درداغ نے جواب دیا۔''تیری درخواست کا جواب یہ ہے کہ تو میرا گھر خالی کردے اور جہاں جی میں آئے چلا جا کیونکہ میں اس قسم کی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔''
ذاکر مصر تھا، بولا۔''آپ میری درخواست پر فوری فیصلہ نہیں کرسکتے تو کوئی بات نہیں، میں چند دن انتظار بھی کرسکتا ہوں کیونکہ میں بذاتِ خود ان باتوں کا بہت عادی ہوں۔''
درداغ نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور خود ہیرس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ہیرس کے سامنے پورا معاملہ رکھ دیا، بولا۔''اب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ اب میں اس کو نہیں رکھ سکتا۔''
ہیرس نے جواب دیا۔''نہیں۔ ابھی وہ تیرے پاس ہی رہے گا۔''
درداغ نے عاجزی سے کہا۔''میری عزت آبرو خطرے میں ہے۔''
ہیرس ناراض ہوگیا۔''اونچی آواز میں زیادہ باتیں کرنا مجھے بالکل پسند نہیں۔''
درداغ ایک دم سہم گیا۔''آپ فرماتے ہیں تو اس کو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا لیکن عزت آبرو میری خطرے میں ضرور رہے گی۔''
ہیرس نے کہا۔''میں دیکھتا ہوں تو عورتوں کے معاملے میں بڑا حریص ہے۔ رمان کو اس تاجر کے حوالے کرکے پیچھا چھڑا۔''
درداغ کی ذہانت نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اگر وہ ہیرس کے پاس کچھ دیر اور ٹھہرا اور اس موضوع پر بات ہوتی رہی تو ہیرس رمان کو ذاکر کے حوالے کردے گا......جبراً حکماً۔
درداغ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا، غمزدہ ذاکر آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا ہوا ہے۔دروازہ کھلنے کی آواز اور قدموں کی آہٹ سے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کی۔
درداغ تھکا ہارا سا ذاکر کے پاس ہی بیٹھ گیا، بولا۔''میری خواہش تو یہی ہے کہ تو اس وقت تک میرے ساتھ رہ جب تک کہ منگولوں سے فیصلہ کن جنگ نہیں ہوجاتی۔اب تو بشوق یہیں رہ مگر خدا کے لیے میری ناموس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں۔''
ذاکر نے جواب دیا۔''دوست! تم بہت چالاک اور سمجھدار ہو۔تم نے سوچا ہوگا جنگ میں تو میرا مارا جانا یقینی

ہی ہے اس لیے بیٹھے بن گئے۔"

درداغ نے کہا۔ "بخدا! میں نے یہ نہیں سوچا اور پھر شاید تجھ کو یہ بات نہیں معلوم کہ جنگ میں عموماً وہ لوگ مارے جاتے ہیں جن کے زندہ رہنے کی امید کی جاتی ہے اور وہ لوگ زندہ رہتے ہیں جن کے مارے جانے کی توقع ہوتی ہے۔"

ذاکر نے بڑی بے بسی سے درخواست کی۔ "درداغ! میں تمہارا شکر گزار ہوں، براہ کرم تم مجھے میرے ساتھیوں کے پاس پہنچا دو۔ میں وہاں خوش وخرم رہوں گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "لیکن میں اپنی یا تیری مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں بیبرس کے سامنے تیری درخواست رکھ دوں گا۔ پھر وہ جو حکم دے گا اس پر عمل کروں گا۔"

ذاکر بے دلی سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ لیٹ گیا۔ درداغ کچھ دیر تو اس کے پاس ہی کھڑا رہا، پھر ذاکر کی عدم توجہی سے چڑ کر اندر چلا گیا۔

نصف رات کے بعد درداغ نے صحن کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں ذاکر کے کمرے پر ٹھہر گئیں۔ ذاکر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چراغ کی روشنی کمرے سے باہر صحن تک آ گئی تھی۔ اس نے اس مدھم روشنی میں ایک سایہ سا محسوس کیا۔ یہ مضطرب اور بے چین سایہ ادھر سے ادھر متحرک تھا۔ وہ پھرتی سے اٹھا اور رمان کے کمرے میں اس کو دیکھنے پہنچ گیا۔ اس وقت رمان گہری نیند سوئی ہوئی تھی، اس نے سوچا۔ "خدایا! پھر یہ کیا ماجرا ہے؟"

وہ اپنا شک رفع کرنے علیہ اور صفیہ کے کمروں میں گیا اور انہیں بھی سوتا دیکھ کر واپس آ گیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر صحن کو عبور کرتا ہوا ذاکر کے پاس پہنچ گیا۔

ذاکر چراغ کی مدھم اور تاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں تلوار چلا رہا تھا۔

درداغ نے حیرت سے پوچھا۔ "ذاکر! یہ کیا ہے؟ یہ آدھی رات کے بعد شمشیر زنی کیسی؟"

ذاکر نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔ "درداغ! میں شمشیر زنی اور فنِ سپہ گری کے حصول میں ماہر اور یکتا ہو جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں طفیلی اور کمتر بن کر نہیں رہوں گا۔"

درداغ نے کہا۔ "اگر شوق کا یہ حال ہے تو اللہ نے چاہا تو بہت جلد نامور سپاہی بن جائے گا۔"

ذاکر تلوار چلاتا رہا پھر جب وہ تھک گیا تو بے دم ہو کر صحن ہی میں لیٹ گیا۔ درداغ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ درداغ نے محسوس کیا کہ ذاکر اس کی باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہا۔ وہ کچھ دیر تو ذاکر کے پاس ہی رہا، اس کے بعد دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ذاکر صبح فجر کی نماز پڑھ کر ادھر ادھر نکل جاتا اور درداغ اس کو تلاش کرتا رہ جاتا۔ وہ بے مقصد قاہرہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ کبھی کبھی وہ دریائے نیل کے ساحل پر جمع ہونے والوں کی صورتیں دیکھتا رہتا۔ درداغ اس کا پیچھا کرتا اور تھک جاتا۔ آخر ایک دن درداغ نے ذاکر سے صاف صاف کہہ دیا۔ "تجھ کو جہاں کہیں جانا ہو مجھ کو پہلے ہی سے بتا دیا کر اور پھر کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں تیرا پیچھا کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "تب پھر میرا پیچھا نہ کیا کرو۔"

درداغ نے کہا۔ "اگر میں تیرا پیچھا نہ کروں اور تو کہیں فرار ہو جائے پھر.... پھر کیا ہو گا میرا؟ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ جاؤں گا۔"

ذاکر نے چڑچڑے پن سے جواب دیا۔ "تبھی تو میں کہتا ہوں کہ مجھے میرے ساتھیوں کے پاس پہنچا دو۔"

یہ تلخ کلامیاں جاری تھیں اور ذاکر اور درداغ بتدریج ایک دوسرے کے دشمن ہوتے جا رہے تھے کہ بیبرس نے ذاکر کو طلب کر لیا۔ اس نے ذاکر سے پوچھا۔ "تو نے فنِ سپاہ گری کس حد تک حاصل کر لیا؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں اس کی پیمائش نہیں کر سکتا لیکن میں نے جتنا کچھ حاصل کر لیا ہے، اس سے میں اپنی جان بچا اور دشمنوں کو ٹھکانے ضرور لگا سکتا ہوں۔"

بیبرس نے کہا۔ "پہلے میرا خیال تھا کہ تجھ کو تنہا روانہ کر دوں لیکن ان دنوں اس نوع کا سفر خاصا خطرناک ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں تیرے ساتھیوں کو بھی تیرے ساتھ کر دوں۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "یہ آپ کی بندہ پروری ہے ورنہ میں تنہا بھی جا سکتا ہوں۔"

بیبرس نے ذاکر کو سمجھایا۔ "جب تو مصری سرحدوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا شامی سرحد کے پہلے قصبے غزہ میں داخل ہو گا تو وہاں تجھے منگولوں کی چوکیاں دکھائی دیں گی اور جگہ جگہ منگولوں سے مڈبھیڑ بھی ہو سکتی ہے۔ بس تیرا کام یہ ہو گا کہ تو ان سب کو دھوکا دے کر دمشق تک پہنچ جا۔ دمشق کی جامع مسجد کے باب البرید میں تجھ کو ایک صوفی ملے گا۔ اس صوفی کی پہچان یہ ہو گی کہ باب البرید کے لنگر خانے سے ہر کوئی کھا پی رہا ہو گا مگر یہ صوفی ان سب سے الگ تھلگ اللہ اللہ کرتا نظر آئے گا۔

ذاکر نے کہا۔ ''لیکن یہ تو اس صوفی کی کوئی پہچان نہ ہوئی۔''

بیبرس نے چڑ کر جواب دیا۔ ''میں اپنی گفتگو کے دوران دخل اندازی یا قطع کلامی بالکل پسند نہیں کرتا۔ جب تو باب البرید میں داخل ہوگا تو یہاں تجھے ایک لنگر خانہ ملے گا۔ اس لنگر خانے سے متصل سبزی فروش اور عطر فروش اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے دکھائی دیں گے۔ یہیں ایک پھولوں کی منڈی بھی ہے۔ جس صوفی کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ وہ گلاب کے پھولوں کا عاشق ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہر وقت ایک گلاب کا پھول ضرور نظر آئے گا۔ وہ خوشبو کا دلدادہ ہے اور خس کی خوشبو اسے بطورِ خاص پسند ہے۔ جب یہ ساری علامتیں اس میں نظر آجائیں تو میرا یہ خط اس کے حوالے کر دینا۔''

ذاکر نے کپڑے پر لکھا ہوا یہ خط بیبرس سے لے لیا۔ کالے کپڑے پر کسی سفید چیز سے خط لکھا گیا تھا۔

بیبرس نے مزید تنبیہ کی۔ ''اور خبردار جو تو نے اس خط کو پڑھنے کی کوشش کی۔ یہاں سے تو اور تیرے ساتھی صوفیوں کی وضع قطع اختیار کریں گے کیونکہ منگول ان نہتوں کو زیادہ پریشان نہیں کرتے۔''

ذاکر نے پوچھا۔ ''اگر یہ خط خدانخواستہ منگولوں کے ہتھے چڑھ گیا تب کیا ہوگا؟''

بیبرس نے غصے میں جواب دیا۔ ''تب پھر میں تجھ کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ میں تیرے ساتھ بائیس تئیس آدمی اور بھیجوں گا۔ کیا ان میں ایک بھی اتنا ہوشیار اور چالاک نہیں ہوگا کہ جو میرے خط کی حفاظت کر سکے؟''

ذاکر نے عرض کیا۔ ''بہر حال اللہ نے چاہا تو میں اس آزمائش میں پورا اتروں گا۔''

انہیں لباس عطا کیا گیا۔ اس موقع پر درداغ کو بھی بلا لیا گیا۔ بیبرس نے درداغ سے کہا۔ ''درداغ! آج میں نے تیرے شاگرد کے سپرد ایسا نازک کام کیا ہے کہ اگر یہ اس میں کامیاب ہوگیا تو میں انعام و اکرام سے اس کو مالا مال کر دوں گا۔''

درداغ نے دعائیہ مشتبہ لہجے میں کہا۔ ''خدا اسے کامیاب کرے۔''

بیبرس نے ذاکر اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ''منگول سردار قطبوغا بہت چالاک اور عیار ہے۔ ہو سکتا ہے راہ میں اس سے کہیں مڈبھیڑ ہو جائے۔ اگر ایسا نازک وقت آجائے تو تم میں سے چند بدرجہ مجبوری جنگ کر کے اسے روکیں گے اور بقیہ میرا خط لے کر آگے بڑھ جائیں گے۔ یاد رکھو، میرا یہ خط بہت اہم ہے اور جامع دمشق کے باب البرید والے صوفی تک اس کا پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

بیبرس نے اچانک درداغ کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''درداغ! تیری ناموس کا کیا حال ہے؟''

درداغ نے بجھے دل سے جواب دیا۔ ''کماندار محترم! ٹھیک ہے۔ ایک خلش سی دل کو تڑپاتی اور ہلکان کرتی رہتی تھی۔ اگر یہ دور ہو جائے تو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ نہ تو کوئی خوش نصیب ملے گا اور نہ......''

بیبرس نے ذاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس شخص نے میرا یہ کام کر دیا تو میں درداغ ایک قربانی تجھ سے بھی چاہوں گا۔''

درداغ کے دل میں ایک کانٹا اور ٹوٹ گیا، ایک پھانس اور چبھ گئی۔

ان لوگوں کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا، وہ چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد بیبرس کماندار کا انداز ہی بدل گیا۔ اس نے درداغ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ''درداغ! میں مسلمانوں سے مایوس نہیں ہوں۔ یہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، آپ اس کو سمجھائیں اور اس کی دینی حمیت اور غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کریں، اللہ نے چاہا تو آپ مایوس نہیں ہوں گے۔''

☆☆☆

ذاکر اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے غزہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کو بار بار ایک ہی خیال ستا رہا تھا اگر منگولوں نے اس کے ساتھ رعایت نہ کی اور دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس نے محسوس کیا، اس کے تمام ساتھی بد دل تھے۔ ان کے چہروں پر جبر اور مایوسی دور سے نظر آتی تھی۔ ادھیڑ عمر شخص جو ان سب کا بڑا ہمدرد تھا، بہت زیادہ مایوس اور دل برداشتہ نظر آتا تھا۔ صحرائے سینائی کی حد میں داخل ہونے سے پہلے ان سب نے زیتون کے ایک درخت تلے قیام کیا۔

ادھیڑ عمر ساتھی کو قبیط نامی مربا بہت پسند تھا۔ یہ اس مربے کو کھانے کے ساتھ مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ کھانے کے دوران اس نے اپنے ساتھیوں کے سامنے ایک تجویز رکھی، اس نے کہا۔ ''اب اگر ہم چاہیں تو چپ چاپ مشرق کو مڑ جائیں۔ عرب ہمارے سامنے ہے اور ہم سب بیبرس کی بیگار سے بچ جائیں گے۔''

کئی نوجوانوں نے اس کی تائید بھی کی مگر ذاکر نے سختی سے اس تجویز کو رد کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''ہمارا سامانِ تجارت بیبرس کے

قبضے میں ہے۔ اس کے بغیر ہم کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ ہم بیبرس کا خط مذکورہ صوفی کو ضرور پہنچائیں گے۔''

ایک نوجوان نے ذاکر کی مخالفت کی۔ ''اگر منگولوں نے ہمیں گھیر گھار کے قتل کر دیا تو؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''اور اگر بیبرس ہی ہمیں قتل کرا دیتا تو؟''

کسی تیسرے نے کہا۔ ''لیکن اب تو ہم زندہ ہیں، اس زندگی سے فائدہ اٹھائیں۔''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ جہاں جانا چاہیں چلے جائیں لیکن میں یہ خط دمشق کے صوفی کو ضرور پہنچاؤں گا۔''

ذاکر کے مضبوط لب و لہجے نے ہر کسی کو بے بس کر دیا۔

ایک نے ہنس کر طنز کیا۔ ''حالانکہ جہاد کی مذمت اور برائی ذاکر ہی نے کی تھی اور آج یہی سب سے زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''بے شک۔ لیکن پچھلے دنوں مجھے جو کچھ بتایا گیا، اس نے مجھے اپنے سابقہ خیالات پر شرمندہ اور نادم کر دیا۔''

ذاکر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے تمام ساتھی اس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اس نے کہا۔ ''دوستو! جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ آپ لوگ جہاں چاہیں چلے جائیں، میں بیبرس کا خط دمشق کے صوفی کو ضرور پہنچاؤں گا۔''

اس موقع پر چار کے سوا سبھی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان سب نے آپس میں ایکا کر کے عرب کا رخ کیا اور ذاکر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جن چار نے ذاکر کا ساتھ دیا تھا، ان میں سے ایک نے کہا۔ ''یہ بڑی بدعہدی اور بد اخلاقی کی بات ہے، ان لوگوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ بیبرس نے ہماری بابت اس طرح نہ سوچا ہو اور وہ انہیں اس طرح بہ آسانی نکل جانے دے۔''

ذاکر اور اس کے چاروں ساتھی شام میں داخل ہو گئے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر تعینات منگول ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان منگولوں کی مدد کے لیے مقامی لوگ بھی ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک گرانڈیل منگول جو گنجا بھی تھا، ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ان چاروں سے پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟''

ذاکر نے صاف صاف بتا دیا۔ [illegible]

گنجا منگول چونک پڑا۔ ''قاہرہ سے؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''ہاں قاہرہ سے...... کیوں؟ قاہرہ سے آنا جرم ہے؟''

گنجے منگول نے کہا۔ ''تو جہاں چاہے آئے جائے، تجھے آنے جانے سے کون روکے گا۔ تم لوگ تو درویش ہو۔''

ایک منگول ان پانچوں کی تلاشی لینا چاہتا تھا، اس نے کہا۔ ''صاحبان! آپ لوگ قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ میں آپ حضرات کی تلاشی لوں گا۔''

ذاکر نے بلا حیل و حجت اپنے سامان اور خود کو اس منگول کی تحویل میں دے دیا۔ ذاکر کے چاروں ساتھی بہت پریشان تھے، ان کا خیال تھا کہ بیبرس کا خط ذاکر کے پاس سے قطعی پکڑا جائے گا اور اس کے بعد ہر ایک کا عبرت ناک حشر ہو گا۔

منگول ان کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہ کر سکے۔ ہاں ان کے کمبلوں کے لباس میں سے پانچ تیشے ضرور برآمد ہوئے۔ گنجے منگول نے ان تیشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تم لوگ دنیا ترک کر چکے ہو تو ان تیشوں کا پاس رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

ذاکر کے ساتھی تو اس سوال سے گھبرا گئے مگر ذاکر کے ہوش و حواس بجا تھے۔ اس نے جواب دیا۔ ''جناب! ہم دنیا ترک کر چکے ہیں۔ ہمیں شہروں اور آبادیوں میں تو پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے مگر جنگلوں اور ویرانوں میں جب ہمیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو ان تیشوں کی مدد سے ہم درختوں کی چھال، گھاس اور بعض جڑوں کو زمین سے کھود کر نکالتے اور کھاتے ہیں۔''

گنجے منگول نے طنزاً پوچھا۔ ''اور کبھی کبھی انہیں انسانی پیٹ میں اتار دیتے ہو گے؟''

ذاکر نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ ''توبہ توبہ۔ ہم اتنا برا کام نہیں کرتے۔''

گنجے منگول نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔ ''انسانوں کو ہلاک کرنا برا کام ہے؟ گویا ہم لوگ برے ہیں جو دن رات یہی کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا خان اعظم چنگیز خان بہت برا آدمی تھا، جس نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

ذاکر ذرا بھی نہیں گھبرایا جبکہ اس کے ساتھی بہت گھبرائے ہوئے تھے، ذاکر نے جواب دیا۔ ''اس کام کو ہم جیسے گوشہ نشین لوگ برا سمجھتے ہیں، اپنے لیے صرف اپنے لیے۔ ورنہ خدا نے جس انسان کو جو کام سونپ دیا ہے، وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



گنجے منگول نے ان پانچوں کو ایک کونے میں لے جا کر پوچھا۔ "تم لوگ قاہرہ سے آرہے ہو، تم نے بیبرس کا نام تو سنا ہوگا؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "نام سنا کیا، میں تو اس سے مل بھی چکا ہوں۔"

گنجے منگول کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں، بولا۔ "تو اس سے کیوں مل چکا ہے؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "جناب والا! ہم نے سنا ہے وہ کسی کے خلاف فوج کشی کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ہر صحت مند کو اپنی فوج میں جبراً شامل کر رہا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ہم کو بھی پکڑ لیا تھا لیکن ہم سب منت سماجت کر کے چھوٹ گئے مگر ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس نے بہت بڑی فوج تیار کر لی ہے۔"

گنجے منگول نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "بیبرس تو پاگل ہو گیا ہے۔ آج دنیا میں زمین کے اوپر اور جاودانی نیلے آسمان کے نیچے کوئی طاقت بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارا مقابلہ کر سکے۔ میں مصر اور قاہرہ کی بربادی اپنی چشمِ تصور سے دیکھ رہا ہوں۔"

پھر معلوم نہیں گنجے منگول کو کیا بات یاد آ گئی، پوچھا۔ "تم جاؤ گے کہاں؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ہم دمشق جا رہے ہیں۔ وہاں کے مضافاتی پہاڑی سلسلے میں تارک الدنیا لوگوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ ہم ان غاروں میں یکسوئی سے عبادت کرنا چاہتے ہیں۔"

گنجا منگول ہنسنے لگا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ اور غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہو۔"

اب ذاکر کی سانس میں سانس آئی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ جب وہ گنجے منگول کے پاس سے ہٹ رہا تھا تو اس نے اسی وقت ایک دوسرے قافلے کو اس سرحدی چوکی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ لوگ بھی درویشوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ گنجا منگول انہیں بھی ایک کونے میں لے جا کر ان سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔

ذاکر کے ساتھیوں کو حیرت تھی کہ تلاشی کے دوران بیبرس کا خط کہاں چلا گیا تھا۔ ایک نے دبی زبان میں پوچھا۔ "اور ذاکر وہ خط... وہ خط کہاں چلا گیا؟"

ذاکر اپنے ساتھیوں کو چھوٹے چھوٹے درختوں کی جھاڑیوں میں لے گیا اور وہاں کی زمین کے ایک حصے کو کھود کر خط نکال لیا، بولا۔ "میں نے احتیاطاً اس کو یہاں چھپا دیا تھا۔"

ذاکر یہاں رکا نہیں، فوراً آگے بڑھ گیا۔ ان کے پاس نہ تو خیمے تھے، نہ کوئی اور سامان، بس گھوڑے تھے۔ جہاں کہیں سبزہ نظر آتا گھوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتے اور خود درختوں کے سائے میں کھا پی کر آرام کر لیتے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی بستی میں ایک کنوئیں پر لڑکیوں اور عورتوں کو پانی بھرتے دیکھا۔ یہاں کنوئیں کے پاس دو درویش بھی موجود تھے جو ان کے بعد آئے تھے اور گنجا منگول انہیں ایک کونے میں لے جا کر سوال جواب کرنے لگا تھا۔ ان پانچوں کو بھی پیاس لگی ہوئی تھی مگر یہ آدمیوں سے ملتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہ پانچوں کنوئیں سے دور دور گزرنے لگے کہ ایک درویش نے انہیں آواز دی۔ "درویشو! ایسی بھی کیا بے مروتی، آؤ پانی تو پی لو۔"

ذاکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ درویش نے یہ بات اپنے کسی ساتھی درویش سے کہی ہے یا ذاکر سے۔ ابھی وہ اس کا کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ وہی درویش تیز تیز قدم مارتا اس کے پاس آ گیا، بولا۔ "درویشو! میں تم سے مخاطب ہوں۔"

ذاکر نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھ سے؟ ہم سے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "ہاں تم سے۔"

ذاکر نے کہا۔ "لیکن ہمیں تو پیاس نہیں لگی۔ تم پیاسے ہو تو پیو پانی۔"

درویش نے ذاکر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اگر تم پیاسے نہیں ہو تو تمہارے گھوڑے تو پیاسے ہوں گے، انہی کو پانی پلا دو۔"

ذاکر نے سوچا۔ 'پتا نہیں یہ درویش کون ہیں جو بلاوجہ بے تکلف ہوتے جا رہے ہیں۔'

ذاکر ازراہِ تکلف و اخلاقیات اس درویش کے ساتھ چلا گیا۔ عورتیں اور لڑکیاں انہیں چلو سے پانی پلا رہی تھیں۔ اس رومانی منظر نے ذاکر کے دل میں گدگدی سی کر دی۔ دل نہ چاہنے کے باوجود وہ بھی چلو سے پانی پینے لگا۔ دوسرے درویش اس کی اس حرکت پر مسکرانے لگے تھے۔

عورتیں اور لڑکیاں انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک جوان میں زیادہ ذہین اور شریر نظر آتی تھی، دوسروں سے کہنے لگی۔ "یہ کیسے احمق اور کم عقل لوگ ہیں جو نوجوانی ہی میں تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔"

دوسری عورتیں اور لڑکیاں زور زور سے ہنسنے لگیں۔

اس بستی کے ایک چھوٹے سے باغ میں ان لوگوں نے قیام کیا۔ بستی والوں کو ان پر رحم آیا اور تین دن متواتر انہیں کھانے پہنچاتے رہے۔ ذاکر نے ان درویشوں میں ایک

حیرت انگیز بات دیکھی تھی۔ یہ درویش تعداد میں بارہ تھے اور ان سبھوں نے اپنے اپنے سروں پر سفید چادریں ڈال رکھی تھیں۔ ان چادروں کے گھونگھٹ میں ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے اور انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ ان میں ایک درویش ذاکر سے بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ ذاکر نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ یہ پچیس تیس سالہ جوان کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔

ذاکر نے اس سے پوچھا۔ ''دیکھو، درویش ہم بھی ہیں اور درویش تم بھی ہو۔ یہ تم لوگ چادروں میں اپنی شکلیں کیوں چھپائے رہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دنیا کو بلاوجہ نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی دنیا کو اپنی صورت دکھائیں گے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''بابا! آپ لوگوں کا درویشی میں کیا مسلک ہے؟''

اس سوال نے ذاکر کو پریشان کر دیا، بولا۔ ''ترکِ دنیا، معصیت سے بچنا۔ دل آزاری سے بچنا۔''

''خوب خوب۔'' وہ کچھ سوچنے لگا، پھر اچانک پوچھا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے ساتھ بائیس تیئس آدمی تھے وہ سب کہاں گئے؟''

ذاکر کو اس سوال نے بدحواس ہی کر دیا، پوچھا۔ ''آپ نے انہیں کہاں دیکھا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''قاہرہ میں۔ جب تم لوگ وہاں سے چلے تھے، ہم بھی وہیں موجود تھے۔''

ذاکر نے کہا۔ ''افسوس کہ درویشی انہیں پسند نہیں آئی اور وہ دنیا میں واپس چلے گئے۔''

اس جوان نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ ''اور تم لوگ جا کہاں رہے ہو؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''دمشق، ہم وہاں کے غاروں میں یکسوئی سے عبادت کرنا چاہتے ہیں۔''

جوان نے کہا۔ ''ہم بھی دمشق ہی جا رہے ہیں۔ ہم سب پہلے تو وہاں کے عجائبات کا مشاہدہ کریں گے اس کے بعد سوچیں گے کہ اب کہاں بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔''

بستی کی لڑکیاں اور عورتیں ان کے پاس مزے مزے کی خواہشیں اور آرزوئیں لے کر آنے لگیں۔ وہ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں سے اپنے حق میں دعا اور مدد کی طالب تھیں۔ کسی کو اس کا عاشق درکار تھا، کسی کو اس کا محبوب، کسی کا شوہر بے کار تھا اس کو کام درکار تھا۔

ذاکر نے سوچا اگر وہ اس بستی میں چند دن اور رہ گیا تو وہ اور اس کے ساتھی یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ سفید پوش درویش بھی یہاں کی لڑکیوں اور عورتوں سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک رات جب پوری بستی محوِ خواب تھی، ان لوگوں نے کوچ کیا اور دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ذاکر کا راستہ الگ ہو چکا تھا اور گھونگھٹ پوش درویشوں کا الگ۔

ایک جگہ ان درویشوں پر لٹیروں نے حملہ کر دیا۔ ذاکر اور اس کے ساتھیوں نے ان حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ بعد میں انہیں اپنے اس کارنامے پر بڑی حیرت ہوئی اور خود انہیں اس کی سچائی پر یقین نہیں آیا کہ یہ سب کس طرح ہو گیا۔ انہوں نے لٹیروں کو کس طرح شکست دے دی؟ ان سوالوں کے اس کے پاس مدلل اور واضح جواب نہیں تھے۔

جب وہ دمشق کے قریب پہنچا تو اس نے اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ میں سے سر اٹھائے مسجد کے مینار دیکھے۔ گرجا دیکھا اور قلعے کی فصیلیں دیکھیں۔ یہاں راستے میں منگولوں کا دور دورہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر گدھوں اور گھوڑوں پر سوار گرد و غبار اڑاتے ادھر ادھر نکل جاتے۔ یہاں راستوں میں بھی منگول ہی منگول نظر آ رہے تھے۔

ایک منگول گدھے پر سوار دمشق والوں کو محظوظ کرتا پھر رہا تھا۔ دمشق کے بچے اس پر تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ ان سب کو چھوڑتا ہوا ان کا خیال کیے بغیر جامع مسجد کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں جامع مسجد کے چاروں طرف دکانوں اور بازاروں کا زور تھا۔

ذاکر اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے جامع مسجد پہنچ گیا۔ وہ اس عظیم الشان مسجد کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پوری مسجد کو خوب اچھی طرح دیکھے لیکن ہیرس کی امانت اس کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ مسجد کے غربی دروازے میں داخل ہوا۔ اسی دروازے کو باب البرید کہتے تھے۔ یہاں ایک لنگر خانہ بنا ہوا تھا۔ اس نے اس لنگر خانے میں اس صوفی کو تلاش کیا جس کے نام یہ خط لکھا گیا تھا۔ جب یہاں مایوسی ہوئی تو وہ سبزی فروشوں کی طرف چلا گیا اور سبزی فروشوں کے بعد عطر فروشوں کی طرف نکل گیا۔ مذکورہ اور مطلوبہ صوفی یہاں بھی نہ نظر آیا۔ ذاکر کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عطر فروشوں کے سامنے سے گزر کر پھولوں کی منڈی میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھی بھی خاصے پریشان تھے اور وہ بار بار اس سے پوچھ رہے تھے۔ ''اس صوفی کی پہچان کو تم بھولے تو نہیں؟ اس کو یہیں باب البرید کے آس پاس ہی کہیں ملنا تھا یا کسی اور دروازے پر؟''

ذاکر انہیں چڑچڑے انداز میں ڈانٹ دیتا۔ ''خدا

کے لیے کچھ دیر خاموش رہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس صوفی کو میں نے باب البرید کے آس پاس کہیں ملنا ہے۔"

ذاکر نے ان جگہوں کے کئی چکر لگائے مگر ناکام ونامراد رہا۔ آخر وہ شمال کی طرف مڑ گیا۔ یہاں اسے ایک اور پھاٹک نظر آیا۔ اس پھاٹک پر موٹا موٹا لکھا ہوا تھا 'باب الناطفیین'۔ جن ستونوں پر یہ پھاٹک کھڑا تھا، وہ میناروں کی طرح بلند سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اوپر تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے دائیں بائیں دو گول گول حوض بنے ہوئے تھے۔ دونوں حوضوں میں پانچ پانچ ٹونٹیوں سے پانی آ رہا تھا جس سے دونوں حوض پانی سے لبریز ہو رہے تھے۔ اس دروازے سے ملحق ایک ایوان تھا۔ اس ایوان سے ملا ہوا رہائشی حصہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمروں کا سلسلہ۔ ان میں اساتذہ رہتے تھے۔ وہ اس ایوان میں گھومتا پھرتا رہا۔ ایوان سے نکلتے ہی دائیں طرف ایک خانقاہ سی نظر آئی۔ اس نے ایک شخص کو روک لیا اور پوچھا۔ "برادرِ عزیز! یہ خانقاہ کیسی ہے؟"

اس شخص نے ذاکر اور اس کے ساتھیوں کو بہت غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تم لوگ صوفی ہو؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ہم اپنی وضع قطع سے آپ کو کیا نظر آتے ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "صوفی۔"

ذاکر نے کہا۔ "ہاں ہم صوفی ہیں، اب آپ بتائیں یہ خانقاہ کیسی ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "صوفیو! خوش ہو جاؤ کہ یہ صوفیوں کی قیام گاہ ہے اور اسے صوفیوں ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔"

ذاکر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "دوستو! کیا خیال ہے، ہمیں اس خانقاہ میں قیام کرنا چاہیے، اس کے بعد اطمینان سے اپنے صوفی کو تلاش کریں گے۔"

سب نے اس خیال کی تائید کی اور اس خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں چھت سے لٹکے ہوئے فانوس اور دیواروں کی منبت کاری نے ان سب کو بہت متاثر کیا۔ وہ سب خانقاہ کے اندر قطار میں بنے ہوئے کمروں میں سے ایک میں ٹھہر گئے۔ یہاں اپنا سامان رکھ کر وہ حوض پر منہ ہاتھ دھونے چلے گئے۔ پھر جب منہ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو انہوں نے اپنے حجرے سے ملحقہ دو حجروں میں انہی گھونگھٹ پوش درویشوں کو مقیم پایا۔ یہاں انہوں نے اپنے چہروں سے سفید چادریں اتار دی تھیں۔ یہ سارے کے سارے مضبوط اور صحت مند جوان تھے۔

ذاکر نے ان میں اس نوجوان کو تلاش کیا جس سے وہ ذرا بے تکلفی سے باتیں کر چکا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اور اس کے ساتھی ان کے حجرے میں داخل ہوئے اور پوچھا۔ "درویشو! تم کل کتنے ہو؟ بتاؤ تاکہ میں تمہارے کھانے کا بندوبست کروں۔"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ہم کل پانچ ہیں۔"

وہ دونوں یہ پوچھ کر چلے گئے۔ راستے کی تکان نے ان پر نیند سی طاری کر دی تھی۔ کوشش کے باوجود اعصاب جواب دے رہے تھے اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ پانچوں کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔ ان کے خراٹوں کی آوازیں دور دور تک پہنچنے لگیں۔ کئی گھنٹے بعد جب وہ بیدار ہو گئے تو ذاکر کو پھر ہیبرس کا خط اور صوفی یاد آ گئے۔ اس نے ایک بار پھر صوفی کی تلاش کا فیصلہ کیا اور ہیبرس کا خط تلاش کرنے لگا۔ خط کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے اور دل اور دماغ ایک کرب اور اذیت محسوس کرنے لگے۔ ذاکر نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ "دوستو! وہ خط کہاں چلا گیا؟ میں تو برباد ہو گیا میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ فوت ہو گیا۔"

ایک ساتھی نے پوچھا۔ "وہ خط یہاں تک لائے بھی تھے یا راستے ہی میں کہیں گر آئے؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ابھی چند گھنٹے پہلے جب میں صوفی کو تلاش کر رہا تھا، وہ خط میرے پاس موجود تھا۔ وہ سونے سے پہلے بھی میرے پاس تھا، مجھے اتنی بڑی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔"

خط کی زور و شور سے تلاش ایک بار پھر شروع ہوئی مگر وہ نہیں ملا۔ لنگر خانے کی طرف سے ان پانچوں کا کھانا آیا مگر خط کے صدمے نے ذاکر کی بھوک پیاس ختم کر دی تھی۔ اس نے اپنا کھانا کھائے بغیر ہی واپس کر دیا۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! شاید وہ خط مجھے نہیں ملے گا۔ مجھے مشورہ دو کہ اب میں کیا کروں؟"

ایک نے مشورہ دیا کہ تلاش جاری رکھو۔

ذاکر نے پوچھا۔ "کہاں جاری رکھوں تلاش کو؟ میرا خیال ہے وہ خط چوری ہو گیا۔ کوئی اس کو چرا لے گیا۔"

دوسرے دوست نے کہا۔ "اس خط کو کوئی کیوں چرائے گا؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں

لکھا گیا تھا لیکن یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس میں کوئی نہایت اہم بات ضرور لکھی ہوگی۔''

تیسرے دوست نے کہا۔''میں سفر کی صعوبتوں سے واقف ہوں لیکن دوست! تمہاری خاطر میں قاہرہ واپس چلنے کو تیار ہوں۔ تم بیبرس سے دوسرا خط لکھوا لینا۔ اس کو دوبارہ پہنچا دیا جائے گا۔''

ذاکر نے جواب دیا۔''افسوس کہ تو بیبرس سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ وہ مجھے اس لغزش پر زندہ زمین میں گڑوا دے گا۔''

ذاکر کو رونا آرہا تھا، اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔''میں ایک بار اور اس کو تلاش کرتا ہوں اگر وہ مل گیا تو خیر لیکن اگر وہ نہ ملا تو میں کسی پہاڑی سے کود کر خودکشی کرلوں گا۔''

ذاکر نے ایک بار پھر پوری تندہی سے خط کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ اب بات ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

شام کو فانوس روشن کردیے گئے، اس کی روشنی میں حجروں میں مقیم صوفی حجروں سے نکل کر بیچ کے ہال میں جمع ہونے لگے۔ ان میں وہ جوان بھی نظر آگیا، ذاکر کو جس کی تلاش تھی۔ اس نے ذاکر سے کہا۔''عجیب بات ہے کہ جہاں ہم لوگ ٹھہرتے ہیں، وہیں تم لوگ بھی آجاتے ہو۔ بہرحال خوب! اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ پہاڑیوں کی کھوہ میں کب جاؤ گے؟''

ذاکر نے جواب دیا۔''کسی دن بھی چلا جاؤں گا۔''

جوان نے ذاکر کی شکل بہت غور سے دیکھی اور پوچھا۔ ''درویش! کیا بات ہے، تم بہت پریشان نظر آتے ہو؟''

ذاکر نے جواب دیا۔''میں کیوں پریشان ہوں، اب کیا بتاؤں، درویش! میرے حق میں دعا کرو کہ میری یہ مشکل آسان ہوجائے۔''

جوان نے بے چینی سے پوچھا۔''کون سی مشکل درویش! کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ ہوسکتا ہے میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔''

ذاکر نے سرد آہ بھری۔''اے کاش ایسا ممکن ہوتا۔''

جوان ذاکر کو اشارے سے بلا کر ایک طرف لے گیا، بولا۔''درویش! اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

بات ایسی تھی کہ ذاکر کسی کو صاف صاف بتا بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی جواب دیا۔''درویش! جب میں قاہرہ سے چلا تھا، تو وہاں کے ایک شخص نے یہاں کے ایک صوفی کے نام ایک خط دیا تھا۔ وہ خط مجھ سے گم ہوچکا ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟''

جوان درویش نے پوچھا۔''اس خط میں لکھا کیا تھا؟''

ذاکر نے جواب دیا۔''میں نے اس خط کو پڑھا ہی نہیں تھا۔''

جوان درویش نے کہا۔''تمہیں اس خط کو پڑھنا چاہیے تھا، تاکہ کم از کم اس خط کا مفہوم مکتوب الیہ تک پہنچا دیتے۔''

ذاکر نے کہا۔''میں کسی کا خط کس طرح پڑھ سکتا تھا۔ یہ تو بڑی بداخلاقی ہوتی۔''

جوان نے مشورہ دیا۔''تب پھر آپ ایسا کریں، میں دو ہفتے بعد قاہرہ واپس جانے والا ہوں۔ آپ اس شخص کے نام ایک خط لکھ دیجیے گا جس نے یہ خط لکھا تھا، آپ اس کو صاف صاف لکھ دیجیے کہ وہ کہیں گم ہوگیا، دوسرا لکھ کر بھیج دیجیے۔''

ذاکر نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔''بہتر ہے بدرجہ مجبوری یہی کرنا ہوگا مجھے۔''

جوان درویش اس کو وہیں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔

ذاکر کا کھانا پینا حرام ہوگیا۔ دوسرے دن صبح سو کر جو اٹھا تو کمزوری نے اسے حد سے زیادہ نڈھال کردیا تھا۔ اب اس پر مایوسی نے مکمل غلبہ پالیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے الوداعی ملاقات کی، اس نے کہا۔''دوستو! اگر میں شام تک واپس نہ آؤں تو تم یہ سمجھ لینا کہ میں قاہرہ واپس چلا گیا، پھر تم جہاں چاہو چلے جانا۔''

دوستوں نے کہا۔''قاہرہ ہم بھی ساتھ چلیں گے تنہا نہ جانا، ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

وہ جامع مسجد پر بھی الوداعی نظریں ڈالتا ہوا غوطۂ دمشق کے اس پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ یہاں درختوں پر خوش رنگ اور خوش آواز پرند نغمہ سرائیوں میں مشغول تھے اور پورا کہسار بہت ساری خوشبوؤں کے مرکب سے مہکا ہوا تھا۔ وہ یہاں ایک ایسی بلند و بالا پہاڑی کی تلاش میں تھا جہاں سے کود کر وہ اپنی جان دے سکتا۔

گھومتے پھرتے آخرکار وہ ایک ایسی پہاڑی پر پہنچ چکا تھا، جس کے نشیب میں خطرناک کھڈ اور پہاڑ یا چٹانیں تھیں۔ اس کو خودکشی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ اس نے ایک چٹان پر نماز شکرانہ ادا کی اور جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو عجیب سی تمناؤں کا اظہار کررہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

''اے میرے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ میں پورے سفر میں کسی ایک جگہ بھی غافل نہیں رہا پھر وہ خط کہاں چلا گیا؟ الٰہ العالمین! اس راز سے تیرے سوا کوئی بھی واقف نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خودکشی حرام ہے لیکن مجھ میں اتنی

ہمت نہیں ہے کہ میں بیبرس کو جا کر یہ بتاؤں کہ اس کا خط مکتوب الیہ تک پہنچنے سے پہلے ہی گم ہو گیا۔ اے میرے مولا! مجھے معاف فرما دے۔''

جب وہ خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا تو جوان درویش بھاگتا ہوا ذاکر کے پاس پہنچا، بولا۔ ''درویش! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ وہ درویش صوفی جس کے نام تو کسی کا خط لایا تھا، تجھ کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مذکورہ خط اس کو مل چکا، اب واپس چل اور اس صوفی سے ملاقات کر لے۔''

ذاکر کو اس شخص کی باتوں پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ ''مگر اس صوفی کو یہ بات کیونکر معلوم ہوئی کہ میں کوئی خط اس کے نام لایا تھا اور پھر یہ کہ وہ خط اس کو پہنچایا کس نے؟''

جوان درویش نے جواب دیا۔ ''تمہاری ان بہت ساری باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مذکورہ خط اس صوفی کو مل چکا ہے۔''

اب کچھ کچھ امید کی کرن پیدا ہو چکی تھی، ذاکر نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور جوان درویش کے ساتھ صوفیوں کی خانقاہ میں واپس آ گیا۔ ذاکر کے دوستوں نے اس کو ایک بار پھر اپنے درمیان دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔

جوان درویش نے صوفی کو ادھر ادھر دیکھا تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے ذاکر سے کہا۔ ''درویش! پریشان نہ ہونا، صوفی اس وقت کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گا میں تمہیں بلوالوں گا۔''

شام کو مغرب کے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا صوفی ذاکر کے حجرے میں داخل ہوا۔

اس نے حجرے میں داخل ہوتے ہی ذاکر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''ذاکر! تو نے انتہائی غیر ذمے داری کا ثبوت دیا۔ تو نے میرے خط کو اس بے پروائی سے اپنے پاس رکھا کہ میرے آدمی اسے بہ آسانی اڑا لائے۔ ذرا سوچ تو سہی کہ اگر میں تیرے سپرد کوئی دوسری اہم چیز کرتا اور اسے میرے دشمن لے اڑتے تو کیا ہوتا۔''

صوفی بڑبڑا رہا تھا اور ذاکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ صوفی کون ہے اور کس سے مخاطب ہے؟ صوفی کی آواز البتہ شناسا محسوس ہو رہی تھی۔ صوفی اپنی کہے چلا جا رہا تھا۔ ''تو نے اپنے ساتھیوں کو بھی آزاد کر دیا، حالانکہ تیرا یہ فرض تھا کہ تو انہیں سمجھاتا اور اپنے ساتھ رکھتا لیکن تو نے بہت آسانی سے چلا جانے دیا۔''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی غلطیوں کا اعتراف ہے لیکن میرے جن ساتھیوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا، میں انہیں بجبر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔''

صوفی نے پوچھا۔ ''تو نے دمشق میں کیا دیکھا؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''جامع دمشق کا باب البرید اور اس سے متعلقہ حصے۔''

صوفی نے پھر سوال کیا۔ ''تجھ کو یاد ہوگا کہ تو نے جہاد کا مذاق اڑایا تھا۔ اس وقت اسلامی قانون تجھے سزا دے سکتا تھا مگر بیبرس نے تیری اصلاح کی اور آج تو اسلام کے لیے قاہرہ سے دمشق تک کا پُرخطر سفر کر کے آیا ہے، اب تجھ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔''

ذاکر کے خیال میں یہ ساری باتیں فضول تھیں کیونکہ یہ موقع ان باتوں کا تو نہیں تھا۔

صوفی نے پوچھا۔ ''کیا تو نے مجھے پہچانا؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

صوفی نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دی، ذاکر نے دیکھا تو کانپنے لگا۔ اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے، بے اختیار بولا۔ ''ارے یہ آپ؟''

ذاکر کے سامنے رکن الدین بیبرس کھڑا تھا۔ ''ذاکر! میں خود یہاں آنے والا تھا، اس لیے تجھ کو یہاں پہلے روانہ کر دیا۔''

بیبرس نے ذاکر کو سمجھایا۔ ''ذاکر! میں یہاں جو کچھ دیکھنے اور سمجھنے آیا ہوں، اسے دیکھے اور سمجھے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔''

ذاکر کو حیرت اور تعجب نے لاجواب کر دیا تھا۔

دمشق کے مشرقی میدان میں منگول سپاہ ڈیرا ڈالے پڑی تھی۔ ان کا سپہ سالار قطلو بوغا اس کے معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ بیبرس اپنے درویشوں کے ساتھ باب البرید کی خانقاہ سے باہر نکلا اور جبل قاسیون کی طرف جانے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے بیبرس ہی کی طرح سفید احرام باندھ رکھے تھے اور احرام کے پلو سے سر اور چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ اس وقت انہوں نے گھوڑوں کے بجائے گدھوں پر سفر شروع کیا تھا۔ یہ اتنا دلکش منظر تھا کہ منگولوں کی نظریں اس ملکوتی قافلے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کو یہ درویش بہت اچھے لگے۔ اس وقت قطلو بوغا اپنے نائبین کے ساتھ منگولوں کے درمیان پیدل چل رہا تھا۔ وہ منگولوں کو بتا رہا تھا کہ اب انہیں قاہرہ کا رخ کرنا ہے اور سیف الدین قطز اور بیبرس کو ان کی گستاخیوں کی عبرت ناک سزا دینی ہے کیونکہ ان دونوں کے حکم سے منگول وفد کے ارکان کو بلاوجہ قتل کر دیا گیا۔

منگول سپاہ کے مجلا ہتھیار دھوپ میں چمک رہے تھے

اور سورج کی شعاعیں ان سے ٹکرا ٹکرا کر نظروں میں خیرگی پیدا کر رہی تھیں۔ بیبرس اپنے رفقا کے ساتھ بالکل ان کے قریب سے گزرا، قطبوغا نے بھی انہیں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا پھر اپنے نائبین سے پوچھا۔ ''یہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟''

کسی دمشقی نے جواب دیا۔ ''منگول سردار! یہ درویش ہیں اور غالباً دمشق کے اطراف کے مقاماتِ مقدسہ اور زیاراتِ منورہ کی زیارت کرنے جا رہے ہیں۔''

قطبوغا نے پوچھا۔ ''ان کا تعلق کس مذہب سے ہو سکتا ہے؟''

دمشقی نے جواب دیا۔ ''یہ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔''

قطبوغا نے حکم دیا۔ ''انہیں روکا جائے، میں ان سے بات کروں گا۔''

قطبوغا کا حکم اٹل تھا، منگول سپاہ کا ایک دستہ آگے بڑھا اور درویشوں کا راستہ روک لیا۔

بیبرس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے سپاہیو! تم ہمارا راستہ کیوں روک رہے ہو؟''

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ''تم سب کو ہمارے سردار قطبوغا نے بلوایا ہے۔''

بیبرس نے کہا۔ ''ہم درویشوں کو تم لوگ کیوں پریشان کر رہے ہو؟ ہم نے دنیا کو چھوڑ دیا پھر تم لوگ ہمیں کیوں دنیا کی طرف لے جانا چاہتے ہو؟''

منگول سپاہی نے سختی سے کہا۔ ''ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تعمیل کرو، ورنہ ہم جبراً لے جائیں گے۔''

بیبرس نے اپنے درویش ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''درویشو! تمہاری کیا رائے ہے؟''

بیبرس کے ایک قریبی ساتھی نے جواب دیا۔ ''اخی! ہم امن پسند تارک الدنیا لوگ، جھگڑے فساد سے ہمیشہ بچتے رہے ہیں اس لیے اس معاملے کو بھی بحسن و خوبی نمٹا دینا چاہیے۔''

بیبرس اور اس کے ساتھی منگول دستے کے ساتھ قطبوغا کے پاس چلے گئے۔ قطبوغا نے معائنے کا کام فی الحال ختم کر دیا تھا۔ وہ اپنے نائبین کے ساتھ اپنے خیمے میں جا چکا تھا۔ بیبرس اور اس کے درویش ساتھیوں کو قطبوغا کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت قطبوغا ایک اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ قطبوغا یوں تو منگولوں کے لباس میں تھا لیکن اس کے گلے میں چھوٹی سی سونے کی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ چوکی پر بھورے رنگ کی سمور بچھی ہوئی تھی۔ قطبوغا کا دربار ہلاکو خان کا دربار معلوم ہوتا تھا۔ قطبوغا کے سامنے جو منگول سردار بیٹھے تھے، ان کے جسموں پر قاقم و سمور کے لباس تھے لیکن ان کے شانوں پر ریشمی چادریں تھیں۔ حالانکہ پہلے ان ریشمی چادروں کی جگہ بھیڑیوں کی بھوری کھالیں ہوا کرتی تھیں۔ بیبرس نے ان کے گھوڑوں کی لگاموں میں چاندی کے زیورات پروئے دیکھے تھے۔ دربار میں موجود سرداروں کے ہتھیاروں کے دستوں پر ہیروں اور جواہرات کی شعلہ فشاں چمک دیکھی۔ قطبوغا کی نشست کا انداز انتہائی متکبرانہ تھا۔ اس وقت وہ کسی شہنشاہ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ خاقانوں کے دربار کی طرح خیمے کے ایک گوشے میں دو تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تخت پر تازہ پھل اور خشک فواکہات رکھے تھے اور دوسرے تخت پر شراب کے اور گھوڑی کے دودھ کے مٹکے رکھے تھے۔ ان کے پاس ہی پینے کے آلات سجے ہوئے تھے۔

قطبوغا نے درویشوں سے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو اور کیا کرتے ہو؟''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''ہم درویش تارک الدنیا لوگ ہیں اور اپنے دشمنوں سے شب و روز جنگ کرتے رہتے ہیں۔''

قطبوغا نے حیرت سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''ذرا تم لوگ بھی اس احمق کی باتیں سننا۔ درویش ہے اور اپنے دشمنوں سے جنگ بھی کرتا رہتا ہے۔'' پھر بیبرس سے پوچھا۔ ''تیرے دشمن کون اور کہاں ہیں؟''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''میرا نفسِ امارہ، میری خواہشات، حرص و طمع، خودستائی، خودپرستی۔''

قطبوغا کو ہنسی آ گئی، بولا۔ ''تم لوگ مسلمان ہو، خوب!''

ایک منگول سردار قطبوغا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ان سے پوچھا جائے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں؟''

جب یہی سوال بیبرس اور اس کے ساتھیوں سے کیا گیا تو بیبرس نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو نکلے ہیں۔ ان کی زیارت کر کے واپس چلے جائیں گے۔''

قطبوغا نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، مسلمانوں کے مطلب کی یہاں کوئی بھی زیارت گاہ نہیں۔''

بیبرس نے خفگی سے جواب دیا۔ ''منگول سردار! اللہ کی شان ہے کہ آپ جنگجو لوگ بھی مقاماتِ مقدسہ اور زیارت گاہوں پر بات کر رہے ہیں حالانکہ اس کا علم ہم درویشوں ہی کو ہونا چاہیے۔''

قطبوغا کچھ شرمندہ ہو گیا، بولا۔ ''درویش! اچھا بتا تو سہی تو یہاں کس کس چیز کی زیارت کرے گا؟''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''ہم جبل قاسیون کے پہلو میں برزہ نامی گاؤں میں جائیں گے کیونکہ اسی گاؤں میں ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے پھر ہم اس غار میں جائیں گے جہاں سے حضرت ابراہیمؑ چاند سورج اور ستاروں کا مشاہدہ کر کے خدائے واحد اور قادر مطلق پر ایمان لائے تھے۔ یہیں پہاڑ کی چوٹی پر شہر کے مغرب میں تمام باغوں سے اوپر وہ پہاڑی ہے جس کو ربوہ کہتے ہیں۔ یہاں حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو لے کر رہی تھیں، میں ان جملہ مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔''

قطلو بوغا نے حیرت سے پوچھا۔ ''درویش! کیا تو مسیح اور ان کی مقدس مریمؑ کی عزت کرتا ہے؟''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''عزت کرنا کیا معنی؟ ہم مسلمانوں کا ان پر ایمان لائے بغیر اسلام تک پورا نہیں ہوتا۔ دین ناقص رہ جاتا ہے۔ اس لیے ہم دنیا بھر کے مسلمان سابقہ نبیوں اور ان کی کتابوں پر ایمان لاتے اور رکھتے ہیں۔''

قطلو بوغا نے عجیب سی نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ درویش تو عجیب و غریب باتیں کر رہا ہے۔ معلوم نہیں ان باتوں میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے۔''

دمشقی نے قطلو بوغا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''منگول فاتح! یہ درویش جو کچھ کہہ رہا ہے، از روئے اسلام درست کہہ رہا ہے۔''

قطلو بوغا نے کہا۔ ''یہ جو کچھ کہہ رہا ہے از روئے اسلام درست ہو یا غلط، اس نے حضرت مسیح اور ان کی مقدس ماں مریم کا نام لیا ہے، اس لیے میں ان سے زیادہ سوال جواب نہیں کروں گا۔''

بیبرس نے پوچھا۔ ''کیا منگول سردار نے مسیحی دین اختیار کرلیا ہے؟''

قطلو بوغا نے جواب دیا۔ ''ہاں کیونکہ ہمارے عظیم ایل خان (ہلاکو) کی ہر دلعزیز بیوی دوقوز بھی مسیحی ہے۔ ہمیں اس کی خوشنودی کے لیے یہ مذہب اختیار کرنا پڑا۔''

بیبرس مسکرایا۔ ''خوب! لوگ دین اپنی مرضی یا دین کی سچائی کی وجہ سے نہیں اختیار کرتے بلکہ اپنے بادشاہوں کی بیویوں کی خوشنودی کے لیے اختیار کرتے ہیں۔''

قطلو بوغا نے غضب ناک ہو کر تنبیہ کی۔ ''میں درویشوں کے خون سے خود کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا، اس لیے تم بھی اپنی حد میں رہو۔''

بیبرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قطلو بوغا نے کہا۔ ''اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا، جان لیا۔''

بیبرس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خیمے سے نکلا اور جبل قاسیون کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے آس پاس اور آگے پیچھے غور سے دیکھا۔ وہاں اس کے اور درویشوں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ بیبرس زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ''بخدا میں نے قطلو بوغا اور اس کی سپاہ سے زیادہ بے وقوف لوگ نہیں دیکھے۔ میں نے ان کے سرداروں کے کاندھوں پر ریشمی چادریں دیکھی ہیں اور ان کے گھوڑوں کی لگاموں میں چاندی کے زیورات پروئے ہوئے دیکھے۔ ان کے ہتھیاروں کے دستوں میں ہیرے اور جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم جن منگولوں سے جنگ کریں گے، وہ چنگیز خانی منگول نہیں ہیں۔ یہ بھی شہری تمدن کے اسیر ہو چکے ہیں اور ان کی حرص و طمع نے انہیں بھی بہت زیادہ مصلحت اندیش اور بزدل بنا دیا ہوگا۔ کیا تم لوگوں نے قطلو بوغا کو تخت پر بادشاہوں کی طرح بیٹھے نہیں دیکھا؟''

ذاکر، بیبرس کا مداح بلکہ پرستار ہو چکا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ بیبرس دمشق کیوں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا، بیبرس اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد جبل قاسیون نہیں جائے گا لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا۔ وہ سیدھا جبل قاسیون کے پہلو میں برزہ نامی گاؤں میں پہنچا۔ یہاں مسلمانوں نے ایک مسجد اور بلند مینار تعمیر کر دیا تھا۔ بیبرس نے کہا۔ ''یہی مسجد اور مینار وہ جگہ ہیں جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔''

جملہ درویشوں نے اس مقدس جگہ کو نہایت عزت واحترام سے دیکھا پھر یہ سب اس غار میں گئے جہاں سے حضرت ابراہیمؑ چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھ دیکھ کر خدائے عظیم و برتر کا تصور کیا کرتے تھے۔ یہاں کے مقامی راہنما نے انہیں وہ مشہور قبرستان دکھایا جہاں وہاں کی روایات کے مطابق ستر ہزار انبیاؑ دفن تھے۔ یہ قبرستان ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

راہنما ان درویشوں کو مولد ابراہیمؑ کے مغرب میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک غار میں لے گیا۔ اس غار کو کہف الدم کہتے تھے۔ غار کے اوپر ایک سرخ پگڈنڈی بہت دور تک چلی گئی تھی جہاں یہ سرخ پگڈنڈی ختم ہو جاتی تھی، وہاں ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ راہنما نے انہیں بتایا۔ ''فقرا! یہ مسجد وہ جگہ ہے جہاں سے قابیل اپنے بھائی ہابیل کی تلاش میں چلا تھا پھر جب ہابیل مل گیا تو اس کو قتل کر دیا اور اس کی خون بہتی ہوئی لاش کو ٹھکانے لگانے کے ارادے سے اس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ یہ پگڈنڈی اسی خون

سے ہمیشہ کے لیے سرخ ہوگئی ہے۔"

پھر یہ راہنما ان سب کو اس غار میں لے گیا۔ جہاں قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش لے گیا تھا۔ اس نے جھک کر اس جگہ کو بوسہ دیا اور کہا۔ "حضرات! یہی وہ مقدس جگہ ہے جہاں رسول مقبولؐ، عیسیٰؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور ایوبؑ وغیرہ نے نماز ادا کی۔"

یہاں بھی ایک شاندار مسجد تعمیر کردی گئی تھی۔ بیبرس اور اس کے رفقا نے اس جگہ نمازیں پڑھیں اور مقاماتِ مقدسہ کو بوسے دیے۔

مسجد کے اوپر مسافروں کے لیے حجرے بنے ہوئے تھے۔

راہنما پہاڑ کے نیچے کہف الجوع نامی ایک غار میں لے گیا اور انہیں بتایا کہ اس جگہ ستر پیغمبر بھوک سے ہلاک ہوئے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک روٹی تھی اور خود ستر تھے۔ وہ سب باری باری روٹی ایک دوسرے کی طرف بڑھاتے رہے کھائی کسی نے بھی نہیں۔ آخر بھوک نے انہیں قید زندگی سے آزاد کردیا۔ یہاں بھی ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔

پھر راہنما پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا۔ شہر کے مغرب میں تمام باغوں سے اوپر ربوہ نامی پہاڑی پر۔ ایک بلند و بالا قصر کی طرح اس پر سیڑھیوں کے ذریعے چڑھا جاسکتا تھا۔ یہاں اوپر ایک چھوٹا سا غار حجرے کی طرح تھا۔ راہنما نے بتایا۔ "یہاں حضرت مریمؑ اپنے بیٹے مسیحؑ کے ساتھ قیام فرما رہی ہیں۔"

یہاں بھی ایک مسجد اور ایک حوض تعمیر کرادیا گیا تھا۔

یہ لوگ بڑی دیر تک یہاں گھومتے پھرتے رہے۔

شام کو جب یہ لوگ باب البرید کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو بہت تھک چکے تھے۔ ذاکر نے پوچھا۔ "کماندار محترم! منگول سردار قطلوبغا سے جو کچھ کہا گیا تھا، کیا اس کے بعد ان مقامات مقدسہ کی زیارت ضروری ہوگئی تھی؟"

بیبرس نے جواب دیا۔ "ان مقامات مقدسہ کی زیارت یوں بھی ضروری ہوگئی تھی کہ کہیں قطلوبغا نے ہمارے قول و فعل میں مطابقت کو دیکھنے کے لیے ہمارے پیچھے اپنے آدمی نہ لگا دیے ہوں۔"

ذاکر لاجواب ہوگیا۔ بیبرس نے دمشق میں تین دن اور قیام کیا اور اس کے بعد قاہرہ واپس چلا گیا۔ جب اس نے منگولوں کی چوکیوں کو پار کیا تو اس کے اپنے سامنے اپنی چوکیاں نظر آنے لگیں۔ یہاں وہ نسبتاً ایک بڑی چوکی پر پہنچا اور چوکی کے نگراں سے کہا۔ "ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر جنہیں میں جاتے وقت تیری تحویل میں دے گیا تھا۔"

چوکی کے پیچھے ایک خاصا بڑا احاطہ تھا، اس احاطے کے چاروں طرف اونچی اونچی سنگین دیواریں کھڑی تھیں۔ احاطے کے اندر بیرکیں سی بنی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ان بیرکوں میں سے تقریباً اٹھارہ افراد کو نکال کر بیبرس کے حوالے کردیا گیا۔ ذاکر نے انہیں ایک نظر میں پہچان لیا۔ یہ سب وہی لوگ تھے جنہوں نے ذاکر کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

بیبرس نے ان سب کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "بھگوڑو! مت گھبراؤ، میں تمہیں وہی سزا دوں گا جو بھگوڑوں کے لیے مقرر ہے۔"

وہ سب گڑگڑانے اور رونے لگے۔

بیبرس یہاں سے روانہ ہوئے اور بعجلت قاہرہ میں داخل ہوگئے۔ وہاں سلطان سیف الدین قطز بڑی بے چینی سے بیبرس کا انتظار کر رہا تھا۔ خود سلطان کو بھی بیبرس کے منصوبوں کا علم نہ تھا۔

یہاں اس نے درواغ کو بلوا کر دریافت کیا۔ "جب منگولوں میں کچھ لوگ چوری سے راہِ فرار اختیار کرتے تھے تو خاقان یا اس کے بھائی ان بھگوڑوں کے لیے کیا سزا تجویز کرتے تھے؟"

درواغ نے جواب دیا۔ "اول تو وہاں اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہاں، میں نے ایک بار پانچ آدمیوں کو فرار اور گرفتار ہوتے دیکھا۔ خاقان نے ان کے گلے میں لکڑی کی دھنیاں ڈلوادی تھیں اور انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اس بوجھ کے ساتھ انہی راہوں پر دوڑ لگائیں جن سے وہ فرار ہو رہے تھے۔"

بیبرس نے اس عجیب و غریب سزا کو بڑی توجہ سے سنا اور مسکرایا۔ بھگوڑے تاجر خوف سے سپید پڑ گئے تھے۔

ذاکر کو اپنے ساتھیوں پر رحم آرہا تھا۔ اس نے ان کی سفارش کرنا چاہی مگر ہمت نہ پڑی۔ آخر اس نے درواغ کا سہارا لیا بولا۔ "دوست درواغ! کماندار بہادر سے کہو، ان غریبوں کو معاف کردیں۔"

درواغ نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں ان کی سفارش نہیں کرسکتا۔"

ذاکر نے کہا۔ "اگر تم سفارش نہیں کرو گے تو مجھے کرنا پڑے گی۔"

لیکن سفارش سے پہلے ہی بیبرس پھر کہیں غائب ہوگیا۔ وہ کہاں گیا تھا، کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔ اٹھارہ تاجر کسی قید خانے میں بند کردیے گئے تھے۔ ذاکر درواغ کے ساتھ چلا گیا۔ درواغ نے راستے میں اس کو سمجھایا۔ "ذاکر! تو نے بیبرس کی نظر میں وقار حاصل کرلیا ہے۔ اب تجھ کو اپنی زندگی

نہایت رکھ رکھاؤ اور احتیاط سے گزارتا ہوگی۔‘‘
ذاکر، درداغ کا مطلب سمجھ چکا تھا، اس نے پوچھا۔ ’’درداغ! تو اسلام اور ہادیٔ اسلام پر کس حد تک یقین رکھتا ہے؟‘‘
درداغ نے جواب دیا۔ ’’میں نے اسلام کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا اور اسلام کا تصور ہادیٔ اسلام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ میری جان، میرا مال ہادیٔ اسلام پر قربان..... مگر تو نے یہ سوال کیوں کیا؟‘‘
ذاکر نے کہا۔ ’’تجھ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب رسول ﷺ نے مکے سے مدینے ہجرت کی تھی تو مدینے میں مواخات (بھائی چارگی) کی ایک رسم ادا کی گئی تھی۔ مہاجروں کو مدینے والوں کا بھائی بنا دیا گیا تھا۔ ان انصار بھائیوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنی املاک، اپنی زمین، اپنے کاروبار اور اپنی بیویوں میں حصے دار بنالیا تھا۔ جن کے پاس دو بیویاں تھیں، ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے حوالے کر دیا تھا اور جن کے پاس تین بیویاں تھیں......‘‘
اب درداغ نے ذاکر کا مفہوم پالیا تھا پھر بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا، پوچھا۔ ’’بات صاف صاف کر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟‘‘
ذاکر نے جواب دیا۔ ’’آپ کو تین لڑکیاں حاصل ہیں، ان میں سے ایک میرے حوالے کر دیں اور مجھے اپنا بھائی بنالیں۔‘‘
درداغ نے کہا۔ ’’لیکن نہ تو، تو مہاجر ہے اور نہ ہی میں انصار اور نہ ہی قاہرہ میں رشتہ مواخات کی گرم بازاری ہے۔ اگر اس رسم کو قاہرہ میں عام کر دیا جائے تو میں بھی سوچوں گا ورنہ تن تنہا میں یہ کام نہیں کر سکتا۔‘‘
ذاکر لاجواب اور بے بس ہو کر چپ ہو گیا۔ درداغ اس کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ذاکر نے اپنے کمرے کے اندرونی دروازے کو ذرا سا کھول کر چھوڑ دیا اور یہاں سے وہ رمان کی دید کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا لیکن وہ ناکام رہا کیونکہ درداغ کی موجودگی میں یہ کام مشکل تھا۔
کئی دن بعد بیبرس آ گیا۔ اس نے شب و روز محنت کر کے ترکمانوں، عربوں، بددؤں، بالائی مصر کے وحشی حورہ قبائل پر مشتمل ایک لاکھ کی فوج تیار کر لی تھی۔ اس نے اس عظیم الشان فوج کے سامنے سلطان سیف الدین قطز کو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ قطز جو کچھ دیکھ رہا تھا، اس پر اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بیبرس سے پوچھا۔ ’’کیا یہ بھیڑ بھاڑ منگول ماہر جنگ جوؤں کا مقابلہ کر سکے گی؟‘‘

بیبرس نے جواب دیا۔ ’’ضرور کرے گی مقابلہ۔ اللہ نے چاہا تو میں عالم اسلام اور پوری دنیا کو یہ دکھا دوں گا کہ ان وحشی منگولوں کا سر کس طرح کچلا جائے۔ منگول بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔ مجھ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ آدمی، آدمی کو شکست دے سکتا ہے۔‘‘
بیبرس نے اس عظیم الشان لشکر کے سامنے اٹھارہ بھگوڑوں کو طلب کیا۔ بیبرس نے ان کے ہاتھوں کو ان کی پشت پر بندھوا دیا اور ان کا پوری فوج میں گشت کرایا۔ منادی کرنے والا اعلان کرتا پھر رہا تھا۔ ’’لوگو!...... ان کی طرف دیکھو۔ یہ اٹھارہ بھگوڑے ہیں، ہمارے کمانڈر محترم نے انہیں فوج کے لیے رکھا تھا مگر ان بھگوڑوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ اب ان بھگوڑوں کو قابو میں لا کر انہیں سزا دی جا رہی ہے، عبرت ناک سزا..... جس کو دیکھ کر عبرت پکڑی جائے۔‘‘
ذاکر اپنے آپ کو بمشکل آمادہ کر کے بیبرس کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو رہا کرانا چاہتا تھا لیکن بیبرس اپنے شیدائیوں اور اپنے پرستاروں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ بمشکل تمام وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیبرس نے ذاکر کو دیکھا اور منہ پھیر کر دوسروں سے مخاطب ہو گیا۔
اٹھارہ بھگوڑوں کو پوری فوج کے سامنے سے گزارا جا رہا تھا۔ لوگ ان پر ہنس رہے تھے۔
آخر ذاکر بیبرس کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان تیسرا کوئی نہ تھا۔
ذاکر نے کہا۔ ’’کمانڈر محترم! میں آپ کے پاس ایک درخواست لایا ہوں۔‘‘
بیبرس نے جواب دیا۔ ’’درخواست خدا کے روبرو پیش کر کیونکہ ان بھگوڑوں نے مجھ کو نہیں خدا کو مایوس کیا ہے۔ اگر خدا نے انہیں معاف کر دیا تو میں بھی انہیں معاف کر دوں گا۔‘‘
ذاکر کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بیبرس کے پاس سے فوراً ہٹ گیا۔
اٹھارہ بھگوڑوں کو پورے لشکر میں گھما پھرا کر ایک اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا۔ بیبرس نے ان کے گلے میں کاٹھ کی دھنیاں تو نہیں ڈلوائیں مگر ان کے لبوں پر درے ضرور لگوا دیے۔ جب یہ درے ان کے کولہوں پر لگ رہے تھے تو ان کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ذاکر نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔
دُرّوں کی چوٹ نے انہیں بے ہوش کر دیا تھا۔ بیبرس

نے حکم دیا کہ انہیں دوبارہ قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

☆☆☆

ایک دن ہیرس درداخ کو لے کر کہیں غائب ہو گیا۔ کسی کو کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں اور کتنے دن کے لیے گئے ہیں۔

ذاکر نے موقع غنیمت جانا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور صحن کی طرف کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ صحن کے درختوں اور سبزے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں ان دروازوں پر لگی ہوئی تھیں جہاں رمان کا چہرہ نظر آسکتا تھا۔ آخر بالکل سرے والے دروازے سے رمان نمودار ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے ذاکر کو اپنے پاس بلایا۔ دھڑکتے دل اور ڈگمگاتے کپکپاتے قدموں سے وہ رمان کے پاس پہنچا۔ رمان نے رک رک کر پہلا سوال یہ کیا۔ ''یہ درداخ کہاں چلا گیا؟''

ذاکر نے جل کر جواب دیا۔ ''جہنم میں۔''

رمان نے حیران ہو کر ذاکر کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم ایسے ہی گرم مزاج ہو تو میں واپس چلی جاؤں گی۔''

ذاکر ڈر گیا، زبردستی مسکرا کر بولا۔ ''رمان! میں اس فضول کی قید و بند سے عاجز آیا ہوا ہوں۔''

رمان نے پھر وہی سوال کیا۔ ''درداخ کہاں ہے؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں کیونکہ جس کے ساتھ وہ گیا ہے، وہ کبھی یہ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں اور کتنے دن کے لیے جا رہا ہے۔''

رمان نے پوچھا۔ ''تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا کہوں۔''

رمان نے کہا۔ ''پھر میں چلی۔ ہو سکتا ہے رات کو دوبارہ ملاقات ہو جائے۔''

ذاکر اس کو روکتا ہی رہا مگر رمان نہیں رکی، چلی گئی۔ ذاکر کچھ دیر حیران و پریشان جہاں کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ پوری رات اس نے رمان کے انتظار میں گزار دی۔ اندھیری رات میں وہ ایک درخت کے نیچے آسیب کی طرح بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں سرے کے اسی دروازے پر لگی رہیں جہاں سے رمان آئی اور گئی تھی۔ صبح جب موذن کی آواز گونجنے لگی تو وہ غمگین اور دل برداشتہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ اس کو رمان پر غصہ آ رہا تھا جس نے اس کو بڑی اذیت پہنچائی تھی۔

وہ سارا دن اپنے کمرے میں ہی موجود رہا۔ آتش زیر پا کی طرح۔ وہ بار بار صحن کے اس پار دروازوں کی طرف دیکھنے لگتا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

دوسرے دن بھی وہ ناکام ہی رہا لیکن نصف رات کے بعد صحن کی طرف کھلنے والے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ذاکر جانتا تھا کہ اس دروازے پر رمان کے علاوہ کوئی اور دستک نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ سامنے رمان کھڑی تھی۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر اندر داخل ہو گئی اور خود ہی دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ بولی۔ ''افسوس کہ میں کل نہیں آسکی۔ وہ دونوں میری نگرانی کرتی رہتی ہیں۔ آج میں نے ان دونوں کو ان کے کمروں میں بند کر دیا۔ اب وہ صبح تک بند رہیں گی اور میں آزادانہ تم سے باتیں کر سکوں گی۔''

ذاکر نے بے چینی سے پوچھا۔ ''جب وہ دونوں باہر نکلنا چاہیں گی اور دروازوں کو باہر سے بند پائیں گی تو کیا سوچیں گی۔ کیا کہیں گی؟''

رمان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میں یہ سب نہیں سوچتی، کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ درداخ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ علیہ اور صفیہ میرے لیے وبال جان بن چکی ہیں۔ میں ایسی ذلت نہیں برداشت کر سکتی۔''

ذاکر نے مایوسی سے کہا۔ ''اور درداخ تجھ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں پھر یہ مسئلہ حل کس طرح ہوگا؟''

رمان نے جواب دیا۔ ''اگر کسی طرح مصری دولت مند سامنے آجائے تو یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو جائے گا۔''

ذاکر کی نظریں زیتون کے تیل سے روشن چراغ پر جمی ہوئی تھیں، اس نے کہا۔ ''رمان! سنا ہے مصری دولت مند ہیرس کا معتوب ہے۔ وہ سامنے آہی نہیں سکتا، اگر آیا تو پکڑا جائے گا۔''

رمان نے نہایت احتیاط سے ایک اور تجویز پیش کی۔ ''ایک اور تجویز بھی ہے اگر تم ہمت کرو تو میں اسی وقت تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔ تم مجھے لیبیا لے چلو، وہاں کچھ دن رہ کر مراکش چلے جائیں گے اسی طرح ان موذیوں سے بہ آسانی پیچھا چھوٹ سکتا ہے۔''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''جب تک میں ہیرس سے نہیں ملا تھا، تیری تجویز پر عمل کرنا بہت آسان تھا لیکن اب ایسا نہیں کر سکتا۔''

رمان نے پوچھا۔ ''کیا تم ہیرس سے ڈرتے ہو؟''

ذاکر نے جواب دیا۔ ''میں ہیرس سے ڈرتا بھی ہوں اور اس کا احترام بھی کرتا ہوں۔ ہیرس کتنا غیر معمولی انسان ہے، شاید اس کے ہم عصر اس کے مرتبے اور مقام کا

صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔"

لیکن اسی وقت کسی نے باہری دروازے پر دستک دی۔ ذاکر سمجھ گیا اتنی رات کو درواغ کے سوا کوئی بھی نہیں آسکتا۔ اس نے رمان کو سرگوشی میں سمجھانے کی کوشش کی۔ "اب تو یہاں سے فوراً ہی فرار ہو جا اور اپنے کمرے میں بن کے سو رہ۔ اس کے بعد میں دروازہ کھولوں گا تاکہ درواغ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔"

رمان نے سرگوشی میں کہا۔ "میں جا رہی ہوں مگر یہ اس مسئلے کا حل نہیں۔"

رمان جیسے ہی باہر نکلی، ذاکر نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور باہری دروازے کو کھولنے میں توقف اختیار کیا۔ دوسری طرف باہری دروازے پر مستقل دستک دی جا رہی تھی۔

جب ذاکر کو رمان کے بخیر و خوبی چلے جانے کا پورا یقین ہو گیا تو اس نے باہری دروازہ کھول دیا۔ وہاں درواغ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔ "کیا سو رہے تھے؟"

ذاکر نے جواب دیا۔ "ہاں لیکن ابھی نیند بھی پوری طرح نہیں آئی تھی۔"

درواغ نے کمرے کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور پھر اندرونی دروازہ کھول کر جائزہ لینے لگا۔ بولا۔ "ذاکر! تیرے کمرے سے ایک خوشبو آ رہی ہے۔ ذرا تو خود بھی سونگھ کر دیکھ، یہ خوشبو میرے گھر کی ہے۔ انہیں میرے گھر کی خواتین استعمال کرتی ہیں۔"

ذاکر کو بھی خوشبو محسوس ہو رہی تھی لیکن اس نے اس سے انکار کیا، بولا۔ "میں تو کسی قسم کی خوشبو نہیں محسوس کر رہا۔"

درواغ نے بے رخی اور بے مروتی سے کہا۔ "میں کس طرح تیری بات مان لوں، تو اقرار کرے یا نہ کرے لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کمرے میں رمان آئی تھی اور جب میں آیا ہوں، اس وقت وہ یہاں موجود تھی اور جب تجھ کو یہ یقین ہو گیا کہ رمان اپنے کمرے میں پہنچ گئی ہوگی تو، تو نے باہری دروازہ کھولا۔"

حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ ذاکر نے رمان کے موضوع کو نظر انداز کر دیا، بولا۔ "دوست! تم جس طرح چاہو سوچو، میں تم پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ بہرحال بدگمانی بڑا ظلم ہے مجھ پر۔"

درواغ نے بڑے کرب سے کہا۔ "میرا سکھ چین برباد ہو چکا ہے۔ اب تو میرے ساتھ نہیں رہے گا۔ میں نے کمانداراہبرس سے بات کر لی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ تیرا کہیں اور ٹھکانا کر دے گا۔"

ذاکر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "ٹھیک ہے اگر کماندار بیبرس مجھے حکم دیتا ہے کہ میں کہیں اور رہوں تو میں وہیں چلا جاؤں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ میں اپنے دل کو خالی خالی لے جاؤں گا۔ اس میں جو کچھ ہے وہ ہر جگہ موجود رہے گا اور میں اس وقت آزاد ہوں گا کہ جس کے بارے میں جس طرح چاہوں سوچوں۔"

درواغ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو بھی آزاد ہوگا پھر میں دیکھوں گا کہ تو میری ناموس کے بارے میں کس طرح سوچتا ہے۔ میں منگول ہوں ذاکر، میری نس نس اور رگ رگ میں انتقام کا جذبہ موجزن ہے۔"

درواغ اندر چلا گیا اور ذاکر اپنا سامان سمیٹنے لگا لیکن اسی رات کو کوچ کا نقارہ بجنے لگا۔ بیبرس نے اپنے تمام آدمیوں کو اسی وقت طلب کر لیا تھا۔ نقارہ جنگی مستقل بج رہا تھا۔ درواغ تیز تیز قدم اٹھاتا ذاکر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ذاکر بھی تیار ہو چکا تھا۔ دونوں ایک ساتھ گھر سے نکلے اور بیبرس کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت بیبرس مشعلوں کی روشنی میں اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ بیبرس نے ان دونوں کو دیکھتے ہی حکم دیا۔ "ہمیں علی الصباح کوچ کر جانا چاہیے۔"

درواغ اور ذاکر بھی دوسرے سپاہیوں کی طرح جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆☆☆

سلطان سیف الدین قطز زرہ بکتر پہنے اور خود چڑھائے ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔

بیبرس نے ابھی تک اپنا عام سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے میمنے اور میسرے کو خاص ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک بیت پکڑ رکھا تھا۔ اس بیت سے وہ کئی آدمیوں کی پٹائی کر چکا تھا۔ اس فوج میں ذاکر کے اشارہ معتوب ساتھی بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ درواغ نے کئی نسلوں پر مشتمل رنگ برنگی فوج کو دیکھا تو اس کو ان کی کامیابی پر شبہ سا پیدا ہو گیا۔

بیبرس بڑی پھرتی سے اپنے کام انجام دے رہا تھا۔ اس دوران درواغ اور ذاکر نے دیکھا، چند گھڑسواروں نے اپنے اپنے گھوڑے ایک درخت کے تنے سے باندھ دیے اور خود درواغ کے پاس سے گزر کر بیبرس کے پاس چلے گئے۔ بیبرس نے پوچھا۔ "کیا خبر لائے؟"

ایک نے جواب دیا۔ "غزہ کے پاس عین جالوت

کے میدان میں منگول جمع ہو رہے ہیں۔ قط بوغا نے یہ اہتمام کیا ہے کہ جب اس کی پوری سپاہ یہاں پہنچ جائے گی تب وہ اس کو لے کر قاہرہ کا رخ کرے گا۔"

بیبرس نے پوچھا۔ "اس کی سپاہ خالص منگولوں پر مشتمل ہے یا اس میں ادھر ادھر کے لوگ بھی شامل ہیں؟"

اس پہلے شخص نے جواب دیا۔ "ابھی تک اس میں منگولوں کے سوا دوسرے نہیں نظر آئے۔"

بیبرس نے پوچھا۔ "ان کے گھوڑوں کی لگامیں چاندی کے زیورات سے آراستہ ہیں یا نہیں؟"

اس کا جواب ملا۔ "چاندی کے زیورات کا رواج عام ہے بالکل وبا کی طرح۔ ان کے ہتھیاروں کے دستے ہیرے جواہرات سے مزین ہیں۔"

بیبرس بہت خوش نظر آ رہا تھا، اس نے جوش میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جواب میں اللہ اکبر کی آواز دور دور تک گونج گئی۔

صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد بیبرس نے کوچ کا حکم دے دیا۔ فوج کے آگے آگے ان سواروں کا دستہ تھا جو راستوں کی زبردست شناخت اور پہچان رکھتے تھے۔ سلطان سیف الدین قطز لوہے میں غرق چھوٹے موٹے احکام دیتا پھر رہا تھا۔ اس طرح وہ اپنے نفس کو یہ تسلیاں دیتا پھر رہا تھا کہ وہ اتنی بڑی فوج کا مالک اور ملک مصر کا سچا حکمراں ہے۔

گھڑ سوار اور پیدل فوج نے گرد وغبار کا طوفان سا کھڑا کر دیا تھا۔ آسمان پر چمکتا دہکتا سورج گرد وغبار میں چھپ گیا تھا۔

وردا غ کے احساسات سب سے مختلف تھے۔ وہ خود منگول تھا اور جن سے لڑنے جا رہا تھا، وہ بھی منگول تھے۔ اپنی قوم پر تلوار اٹھاتے ہوئے وہ جھجک سی محسوس کر رہا تھا۔

ذاکر تاجر تھا لیکن بیبرس کی محبت نے اسے سپاہی بنا دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس جنگ میں مالِ غنیمت کتنا مل سکتا ہے اور جب وہ اس جنگ سے فارغ ہو کر لوٹے گا تو کیا اس کا اپنا ضبط شدہ سامانِ تجارت واپس مل جائے گا اور وہ ایک تاجر کی حیثیت سے دوبارہ اپنی زندگی کا آغاز کرے گا۔

بیبرس کی سوچ سب سے مختلف تھی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ منگولوں کو عین جالوت کے میدان میں شکست دے کر وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ فلسطین اور شام کا سارا علاقہ ان کے ناپاک وجود سے پاک صاف کر دے گا۔

تیسری منزل پر پڑاؤ کرنے کے بعد بیبرس نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس کا صدر سلطان سیف الدین قطز کو بنایا گیا۔ یہاں بیبرس نے ایک پُرجوش تقریر کی اور بتایا۔ "اسلام پر اتنا برا وقت کبھی نہیں پڑا تھا۔ آج اس مقابلے میں جس کی فتح ہوگی، وہ فتح مند کہلائے گا اور اس کا اثر ونفوذ افریقا کے آخری ساحلی شہر طنجہ تک ہوگا لیکن جو ہارے گا وہ اپنا سب کچھ ہارے گا۔"

بیبرس نے سلطان قطز کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ کو ہتھیاروں کی نمائش میں رکھ رکھاؤ پیدا کرنا چاہیے۔ زرہ بکتر اور خود پہن لینے سے کوئی شخص بہادر تو نہیں بن سکتا۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "بخدا مجھے زرہ بکتر اور خود پہننے کا اتنا شوق نہیں ہے جتنا بظاہر آپ لوگوں کو نظر آتا ہے، ورنہ میری تو بھی خواہش ہے کہ میں عام انسانوں کی طرح اپنے دشمن کو عین جالوت میں شرمناک شکست دوں۔ چاند کا....."

بیبرس نے پوچھا۔ "کیا آپ لوگ مرتے دم تک ہمارا ساتھ دیں گے؟"

سلطان نے بیبرس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اگر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ منگولوں کے وجود سے سرزمین فلسطین اور شام کو پاک کر دیا جائے اور آئندہ اس لائق ہی نہ چھوڑا جائے کہ وہ ہمارے ممالک محروسہ کا رخ کریں۔"

تیسری منزل کے پڑاؤ سے ان لوگوں نے کوچ کیا تو وہ ذرا شمال مغرب میں بڑھتے دبتے چلے گئے۔ آخر کار یہ لوگ عین جالوت کے اس میدان کے سامنے پہنچ گئے جہاں منگول سپاہ پڑاؤ کیے ہوئے تھی۔

قط بوغا اور اس کے ساتھیوں نے اپنے سامنے ایک عظیم الشان لشکر کو صف آرا دیکھا تو ان کے پندار اور آن بان کو ایک ٹھیس سی لگی۔ اس نے اپنے خیمے میں واپس جا کر سلطان سیف الدین قطز کے نام ایک فرمان لکھوایا۔ اس میں اس نے لکھوایا تھا۔

"خاقان کے ایک ناچیز بندے کے ذریعے سلطان مصر اور ارکان حکومت مصر کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی خود ستائی اور تکبر کی روش ترک کر کے میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں معاف کر دوں گا اور خاقان کی خدمت میں بھیج کر مستقل معافی دلا دوں گا۔ میں نے تجھے اپنے لشکر کے سامنے صف آرا دیکھا تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ تو نے ازراہِ تمرد اور سرکشی اپنی سپاہ کو ہمارے خلاف جنگ پر آمادہ کر لیا ہے۔ اے کاش! یہ میری بات مان لیتے اور قاہرہ کے دروازے کھول کر ہمیں خوش آمدید کہتے تو مزہ آ جاتا۔ میں اب بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ تم سب ہتھیار میرے حوالے

کر کے پُرامن شہری بن جاؤ ورنہ ہمیں اپنے لیے، اپنی بقا کے لیے تم پر لشکرکشی کرنا پڑے گی اور اس وقت عفوو رحم کا در بند کیا جا چکا ہوگا۔"

جب یہ خط سلطان قطز کو ملا تو ذرا سی دیر کے لیے وہ مرعوب ہوگیا۔ اس نے یہ خط بیبرس کے حوالے کر دیا۔ اس نے خط کو پڑھا اور اسی وقت اس کا جواب لکھوا دیا۔

"خدا کے نافرمان اور خون آشام انسانو! ہمیں خدا نے حکم دیا ہے کہ تمہارے ہاتھوں سے ہتھیار چھین لیں اور تمہیں اپنے گھوڑوں کے ٹاپوں سے روند ڈالیں۔ تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے ہم تم سے اس کا حساب کتاب مانگ لیں۔ ہم تمہارے قاصدوں کو دوبارہ بھی قتل کر سکتے تھے مگر اس لیے اس سے اجتناب کیا کہ بہرحال ہم دونوں ایک دوسرے سے متصادم ہونے والے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر رحم کیا جائے یا پھر یہ کہ میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیوں کا خواہش مند رہوں۔ میں تم سے جنگ کے میدان میں فیصلہ کن ملاقات کرنے آیا ہوں، امید ہے تم مایوس نہیں کرو گے۔"

قطبوغا خط کا جواب پڑھ کر غصے اور جوش سے پاگل سا ہوگیا اس نے اپنی سپاہ کو حکم دے دیا۔ "یلغار، لشکرکشی، فوراً، آج ہی۔"

بیبرس اور سلطان قطز کو اس کا پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ قطبوغا زیادہ انتظار نہیں کرے گا۔ اس نے خط کے جواب کے ساتھ ہی حملہ آور ہونے کی خبر اپنے سپاہیوں کو دے دیں۔ بیبرس پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قطبوغا نے یاک کے دو دموں والا پرچم آگے بڑھایا اور جاودانی نیلا آسمان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔

دوسری طرف سے بیبرس نے انہیں جواب دیا۔ "نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔"

قطبوغا کے منگول پوری شدت اور قوت سے مصری سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ مصریوں نے اپنا دفاع کیا اور ان کے مقابل جمے رہنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ذرا سی دیر میں مصریوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مصریوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ قطبوغا نے ان کا تعاقب کیا۔ بیبرس اور ایک دوسرا سردار اپنی سپاہ کے ساتھ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ میمنے اور میسرے کی نسبت سے قلب بہت زیادہ پسپا ہو کر دور تک پیچھے ہٹ گیا تھا۔ منگول قلب کا تعاقب کرتے ہوئے بہت دور تک چلے گئے پھر اچانک قلب پلٹ پڑا اور منگولوں پر جوابی حملہ کر دیا۔ منگولوں کو اس کارروائی کی ذرا سی بھی امید نہیں تھی۔ انہیں دونوں سے تو میمنے اور میسرے نے گھیر لیا

تھا اور تیسری سمت سے قلب نے اپنی تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا تھا۔ یہ خالص منگول طریقۂ جنگ تھا جس کو بیبرس نے منگولوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

قطبوغا اور اس کے لائق فوجی سرداروں نے بڑی کوشش کی کہ وہ زنبور کی طرح اپنی گرفت میں لے لینے والی مصری سپاہ سے بچ بچا کر نکل آئیں مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مصری سپاہ نے انہیں بڑی بے دردی اور سفاکی سے کاٹ کر رکھ دیا۔

قطبوغا چیخا۔ "ارے، یہ کیا کرتے ہو؟ یہ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ مردوں کی طرح میدان میں ڈٹے کیوں نہیں رہتے؟"

کسی منگول نے جواب دیا۔ "میدان میں ڈٹے رہنے کی نسبت قتل ہو جانا یا فرار ہو جانا زیادہ آسان ہے۔"

قطبوغا نے کہا۔ "تب پھر قتل ہو جاؤ مگر یاد رکھو جب تک دو چار کو قتل نہ کر دو، اس وقت تک ان کے ہاتھ قتل بھی نہ ہونا۔"

بیبرس ان پر دباؤ ڈالتا بڑھتا چلا آرہا تھا۔

قطبوغا نے اپنی سپاہ کو حکم دیا۔ "خبردار! جو کسی کو بچ کے جانے دیا۔ ایک ایک کو قتل کر کے آگے بڑھو اور ان کی سرکشی کی سزا دو۔"

بیبرس نے جواباً کہا۔ "اور دیکھو، ان میں بڑا منگول سردار قطبوغا بھی ہے۔ ان مدمقابل منگولوں کو اس طرح مارو کہ قطبوغا نہ قتل ہو۔ ہم اس کو زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔"

دوسری طرف قطبوغا نے اپنے کسی سردار کو حکم دیا۔ "دیکھو تو کسی بھی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤ اور اپنے اس بازو کو تقویت پہنچانے کے لیے اتنی سپاہ کمک کے طور پر لے آؤ کہ میں ان کے نرغے سے بچ کر نکل جاؤں۔"

لیکن مصریوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا، اس حصے کی بیبرس کمان کر رہا تھا۔

دوسری طرف منگولوں کا نہایت بے دردی سے صفایا ہوتا جا رہا تھا۔ سلطان سیف الدین قطز جس کو اپنی فتح کا کچھ زیادہ یقین نہیں تھا، جب اس نے اپنی آنکھوں سے منگولوں کو ذبح ہوتے دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے ان منگولوں کا تعاقب کیا جو حلب اور حمص کی طرف بھاگے جا رہے تھے لیکن بیبرس نے سلطان کو ایسا کرنے سے روکا اور کہا۔ "پہلے ان منگولوں کی صفائی ضروری ہے جو ہمارے نرغے میں آچکے ہیں۔ اس کے بعد بھگوڑوں کا تعاقب کیا جائے گا۔"

سلطان قطز رک گیا اور اس نے محصور منگولوں کا قتل

عام شروع کر دیا۔

قطبوغا اپنے دستے کے ساتھ بیبرس کے گھیرے میں آچکا تھا۔ بیبرس کی نظریں قطبوغا پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہا تھا۔

منگول نوجوانوں نے قطبوغا کو مشورہ دیا۔ ''سردار! بھاگ چلیے، جنگ ختم ہو چکی۔ ہم ہار گئے۔ اب ٹھہرے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

قطبوغا نے جواب دیا۔ ''اے کاش! میں بھاگ سکتا۔ میں نے اب تک سینتیس جنگیں لڑی ہیں اور کبھی شکست نہیں کھائی پھر آج میں کس طرح بھاگ سکتا ہوں۔''

ایک منگول تویون (سردار) نے مشورہ دیا۔ ''اگر ایک محاذ پر شکست ہو گئی تو کیا ہوا، زندہ رہے تو دوبارہ فاتح بننے کا امکان باقی رہے گا لیکن اگر قتل کر دیے گئے تو دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔''

قطبوغا نے اپنے تویونوں کو بھاگ جانے کی اجازت دے دی۔ ''تم لوگ جا سکتے ہو۔ ہلاکو خان کو بتا دینا کہ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا۔ میں چاہوں تو تمہاری طرح فرار ہو سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

تویونوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور فرار ہو گئے۔

بیبرس منگولوں کا صفایا کرتا ہوا قطبوغا کے سر پر پہنچ گیا۔ کسی بدوی نے رسی کے سرے میں پھندا بنا کر قطبوغا کی طرف پھینکا۔ یہ پھندا اس کے گلے میں پھنس گیا۔ بدوی سردار نے رسی کو کھینچ کر اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ بدوی سردار نے جست لگائی اور قطبوغا کے سینے پر گرا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔

اتنی دیر میں بیبرس کے حکم پر مصری سپاہیوں نے قطبوغا کو بالکل تنہا کر دیا اور اس کو رسیوں سے باندھ دیا۔

منگولوں نے راہِ فرار اختیار کی اور مصری سپاہ نے ان کا پیچھا کیا۔ اس مصری سپاہ کی قیادت سلطان قطز کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں میں منگولوں سے میدان صاف ہو چکا تھا۔

سلطان قطز خیمے میں بیبرس کے ساتھ داخل ہوا۔ مصری سپاہ دشمنوں کے سامان پر قبضہ کر رہی تھی۔

سلطان قطز کے خیمے میں بیبرس کے علاوہ دوسرے مملوک امراء بھی داخل ہوئے۔ قطبوغا سلطان قطز کے سامنے رسیوں سے جکڑا بیٹھا تھا۔ مملوک امراء اس منگول کی شکل دیکھنا چاہتے تھے جس نے سالہا سال مسلمانوں اور مصریوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔

بیبرس، سلطان قطز کے پاس بیٹھا ہوا تھا، وہ اٹھا اور قطبوغا کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ دیر قطبوغا کی صورت دیکھتا رہا مگر قطبوغا شرم سے سر نہیں اٹھا رہا تھا۔

بیبرس نے اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے تو نظریں کیوں نہیں ملا رہا؟''

قطبوغا نے جواب دیا۔ ''آج میں جن حالات سے دوچار ہوں، خدا دشمن کو بھی ان سے محفوظ رکھے۔''

بیبرس نے پوچھا۔ ''قطبوغا! اب میں ایک سوال کروں گا..... تو دین مسیحی کے لیے یہ جنگ کر رہا تھا یا ہلاکو خان کے لیے؟''

قطبوغا نے جواب دیا۔ ''دونوں کے لیے۔ اگر میں یہ جنگ جیت جاتا تو میں اپنی فتح سے ایک طرف تو ہلاکو خان اور خاقان کو خوش کر دیتا اور دوسری طرف دو قوتزا اور مسیحی دنیا کو بھی خوشی کا پیغام دیتا۔''

بیبرس نے پوچھا۔ ''تو نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کو قید کیا ہے۔ بتا اب تو قید ہے، تجھ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

قطبوغا نے جواب دیا۔ ''میں اپنے آقا ہلاکو خان کی خاطر ہر حال میں خوش ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری ساری خبریں ہلاکو خان تک پہنچ جائیں گی اور وہ میرا بدلہ لینے کے لیے مصر آئے گا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر زمین بوس کر دے گا۔''

بیبرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کا بھی تیرے ہی جیسا حشر ہو۔''

قطبوغا بے چینی سے تلملانے لگا۔ ''ناممکن، ایسا نہیں ہو سکتا۔ نیلا جاودانی آسمان اور خداوند مسیح کی تائید اس کے ساتھ ہے۔''

بیبرس اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ ایک دوسرا مملوک سردار قطبوغا کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا، اس نے پوچھا۔ ''کیا نیلے جاودانی آسمان اور خداوند مسیح کی تائید تیرے ساتھ نہیں تھی؟''

قطبوغا نے جواب دیا۔ ''خاقان اور ایل خان کا اقبال اور ہی ہوتا ہے۔ اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔''

ایک اور مملوک سردار قطبوغا کے ہاتھ پیروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ رسیوں کی بندشوں نے ہاتھ پیروں کے گوشت میں گہرے نشان ڈال دیے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا رسی گوشت میں پیوست ہو گئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''جب تو نے مسلمانوں کو اسی طرح باندھا ہو گا، تو انہیں بھی ایسی ہی تکلیف ہوتی ہو گی..... یہ اس کا بدلہ ہے۔''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

قطلو بوغا نے جواب دیا۔ ”اب میں رسیوں میں جکڑا ہوا تمہارے سامنے ہوں، بے بس اور مجبور...... جو چاہو کہو سنو۔ میں کیا جواب دوں۔“

اسی جگہ سلطان قطز، بیبرس اور مملوک امراء میں صلاح مشورے ہونے لگے۔ اب سلطان قطز کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ اس نے اعلان کیا۔ ”میں بھگوڑے منگولوں کا خود تعاقب کروں گا اور حلب اور حمص کو ان کے وجود سے پاک کر دوں گا۔“

بیبرس نے کہا۔ ”سلطان! حلب اور حمص تک آپ نہ جائیں کیونکہ یہ میرے علاقے ہیں، مجھے جانے دیں۔ میں خود انہیں منگولوں کے وجود سے پاک کر دوں گا۔“

سلطان قطز نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ”حلب اور حمص ابھی سے تیرے علاقے کس طرح ہو گئے؟ ابھی تو وہ سب میرے ہیں۔ تجھ کو اتنی جلدی من مانے فیصلوں پر عملدرآمد سے باز رہنا چاہیے۔“

بیبرس نے پریشانی سے سلطان قطز کی شکل دیکھی اور کہا۔ ”بہادروں میں جو بات نطے پا جاتی ہے، وہ نقش کالحجر (پتھر کی لکیر) ہو جاتی ہے۔ کیا سلطان اپنے وعدے سے پھر سکتے ہیں؟“

سلطان قطز نے جواب دیا۔ ”لیکن حلب اور حمص کا ابھی تجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جب تک انہیں باقاعدہ تیرے حوالے نہ کر دیا جائے تو ان کی بابت بات بھی نہیں کرے گا۔“

بیبرس نے مزید بحث نہیں کی، پوچھا۔ ”تب پھر آپ تو منگولوں کے تعاقب میں حلب روانہ ہو جائیں، میں یہاں کے حالات سنبھالتا ہوں۔ بقیہ باتیں قاہرہ میں ہوں گی۔“

سلطان قطز فوج کا ایک بڑا حصہ لے کر حلب کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیبرس نے عین جالوت اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اپنے قبضے میں کیا اور گرفتار ہو جانے والے منگولوں کا ایک قید خانہ قائم کیا۔

اس فتح نے ذاکر اور اس کے ساتھیوں کو جو خوشی بخشی تھی، اس کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہیں خوش قسمتی سے یہ اعزاز حاصل ہو چکا تھا کہ ناقابلِ شکست منگولوں کو جس فوج نے پہلی بار عبرت ناک شکست دی، اس فوج میں یہ لوگ بھی شامل تھے۔

درداغ کا کہیں پتا نہ تھا۔ بیبرس نے لاشوں اور زخمیوں میں درداغ کو تلاش کیا، وہاں بھی وہ نہیں ملا۔

ذاکر کو درداغ کی گمشدگی سے مسرت ہی حاصل ہو رہی تھی۔ بیبرس نے درداغ کی تلاش کی ذمے داری ذاکر کو سونپ دی۔ ذاکر نے اس کو بڑی لگن سے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ درداغ کے ساتھ جو بھی پیش آیا تھا، اس کا ہر ایک کو قطعی اور حتمی علم ہونا چاہیے۔

وہ تین دن تک درداغ کی جستجو میں رہا مگر کچھ بھی پتا نہ چلا۔

ادھر بیبرس قاہرہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ جب واپسی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں تو اچانک درداغ نمودار ہو گیا۔ اس نے ایک شخص کو رسیوں سے جکڑ کر دوسرے گھوڑے پر ڈال رکھا تھا اور دوسرے گھوڑے کے گلے میں رسی ڈال کر دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ جب وہ اس حال میں بیبرس کے خیمے کے سامنے رکا تو لوگوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا لیکن ذاکر کو بڑی مایوسی ہوئی۔

لوگوں کا شور و غل سن کر بیبرس خیمے سے باہر نکلا اور اپنے سامنے درداغ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ درداغ کے بعد اس کی نظر دوسرے گھوڑے پر پڑی، پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مصری دولت مند۔ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ قطلو بوغا کے ساتھ یہ بھی قاہرہ پہنچنا چاہتا تھا۔“

بیبرس نے خوشی سے درداغ کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ”شاباش! یہ کیا کام کیا ہے تو نے۔“

مصری دولت مند کے ذکر نے ذاکر کو بڑا سکون دیا۔ وہ اس کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ بیبرس کے حکم سے مصری دولت مند کو گھوڑے سے نیچے اتارا گیا۔ وہ بالکل بے حال ہو رہا تھا۔ بیبرس اس کو اپنے خیمے میں لے گیا اور درداغ سے پوچھا۔ ”یہ تجھے کہاں مل گیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شکست کے بعد یہ فرار ہو رہا تھا اور دریائے اردن کے کنارے ایک گاؤں میں چھپ گیا تھا۔ مجھ کو اس کی تلاش میں بڑی محنت کرنا پڑی اور جب میں نے اس کو پا لیا تو یہ میری منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کو نہیں چھوڑا۔“

ذاکر نے پوچھا۔ ”تو یہی وہ مصری دولت مند ہے جس کے قصر سے علیہ اور صفیہ برآمد ہوئی تھیں اور رمان اسی کی کنیز ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مصری دولت مند نے رمان کو میرے حوالے کر دیا تھا، اب رمان بھی میری ہی ہے۔“

ذاکر نے کہا۔ ”مصری تاجر بھی سامنے موجود ہے۔ رمان بھی تیرے پاس زندہ ہے۔ تیرے جھوٹ سچ کا فیصلہ یہ دونوں کر دیں گے۔“

بیبرس نے ان دونوں کو منع کیا کہ فی الحال رمان کے

موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔ قاہرہ پہنچ کر اس مقدمے کا فیصلہ بھی سنا دیا جائے گا۔ اب بیبرس مصری دولت مند سے مخاطب ہوا۔ ''تو ہلاکو خان کے پاس میرے خلاف مدد حاصل کرنے گیا تھا؟''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''مجھ سے غلطی ہوئی، میں اپنی غلطی پر بہت نادم اور شرمسار ہوں۔''

بیبرس نے کہا۔ ''اور پھر قط بوغا کے ساتھ اس لیے جنگ میں شریک ہوا کہ تجھ کو قط بوغا کی فتح کا یقین تھا۔ اگر قط بوغا فاتح ہوتا تو تو اس کے ساتھ قاہرہ میں داخل ہوتا اور اپنی املاک پر قبضہ جماتا۔ کیوں یہی بات تھی نا؟''

مصری دولت مند تھر تھر کانپ رہا تھا، بولا۔ ''ہاں یہی بات تھی، میں بہت شرمندہ اور نادم ہوں۔''

بیبرس نے اپنے فیصلے یا ارادے کا شائبہ تک نہیں ظاہر ہونے دیا۔ اس نے حکم دیا۔ ''مصری دولت مند کو بھی اسیر منگولوں کے ساتھ رکھا جائے۔''

ذاکر، بیبرس سے تخلیے میں ملنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا مقدمہ ورداغ کی عدم موجودگی میں آزادی سے پیش کرنا چاہتا تھا۔

بیبرس نے واپسی کی تیاریاں مکمل ہوتے ہی قاہرہ کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں دوران سفر ذاکر بیبرس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''محترم کماندار! یہ ورداغ کی بڑی زیادتی ہے۔ اس کے پاس تین تین عورتیں ہیں۔ ان میں ایک کا میں طلب گار ہوں۔ حریص منگول اس کو بھی نہیں دینا چاہتا۔''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''میں اس سلسلے میں ابھی بات نہیں کروں گا۔ ورداغ نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس نے اسلام کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا اس لیے میں اس کی تالیفِ قلب کے لیے رمان کو اس سے نہیں لے سکتا۔''

ذاکر نے بدمزگی سے کہا۔ ''لیکن محترم کماندار! وہ ورداغ کو نہیں، مجھ کو پسند کرتی ہے اور میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔''

بیبرس نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میں ورداغ کو اذیت نہیں پہنچا سکتا اور لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔ تجھ کو کتنی لڑکیاں چاہئیں، میں دوں گا۔''

ذاکر چپ ہو گیا۔

قاہرہ پہنچ کر بیبرس کسی اور ہی الجھن میں پھنس چکا تھا۔ سلطان قطز نے اپنا اعتبار ختم کر دیا تھا اور بیبرس سلطان کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہم خیال مملوک امراء کو بھی اپنے منصوبے میں شامل کر لیا۔

بیبرس نے اپنے قصر میں اپنے ہم خیال مملوک امراء کو بلایا اور ان سے سلطان قطز کے رویّے کے خلاف صلاح مشورے کرنے لگا۔ یہیں قط بوغا کو بھی حاضر کیا گیا۔ اس نے اپنے ہم خیال مملوک امرأ سے پوچھا۔ ''اس فتح کا سہرا کس کے سر باندھا جا سکتا ہے اور وہ کون ہے جس نے اس جنگ کو ناگزیر بنا دیا تھا؟''

ایک امیر نے جواب دیا۔ ''رکن الدین تُو اور صرف تُو۔ سلطان قطز تو آخر تک شک و شبہے میں تھا اور جنگ سے گریز کر رہا تھا مگر یہ تیرا ہی حوصلہ تھا کہ ہم سب کو عین جالوت تک کھینچ لے گیا اور منگولوں کو عبرت ناک شکست دی۔''

قط بوغا ان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اس کے تصور میں کئی ماہ پہلے کا وہ درویش مسکرا رہا تھا جو قیامِ دمشق کے دوران اپنے سفید پوش درویشوں کے ساتھ ملا تھا کہ اس وقت وہ جبل قاسیون سے متعلقہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے جا رہا تھا۔ قط بوغا نے بیبرس سے پوچھا۔ ''مصری سردار! کہیں تم وہ تو نہیں جو چند ماہ پہلے دمشق میں جبل قاسیون کی زیارت کرنے گیا تھا؟''

بیبرس کو ہنسی آ گئی، بولا۔ ''ہاں، میں وہی ہوں۔''

قط بوغا نے پوچھا۔ ''مگر اس طرح دمشق جانے کا مقصد کیا تھا؟''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''میں تجھے دیکھنا چاہتا تھا اور تیری عسکری قوت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔''

قط بوغا نے مملوک امراء سے کہا۔ ''تب پھر بلاشبہ یہ جنگ اس مصری سپاہ سالار نے جیتی ہے۔''

بیبرس مملوک امراء کو ایک دوسرے کمرے میں لے گیا اور وہاں دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ جب باتیں کر کے باہر نکلا تو قط بوغا نے کہا۔ ''مصری سردار! میرے ساتھ جو سلوک کرنا ہے کر۔ میں انتظار کی اذیت سے تنگ آ چکا ہوں۔''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں سلطان قطز کی غیر موجودگی میں زیادہ اختیارات نہیں رکھتا۔ وہ حلب سے واپس آ جائے تو کوئی فیصلہ وہ خود کرے گا۔''

قط بوغا خاموش ہو گیا۔ بیبرس نے اس کو قید خانے میں دوبارہ واپس بھیج دیا۔ چند دنوں بعد سلطان قطز قاہرہ واپس آ گیا۔ بیبرس کو اس کی اتنی جلدی واپسی کا یقین نہیں تھا، اس نے پوچھا۔ ''سلطان محترم! کیا آپ نے اپنی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا؟''

سلطان نے بدمزگی سے جواب دیا۔ ''میں مصر کا بادشاہ ہوں، ملک کا سب سے بڑا انسان، میں دوسروں سے تو ان کی مصروفیات اور معمولات کے بارے میں پوچھ گچھ کرسکتا ہوں مگر کوئی اور مجھ سے اس قسم کی باتیں نہیں کرسکتا۔''

اسی دوران سلطان قطز نے اچانک سوال کیا۔ ''بیبرس! میں نے سنا ہے تم مجھ سے ناراض ہو اور میری عدم موجودگی میں میرے خلاف سازشیں کرتے رہے ہو، کیا یہ سچ ہے؟''

بیبرس نے سوال کیا۔ ''لیکن سوال تو یہ ہے کہ میں آپ کے خلاف سازشیں کیوں کروں گا؟''

سلطان قطز نے جواب دیا۔ ''تو اس لیے میرے خلاف سازشیں کرے گا کہ میں تجھ کو حلب اور حمص کی حکومتیں جو نہیں دے رہا ہوں۔''

بیبرس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے؟ اگر یہ درست ہے تو کیوں؟''

سلطان قطز نے رعونت سے جواب دیا۔ ''میں اس ملک کا سلطان ہوں۔ میں جو مناسب سمجھوں گا، کروں گا۔ مجھے مرضی کے خلاف کسی فیصلے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔''

بیبرس نے بھی سخت رویہ اختیار کیا، بولا۔ ''سیف الدین! تم نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے اس کو ثابت کرنا ہوگا۔ میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔''

سلطان قطز نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس کا ثبوت ہے، اس کے گواہ موجود ہیں۔ وہ مملوک امراء جو اس سازش میں تیرے شریک رہے ہیں، تیرے خلاف گواہی دینے کو تیار ہیں اور پھر تیرے دل کی کدورت اور کینے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ تو نے میری عزت اور احترام کو بالائے طاق رکھ کر مجھ کو میرے نام سے مخاطب کیا۔''

بیبرس نے کہا۔ ''سیف الدین! تو نے اپنی عزت واحترام کو خود ہی ختم کردیا۔ عزت کروگے تو عزت وصول کروگے۔''

سلطان قطز کو غصہ آگیا۔ اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو اپنی ریشہ دوانیوں کا ثبوت چاہتا ہے تو میں تیرے شریکِ سازش امراء کو یہیں تیرے سامنے بلوائے لیتا ہوں۔ وہ تیرے منہ پر تیرے خلاف گواہی دے دیں گے۔''

تالی بجاتے ہی چند غلام اندر داخل ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا۔ ''امیر شمس الدین، فضل، یونس اور ربیع کو حاضر کیا جائے۔''

غلام واپس گئے اور کچھ دیر بعد چاروں امراء حاضر کردیے گئے۔

سلطان نے ان چاروں امراء سے کہا۔ ''تم چاروں اس غدار کو بتاؤ کہ اس نے میرے خلاف کس قسم کی سازشیں کی تھیں۔''

امیر شمس الدین سلطان کی طرف بڑھا اور نہایت احترام اور عقیدت مندی سے کہا۔ ''سلطان محترم! میرے جان ومال آپ پر قربان۔ میں اس سازش کا سارا بھانڈا اسی وقت پھوڑ دوں گا مگر اس سے پہلے میں سلطان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں جنہوں نے منگولوں کو شکست دے کر ہمیں عزت وآبرو بخشی۔''

سلطان نے اپنے دونوں ہاتھ امیر شمس الدین کی طرف بڑھا دیے اور امیر شمس الدین نے بوسہ دینے کے بجائے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ سلطان اوندھے منہ زمین پر آرہا۔ بقیہ تینوں امراء نے سلطان کو مکوں اور لاتوں سے مارنا شروع کردیا۔ سلطان چیخنا چلّانا چاہتا تھا مگر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا جاچکا تھا۔

جب وہ بالکل بے دم اور بے حال ہوکر بے ہوش سا ہوگیا تو بیبرس نے اسی وقت اپنے امراء اور ان کی سپاہ کی مدد سے شاہی محل پر قبضہ کرلیا اور چند منادی شاہی محل کے باہر بازاروں اور گلی کوچوں میں یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے۔

''مسلمانو! سلطان سیف الدین قطز کی روح کی بخشش کے لیے دعائیں کرو اور اپنے نئے سلطان رکن الدین بیبرس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگو۔''

قاہرہ کے لوگوں نے بیبرس کی حکومت کو دل وجان سے قبول کیا اور قاہرہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو یہ پوچھتا کہ سلطان قطز کی موت کس طرح واقع ہوئی اور بیبرس کو بادشاہ کس نے بنایا۔

ذاکر اور درواغ کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی تھی کہ ان کا محسن اور ولی نعمت بیبرس مصر کا سلطان بن چکا تھا لیکن اب وہ بیبرس سے بہ آسانی نہیں مل سکتے تھے لیکن ایک دن انہیں اچانک طلب کرلیا گیا۔

جب یہ دونوں بیبرس کے دربار میں پہنچے تو پتا چلا کہ قطبوغا کا مقدمہ درپیش ہے۔

انہوں نے سلطان قطز کا دربار بھی دیکھا تھا لیکن سابقہ دربار میں سلطان بیبرس جیسا شان وشکوہ نہیں تھا۔ بیبرس نے اپنے لیے لقب الملک القاہر پسند کیا تھا اور وزیر کی حیثیت سے زین الدین ابن زبیر کو مقرر کرلیا تھا۔ اس کو مورخین نے زین الملت والدین ابن زبیر لکھا ہے۔ اس

ہوشیار اور عقلمند آدمی نے سلطان کو بڑے کام کی بات بتائی۔ اس نے اعلان کیا۔ ''سلطان المعظم! میں آپ کے لقب کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

بیبرس نے عرض کرنے کی اجازت دے دی۔

وزیر نے کہا۔ ''تاریخ شاہد ہے کہ جس حکمراں نے بھی اپنے لیے القاہر کا لقب پسند کیا، اس نے کبھی فلاح نہیں پائی۔ القاہر بن معتضد نے یہ لقب اختیار کیا اور انجام کار معزول ہوا اور اس کی دونوں آنکھیں نکالی گئیں۔ والیٔ موصل نے القاہر لقب پسند کیا تو اس کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔''

بیبرس نے وزیر کا شکریہ ادا کیا اور اپنے لقب کو القاہر سے الظاہر کر دیا۔

اب بیبرس قطز بوغا سے مخاطب ہوا۔ اس نے قطز بوغا سے پوچھا۔ ''تو مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتا ہے؟''

قطز بوغا نے جواب دیا۔ ''اسی سلوک کی جس کی تو مجھ سے امید کر سکتا تھا۔''

بیبرس نے پوچھا۔ ''یعنی؟''

قطز بوغا نے جواب دیا۔ ''اگر میں فاتح ہوتا اور تو مفتوح اور تو میرا قیدی ہوتا تو میں تجھ کو قتل کرا دیتا۔''

بیبرس نے کہا۔ ''تو نے میری مشکل آسان کر دی، ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ تجھ کو کیا سزا دوں؟''

قطز بوغا نے مملوک امرا پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بیبرس سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے ساری عمر اپنے آقا کی خدمت کی اور عزت اور مقام حاصل کیا جبکہ تو نے اپنے آقا کو قتل کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ میرے قتل کے بعد میرا آقا ہلاکو خان میرا انتقام لینے مصر آئے گا اور بغداد کی طرح قاہرہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ قاہرہ کی آبادی منگولوں کے رحم و کرم پر ہوگی۔''

بیبرس نے جواب دیا۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا، اب تیرا آقا ہلاکو خان قاہرہ کی طرف آنکھ تک نہیں اٹھا سکتا۔ تو نے اپنے آقا کی خدمت کر کے کون سا مقام حاصل کر لیا؟ نوکر کا نوکر ہی رہا۔ میرا آقا؟ دراصل میرا کوئی آقا تھا ہی نہیں۔ ایک کمزور اور ناقص العقل شخص کو ہم نے اپنا آقا بنا لیا تھا۔ پھر جب وہ نااہل ثابت ہوا تو اسے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ میں نے لے لی کیونکہ میں اس سے اور تمام دوسروں سے زیادہ اہل انسان ہوں۔ اگر میں اہل نہ ہوتا تو میرا خدا اتنی آسانی سے اتنا بڑا مقام نہ عطا فرماتا۔''

بیبرس نے قطز بوغا کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ اس کے سر کو ایک اونچے بانس پر باندھ کر شہر میں کھڑا کر دیا گیا اور جسم کے مختلف اعضا قاہرہ کے مختلف دروازوں پر نصب کرا دیے گئے۔ تاکہ منگولوں سے ڈرنے والے ہلاکو خان کے ایک نامی گرامی سردار کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے رہیں۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اب بیبرس کو فرصت ہی فرصت ہے اور وہ ایک بڑا کارنامہ انجام دے کر فرصت پا چکا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ مسخرا اور مزاح پسند بیبرس بڑی سنجیدگی سے مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا، خطرات سے بھرا ہوا مشتبہ مستقبل۔

اس نے کسی بڑے کام کے آغاز سے پہلے مصری دولت مند کو دربار میں طلب کیا۔ اس وقت دربار میں درواغ اور ذاکر بھی موجود تھے۔ بیبرس نے مصری دولت مند سے پوچھا۔ ''جس طرح قطز بوغا نے اپنی سزا خود تجویز کر لی تھی، اسی طرح میں تجھ کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ اپنی سزا خود تجویز کر لے۔''

مصری دولت مند نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''سلطان المعظم! مجھے سزا کا اختیار نہ دیجیے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری تجویز کردہ سزا سے آپ اتفاق نہیں کریں گے اور بالآخر میں وہی سزا پاؤں گا جو آپ تجویز کریں گے۔''

بیبرس نے وعدہ کیا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے لیے تو خود جو سزا تجویز کرے گا، میں وہی دوں گا۔''

مصری دولت مند نے کہا۔ ''تب پھر میں نے اپنے لیے یہ سزا تجویز کی ہے کہ زندگی بھر اپنے سلطان کی خدمت کروں اور اپنی ضبط شدہ جائداد اور مال و زر کا سلطان سے کوئی مطالبہ نہ کروں۔ میں ماضی میں جو کچھ بھی تھا اس سے توبہ کر لوں۔''

بیبرس مسکرایا۔ ''چالاک انسان! میں نے قول دیا تھا اس کو نباہوں گا لیکن یہ تو بتا کہ تو زندگی بھر میری خدمت کس طرح کرے گا؟''

مصری دولت مند نے عرض کیا۔ ''سلطان جو خدمت چاہیں، مجھ سے لیں۔ میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

بیبرس نے درواغ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اب تو بھی اپنا مقدمہ پیش کر دے تاکہ اس کا فیصلہ بھی سنا دیا جائے۔''

درواغ مقدمہ پیش کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا بولا۔ ''میں کوئی مقدمہ کیوں پیش کروں کیونکہ میرے پاس کوئی ایسا متنازعہ مسئلہ ہی نہیں جو حل طلب ہو۔''

ذاکر نے اعلان کیا۔ ''درواغ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے حالانکہ مصری دولت مند کی کنیز رمان درواغ کے گھر

میں موجود ہے اور ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ مصری دولت مند نے اس کنیز کو درداغ کو عطا کیا تھا یا یہ اس پر زبردستی قبضہ جمائے ہوئے ہے۔"

بیبرس نے مصری دولت مند کی طرف دیکھا اور پورا واقعہ بتا کے پوچھا۔"کنیز رمان کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟"

مصری دولت مند نے پوچھا۔"وہ ہے کہاں؟"

بیبرس نے جواب دیا۔"درداغ کے پاس۔"

مصری دولت مند نے کہا۔"میں نے یہ سوچا ضرور تھا کہ رمان کو درداغ کے حوالے کردوں لیکن جب میں درداغ سے ناراض ہوگیا تو اپنا یہ فیصلہ بھی بدل دیا تھا۔" پھر ذرا آہستہ سے کہا۔"اور اگر درداغ نے اپنی مرضی سے رمان کو اپنے پاس رکھ لیا ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔"

درداغ مقدمہ ہار چکا تھا۔ وہ کھسیایا ہوا تھا، جلدی جلدی کہنے لگا۔"مصری دولت مند! تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے حالانکہ تو نے رمان کو مجھے بخش دیا تھا۔"

مصری دولت مند نے کہا۔"اگر میں نے رمان کو تجھے بخش دیا تھا تو اس کو میری عدم موجودگی میں تیرے پاس ہونا چاہیے تھا پھر وہ میرے قصر میں کس طرح پہنچ گئی؟"

بیبرس نے درداغ کو تسلی دی۔"درداغ! صبر کر، تو مقدمہ ہار گیا ہے۔"

ذاکر بہت خوش تھا، مصری دولت مند نے پوچھا۔"یہ کون شخص ہے؟"

ایک امیر نے جواب دیا۔"یہ پہلے تاجر تھا پھر سپاہی بن گیا اور اب اس دربار کا ایک معزز انسان ہے اور غالباً رمان کا عاشق بھی۔"

مصری دولت مند نے حیرت سے کہا۔"خوب! یک نہ شد دو شد۔" پھر سلطان بیبرس سے عرض کیا۔"جناب والا! یہ میں کیا سن رہا ہوں، یہ رمان تک کس طرح پہنچ گیا؟"

درداغ نے چڑ کر پوری روداد سنا دی، بولا۔"میں نے اس شخص پر اپنے ساتھ رکھنے کا احسان کیا تھا پھر یہ شخص رمان تک معلوم نہیں کیسے پہنچ گیا۔"

بیبرس نے کہا۔"مجھے چند نہایت اہم کام انجام دینا ہیں اس لیے تم لوگ رمان کے مسئلے کو خود ہی سلجھا لو۔"

درداغ نے عرض کیا۔"جب سلطان نے اس مسئلے میں اتنی دلچسپی لی ہے تو اب اس کا فیصلہ بھی فرما دیں۔"

بیبرس نے کہا۔"تب پھر میرا فیصلہ سن لو۔ رمان کو مصری دولت مند کے حوالے کردیا جائے۔"

درداغ بیبرس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ کہہ تو کچھ نہیں رہا تھا مگر زبان حال گویا تھی۔"یہ تو بڑا ظلم ہوگیا مجھ پر۔"

بیبرس نے اعلان کیا۔"رمان کو اسی وقت مصری دولت مند کے حوالے کردیا جائے اور مصری دولت مند کو میرے قصر کی دربانی سونپی جاتی ہے۔" اور ذاکر کی بابت حکم ہوا۔"اس کا سامان تجارت اسے واپس کردیا جائے، اس کے علاوہ نقد دینار بھی دیے جائیں۔ دس ہزار دینار نقد بطور انعام اور اس کو آزادی دی جائے کہ جو پیشہ چاہے اختیار کرے۔"

درداغ کو اس فیصلے سے دکھ تو بہت زیادہ ہوا مگر اُف نہ کرسکا۔ اس پر فوری عمل ہوا۔ ذاکر کو اس کا سامانِ تجارت واپس مل گیا اور اس سامان کے ساتھ دس ہزار دینار بطور انعام پیش کردیے گئے۔

ذاکر نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی۔"اب میں تجار نہیں سپاہی ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے اس کی درخواست منظور کرلی اور اپنے خصوصی دستے میں شامل کرلیا۔

ذاکر نے مصری دولت سے دوستی کرنا چاہی مگر وہ اس پر تیار نہیں ہوا، اس نے کہا۔"میں تیری دوستی کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ میں درداغ نہیں کہ تجھ کو رمان سے عشق لڑانے کے لیے اپنے گھر میں داخل کرلوں۔"

ذاکر نے کہا۔"میں رمان کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ اس کی جو قیمت بھی مقرر کریں گے میں ادا کردوں گا۔"

مصری دولت مند نے حیرت سے پوچھا۔"سچ؟"

ذاکر نے کہا۔"آزما کر دیکھ لیجیے۔"

مصری دولت مند نے کہا۔"تب پھر اپنا جملہ سامانِ تجارت جو سلطان کے حکم سے واپس ملا ہے اور انعام والے دس ہزار دینار، یہ چیزیں میرے حوالے کردے۔ میں رمان کو تیرے حوالے کردوں گا۔"

ذاکر نے جواب دیا۔"میں تیار ہوں مگر یہ معاملہ باقاعدہ ہونا چاہیے تاکہ ہمیشہ مضبوط رہے اور کوئی اپنی بات سے پھر نہ سکے۔"

چنانچہ ایک ماہر معاہدہ نویس کی خدمات حاصل کی گئیں اور رمان کو اپنے جملہ سامانِ تجارت اور نقد دس ہزار دینار کے عوض خرید لیا گیا۔ معاہدہ نویس کے پاس بیٹھے ہوئے ایک گمنام شخص نے گواہ میں اپنا نام لکھوا کے دستخط کردیے۔ اس نے دستخط کی جگہ بڑا بڑا ابایان لکھ دیا تھا۔

''سلطان رکن الدین الظاہر بیبرس۔''

مصری دولت مند بہت زیادہ کھسیا گیا، بولا۔ ''آپ کو یہ زحمت نہیں فرمانا تھی۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''تجھ کو یہ کام نہیں کرنا تھا۔ تو نے اس نوجوان پر ظلم کیا ہے۔'' پھر ذاکر سے کہا۔ ''کیا میں نے تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ حسین لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں، پھر رمان پر اپنا سب کچھ یوں لٹائے دے رہا ہے۔''

مصری دولت مند اپنے سامنے رکھے سامان اور نقد رقم کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بیبرس نے سامان اور نقد رقم ذاکر کو واپس دلوادی اور اسی مالیت کی نقد رقم اپنے پاس سے مصری دولت مند کو عطا کر دی اور اس کو حکم دیا کہ خبردار جو آئندہ اس قسم کا کوئی معاہدہ یا لین دین کیا۔

اسی دوران بیبرس کی چوکیوں کے چند چوکیدار منگولوں کے ایک وفد کو لیے ہوئے حاضرِ دربار ہوئے۔ یہ وفد قفقاز کے اس پار سے آیا تھا۔ برقائی خان نے بیبرس کی فتح مندی کی خبر سن کر اس کو مبارکباد دی تھی۔

بیبرس نے ان منگولوں کی بڑی خاطر مدارات کیں اور ان سے پوچھا۔ ''زریں خیل کے خان برقائی خان کو کس قسم کے تحائف پسند ہیں؟''

اب یہ وفد اس نجی اور ذاتی سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

آخر بیبرس نے اپنے طور پر ایک قرآن پاک جو ریشمی جزدان میں رکھا ہوا تھا، ہاتھی دانت اور صندل کا ایک مرصع تخت، زرتار مصلیٰ، نقرئی دستوں کی نفیس تلواریں، دمشقی کمانیں، تازی گھوڑے، ہوا کی طرح بھاگنے والے اونٹ، زرافوں کے کئی جوڑے اور بہت سارے بندر جو ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے، برقائی خان کو بطور تحفہ بھیج دیے۔

برقائی خان نے بیبرس کو فتح مندی کی مبارکباد دیتے ہوئے یہ یقین دلایا تھا کہ ہلاکو خان کو اب مزید سرکشی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کا جواب بیبرس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

''ایک عاجز قبچاقی کا خط قبچاقیوں کے خان کے نام۔ ہلاکو خان اسلام کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے مگر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دوں گا اور کافروں کے خلاف جہاد کروں گا۔''

جب برقائی خان کا وفد بیبرس کا خط اور تحائف لے کر دالگا کے کنارے واپس گیا تو بیبرس کی سرحدی چوکیوں سے اسے خبردار کیا گیا کہ ہلاکو خان نے قراقرم واپسی کا خیال ترک کر دیا ہے اور اب وہ قط بوغا کے انتقام کی خاطر مصر پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

بیبرس نے ہلاکو خان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں، وہ تیزی سے شمالی شام کی طرف بڑھا اور وہاں کی مقامی آبادی کو اپنے ساتھ مصر لے گیا۔ مصری سرحدوں کے اس پار دریائے فرات تک کی گھاس جلا دی گئی، باغات کو کاٹ دیا گیا۔ خالی گاؤں جلا دیے گئے۔ اب اس کو یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ ہلاکو خان کی سپاہ کو شام سے مصر تک چارا نہیں مل سکے گا۔

اس نے شام کے ان قبائل کو زبردستی مصر پہنچا دیا جو منگول حملہ آوروں کی مدد میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس نے پانچ سو آرمینیوں کو مذکورہ شامی قبائل کے سامنے قتل کروا دیا اور شامی قبائل سے کہا۔ ''غیر جانبدار رہو کیونکہ اسی میں فائدہ ہے ورنہ ان آرمینیوں کی طرح تم بھی کاٹ کے رکھ دیے جاؤ گے۔''

اس تیاری کے دوران بیبرس نے برق رفتاری اختیار کر رکھی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا، ایک رات سے زیادہ قیام نہ کرتا۔ اس کا گھوڑا اس کے خیمے کے باہر تیار کھڑا رہتا تھا اور خود بیبرس انہی کپڑوں میں اپنا سفر جاری رکھتا جو ہر وقت اس کے جسم پر رہتے۔

وہ اپنے امراء اور ساتھیوں سے کہتا رہتا۔ ''اصل جنگ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ میں ہلاکو خان کو یہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا بہادروں اور اہلِ تدبیر سے خالی نہیں ہوگئی۔''

''مصر کے مملوک امراء میں سے چند ہلاکو خان کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے لیکن خود بیبرس ذرا بھی نہ گھبرایا اور بڑی پامردی اور استقلال سے ہلاکو خان کی واپسی اور حملہ آوری کے منصوبے بناتا اور توڑتا رہا۔

دوسری طرف ہلاکو خان مصر کی بربادی کے منصوبے بنانے میں مشغول تھا۔

ماخذات

تاریخ تمدنِ اسلام۔ جرجی زیدان۔ الفہرست۔ ابنِ ندیم۔ طبقاتِ ناصری۔ منہاج سراج۔ الفخری۔ ابن طباطبا۔ تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی۔ تاریخ الخلفا۔ مولانا جلال الدین سیوطی

دوسروں کے جذبات کو اپنی ملکیت سمجھنے والی حسینہ کی بے وقوفیوں کا احوال

محبت کے بعد اگر کوئی جذبہ طاقتور ہے تو وہ شاید رقابت کا ہے... جیسے محبت اندھی ہوتی ہے ایسے ہی رقابت بھی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے پھر بھلا کوئی کیسے صحیح اور غلط میں تمیز کرسکتا ہے مگر... یہ دنیا چونکا دینے والے واقعات اور قابلیت منوالینے والے انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ جسے پتھر سمجھ کر راستے سے ہٹانے کے لیے زور مارا جارہا تھا وہی پتھر اتنی گہری چوٹ دے گیا کہ تمام عمر شاید وہ گھاؤ نہ بھر سکے۔

رقابت

تنویر ریاض

وہ موسم بہار کی ایک خوب صورت صبح تھی جب این وائٹ کے خلاف مہم کا آغاز ہوا۔ وہ ان ناخوشگوار واقعات کی عادی تھی۔ اسے ہائی اسکول کا پرنسپل بنے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اگر کولیسٹن کاؤنٹی کے لوگ اس کا پچھلا روپ دیکھ لیتے تو یقیناً حیرت زدہ رہ جاتے لیکن اس روز وہ نمایاں طور پر معزز نظر آرہی تھی۔ اس نے بہت قیمتی جینز بلاؤز اور ہلکے رنگ کا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ انگلیوں کے ناخن بیضوی شکل میں ترشے ہوئے تھے اور بالوں میں بھی سیاہ چمک نظر آرہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی سیکریٹری کرسٹی کی میز کی جانب دیکھا جو عموماً اس وقت تک آجاتی تھی لیکن وہ اپنی جگہ



پر موجود نہیں تھی۔ البتہ اس کا کافی پوٹ ایک کونے میں رکھا ہوا تھا اور این کی میز کے وسط میں پیغامات کا پلندا رکھا ہوا تھا۔ اس نے سب سے اوپر رکھا ہوا کاغذ اٹھایا جس پر گزشتہ روز کی تاریخ درج تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ''تمہارے پہلے شوہر ٹام ولسن کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کل صبح دس بجے آئے گا۔''

این کا تجسس بیدار ہو گیا کیونکہ اس نام کے کسی شخص سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اتنی جلدی گھبرانے والی نہیں تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے ذہن میں مختلف مناظر گردش کرنے لگے۔ اس نے کرسی گھما کر عقب میں نصب الماری کو دیکھا۔ درمیان میں اس کی جوانی کی تصویر تھی جس میں وہ اپنے شوہر کلارک کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور کیمرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ٹریوس ہائی اسکول میں بحیثیت وائس پرنسپل این کا تقرر ہونے سے پہلے ہی کلارک کی ایک حادثے کے نتیجے میں موت واقع ہو گئی تھی۔ وہ دو سال اس حیثیت سے کام کرتی رہی پھر ڈیلیا سینڈر کی خودکشی کے بعد اسے پرنسپل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

اس کے علاوہ تین تصویریں اور بھی تھیں۔ ان میں ایک اس کی چھوٹی بہن ثریا اور دو مرحوم والدین کی تھیں۔ ان میں سے ایک اسٹوڈیو اور دوسری اس کی ماں کی سالگرہ کے موقع پر لی گئی تھی جس میں کئی موم بتیاں اور ایک کیک نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن تصویروں سے یہی لگتا تھا کہ ان کی جوڑی بہت شاندار تھی۔

این کو محسوس ہوا کہ اس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ آ گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس پیغام پر نظر ڈالی اور اس کے ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ یوں لگا جیسے کوئی اسے بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔ اسے اس ذریعے کا پتا لگانا تھا۔ این نے فی الحال اس پراسرار پیغام سے توجہ ہٹا کر اپنے روزمرہ معمولات سرانجام دینا شروع کیے۔ دیگر پیغامات عام نوعیت کے تھے۔ ان میں سے ایک کسی طالب علم کے والدین کی طرف سے تھا جو غالباً مئی میں گریجویشن کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا پیغام اسکول کی نرس نے بھیجا تھا۔ وہ این سے اس طالب علم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی جس پر اسے بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے نیو کمرز کلب کی تقریب میں تقریر کرنے کا دعوت نامہ بھی ملا تھا۔ اس کے علاوہ ایک فلاحی ادارے نے اسکول کے آڈیٹوریم کو استعمال کرنے کی اجازت بھی مانگی تھی۔ اس نے یہ سب باتیں اپنے پاس نوٹ کر لیں۔

ان معاملات سے نمٹنے کے بعد این نے ایک بار پھر اس پیغام پر نظر ڈالی جو اس کے نام نہاد پہلے شوہر کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر کلارک کو دیکھا۔ کئی برسوں سے اس کا یہی معمول تھا جب وہ کسی الجھن یا پریشانی میں مبتلا ہوتی تو کلارک کی تصویر کو دیکھنے لگتی جیسے اس سے مشورہ یا مدد مانگ رہی ہو۔

''صبح بخیر!'' کرسٹی نے دروازے میں رک کر کہا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ این کی نظریں اپنے مرحوم شوہر کی تصویر پر ہیں۔ ''میں معذرت خواہ ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری ایک اور شادی بھی ہو چکی ہے۔''

''کلارک میرا پہلا اور واحد شوہر تھا۔'' این نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ یہ ٹام ولسن کون ہے اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے، وہ کیوں میرا شوہر ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس پر نظر رکھنا ہوگی، یہ جاننے کے لیے کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔''

کرسٹی نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں پولیس کو فون نہیں کرنا چاہیے؟''

''میں اس معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتی۔'' این نے کہا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے کمزوری دکھائی تو کرسٹی اس سے لطف اندوز ہوگی۔ ''ممکن ہے کہ اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔'' این نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''گو کہ یقین سے کہنا مشکل ہے لیکن اس کا امکان ہے۔ مجھ سے ملنے کے بعد اسے احساس ہو جائے گا کہ وہ غلط عورت کے پاس آیا ہے اور معذرت کر کے چلا جائے گا۔ اس طرح یہ چھوٹا سا مسئلہ خود بخود ختم ہو سکتا ہے۔''

کرسٹی نے کہا۔ ''تم نے اس بارے میں نہیں سوچا۔ ہمیں باہر کسی سیکیورٹی گارڈ کو کھڑا کر دینا چاہیے۔''

''میرے خیال میں یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔'' این نے کہا۔ ''اس وقت پال ڈیوٹی پر ہے۔ اسے باہر ہال میں موجود رہنا چاہیے۔''

''میں پال سے کہہ دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں بھی دفتر میں موجود رہوں گی جب تک وہ ولسن نامی شخص عمارت سے باہر نہیں چلا جاتا۔''

''شکریہ کرسٹی! بہتر ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے میں تھوڑا سا کام کر لوں۔''

کرسٹی اس کا اشارہ سمجھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد این نے اپنے سیل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کوچ رابرٹ ہیلسی بول رہا تھا۔

دروازہ بند ہونے کے باوجود دوسرے کمرے میں بیٹھی کرسٹی بہ آسانی سن سکتی تھی کہ این کسی سے باتیں کر رہی ہے البتہ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ این کو اس کا تجربہ تھا۔ اس لیے وہ محتاط تھی۔

''کوچ ہیلسی!'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے کوئی احمق عورت سمجھو گے لیکن ایک شخص جو اپنے آپ کو میرا پہلا شوہر کہہ رہا ہے، وہ دس بجے اسکول پہنچنے والا ہے۔ اس نے گزشتہ روز کرسٹی کو یہ پیغام دیا تھا۔''

''بہت ہی دلچسپ خبر ہے۔'' رابرٹ نے لمحے بھر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''کیا اس نے کرسٹی کو اپنا نام بتایا تھا۔''

''اس کے کہنے کے مطابق میری شادی ٹام ولسن سے ہوئی ہے۔''

''اس وقت میری کوئی کلاس نہیں ہے۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔''

''اچھا۔'' این نے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ اب اس کی پریشانی ختم ہو چکی تھی۔ اس پراسرار شخص سے نمٹنے کے لیے رابرٹ ہی کافی تھا۔ صرف وہی واحد شخص تھا جسے این کے ماضی کے بارے میں معلومات تھیں۔ این کا اصلی نام ٹویلا برن سائیڈ تھا۔ اسے ایک تربیتی کورس کے دوران ہونے والے خوفناک حادثے کے بعد جبری ریٹائر ہونا پڑا تھا۔ اس نے اپنا نام تبدیل کیا اور ٹریوس ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی کیونکہ اس کا امکان بہت کم تھا کہ نارتھ کیرولینا میں کوئی اسے پہچان سکے۔ اس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے کے نقوش تبدیل کر لیے تھے۔ اسی طرح بالوں کا رنگ اور اسٹائل بھی پہلے سے مختلف تھا۔

صرف ایک ماہ بعد ہی اسے نیا کام اچھا لگنے لگا۔ اس نے ٹریوس ہائی اسکول کی بہتری کے لیے کئی اقدامات کیے اور اس کے اسکول کا شمار ریاست کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہونے لگا۔ البتہ اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اسکول کی پرنسپل ڈیلیا سینڈرز تھی۔ اس نے این کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا، اس کے علاوہ وہ ایک شادی شدہ ٹیچر میں بھی دلچسپی لے رہی تھی جس کا اثر اسکول کی ساکھ پر پڑ رہا تھا پھر نہ جانے اس کی ذاتی زندگی میں کیسا موڑ آیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔

این نے بڑی مہارت سے اسکول کا انتظام چلایا۔ وہ اصولوں پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔ خاص کر ڈسپلن کے معاملے میں اس کا رویہ بہت سخت تھا۔ اس وقت بھی وہ دس بجنے میں دس منٹ تک کام کرتی رہی پھر اس نے الماری کی مقفل دراز کھول کر پستول نکالا اور اسے اپنی میز کی اوپر والی دراز میں رکھ دیا۔ نو بج کر پچپن منٹ پر اس نے دوسری دراز میں رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور دراز کو تھوڑا سا کھلا رکھا۔

ٹھیک دس بجے کرسٹی نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''ٹام ولسن تم سے ملنے آیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا تاکہ این کا مبینہ سابق شوہر اندر آسکے۔ این یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھی کہ اس کا پہلا شوہر صورت شکل کے لحاظ سے کیسا ہے لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا قد تقریباً این کے برابر یعنی پانچ فٹ آٹھ انچ اور بالوں کا رنگ سرخی مائل زرد تھا۔ اس نے سیاہ شیشوں والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ این نے اس شخص کو پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کرسٹی نے دروازہ بند کرتے وقت این کو اس طرح دیکھا جیسے یقین دلا رہی ہو کہ سیکورٹی گارڈ باہر موجود ہے۔ اپنے آپ کو ٹام ولسن کہنے والا شخص اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''این! تم بالکل نہیں بدلی ہو۔''

این نے کہا۔ ''میری صرف ایک مرتبہ شادی ہوئی ہے اور تم میرے شوہر نہیں ہو۔''

''تم مکمل طور پر انکار کر رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو بہت بری بات ہے۔''

''تم مجھ سے شادی کرنے کا دعویٰ کیوں کر رہے ہو؟''

''واقعی یہ ملین ڈالر کا سوال ہے، شاید میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ عمر بڑھنے کے بعد تم کیسی لگتی ہو۔ میں نے جھوٹ کہا تھا کہ تمہارے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔''

این نے سر ہلایا اور سوچنے لگی کہ اس شخص سے کیسے نمٹا جائے۔

''شاید تم سوچ رہی ہو کہ میں کتنا بداخلاق ہوں۔'' ٹام ولسن نے کہا۔ ''اور تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔''

این نے کہا۔ ''تم سے کس نے یہاں آنے کے لیے کہا تھا؟''

''تمہیں پتا چل جائے گا۔'' ولسن نے کہا۔ ''میں نے کچھ دوست بنائے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ تم کون ہو۔''

یہ اس کا اصلی چہرہ تھا۔ اس شخص نے اپنے اوپر ایک ملمع چڑھایا ہوا تھا اور ذہنی طور پر منتشر نظر آرہا تھا۔ وہ اپنے

اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ولسن کرسی سے اٹھا اور مزید کوئی لفظ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

''میں نے اس کی کچھ صاف تصویریں لی ہیں۔'' رابرٹ نے اس کے ساتھ میدان میں چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ جب بھی موسم اجازت دیتا تو پرنسپل اور باسکٹ بال کوچ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ لنچ کے وقفے میں اسکول کے میدان میں ضرور چہل قدمی کیا کرتے۔

''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟''

رابرٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، وہ کرائے کی کار پر آیا تھا اور مقامی معلوم نہیں ہوتا۔''

این نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس واقعے کا تعلق اس کی سابقہ زندگی سے تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی اس کی نئی شناخت سے پردہ ہٹانا چاہ رہا ہو۔

''تم اب بھی ڈیوڈ انگولا سے رابطے میں ہو؟'' اس نے رابرٹ سے پوچھا۔ انگولا، این کے مشی گن ٹریننگ اسکول میں رابرٹ کا انسٹرکٹر رہ چکا تھا اور جب رابرٹ اپنی غلطیوں کی وجہ سے ملازمت سے نکالا گیا تو اسی نے اسے این کے پاس بھیجا تھا۔

رابرٹ نے کہا۔ ''میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ اس شخص کو جانتا ہے؟''

این نے مطمئن انداز میں رابرٹ کو دیکھا۔ اسے اس شخص پر پورا بھروسا تھا۔ رابرٹ بولا۔ ''کیا تم چاہتی ہو کہ میں ولسن پر نظر رکھوں؟''

''بہت زیادہ۔'' اس کے لہجے میں شدت تھی جسے محسوس کر کے وہ خود بھی حیران ہو گئی۔ ''میں اس کا مقصد نہیں سمجھ سکی۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ رقم، جنسی تعلق یا پھر کوئی اعتراف۔ وہ مکمل طور پر غیر متوازن لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے این کہہ کر پکارا۔ اسے کون بھیج سکتا ہے؟''

رابرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے خاموشی سے اپنی چہل قدمی جاری رکھی۔

''یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے جھٹکا دینے آیا ہے۔'' این نے کہا۔

''اس نے میری توقع سے بڑھ کر اچھا کام کیا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''تمہیں بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے تھا۔''

ممکن تھا کہ این کو غصہ آ جاتا لیکن وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' این بولی۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ کیا وہ واقعی اس شہر میں کہیں ٹھہرا ہوا ہے؟''

''میں اپنے ایک جاننے والے سراغ رساں سے کہوں گا کہ وہ سارے موٹیل چیک کرے اور میں خود بھی اس کی رہائش کا پتا چلانے کی کوشش کروں گا لیکن جب تک ہمیں اس کے بارے میں مزید معلومات نہیں مل جاتیں، میں اس کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا۔''

اگر وہ دونوں تنہا ہوتے تو این اس کا بوسہ لے لیتی لیکن وہ لوگوں کے سامنے محتاط رہتے تھے۔ این نے کبھی اس سے محبت کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ صرف اس کا دوست تھا اور ان کا ایک مشترکہ مقصد تھا البتہ ان کے درمیان جسمانی تعلقات تھے۔

سہ پہر میں این نے اسکول نرس سے ملاقات کی۔ جب وہ لینی ڈیل کے بارے میں گفتگو کر چکیں تو این نے اس سے کہا۔ ''میں تم سے ایک معاملے میں مشورہ لینا چاہتی ہوں۔'' درمیانی دروازہ کھلا ہوا تھا کیونکہ این چاہتی تھی کہ کرسٹی بھی یہ گفتگو سن لے۔

''بالکل۔'' لوئیس نے جواب دیا۔ وہ کچھ حیران نظر آ رہی تھی۔ اب تک این کے بارے میں اس کی رائے غیر جانبدارانہ تھی اور این کو یہ بات معلوم تھی۔

''میں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا جو کل یہاں آیا تھا اور اس نے میرا پہلا شوہر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔''

''یہ بڑی عجیب بات ہے۔'' لوئیس نے آہستگی سے کہا۔ ''تم اسے بالکل نہیں جانتیں۔''

''میری صرف ایک بار شادی ہوئی تھی۔'' این نے کہا۔ ''کلارک کے مرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ شادی نہیں کروں گی۔''

لوئیس نے تائید میں سر ہلا دیا، حالانکہ پورا اسکول جانتا تھا کہ کوچ ہیلسی اور این اکثر و بیشتر ایک ساتھ گھومتے جاتے تھے۔

''اب یہ شخص آن ٹپکا ہے اور عجیب و غریب دعویٰ کر رہا ہے۔ اس کی گفتگو بھی غیر معقول تھی۔'' این اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں یقین کر لوں کہ یہ شخص مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا؟ میں پولیس کو فون کرنا نہیں چاہتی کیونکہ وہ تھوڑا سا کھسکا ہوا لگتا ہے۔''

''خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔'' لوئیس نے بے رخی سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میرے بجائے تمہیں کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیے۔ میں تو محض ایک اسکول نرس ہوں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' این نے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے کہ تم مخبوط الحواس طالب علموں کے ساتھ کتنی اچھی طرح پیش آتی ہو۔''

''شکریہ۔'' لوئیس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اس شخص کو اسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، تم... کہتی ہو کہ اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''کبھی نہیں۔ میں بالکل نہیں جانتی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ ممکن ہے کہ میں دوبارہ اس سے کچھ نہ سنوں۔''

''مجھے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔'' لوئیس نے کہا۔ ''لیکن میں اس پر بھروسا نہیں کرسکتی۔''

''میں مطمئن ہوں کہ گھر پر ایک معقول سیکیورٹی سسٹم موجود ہے۔'' این نے کہا۔

نرس نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور چلی گئی۔ بقیہ دن خاموشی سے گزر گیا۔ اس شام رابرٹ یہ بتانے کے لیے این کے گھر آیا کہ ڈیوڈ انگولا سے اس نے کیا سنا ہے۔ اس کے عملے کے کسی فرد نے وہ تصویر نہیں پہچانی جو البرٹ نے کھینچی تھی۔ اس نے این کو بتایا۔ ''لیکن میرے سراغ رساں کا کہنا ہے کہ ٹام ولسن بیسٹ ویسٹرن میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ اس کی عدم موجودگی میں کمرے میں داخل ہوا اور اس کی تمام چیزوں کی تصویریں لے لیں۔''

رابرٹ اور این وہ تصویریں دیکھنے لگے۔ رابرٹ کے پاس ایک دوسرا لیپ ٹاپ اور دوسرے نام سے ایک اکاؤنٹ تھا جس میں ایسی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ وہ اپنے کام والے لیپ ٹاپ کو اس کے لیے استعمال نہیں کرتا تھا۔ پہلی تصویر اس کار کی تھی جو ولسن نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ پرائیویٹ سراغ رساں نے کمرے میں جا کر اس کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں رکھی ہوئی چیزوں کی بھی تصویریں بنالیں۔ اس کے کپڑے اوسط درجے کے تھے جن میں خاکی پتلونیں، چیک کی قمیصیں، باکسروں کے پہننے والے جوتے وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مقامی برانڈ کی تھیں اور بہ آسانی شاپنگ سینٹرز میں دستیاب تھیں۔ بہرحال رابرٹ اور این نے اپنے اطمینان کے لیے محدب عدسے سے ان تصویروں کا معائنہ کیا۔

سب سے پہلی دلچسپ بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ولسن کے پاس این کی توقع سے زیادہ رقم تھی۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی۔ وہ اپنے اے ٹی ایم سے بھی پیسے نکال سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی سلپ نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ کسی نے اسے یہ رقم دی ہو۔ سراغ رساں نے ولسن کی شیونگ کٹ میں رکھے ہوئے سامان کی بھی تصویریں لی تھیں۔ ان میں ڈسپوزیبل ریزر، شیونگ کریم، کنگھا، ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک پلاسٹک کے ڈبے میں کچھ دوائیں بھی تھیں۔ اس نے ان دواؤں کی علیحدہ تصویر بھی لی تھی جس میں ان کا نام واضح طور پر پڑھا جارہا تھا۔ اس دوا کا نام رہی رائیڈون تھا۔

''یہ تو شیزوفرینیا کے مریضوں کو دی جاتی ہے۔ اس میں مریض کی شخصیت بے ربط اور منتشر ہوجاتی ہے اور اسے طویل عرصے تک اسپتال میں رہنا پڑتا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اگر ولسن اتنا ہی بیمار ہے تو اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑا ہے جو نتائج سے بے پروا ہے۔''

دوسرے دن... این لنچ کے وقفے میں اپنے دفتر کے باہر ہال میں کھڑی ہوئی تھی۔ جونہی گھنٹی بجی، بڑی کلاسوں کے طالب علم کمروں سے نکل کر کیفے ٹیریا کی جانب جانے لگے۔ نویں، دسویں اور گیارھویں جماعت کے طلبہ نے مقررہ وقت میں لنچ ختم کیا اور اپنی کلاسوں کی طرف واپس آنے لگے۔ این کی موجودگی کی وجہ سے وہ خاموشی سے گزرتے چلے گئے۔ ویسے بھی وہ ان میں سے زیادہ تر کو ناموں سے پہچانتی تھی۔ جب میں بال کے دو کھلاڑی اس کے قریب آئے تو اس نے ان کا نام لے کر کہا۔ ''فرینک...... مارٹی! میں سہ پہر میں تمہارا میچ دیکھنے آؤں گی۔''

''ہم جیتیں گے۔'' فرینک نے اعتماد سے کہا۔

این کی پشت بیرونی دروازے کی طرف تھی اور وہ مارٹی کی باتیں سن رہی تھی اس لیے اسے ٹام ولسن کی آمد کا پتا نہیں چلا۔ وہ میٹل ڈیٹیکٹر سے گزر کر آیا تھا لیکن بیپ کی آواز نہیں سنائی دی۔ گویا وہ غیر مسلح تھا لیکن ان لڑکوں کے خوف زدہ چہروں نے اسے چوکنا کردیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ولسن چند قدم دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر این پر حملہ کردیا۔ وہ جوابی وار کرکے اس کے کندھے یا بازو کو نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن وہ لڑکھڑا گئی کیونکہ وہ باکسر نہیں بلکہ اسکول پرنسپل تھی۔ وہ پشت کے بل زمین پر گری اور کچھ دیر سانس روکے ششدر پڑی رہی۔ اسے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہورہی تھی کہ فرینک اور مارٹی پہاڑ بن کر ولسن پر ٹوٹ پڑے تھے لیکن وہ مسکرا نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کے ہونٹ

سے خون بہہ رہا تھا۔

اسکول والوں کے خیال میں یہ ایک رومانی منظر تھا کہ این کو اس کے اپنے طالب علموں نے بچایا جس سے این کی مقبولیت ظاہر ہوئی تھی۔ کوچ ہیلسی بھی اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت تک پولیس کو کئی فون ہو چکے تھے۔ این ہوش میں تھی اور اٹھنا چاہ رہی تھی لیکن نرس لوئیس کا اصرار تھا کہ اسے طبی عملے کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پولیس کے آنے تک طلبہ نے ٹام ولسن کو قابو کیے رکھا اور وہ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

اس رات رابرٹ نے این سے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس کی شوٹنگ کٹ میں جو دوا رکھی ہوئی تھی وہ محض ایک دکھاوا ہے لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ اسے واقعی اس دوا کی ضرورت ہے۔''

این کے چہرے پر زخم آئے تھے اور ہونٹ بھی سوج گیا تھا لیکن ولسن یہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرح ضرب لگاتا ہے کیونکہ اس کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی اور نہ ہی فریکچر ہوا۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور اس کے آگے سے ہٹ گئی۔

''اب تو تم سب لوگوں کی پسندیدہ شخصیت بن گئی ہو۔'' رابرٹ نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ اسکول کی انتظامیہ اس بارے میں سوالات کرے گی۔'' این نے کہا۔ ''وہ یقیناً حیران ہوں گے کہ جب میں شادی شدہ ہونے کی تردید کر چکی ہوں تو یہ پہلا شوہر میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔ وہ یقیناً سوچیں گے کہ اس معاملے میں میرا بھی کوئی کردار ہے اور وہ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ولسن سچ بول رہا ہے۔''

حقیقت بھی یہی تھی۔ بڑی تیزی سے افواہیں کولیسٹن کاؤنٹی میں پھیلنے لگیں۔ جن لوگوں نے کبھی این کا نام بھی نہیں سنا تھا، اب وہ اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ بہت جلد این کو احساس ہو گیا کہ وہ سخت خطرے میں ہے۔ لوگوں کی ہمدردی اب تجسس میں بدل گئی تھی اور انہیں گپ لگانے کے لیے ایک موضوع مل گیا تھا۔

''کون ایسا کرنا چاہے گا؟'' این نے رابرٹ سے کہا۔ ''وہ کون ہے جسے میرا اصلی نام معلوم نہیں۔ اس کے باوجود وہ مجھے بے عزت کرنا یا مردہ دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اگر ولسن گن لے کر آتا تو میں خون میں لت پت فرش پر پڑی ہوئی ہوتی۔ اسے میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہیں سے میرا نشانہ لے سکتا تھا۔''

''واقعی اگر اسے تمہارا اصلی نام معلوم ہوتا تو وہ اب تک اپنی زبان پر لے آتا۔'' رابرٹ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہیں نہیں جانتا اور اسے کوئی استعمال کر رہا ہے۔ اس کے پاس سے ملنے والی رقم سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی نے اسے اس کام کے لیے معاوضہ دیا ہے لیکن وہ کون ہے جو تم سے اتنا ناراض ہے اور خوفزدہ کرنا چاہ رہا ہے۔''

''ڈیلیا نے خودکشی کی تھی۔'' این نے کہا۔ ''اور بھی کسی نے اس بارے میں کوئی مختلف بات نہیں کی۔ اس لیے وہ معاملہ تو ختم ہو گیا۔ اسی طرح ہم نے اس لڑکی سارہ ٹوتھ کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ تمہارے باسکٹ بال کے کھلاڑی کی کیا صورتِ حال ہے؟''

رابرٹ کیبنٹ سے پلیٹیں نکالتے ہوئے بولا۔ ''آخری بار جب میری اس کے والدین سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ اس کی تیاریوں سے مطمئن نظر آرہے تھے۔''

''اس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ پھر کون ہو سکتا ہے؟''

''ہمیں دیکھنا ہو گا کہ پولیس ٹام ولسن کے بارے میں کیا کہتی ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

رات گئے دو سراغ رساں این کے گھر آئے۔ انہوں نے ہی فون کر کے انہیں بلایا تھا۔ ''میں نے تمہیں میچوں میں دیکھا ہے۔'' نیڈرا کروبی بولی۔ ''ہم اب بھی کبھی کبھار میچ دیکھنے جاتے ہیں۔ میرا شوہر فٹ بال کا کھلاڑی تھا اور میں اسکول کے زمانے میں سوفٹ بال کھیلا کرتی تھی۔''

دوسرا سراغ رساں لی لینڈ اسٹراڈ سیاہ فام، مضبوط جسم اور خاموش طبیعت تھا۔ این نے انہیں چائے یا مشروب کی پیشکش کی لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ ٹام ولسن کون ہے؟''

''ہاں۔'' نیڈرا نے کہا۔ ''ہم نے انگلیوں کے نشانات سے اس کا ریکارڈ حاصل کر لیا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنی ذہنی بیماری کی وجہ سے مشکلات میں پڑ چکا ہے۔ وہ حال ہی میں جنوبی کیرولینا کے ایک دماغی اسپتال سے ڈسچارج ہوا تھا اور ایک ہفتہ قبل گھر والوں نے اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے۔ اس لیے اسے کرائے پر کار اور موٹیل میں کمرا لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے پاس کچھ رقم اور ایک پری پیڈ ویزا گفٹ کارڈ بھی تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے یہ کہاں سے حاصل کیا۔ اس کے گھر والوں نے اسے رقم

دینے کی تردید کی ہے۔''

''پھر وہ یہاں کیوں آیا؟'' این نے پوچھا۔ ''اور اس نے مجھ کو ہی نشانہ کیوں بنایا؟''

نیڈرا کروسبی بولی۔ ''ہم خود بھی حیران ہیں۔ تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اس سے پہلے ٹام ولسن کو کبھی نہیں دیکھا؟'' اس کے لہجے میں شک جھلک رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' این نے کہا۔ رابرٹ نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

''ہمیں اس کی کار سے کچھ کاغذات ملے ہیں۔'' کروسبی نے کہا۔ ''ان میں تمہارے دستخط شدہ کچھ ذاتی خطوط بھی ہیں۔''

این اپنی حیرت نہ چھپا سکی اور بے ساختہ بولی۔ ''نہیں، وہ خطوط میرے نہیں ہو سکتے۔'' وہ کبھی کسی کو اس لیے خط نہیں لکھتی تھی کہ انہیں سنبھال کر رکھا جائے۔

کروسبی سوچتے ہوئے بولی۔ ''ہم تمہیں ان کی نقول دکھائیں گے پھر تم اپنی رائے دے سکتی ہو۔ کیا ہمیں تمہاری تحریر کے چند نمونے مل سکتے ہیں؟''

این سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مل جائیں گے۔''

کروسبی نے اسٹراوڈ کی طرف دیکھا۔ وہ پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم سے یہ سوال پوچھنا حماقت ہوگی لیکن تم نے کبھی یہ سوچا کہ تمہارا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے؟''

این قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''کاش یہ احمقانہ سوال ہی ہوتا۔ پرنسپل کے تو کئی دشمن ہو سکتے ہیں۔ پہلے والدین اسکول کی انتظامیہ کا ساتھ دیتے تھے لیکن اب وہ اپنے بچوں کی حمایت کرتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ بچہ کتنا احمق یا بدتمیز ہے۔ یہ محبت کرنے کا نیا انداز ہے لہٰذا ایسے والدین ہیں جو مجھے بالکل پسند نہیں کرتے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ میری گاڑی کا ٹائر پنکچر کر سکتے ہیں یا میرے خلاف مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ ان سے اس حرکت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

''ذاتی محرک کے بغیر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔'' اسٹراوڈ نے کہا۔ ''کوئی ایسا شخص جسے تم نے ٹھکرا دیا ہو؟''

این نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر ایسا کوئی ہے تو میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔''

''یہ ساری صورت حال خاصی الجھا دینے والی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ تمہیں اس کی وجہ بھی معلوم نہیں۔'' سراغ رساں کروسبی نے کہا۔ ''براہ کرم تم اپنی یادداشت پر زور ڈالو اور اگر کوئی بات تمہارے ذہن میں آتی ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''میری یادداشت.....'' این دہراتے ہوئے بولی۔

''مجھے امید ہے کہ تم وہ خطوط اپنے ساتھ لائی ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں گئی اور دو کاغذ لے کر آئی۔ ان میں ایک سامان کی فہرست تھی اور دوسرے پر وہ کام لکھے ہوئے تھے جو اسے کرنا تھے۔

کروسبی نے ایک فائل کھول کر ان خطوط کی نقول این کے حوالے کیں۔ این اور رابرٹ نے بیک وقت انہیں پڑھنا شروع کیا۔ پہلے خط کی عبارت کچھ یوں تھی۔

''ٹام! میں ہر روز تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔ مجھے واقعی اس علیحدگی پر پچھتاوا ہو رہا ہے۔ تم مجھ سے ملو تاکہ ہم اس پر بات کر سکیں۔ ممکن ہے کہ تمہارے آنے تک میرا ذہن بدل جائے لیکن میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھ سے فوراً ملو۔'' تینوں خطوط کی ایک جیسی عبارت تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مجھے تنگ کیا ہے۔'' این بولی۔ ''تینوں خطوط میں ایک ہی بات لکھی ہوئی ہے کہ میرے پاس آؤ۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں قبول یا مسترد کردوں۔'' وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بے چارہ ...... لیکن تم نے دیکھا کہ کم از کم ان خطوط کی ہینڈ رائٹنگ مجھ سے مختلف ہے۔''

اگلے روز این کو سیاہ پھولوں کا ایک بوکے ملا۔ جب گل فروش نے اسے کرسٹی کی میز پر رکھا تو اس نے انٹرکام پر این کو اطلاع دی۔ وہ باہر آئی اور دیکھا کہ تمام پھولوں کو سیاہ رنگ دیا گیا تھا اور انہیں سیاہ ربن سے ہی باندھا گیا تھا۔

''یہ کس نے بھیجا ہے؟'' این نے اس عورت سے پوچھا جو بوکے لے کر آئی تھی۔

''ہمیں انٹرنیٹ پر آرڈر موصول ہوا تھا اور اس کی ادائیگی بھی آن لائن ہوگئی ہے۔'' اس عورت نے جواب دیا۔ ''کیا تم اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟''

''اس نے اپنا کوئی کارڈ نہیں دیا؟'' کرسٹی نے پوچھا۔

''ہم نے کہا تھا لیکن وہ کوئی رسید نہیں چاہتی۔''

''کیا وہ کوئی عورت ہے؟''

''ہاں۔ اس نے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی عورت ہے۔''

این نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ بوکے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد اسے معلوم ہوگیا کہ اس میں کوئی خفیہ مائیکروفون نہیں اور نہ ہی کوئی پیغام بھیجا گیا تھا۔

اس سے اگلے روز ایک نوجوان شخص پولیس کی وردی میں ملبوس اس کے دفتر آیا اور این سے بات کرنے کی خواہش کی۔ اس کے پاس ایک سی ڈی پلیئر تھا لیکن کرسٹی نے اس پر توجہ نہیں دی اور این کو اس کے کمرے سے باہر بلالیا۔ اس پولیس والے نے سی ڈی پلیئر آن کرکے اس پر ناچنا شروع کردیا۔ این نے اسے ڈانٹ کر خاموش کروایا اور کہا کہ وہ اصلی پولیس کے آنے تک چپ چاپ بیٹھا رہے۔

سراغ رساں کروسبی پندرہ منٹ میں پہنچ گئی۔ اس دوران این یہ معلوم کرچکی تھی کہ وہ نوجوان شخص اسٹیج آرٹسٹ ریندی روڈمین تھا اور اس کی اپنی ایک ویب سائٹ بھی تھی لیکن پہلے کبھی اسے ایسا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ کروسبی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہم اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی کا وارنٹ لے سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ جج اس پر تیار ہوگا یا نہیں۔ بہرحال کسی فنکار کو تمہارے دفتر بھیجنا کوئی سنگین جرم نہیں۔ روڈمین کا کہنا ہے کہ کسی نے اس کے میل باکس میں ایک لفافہ اور کچھ نقد رقم ڈال دی تھی۔ لفافے میں ایک خط تھا جس میں تمہارا نام، وقت اور جگہ درج تھی جہاں اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس نے سمجھا کہ شاید یہ تمہاری سالگرہ کی خوشی میں ہے۔ میں اس کے اپارٹمنٹ کی عمارت چیک کروں گی۔ شاید وہاں لگے ہوئے سیکیورٹی کیمروں سے پتا چل جائے کہ کس شخص نے اس میل باکس میں وہ لفافہ ڈالا تھا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ٹام ولسن دوبارہ جنوبی کیرولینا کے دماغی اسپتال میں داخل ہوگیا ہے۔ اس کی ماں اسے بغرضِ علاج وہاں لے گئی تھی۔''

اگلے دو دنوں میں این نے محسوس کیا کہ جب وہ طالب علموں کے پاس سے گزرتی ہے تو وہ اسے دیکھ کر زیرلب مسکراتے اور کچھ قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ یہ واضح ہوگیا تھا کہ ان پے درپے واقعات کا مقصد اسے تضحیک کا نشانہ بنانا تھا۔ این کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوا کہ لوگ اسے ناپسند کریں یا نفرت کرنے لگیں لیکن یہ صورتِ حال اس کے لیے نہ صرف تکلیف دہ تھی بلکہ اس سے اس کی ملازمت بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ خاص طور پر جب اس کے سپرنٹنڈنٹ نے فون کرکے اس بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے آپ پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔

''میں خود نہیں سمجھ سکی کہ یہ سب کیا ہورہا ہے تاہم مجھے پوری امید ہے کہ یہ مذاق بہت جلد ختم ہوجائے گا۔''

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری صبح جب وہ اسکول پہنچی تو مرکزی دروازے پر ایک بینر لٹکا ہوا تھا جس پر یہ عبارت درج تھی۔ ''این! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ایلیو۔''

این نے چوکیدار کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ وقت پر آگیا تھا۔ دس منٹ بعد اس نے وہ بینر اتار کر کوڑا جلانے کی بھٹی میں پھینک دیا لیکن اس سے پہلے کچھ طالب علموں نے اس کی تصویریں اتار کر چالیس کے قریب دوستوں کو بھیج دیں۔ این نے فوراً ہی سیکیورٹی کیمرے کی فوٹیج دیکھی۔ اس میں کوئی شخص سوئٹر پینٹ اور ہڈ میں ملبوس سیڑھی پر چڑھا ہوا بینر لگا رہا تھا۔ اس نے ایک اونی کنٹوپ کی مدد سے اپنا چہرہ اور سر چھپا رکھا تھا۔

''یہ جاننا ممکن نہیں کہ یہ مرد ہے یا عورت۔'' این نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

رابرٹ نے وہ فوٹیج دوبارہ دیکھی اور بولا۔ ''جس انداز سے وہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ کوئی عورت ہے۔''

''اب یہ سلسلہ ختم ہوجانا چاہیے۔'' این نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' رابرٹ بھی این کی طرح سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ کون تمہیں بدنام کرنا چاہ رہا ہے۔''

لیکن وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس مسئلے پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ بیس بال کا سیزن شروع ہوچکا تھا اور وہ شام تک بلکہ اختتامِ ہفتہ بھی اس میں مصروف رہتا۔ این اپنا فارغ وقت صفائی ستھرائی میں گزار رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔ اس کے خلاف چلائی جانے والی مہم بالکل ذاتی نوعیت کی تھی۔ این نے اس بارے میں سوچنے کی کوشش کی کہ شاید کسی کو اس سے کوئی شکایت ہو یا پھر کوئی اتنے غصے میں ہے کہ اسے بدنام کرنے کے لیے اپنا وقت اور پیسا خرچ کررہا ہے۔

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے۔ اگر وہ اپنی سوچ کا دائرہ وسیع کرکے ان لوگوں کو اس میں شامل کرتی جو اس کی گزشتہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے تو ان کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ یہ مہم این کے خلاف تھی اور گزشتہ زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اچانک اس کے دماغ میں ایک مبہم خیال آیا۔ وہ اپنی وارڈ روب کی صفائی کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ممکن ہے اس کا کوئی تعلق رابرٹ سے ہو۔ وہ صرف اسکول کی پرنسپل ہی نہیں بلکہ رابرٹ کی گرل فرینڈ بھی تھی۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ کر اس خیال پر غور کرنے لگی۔ اس کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ درست انداز میں سوچ رہی ہے۔

رابرٹ نے این کے آنے کے ایک سال بعد اسکول میں ملازمت اختیار کی تھی۔ اس سے پہلے وہ کیا کرتا رہا، اس بارے میں این کو کچھ معلوم نہیں تھا بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ این کا دوست بننے سے پہلے اس کی زندگی میں کتنی عورتیں آچکی تھیں اور نہ ہی اس نے کبھی اس بارے میں سوچا تھا لیکن اب این کے دل میں کھدبد ہو رہی تھی اور اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہو گیا تھا۔

رابرٹ سہ پہر میں طویل پریکٹس کرنے کے بعد تھکا ہوا تھا لیکن این نے اصرار کیا کہ وہ گھر جانے سے پہلے رات کا کھانا اس کے ساتھ کھائے۔ اس نے خاص طور پر اس کے لیے لیمن چکن اور چاول بنائے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور جب وہ اپنی پلیٹ صاف کرنے کے بعد اٹھنے لگا تو این بولی۔

''ان واقعات کے بارے میں آج میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔''

''وہ کیا؟'' رابرٹ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''وہ کون ہے جو تمہارے دور ہو جانے پر ناراض ہو سکتی ہے؟'' این نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اوہ!'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم سے ملنے سے قبل میرا کسی اور کے ساتھ تعلق تھا؟''

یہ کہہ کر وہ سوچ میں پڑ گیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''کیری ایمروز۔ وہ طلاق یافتہ بیالوجی کی ٹیچر تھی اور نرس لوئیس۔''

''اس کے علاوہ؟'' اس نے پُرسکون رہتے ہوئے پوچھا۔

''ماریا ٹیٹ......'' اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا جسے این نہ دیکھ سکی۔

''ان تین عورتوں کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''صرف جسمانی تعلق۔''

این جانتی تھی کہ لوئیس ان تینوں میں بہترین ہے اور اگر وہ اس کے خلاف کوئی منصوبہ بنا رہی ہے تو وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ گہری تھی لیکن وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس لیے اس کی جانب سے اس کا امکان تھا۔ کیری ایمروز کافی عرصے سے ایک مرد کے ساتھ ملاقاتیں کر رہی تھی۔ ماریا ٹیٹ باسکٹ بال کی کھلاڑی تھی اور این کو اس کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا۔ ماریا کی ٹیم اکثر و بیشتر جیتتی رہتی تھی اور اس کے والدین مطمئن دکھائی دیتے تھے۔

''اس فوٹیج میں جو عورت نظر آرہی ہے، وہ ماریا یا لوئیس ہو سکتی ہے۔'' این نے کہا۔ ''کیری کے مقابلے میں یہ دونوں اس عورت سے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ جس کسی نے سیڑھی لگایا، اس نے سیڑھی کا استعمال بھی کیا ہوگا۔ کیری کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ تم مجھے ماریا اور لوئیس کے بارے میں بتاؤ۔''

''تم ماریا یا لوئیس کے بارے میں بہت حساس ہو رہی ہو۔'' رابرٹ نے کہا۔

این بولی۔ ''ہاں۔ میں یہ فرض کر رہی ہوں کہ تم نے کسی وجہ سے ان کے ساتھ جنسی تعلقات ختم کیے۔''

رابرٹ نے مسکرانے کی کوشش کی اور بولا۔ ''لوئیس بہت تیز ہے اور اس کی حس مزاح بھی بہت اچھی ہے لیکن اسے جس شخص کی تلاش تھی وہ میں نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی یہ بات جانتی تھی۔ اس نے مجھے فون کرنا چھوڑ دیا جبکہ ماریا پُرجوش اور جذباتی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے ناموں کے بارے میں بھی سوچنے لگی تھی۔ اس نے صرف دو ملاقاتوں کے بعد ہی میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔''

این نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بولی۔ ''گویا لوئیس اور ماریا کے زیادہ امکانات ہیں لیکن مجھے کیری ایمروز کو بھی چیک کرنا ہوگا۔ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے بدنام کرنا چاہتی ہے۔ بظاہر وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ میں نے تمہیں اس سے چھین لیا ہے۔''

رابرٹ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہتر جانتی ہوں گی۔''

''وہ جو کوئی بھی ہے۔ ہمیں اس کو روکنا ہوگا۔'' این نے کہا۔ ''کیونکہ سپرنٹنڈنٹ چبھتے ہوئے سوالات کر رہا ہے۔ ٹیچر اور بچے مجھے دیکھ کر قہقہے لگانے لگے ہیں۔ اپنی حیثیت کو دوبارہ بنانے کے لیے مجھے کافی وقت درکار ہوگا۔''

''اگر ہم اسے بے نقاب کر دیں تو تمہاری پوزیشن صاف ہو جائے گی۔'' رابرٹ نے کہا۔

"اس سے تو یہی ظاہر ہوگا کہ پرنسپل، کوچ اور اسکول کی ایک اور ملازمہ کے درمیان محبت کی تکون بن گئی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔"

"اس معاملے کو روکنا ہوگا اور کسی نہ کسی طرح اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم ہی واحد فرد نہ ہو جس کو وہ رسوا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔"

"اس طرح بات دب جائے گی۔" این نے آہستہ سے کہا۔ "اور مجھ پر سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی۔"

"پھر ہمارا انتخاب کون ہے؟"

"ہمیں کسی مرد کو بیچ میں لانا ہوگا۔" این نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "روز منٹگمری کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مڈل اسکول کا پرنسپل۔"

"بالکل مناسب رہے گا۔" رابرٹ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کس طرح تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ تمہیں تو میری معروفیت کا علم ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" این نے پرسکون انداز میں کہا۔ "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

روز منٹگمری پندرہ سال سے مڈل اسکول کا پرنسپل تھا اور اس کا وہیں مرنے کا پروگرام تھا۔ زیادہ کام اس کا اسسٹنٹ کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی سیکریٹری کو ڈانٹ ڈپٹ کر کام نکلواتا اور اس کے طالب علم بھی اتنے برے نہیں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر چھوٹی عمر کے تھے جن سے کسی بڑی شرارت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

روز...... بدھ کی صبح اپنی گاڑی میں پارکنگ لاٹ پہنچا اور جیسے ہی وہ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا، اس نے دیکھا کہ طلبہ اوپر کی جانب اشارے کر رہے ہیں۔ وہ کھمبوں کے درمیان ایک سفید رنگ کا بینر لٹک رہا تھا جس پر نیلے رنگ سے لکھا تھا۔ "روز گدھوں سے ڈیٹنگ کرتا ہے۔"

روز نے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر این پر قہقہے لگائے تھے اور اب وہ خود مذاق کا نشانہ بن گیا تھا۔ گو کہ اسکول کے بچوں کو سیل فون رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن چند ایک کے پاس فون تھے۔ اس سے پہلے کہ روز انہیں ضبط کرتا کم از کم تین بچوں نے اس بینر کی تصویریں اتار کر آگے بھیج دیں۔ اب یہ بات چھپ نہیں سکتی تھی۔

آنے والے ہفتے میں روز منٹگمری کو پچاس پونڈ والے دس کھاد کے بیگ موصول ہوئے جنہیں اس کے احتجاج کے باوجود اسکول کے میدان میں رکھ دیا گیا۔ اسی طرح وہ کلین ٹائیگر نامی فٹ بال ٹیم کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ جب پیر کی صبح بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے والے صحن میں درختوں پر ہر قسم اور سائز کے گتے کے شیر لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اس کے بیرونی دروازے پر بھی چسپاں کر دیا گیا تھا۔

روز نے اگلے روز این کو فون کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے اظہار ہمدردی کرے گی۔ وہ بھول گیا کہ اس نے این کے پہلے شوہر کی آمد، بوکے، اسکول کے دروازے پر لگے بینر اور آرٹسٹ کے آنے پر کیا تبصرے کیے تھے۔ اگر وہ یہ توقع کر رہا تھا کہ این اس سے ہمدردی کرے گی تو وہ غلطی پر تھا۔ این نے نہ صرف یہ کہ اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دھیان سے اس کی شکایت بھی نہیں سنی اور سرد مہری دکھاتے ہوئے کہا۔ "روز! آج میں بہت معروف ہوں لیکن یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔"

وہی دونوں پولیس سراغ رساں ہیڈرا کروبی اور لی لینڈ اسٹراؤڈ، روز کے پاس بھی آئے۔ انہوں نے سیکیورٹی کیمرے کی فوٹیج دیکھی جس میں پانچ فٹ آٹھ انچ کا دبلا پتلا شخص پینٹ، ماسک اور ہوڈی میں نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسٹول اور بینر لٹکانے کے لیے ضروری سامان لے کر آیا تھا۔ ماسک کی وجہ سے اس کا چہرہ ویڈیو میں نہیں آسکا۔ اسی طرح روز کے پڑوسیوں نے کسی شخص کو گتے کے شیر لٹکاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس شخص نے کھاد کی قیمت ادا کی تھی، اس نے ڈیلیوری کے لیے ایک خط اور نقد رقم بھیج دی تھی۔ اس خط پر روز منٹگمری کے دستخط تھے۔

اب طنزیہ جملوں اور مذاق کا رخ این سے ہٹ کر روز کی جانب ہوگیا۔ علاقے کے دوسرے اسکول پرنسپل یہ محسوس کرنے لگے کہ اگلا نشانہ وہ ہوسکتے ہیں۔ اس طرح قہقہوں کا طوفان تھم گیا۔ چار دن بعد ہی این کے سامنے اس کے اثرات آنا شروع ہوگئے۔ وہ لوئیس، کیری ایمبروز اور ماریا ٹیٹ کے بارے میں معلومات جمع کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے ان کی ملازمت کا ریکارڈ بھی دیکھا۔ اسے ایک بس ڈرائیور کے شوہر کی تدفین میں جانا تھا۔ اس لیے اس نے ان تینوں عورتوں سے اگلے روز ملنے کا پروگرام بنایا۔ تجہیز و تکفین کے سلسلے میں کچھ مشکل پیش آ رہی تھی جس کے لیے این کو کوشش کرنا پڑی۔ جنازہ گاہ کا ڈائریکٹر اسے ایک کونے میں لے گیا اور اس پر زور دینے لگا کہ وہ اپنے لیے پہلے سے انتظام کرے۔

اگلے روز اس نے کیری کو لیبارٹری کے معاملات پر

بات کرنے کے بہانے اپنے دفتر میں بلالیا۔ کیری نے اسے بتایا کہ لیبارٹری میں ضرورت کے مطابق سامان نہیں ہے۔ این اس کے لیے بجٹ میں رقم مختص کرنے پر رضامند ہوگئی۔ یہ ایک خوشگوار ملاقات تھی۔ این نے بڑی ہوشیاری سے گفتگو کا رخ ذاتی معاملات کی طرف موڑ دیا اور کیری سے اس کے پہلے شوہر ، ڈیٹنگ اور آبائی شہر کے بارے میں سوالات کرنے لگی۔

''باؤلنگ گرین۔۔۔'' کیری نے آبائی شہر کے بارے میں بتایا۔ ''میرے سابق شوہر کو یہاں ملازمت مل گئی تو ہم اس شہر میں چلے آئے لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ یہ بھی اچھی جگہ ہے۔''

''تم نے باؤلنگ گرین اور ٹریوس کے علاوہ کہیں اور نہیں پڑھایا؟''

''نہیں۔'' کیری نے کہا۔ ''گو کہ مجھے پڑھاتے ہوئے سات سال ہوچکے ہیں۔''

جب وہ جانے کے لیے اٹھنے لگی تو این نے پوچھا۔ ''کیا تم رابرٹ ہیلنسی سے ڈیٹنگ نہیں کررہی تھیں؟''

کیری اچھی طرح جانتی تھی بلکہ سارے اسکول کو یہ معلوم تھا کہ این اور رابرٹ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن کیری کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔''اوہ۔۔۔صرف پانچ منٹ کے لیے۔'' اس نے کہا۔ ''میں گزشتہ ایک سال سے میک کورمک سے مل رہی ہوں۔ تم اسے جانتی ہو؟ وہ چلیز میں منیجر ہے۔''

این کو قائل ہونا پڑا کہ وہ کیری ایمرز کا نام اس فہرست سے نکال سکتی ہے۔ بشرطیکہ بعد میں وہ ایک اعلیٰ درجے کی اداکارہ نہ نکلے۔ اس کے بعد لوئیس اور ماریا ہی رہ جاتی تھیں۔ این نے لوئیس کا پورا ریکارڈ لفظ بہ لفظ پڑھ رکھا تھا اور اس کا دفتر بھی قریب ہی تھا۔ اس کے لیے لوئیس سے بات کرنا آسان تھا اور جب وہ ایک بچے کے بارے میں رپورٹ دینے آئی جس میں خسرہ کی علامات ظاہر ہورہی تھیں تو این نے محسوس کیا کہ اس سے بات کرنے کے لیے یہی مناسب وقت ہے۔ لوئیس نے اس لڑکے کی ماں کو فون کردیا تھا جو اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔

''یہ تم نے اچھا کیا لوئیس۔'' این بولی۔

لوئیس کو لگا جیسے وہ اس پر طنز کررہی ہو۔ اس نے تنگ کر کہا۔ ''پھر میں کیا کرتی این؟ اس لڑکے سے کہتی کہ کلاس میں جا کر بیٹھو؟''

این نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ دراصل مجھے بچوں سے مذاق کرنے کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ بڑوں سے اسی لہجے میں گفتگو کرنے لگی ہوں۔''

لوئیس مطمئن ہوگئی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں روز منٹگمری کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر تبصرے لگا رہی تھیں۔ این کا خیال تھا کہ لوئیس ایسی حرکت نہیں کرسکتی کیونکہ اس کی ایک دس سالہ بیٹی بھی تھی اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی شخص کی معاوضے پر خدمات حاصل کرے یا سیڑھی پر چڑھ کر بینرز لگائے۔

اگر کیری یا لوئیس نے اسے ایذا نہیں پہنچائی تو یقیناً ماریا ٹیٹ ہی وہ عورت تھی جس پر سو فیصد شک کیا جاسکتا تھا تاہم این کے پاس اس کو اپنے دفتر بلانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اپنی ٹیم میں مقبول ہونے کے ساتھ ایک اچھی کوچ بھی تھی اور اس کے بارے میں کبھی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی تھی۔

وہ لنچ کے وقفے میں دفتر سے باہر آئی۔ اسے یقین تھا کہ ماریا اس وقت اپنی ٹیم کو پریکٹس کروارہی ہوگی۔ لڑکیاں لنچ کرنے کیفے ٹیریا جاچکی تھیں اور ماریا تنہا کھڑی خلا میں گھور رہی تھی۔ جب وہ اپنی خوابوں کی دنیا سے باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ این اس کے برابر میں کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا انداز فوراً ہی بدل گیا اور وہ بولی۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہورہی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اس اسکول میں جہاں چاہوں جاسکتی ہوں۔''

ماریا نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں دراصل بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ تم نے مجھے چونکا دیا۔''

''ہاں۔'' این نے کہا اور وہاں سے چل دی۔ اس کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ اگلے قدم کے طور پر اس نے ماریا کے پرانے اسکول کے پرنسپل کو فون کیا۔ یہ اسکول جنوبی کیرولینا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع تھا۔ این نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''ماریا نے اپنی خدمات اسٹاف کونسلنگ سروس کے لیے رضاکارانہ طور پر پیش کی ہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا وہ ذہنی طور پر مضبوط ہے کیونکہ اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کافی عرصہ زیرعلاج رہی ہے۔''

''ہاں۔'' مسٹر شیرمن نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ماریا ٹیچر بننے سے پہلے یہاں پڑھا کرتی تھی۔ ماں نے

دوسری شادی کرلی تو اس نے ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کیا اور اسے اپنے سوتیلے باپ جے ٹیٹ سے ہم آہنگ ہونے میں کافی وقت لگ گیا پھر جب وہ بڑی کلاس میں آئی تو بوائے فرینڈ سے اس کا جھگڑا ہوگیا اور وہ دوسرے کالج میں چلا گیا جس کا اس پر بُرا اثر پڑا۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ بہتر محسوس کر رہی ہوگی۔"

"اس کا یہاں بہت اچھا ریکارڈ ہے۔" این نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "ماں کی دوسری شادی سے پہلے کیا وہ اپنے نام کے ساتھ ولسن لگاتی تھی؟"

"ہاں......" شیرمن نے کہا۔ "ولسن نام کے لوگ بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔"

ولسن ایک عام نام تھا اور اس کا بہت کم امکان تھا کہ ماریا کا نام ولسن سے کوئی تعلق ہو جس نے این کا شوہر ہونے کا دعویٰ کیا تھا لیکن این امکانات پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے چنانچہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ اپنے گھر سے روانہ ہوگئی۔

اگلے روز سہ پہر میں ٹریوس پینتھرز کی ٹیم کا میچ تھا۔ این حسبِ معمول تماشائیوں کے اسٹینڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماریا بھی موجود تھی۔ اس امید پر کہ شاید وہ رابرٹ ہیلسی کو دیر تک دیکھ سکے۔ این نے ماریا کو دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کا منصوبہ کامیاب جا رہا تھا۔ اس رات ایک بجے کے قریب این ایک بار پھر ماریا کے احاطے میں موجود تھی۔ اس نے اپنی کار ایک میل دور کھڑی کی تھی۔ اس نے گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن انہیں مکمل طور پر سیاہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر کوئی اسے روکتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ اس کی کار خراب ہوگئی ہے یا سیل فون کھو گیا ہے اور وہ مدد کے لیے اپنے کسی جاننے والے کی تلاش میں ہے لیکن بہتر یہی تھا کہ اسے کوئی نہ دیکھے۔

ماریا کا گھر پرانے طرز کا تھا اور اس میں کوئی سیکیورٹی سسٹم نہیں تھا۔ این بڑی آسانی سے عقبی دروازے کے ذریعے گھر میں داخل ہوگئی۔ وہ اس گھر کے نقشے سے واقف تھی کیونکہ ایک رات پہلے اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ماریا کے بیڈروم میں چلی گئی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ ماریا گہری نیند سو رہی ہے تو اس نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکال کر اس کے سرہانے الارم کلاک کے نیچے رکھ دی۔

اگلے روز ماریا دیر سے اسکول پہنچی۔ اس کے بال بے ترتیب تھے اور وہ خاصی بدحواس دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ذرا سی آواز پر چونک جاتی اور پوری طرح اپنے کھلاڑیوں کی پریکٹس پر بھی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس نے کوچ جینفر لی سے کہا کہ وہ اس کے گھر رات گزارنا چاہتی ہے۔ دو دن بعد اس کی حالت بہتر دکھائی دینے لگی اور اس نے اپنے گھر پر سونا شروع کر دیا لیکن اس نے نئے تالے اور سیکیورٹی سسٹم لگوانے میں دیر نہیں کی۔

ایک ماہ بعد یہ افواہ پھیل گئی کہ مس ٹیٹ نے ملازمت کے لیے دو جگہ درخواست دی ہے اور ان میں سے ایک ٹریوس کا سب سے بڑا حریف پاول ہائی اسکول ہے۔ ایک ہفتے بعد ماریا نے رابرٹ سے اس کے دفتر میں ملاقات کی اور بولی۔ "تم نے مجھے مبارکباد نہیں دی۔"

"کیا تم نے کہیں اور ملازمت کرلی ہے؟"

"ہاں...... پاول میں۔ یہاں یہ میرا آخری سمسٹر ہے۔"

"مبارک ہو۔" رابرٹ نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ماریا سرد آہ بھر کر جانے لگی لیکن رابرٹ نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"اس نے یقیناً برا محسوس کیا ہوگا۔" رابرٹ نے این کو یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ دونوں رابرٹ کے گھر پر ڈنر کر رہے تھے۔

"اسے کرنا بھی چاہیے۔" این نے کہا۔ "وہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے تکلیف پہنچا کر اپنا مقصد حاصل کرلے گی۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ کس طرح اسے اتنی بری طرح خوفزدہ کردیا؟"

"میں نے ایک رات قبل بستر میں سوتے ہوئے اس کی ایک تصویر لی تھی۔" این نے کہا۔ "وہ تصویر اور تدفین کرنے والے فرسٹ میموریل فنرل ہوم کے ساتھ ہونے والے معاہدے کا فارم اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس فارم میں اس کا نام اور تاریخ وفات درج کردی جو مئی کے مہینے میں اسکول بند ہونے کا دن ہے۔"

رابرٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اچھا طریقہ اختیار کیا۔"

"میں جانتی تھی۔ اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھے۔" این نے اطمینان سے کہا۔ "بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ ذرا سا بھی امکان نہیں تھا۔ تم جانتے ہو کہ میں امکانات پر یقین نہیں رکھتی۔"



قسط:16

شیش محل

اسماء قادری

جہاں، پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رمن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن بظاہر ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک جھلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رمن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ رمن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ مجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے رمن کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے۔ رمن کو اب مجو کی تلاش ہوتی ہے۔ رمن جولیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جولیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر رمن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس رمن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ رمن پر ولیم نامی گورے افسر پر بدترین تشدد کا الزام ہے۔ رمن جولیٹ کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب میں ولدار آغا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے لیکن ولدار آغا ملک سے باہر تھا اس لیے رمن کو واپس آنا پڑتا ہے۔ رمن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسد اللہ جولیٹ کو دیکھ کر شک و شبہے میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ اس میں جوزفین کی جھلک پائی جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کے ذمے دار گنیش کو دیکھ لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان دھینگا مشتی میں گنیش جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فاروق بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق چاند بانو سے ملنے جاتا ہے، واپسی پر اسے کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیگم کے بیٹے اختر کی آمد پر جشن منایا جاتا ہے۔ وہیں اختر جولیٹ کو دیکھتا ہے اور رات میں شراب کے نشے میں اسے پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جولیٹ کے شور مچانے پر وہ پکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جولیٹ انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آمد تک موقوف ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ربن کو اڈے پر قدم رکھتے ہی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ تمام حاضر افراد کے چہروں پر فکر کا سایہ تھا اور وہ اداس نظر آرہے تھے۔ اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ سہ پہر کو جب وہ یہاں سے روانہ ہوا تھا تو سب کچھ معمول پر تھا۔ اس نے سہ پہر سے رات نو بجے تک کا وقت مجو والے اڈے پر گزارا تھا۔ اڈے کے نظم و نسق سے متعلق بہت سے امور انجام دینے کے علاوہ اس نے علاقے کے چیدہ چیدہ افراد سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ اڈے اور اڈے والوں کو کسی بھی نظر سے دیکھا جاتا ہو، اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ہر علاقے کے لوگ جانتے تھے کہ اڈے والوں سے بنا کر رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ ان کے کئی مسائل تو پولیس کے پاس جانے سے قبل اڈے ہی سے حل ہو جاتے تھے۔ اڈا اہلِ علاقہ کے تحفظ کی ذمے داری بھی خود اٹھا لیتا تھا۔ ہاں کہیں کہیں ایسا بھی تھا کہ اڈے والوں نے اہلِ علاقہ کا جینا حرام کر رکھا تھا اور لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ جیسا کہ مجو کے دور میں بھی ہوا کرتا تھا لیکن اڈا ربن کے پاس آجانے کے بعد سے اس نے سب کو لگام ڈال دی تھی اور اہلِ علاقہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

علاقے کے سرکردہ لوگ کافی دنوں سے ربن سے ملاقات کے خواہاں تھے لیکن اسے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اب اس نے موقع نکال کر ان لوگوں کو مدعو کیا اور یقین دہانی کروائی کہ اڈے کی طرف سے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔ مجو کے لاڈلے ٹیکے کا انجام اہلِ علاقہ نے دیکھ رکھا تھا۔ ٹیکے نے کپڑے کی ایک دکان سے بنا دام دیے کئی تھان کٹوا لیے تھے۔ ربن کے علم میں جیسے ہی یہ واقعہ آیا، اس نے بیچ چوراہے پر ٹیکے کو جوتے لگانے کی سزا دے ڈالی۔ اس سزا کے بعد ایک طرف اڈے پر موجود مجو کے پرانے آدمی سنبھل گئے اور دوسری طرف اہلِ علاقہ کو بھی یہ مثبت پیغام مل گیا کہ اڈے کو سنبھالنے والے نئے لوگ پہلے والوں کی طرح نہیں ہیں۔ نئے نافذ کیے ہوئے طریقہ کار نے اس بات کو ثابت بھی کر دیا چنانچہ اہلِ علاقہ ربن کے بے حد شکر گزار تھے۔

ملاقات ہوئی تو دونوں فریقین نے باہم یقین دہانیاں اور وعدے وعید کر ڈالے۔ ربن نے ان ملاقاتوں سے ایک پنتھ دو کاج والا کام لیا۔ اہلِ علاقہ سے ملاقات کے جو فوائد تھے وہ اپنی جگہ تھے لیکن اصل میں وہ اڈے پر اپنی مسلسل موجودگی کے گواہان بھی بنا تا رہا تھا۔ آج رامو کی نگرانی میں اس کے آدمی ایک بہت اہم کام انجام دینے والے تھے۔

آج کے دن انسپکٹر وکرم پر ہاتھ ڈالنے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ انسپکٹر کے معمولات کی مسلسل نگرانی کے بعد یہ بات سامنے آگئی تھی کہ وہ رات سات اور آٹھ بجے کے دوران تھانے سے نکل کر اپنی رکھیل سے ملنے جاتا ہے۔ وہاں وہ طے شدہ وقت نہیں گزارتا تھا لیکن رات بھر کے لیے بھی رکتا ہوا بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ شادی شدہ آدمی تھا اور ظاہر ہے بیوی بچوں سے چھپ کر یہ شغل پال رکھا تھا اس لیے احتیاط کرتا تھا پھر اس کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی تھیں۔ بعض اوقات اسے رات کے وقت بھی ڈیوٹی پر حاضر رہنا پڑتا تھا اور اچانک ہی تھانے سے بلاوا آجاتا تھا اس لیے وہ رات کے وقت اپنے گھر پر رہنے کو ہی ترجیح دیتا تھا یہ اور بات کہ کبھی کبھار ڈیوٹی کے بہانے رکھیل کے گھر بھی رات گزارنے کا موقع نکال لیتا ہو۔ ربن اور اس کے آدمیوں کو ان ساری باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ان کے لیے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ وکرم نے اپنی رکھیل کو سب سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا اس لیے اس سے ملاقات کے لیے تنہا اور سادہ لباس میں جاتا تھا۔ اس موقع پر اگر اسے چھاپ لیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور وکرم کے غیاب کا شور اٹھنے سے پہلے ہی اسے محفوظ مقام پر منتقل کر کے اسے مناسب ''ٹریٹمنٹ'' دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا۔

اڈے اور تھانے کے درمیان پیدا ہونے والی چپقلش سب کے علم میں تھی اس لیے اغوا کے وقت ربن کی اڈے پر ہی موجودگی کے گواہان بنانے کے لیے یہ سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ گواہان کی موجودگی میں کم از کم اس پر براہِ راست کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے آدمیوں میں سے پولیس کتنوں کی اور کہاں تک چھان پھٹک کرتی۔ ربن نے یہ سارا اہتمام رامو کے اصرار پر کیا تھا۔ رامو کا مشورہ تھا کہ دادا کو آزاد اور شک و شبے سے بالاتر رہنا چاہیے تاکہ آزاد رہ کر سارے معاملات دیکھ اور سنبھال سکے۔ اس کی موجودگی اس کے آدمیوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ ربن اس کے دلائل سے قائل ہو گیا تھا اس لیے اس کی بات مان لی تھی۔ ایک طے شدہ وقت مجو والے اڈے پر گزارنے کے بعد اس نے اپنے اس ٹھکانے کا رخ کیا تھا جہاں وکرم کو رکھا گیا تھا۔ اچھو والے ٹھکانے کے علاوہ بھی اس کے کچھ اور ٹھکانے تھے اور یہ ان ہی میں سے ایک ٹھکانا تھا۔ وکرم اسے اپنے سامنے پا کر بہت جلبلایا تھا اور بڑی دھمکیاں دی تھیں کہ ربن کو اس کے اغوا کی حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ عالم اشتعال میں وہ ربن کو منہ بھر کے گالیاں

بھی بکنار رہا تھا لیکن ربن نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دیا تھا، البتہ اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ وکرم کو نہایت عمدہ کھانا شکم سیر ہو کر کھلایا جائے۔

اس کے حکم پر اشتہا انگیز کھانا وکرم کو پیش کیا گیا تھا۔ کھانے میں جلیبیوں سمیت دو مزید میٹھے بھی شامل تھے۔ اچھا کھانا اور اس سے بھی بڑھ کر میٹھا وکرم کی کمزوری تھی۔ کھانا سامنے آیا تو وہ غصے اور پریشانی کے باوجود اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور خوب جی بھر کر کھایا۔ اس شکم سیری کے بعد ربن نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وکرم رات بھر سونا تو دور کی بات، پلک بھی نہ جھپکنے پائے۔ شکم سیری اور ساتھ ہی بڑی مقدار میں میٹھے کے استعمال کے بعد نیند سے محرومی وکرم پر کیسا عذاب بن کر ٹوٹے گی، اس بات سے ربن اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے وکرم سے سارے سوال جواب اگلے دن کے لیے اٹھا رکھے تھے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا تو اس سے کچھ بھی اگلوانا آسان ہو جاتا۔ اس طرف سے بالکل مطمئن ربن رات گئے اپنے اڈے واپس پہنچا تھا لیکن یہاں سب کی اتری صورتیں اس کی منتظر تھیں۔

"کیا بات ہے رے۔ یہ سالی تمہاری شکلوں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" اس نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر تشویش سے پوچھا۔

"فاروق استاد کا کچھ پتا نہیں دادا!" جانی ہمت کر کے آگے آیا اور اسے اطلاع دی۔ گولو رات کو جلدی سونے کا عادی تھا اور باقی لوگوں نے احتیاط کی تھی کہ وہ نیند سے جاگنے نہ پائے ورنہ اس وقت ربن کے سوال کرنے سے پہلے اس کے اڈے پر قدم رکھتے ہی وہ اسے یہ اطلاع دے دیتا۔

"پتا نہیں کا کیا مطلب ہے حرام......" ربن کے لہجے میں قہر اتر آیا۔

"آج شام فاروق استاد چاند بانو سے ملاقات کے لیے جانے کا بول کر اڈے سے نکلا تھا۔ بول کے گیا تھا کہ تھوڑا جاستی ٹیم (ٹائم) لگ سکتا ہے اس واسطے کھانے کے ٹیم تک تو سب ریلیکس رہا پر جیسے جیسے ٹائم گزرتا گیا، فکر ہونے لگی۔ فاروق استاد کا موڈ خراب نہ ہو یہ سوچ کر تھوڑی دیر اور راہ دیکھتے رہے لیکن پھر گھبرا کر بندہ خبر لینے کو دوڑایا۔ ادھر سے پتا چلا کہ بہت دیر ہوئی فاروق استاد رات کا کھانا کھا کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر اڈے کیوں نہیں پہنچا، یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا۔" جانی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

"وہ گیا تھا تو اس کے پیچھے بندے کیوں نہیں گئے؟ اپن نے بولا تھا نا کہ اسے اکیلا نہیں چھوڑنے کا ہے۔" ربن غرایا۔

"تمہارا آرڈر سب کی ناج میں ہے دادا پر فاروق استاد کا بھی تو تمہیں پتا ہے۔ بولا میں بتا کر جا رہا ہوں کہ کدھر جا رہا ہوں اس لیے کسی کو میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بولنے پر بھی اگر کوئی اس کے پیچھے جاتا تو تم کو معلوم ہے اس کا مزاج بگڑ جاتا اس لیے سب چپ کر کے بیٹھ گیا۔" جانی نے صفائی پیش کی۔

"پھر اب...... اب کیا کر رہے ہو؟ اسے تلاش کرنے کو کچھ کیا یا عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر ادھر ہی آنسو بہاتے بیٹھے ہو۔" ربن کے مزاج کی خرابی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"بندے نکلے ہوئے ہیں دادا! کوٹھے سے اڈے تک ایک ایک انچ چھان مار رہے گے۔ اپن کو تھوڑے لوگوں کے ساتھ اس واسطے رکنا پڑا تھا کہ اڈے کو بھی خالی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ تمہارا ویٹ بھی کر رہے تھے۔" جانی دھیمے لہجے میں اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس کی نظریں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے فاروق کے غائب ہونے میں اس کی کوئی غلطی ہو۔

"اس سورما کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہوا ہے، کسی کو خبر نہیں دے رہا ہے۔ شہر میں دشمنیاں بھی پال رکھی ہیں۔ اب خود سے غائب ہوا ہے یا کسی نے گڑبڑ کی ہے، اپنے کو ہر طرف دیکھنا ہوگا۔" اس بار ربن کے لہجے میں غصے کے بجائے صرف اور صرف فکر تھا۔ فاروق کی پریشانی، اڈے کے معاملات اور ملک کے بگڑتے حالات نے اسے خود بھی ذہنی طور پر بہت الجھایا ہوا تھا اس لیے خلاف مزاج جلدی غصے کا اظہار کرنے لگا تھا ورنہ وہ خود بڑا اپنے آپ پر قابو رکھنے والا آدمی تھا۔

"تم ٹینشن مت لو دادا! فاروق استاد کے لیے ادھر سب کے دل میں بڑا لو (Love) ہے۔ اس کے لیے اپن لوگ اپنا جان بھی دے سکتا ہے۔" جانی نے اسے حوصلہ دیا۔ ربن اس سے کچھ کہے بغیر اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور حقے کی نے ہونٹوں سے لگائی۔ اس کی آمد کے فوراً بعد ہی بجو نے حقہ گرم کر کے وہاں لا رکھا تھا۔ ربن پرسوچ انداز میں اسے گڑگڑانے لگا۔ جانی سمیت سب کو اس نے ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا تھا۔ ان لوگوں کے باہر نکلے ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازے پر دستک دے کر اندر

داخل ہوا۔ اس کے پیچھے جانی بھی تھا۔ وجے کے چہرے کے ہیجانی تاثرات نے ربن کو چونکا دیا۔ لگتا تھا وہ کوئی بہت بڑی خبر لے کر آیا ہے۔

''دادا..... دادا بہت بڑی خبر ہے اور اپنے کو لگتا ہے کہ فاروق استاد کے بارے میں ہی ہے۔'' ربن کے کوئی سوال کرنے سے پہلے ہی وجے نے جوش میں بولنا شروع کر دیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور یہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت عجلت میں یہاں پہنچا ہے۔

''پہلے اچھی طرح سانس لے پھر بول کہ کیا بات ہے۔'' ربن نے اسے نصیحت کی۔ خود اس کے لیے بھی ایک ایک لمحہ بھاری تھا لیکن وہ تحمل سے کام لے رہا تھا۔

''اپن لوگ کوٹھے سے اڈے تک کے راستے پر فاروق استاد کے بارے میں معلوم کرتے پھر رہے تھے کہ ایک ڈبل روٹی مکھن والا مل گیا۔ غریب لکڑی کے خالی کھوکھے میں ڈبل روٹیاں اور مکھن کی ٹکیاں رکھ کر اپنے کاندھے پر لاد کر رات گئے پھیری لگاتا ہے۔ صبح ناشتے میں ڈبل روٹی مکھن پسند کرنے والے اس سے تازہ ڈبل روٹی اور مکھن خرید لیتے ہیں۔ اپن نے اس کو فاروق استاد کا حلیہ بتا کر اس سے پوچھا کہ اس حلیے کے آدمی کو ادھر کہیں راستے میں دیکھا ہے تو پہلے تو منع کر دیا، پر اپنے کو اس کے انداز سے لگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ خبر ضرور ہے اس لیے اپن اس کی جان کو آ گیا۔ تھوڑی جیب بھی گرم کیا تو اس نے زبان کھول دیا اور بولا کہ وہ ادھر کوٹھوں والے علاقے میں ڈبل روٹی، مکھن کی سپلائی دینے جا رہا تھا تو اس نے چار بندوں کو فاروق استاد کے حلیے کے ایک آدمی کو گھیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لوگ اسے ایک کمبل میں لپیٹ کر موٹر میں ڈال کر لے گئے تھے۔ ان لوگوں کی اس پر نظر نہ پڑے اس لیے وہ ڈر کر ایک ٹھیلے کے پیچھے چھپ گیا تھا اور وہیں سے اس نے ساری کارروائی دیکھی تھی۔'' وجے نے اسے تفصیلی رپورٹ پیش کی جسے سن کر ربن کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور بولا۔

''ان چاروں میں سے کسی کو پہچانتا تھا وہ ڈبل روٹی والا۔''

''اپن پوچھا تھا۔ بولا تین کو تو بالکل نہیں جانتا پر ایک ذرا جانا پہچانا تھا، ادھر کوٹھوں پر آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ چھوٹا موٹا غنڈا ہے پر کچھ لوگ پولیس کا ٹاؤٹ بھی بولتے ہیں۔'' وجے کی دی یہ اطلاع بڑی اہم تھی۔ ربن کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہو گیا۔ فاروق کو اغوا کرنے والوں میں سے کسی ایک پر پولیس کے مخبر ہونے کا شک ہونے کا ایک مطلب یہ بھی لیا جا سکتا تھا کہ اس معاملے میں پولیس ملوث ہے۔ بجو دادا پر بھی شک کیا جا سکتا تھا کیونکہ پولیس اور بجو دادا کا گٹھ جوڑ بھی کئی بار محسوس کیا جا چکا تھا۔ چاند بانو کی وجہ سے بجو یوں بھی فاروق سے خصوصی دشمنی رکھتا تھا کہ چاند بانو اسے منہ نہیں لگاتی تھی اور فاروق کو دل میں بٹھا رکھا تھا۔

''وہ ڈبل روٹی والا کدھر ہی ہے؟'' لمحہ بھر سوچنے کے بعد ربن نے وجے سے دریافت کیا۔

''اپن ساتھ ہی لے کر آیا ہے لیکن بہت ڈرا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ادھر بلا اسے۔'' ربن نے حکم دیا۔ اگلے ہی لمحے ڈبل روٹی والا اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''کیا نام ہے رے تیرا؟'' ربن نے نرمی سے پوچھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ چالیس سال سے کچھ اوپر کا وہ آدمی دبلا پتلا اور درمیانی قامت کا تھا۔ رنگت دبتی ہوئی تھی اور جسم پر موجود بوسیدہ لباس کے علاوہ چہرے پر موجود مخصوص تاثر بھی اس کی غربت کی گواہی دے رہا تھا۔

''لطیف نام ہے دادا پر سب طیفا طیفا بولتے ہیں۔'' اس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

''کتنے بچے ہیں تیرے؟'' ربن نے مزید پوچھا۔

''پانچ دادا! تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔'' اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ ادھر سے جائے تو اسے اس کے بچوں کے لیے تحفے اور خرچہ پانی دے کر بھیجنا۔'' ربن نے وجے اور جانی کی طرف رخ کر کے حکم دیا۔

''شکریہ دادا۔ اللہ تمہیں لمبی عمر دے۔'' وہ خوش ہو کر دعائیں دینے لگا۔

''دیکھ یار طیفے! اپنے کو اپنی لمبی عمر نہیں چاہیے۔ تو باپ ہے۔ تیرے پانچ بچے ہیں۔ تیرے کو معلوم ہے کہ باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے کتنا پیار ہوتا ہے۔ ادھر حرام کے پلے جس کو اٹھا کر لے گئے ہیں، وہ اپنے واسطے اولاد ہی ہے۔ تو اپنے کو اپنے بچے تک پہنچنے میں مدد کر دے تو اپن کے لیے یہ بہت ہے۔'' سامنے کوئی غنڈا بدمعاش ہوتا تو ربن دھونس اور دھمکی کی زبان میں بات کرتا لیکن اس غریب نانبائی سے بہت نرمی سے پیش آ رہا تھا۔

''اپن تمہاری کیا مدد کر سکتا ہے دادا اپن تو بڑا کمزور آدمی ہے۔'' وہ حیران ہوا۔

''تو اغوا کرنے والوں میں سے جس آدمی کو پہچانتا ہے اس کا نام پتا ٹھیک سے بتا دے وبس یہی بہت ہے۔''

''اپن تمہارے آدمی کو بولا تا دادا کہ اپن بس اسے

پہچانتا ہے۔ وہ اپن کو اپنا وصندا کرتے ہوئے کبھی کبھی دکھائی دے جاتا ہے۔ صورت سے ہی غنڈا لگتا ہے اور اپن غریب آدمی ہے اس لیے ایسے لوگوں سے دور رہتا ہے۔ اب تم بولو اپن تمہیں اس کے بارے میں کیسے بتائے؟'' اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

''تو بولا کہ اس کے بارے میں پولیس کا ناؤٹ ہونے کی سن گن ہے۔ تو بھلا یہ کیسے؟ تو کسی سے اس کے بارے میں بات کیا ہوگا تو اس نے تجھے یہ خبر دی ہوگی نا۔'' ربن نے نکتہ اٹھایا۔

''وہ تو ایسے ہی ادھر بازار میں ایک دن پھول والے سے بات ہورہی تھی تو اس نے اپن کو بولا تھا ورنہ اپن خود سے اسے نہیں جانتا۔'' نانبائی اپنی جگہ بڑا احتیاط تھا۔

''اس سے پھول والے کا معلوم کرو اور پھول والے سے جتنا اگلوا سکتے ہو اگلواؤ۔ اپن کو اپنا بچہ جلدی واپس اپنے بیچ چاہیے۔'' اس کی بات سن کر ربن نے فوراً حکم جاری کیا۔

''جیسا تم بولو دادا۔'' جانی اور دیپے پوری طرح مستعد تھے۔

''یہ کام جلدی نمٹاؤ۔ ایسے بات بن جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اشوک بچن کو بلوا کر تھانے میں اغوا کی رپٹ لکھواتے ہیں۔'' وہ ہر طرف اپنا دماغ دوڑا رہا تھا۔

''ادھر رامو کو بھی خبر بھجوا دے۔ وہ بھی ادھر سے بندے دوڑا کر شہر میں کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔'' اس کی طرف سے ایک اور حکم جاری ہوا۔ فاروق کے لیے اس کا دل اتنا مضطرب تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا گھڑی کی چوتھائی میں اسے واپس اڈے لے آئے۔ اڈے پر موجود منو اور اکبر بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل بھی فاروق کے لیے مضطرب تھے اور وہ خود بھی اس کی تلاش میں نکلنا چاہتے تھے لیکن بمبئی ان کے لیے اجنبی شہر تھا اور وہ یہاں باہر نکل کر ٹاک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے جانی نے خود انہیں باہر جانے سے روک دیا تھا۔ بس یہاں شدومد سے جاری کارروائیاں دیکھ کر ان کے دل کو تسلی مل رہی تھی کہ جلد فاروق ان کے درمیان موجود ہوگا۔

☆☆☆

جولیٹ کا حویلی میں مقام یکایک بدل گیا تھا۔ وہ ملازمہ بن کر یہاں آئی تھی لیکن اب حویلی کے ورثا میں شامل ہوگئی تھی۔ اس کی حویلی سے وابستگی کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا گیا تھا لیکن تمام سرکردہ افراد کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ وہ جوزفین کے بطن سے جنم لینے والی اسد اللہ کی بیٹی ہے۔ ملازمین میں سے بھی جو بہت خاص تھے، انہیں تھوڑی بہت سن گن مل گئی تھی لیکن کسی نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ حویلی کے پرانے نمک خوار تھے اور جانتے تھے کہ کان کچھ سن بھی لیں تو مالکان کی اجازت کے بغیر زبان نہیں کھولی جاسکتی۔

اسد اللہ کا بس چلتا تو وہ پہلے ہی دن جولیٹ کے اپنی بیٹی ہونے کا اعلان کر دیتے لیکن بڑے بھائی صفی اللہ کے مشورے پر خاموش تھے۔ صفی اللہ کا کہنا تھا کہ بڑے نواب صاحب کی آمد پر ان کے علم میں سارے معاملات لانے کے بعد ہی کوئی اعلان کیا جانے تو بہتر ہے۔ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ جولیٹ کی ذات کو طنز و تضحیک کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے اسد اللہ اس جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں کہ جوزفین سے انہوں نے خفیہ شادی کر لی تھی۔ اسد اللہ بچے نہیں تھے۔ وہ خود بھی معاملات کی نزاکت کو سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے بڑے بھائی کے دیے ہوئے دونوں مشورے قبول کر لیے تھے۔ اب بس نواب صاحب کی واپسی کا انتظار تھا۔ انتظار کا یہ وقت دونوں باپ بیٹی زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ بتا رہے تھے۔ دونوں کے پاس ایک زمانے کی تفصیل تھی جو انہیں ایک دوسرے کو سنانی تھی اس لیے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا اور وہ بلا تکان گفتگو کیے جاتے تھے۔ اسد اللہ مردانے میں جاتے تو جولیٹ کو تھوڑی دیر کی فرصت ملتی حسیب اللہ کی بیٹی ماہ نور کو پڑھانے کا سلسلہ اس نے اب بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ اسے پڑھاتی یا نواب زادی عالیہ کے پاس جا بیٹھتی۔ اپنے مفاد کے لیے انہوں نے جوزفین کو حویلی سے نکلوانے میں جو کردار ادا کیا تھا، وہ اپنی جگہ تھا لیکن اپنے اس فعل پر شرمندگی اور اعتراف خطا کے بعد وہ اسے بری نہیں لگتی تھیں۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ بے شک بشری کمزوری نے غالب آکر وقتی طور پر نواب زادی عالیہ کو غلط کام کے لیے مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اپنے اس عمل پر نادم تھیں تو یہ بھی ان کے اچھے ہونے کی ایک دلیل تھی۔ ان کے مقابلے میں ندرت جہاں عرف آپا بیگم نے تو ایسی کوئی زحمت ہی نہیں کی تھی، الٹا اس پر ہی الزامات اور تہمتیں لگاتی رہی تھیں۔

آج کل انہوں نے خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر رکھا تھا جہاں ان کی اکثر و بیشتر اپنے لکھے بیٹے اختر کے ساتھ نشست جمتی رہتی تھی۔ لگتا تھا دونوں ماں بیٹے مل کر نواب صاحب کی واپسی پر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو طے

کرنے میں مصروف ہیں۔ مشاورت کے لیے عشرت جہاں بھی ان کے ساتھ ہی موجود رہتی تھی۔ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں، اس کی اسد اللہ کو پروا نہیں تھی کیونکہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ نواب صاحب کے روبرو سچائی اور دوٹوک موقف کا اظہار کریں گے۔ وہ جولیٹ کو برسوں کی محبت دنوں میں دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے وہ سارا زیور جو ان کی مرحومہ بیوی کو شادی میں چڑھایا گیا تھا اور اب ان کی ملکیت میں تھا، جولیٹ کو سونپ دیا تھا۔ جولیٹ کو اس قیمتی زیور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اپنے سگے باپ کی محبتوں اور عنایتوں پر اس کا دل نہال تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جلد سے جلد نواب صاحب شکار پر سے واپس آجائیں تاکہ اس کے مستقبل کا فیصلہ ہو سکے۔

نواب صاحب کا پروگرام ذرا طوالت اختیار کر گیا تھا اور وہ اپنے جس دوست کی دعوت پر شکار کے لیے تشریف لے گئے تھے، ان کے ملازم نے حویلی میں پروگرام کی اس طوالت کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ ان کی آمد میں اس تاخیر پر صبر کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جولیٹ کو بس جو واحد اطمینان تھا وہ یہ تھا کہ نواب زادہ اسد اللہ ہر حال میں اس کی ذمے داری نبھانے کا وعدہ کر چکے ہیں اور اب وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ آج اسد اللہ نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ جاگیر کا نظام دیکھنے جارہے ہیں اس لیے مغرب سے پہلے واپسی نہیں ہو سکے گی۔ وہ علی الصباح روانہ ہو گئے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں وہ حویلی میں تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ اسد اللہ کی غیر موجودگی میں ندرت جہاں، اختر اور عشرت کسی قسم کی سازش کی کوشش نہ کریں لیکن اسد اللہ اسے اطمینان دلا کر گئے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں نواب زادہ صفی اللہ اس کے ذمے دار ہوں گے۔ حسیب اللہ اور اس کی بیوی کا رویہ بھی اس کے ساتھ مناسب تھا اور عالیہ تو بھتیجیوں والی مخصوص محبتیں اس پر نچھاور کر رہی تھیں اس لیے اس کے خدشات نے زیادہ طاقتور شکل اختیار نہیں کی۔

صبح ناشتے کے بعد کا وقت اس نے ماہ نور کے ساتھ گزارا، کچھ دیر عالیہ کے ساتھ بیٹھی اور دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کتاب کا مطالعہ کرتی رہی۔ شام کے وقت ہوا خوری کے لیے پائیں باغ میں نکل گئی۔ وہاں اس کا آصف خان سے سامنا ہو گیا۔ اس نے بڑی دلچسپی سے جولیٹ کی طرف دیکھا۔ گہرے سبز رنگ کے تنگ پاجامے کے ساتھ اس نے انگوری رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور گہرا سبز دوپٹا بے پروائی سے شانوں پر پڑا ہوا تھا۔ لباس کی یہ تبدیلی خود بخود عمل میں آگئی تھی۔ آپا بیگم کے حکم پر مشرقی لباس زیب تن کرنے سے شدت سے انکار کرنے والی جولیٹ نے باپ کی محبت میں خود بخود یہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اسد اللہ نے اس سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا اور نہ ہی اس کے رہن سہن پر معترض ہوئے تھے لیکن اس کے دل نے خود اس سے کہا تھا کہ وہ اس روپ میں ڈھل جائے جس روپ میں اسے دیکھنا اس کے باپ کے لیے خوشی کا باعث بنے گا اور واقعی اسد اللہ اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ آصف خان کی اس پر جمی نظروں میں بھی پسندیدگی کا تاثر تھا۔

"بہت دنوں بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔"

جولیٹ نے اس کی پسندیدگی کو محسوس کیا لیکن تجاہل سے کام لیتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"آپ ہی کو فرصت نہیں تھی ورنہ میں تو ہر روز راہ دیکھتا تھا۔" آصف خان نے ظریفانہ لہجے میں شکایت کی تو وہ جواب میں محض مسکرا دی۔

"تبدیلی آپ پر جچ رہی ہے۔ خوانخواہ ہی آپ آپا بیگم کی ضد میں اس پہناوے کو اختیار کرنے سے انکار کرتی رہیں۔ اس لباس میں تو آپ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں۔" اس بار آصف خان نے کھل کر اس کی تعریف کی۔

"تبدیلیوں کو دل سے قبول کیا جائے تب ہی اچھی لگتی ہیں۔ جبراً کسی پر کچھ بھی مسلط کیا جائے تو وہ ذہنی طور پر قبول نہیں کیا جاتا اس لیے آپ میرے پہلے انکار کو خوانخواہ نہ ٹھہرائیے۔" جولیٹ نے مضبوط لہجے میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

"ہر تبدیلی دل سے قبول نہیں کی جاتی۔ کیا آپا بیگم اور ان کی اولاد نے حویلی میں آنے والی تبدیلی کو قبول کر لیا ہے؟" آصف خان نے معنی خیز لہجے میں پوچھا تو وہ جان گئی کہ وہ محرم راز ہے اور ابھی بات کھولے نہ جانے کے باوجود جانتا ہے کہ حویلی کی تاریخ میں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔

"انا اور ضد میں کسی تبدیلی کو نہ قبول کرنے اور اصولی موقف کے تحت انکار کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ جو لوگ انا پرستی کا شکار ہیں انہیں ان کی اس روش پر ہی خوش رہنے دیں، مجھے ان سے کوئی غرض ہے نہ مطلب۔ میں جب یہاں آئی تھی اس وقت بات اور تھی، اب بات کچھ اور ہے۔ اب وہ سارے لوگ میرے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اب مجھے ان سے کوئی مقابلہ نہیں کرنا کیونکہ

مجھے بلا مقابلہ ہی وہ مقام مل گیا ہے جو میرا حق تھا۔'' وہ بہت منتخب الفاظ میں آصف خان کی بات کا جواب دے رہی تھی۔ آج وہ دونوں کہیں بیٹھنے کے بجائے یونہی ٹہلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

''حویلی میں آپ کے مقام کا تعین میرے خیال میں تو ابھی پوری طرح نہیں ہوا ہے۔ ابھی بڑے نواب صاحب کے حضور یہ معاملہ پیش ہونا ہے اور یہاں لوگوں کا جو مزاج ہے اس کو دیکھتے ہوئے میں کسی مثبت ردِعمل کی کم ہی امید رکھتا ہوں۔'' آصف خان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''شاید مجھ سے الفاظ کے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔ مجھے حویلی میں اپنے مقام کے تعین کے بجائے اس فرد واحد کی زندگی میں اپنے مقام کی بات کرنی چاہیے تھی جس سے اپنے رشتے کی بنیاد پر میں یہاں آئی ہوں۔ میری بدگمانی کے برخلاف وہ بہت مخلص اور دیانت دار انسان ثابت ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ آخر تک مجھ سے اپنا رشتہ نبھائیں گے۔'' اس نے اب بھی اسد اللہ کا نام لینے یا ان سے اپنا رشتہ بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیا حالانکہ آصف خان کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اسے سب باتوں کا پوری طرح علم ہے۔

''یقیناً وہ ایسا ہی کریں گے۔ میں نے انہیں جتنا جانا ہے اس حساب سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ تعلق، وعدے اور رشتے نبھانے والے انسان ہیں۔'' آصف خان نے بھی اسد اللہ کا نام لینے سے گریز کیا۔ اس کی بات سن کر جولیٹ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور محض مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ چند منٹوں تک وہ دونوں یونہی خاموشی سے ٹہلتے رہے پھر آصف خان بولا۔

''آیئے کچھ دیر وہاں بیٹھتے ہیں۔'' جولیٹ نے انکار نہیں کیا اور اس کی اشارہ کردہ سنگی بنچ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں درمیان میں تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر ایک ساتھ بنچ پر بیٹھ گئے تو آصف خان نے دھیرے سے کھنکھارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا اور جھجکتے ہوئے بولا۔

''میں کچھ عرصے سے آپ سے ایک بات کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر اجازت ہو تو اب کہہ دوں؟''

''ایسی کیا بات ہے بھلا جو ایک پٹھان زادہ نہیں کہہ پا رہا۔ میں نے تو سنا ہے کہ پٹھان بہت بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔'' اس کو جھجکتے دیکھ کر جولیٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بات بہت خاص ہو، خاص شخص کے روبرو کہنی ہو اور اس پر آپ کی زندگی کا دارومدار ہو تو کہتے ہوئے انسان جھجک ہی جاتا ہے۔''

''اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ آپ کہیے تو...''
جولیٹ نے اس سے اصرار کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کی نئی شروع ہونے والی زندگی میں مجھے آپ کی ہم سفری کا شرف حاصل ہو جائے۔'' آخر کار اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی جسے سن کر جولیٹ پل بھر کے لیے چپ ہوگئی پھر بولی۔

''میرے خیال میں آپ نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے عجلت سے کام لیا ہے۔ میرے متعلق ابھی بہت کچھ طے ہونا باقی ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے یہ حویلی چھوڑ کر جانا پڑ جائے پھر سب سے بڑا مسئلہ مذہب کا ہے۔ ایک مسلمان خاندان کا حصہ ہونے کے باوجود میں اب بھی عیسائی ہوں اور فی الحال میں نے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہے۔ آپ بے شک اپنے والدین اور قبیلے سے دور رہ رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ان کی اجازت کے بغیر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مختار نہیں ہیں۔ میرے نام کے ساتھ جڑی ناجائز کی گالی اور مذہب دو ایسے مسئلے ہیں جو میرے وجود کو آپ کے خاندان کے لیے ناقابل قبول بنا دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے آپ خود کو مشکل میں نہ ڈالیں۔'' جولیٹ نے سکون سے اس کی خواہش سنی اور پھر اسے جواب دیا۔

''اسد انکل سے بابا کی دوستی کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ آپ کے لیے کہیں کوئی غلط لفظ کا استعمال کر ہی نہیں سکتا۔ رہی مذہب کی بات تو عیسائی اہلِ کتاب ہوتے ہیں اور ہمارے مذہب میں اہلِ کتاب عورت سے نکاح جائز ہے۔'' آصف خان نے نہایت رسان سے اسے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن یقین جانیے بہت کچھ جان کر بھی ابھی آپ میرے بارے میں سب کچھ نہیں جانتے ہیں۔ میرا یہاں سے تعلق مجھے اتنا معتبر نہیں کر دیتا کہ آپ مجھے زندگی کا ساتھی بنانے جیسا اہم فیصلہ کر بیٹھے ہیں۔ ابھی تو عشق کے بہت امتحان باقی ہیں۔'' جولیٹ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی در آئی۔

''مجھے امید ہے کہ میں عشق کے ہر امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا اور ہاں پلیز آپ اس غلط فہمی کو اپنے ذہن سے نکال دیں کہ میں نے آپ کا یہاں سے تعلق ظاہر ہونے پر آپ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس سلسلے میں کافی دن سے غور کر رہا تھا لیکن آپ سے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔'' وضاحت

پیش کرتے ہوئے آصف خان کے لہجے میں بھی ہلکی سی جارحیت آگئی تھی۔

"میں آپ کی اس بات سے اختلاف نہیں کروں گی، یقیناً آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح کہہ رہے ہوں گے لیکن میرا یہ موقف اپنی جگہ قائم ہے کہ ابھی آپ میرے بارے میں سب کچھ نہیں جانتے اس لیے اتنا بڑا فیصلہ مت کریں۔"

"مجھے یقین ہے کہ سب کچھ جان کر بھی میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا البتہ آپ اپنی الجھن کے خاتمے کے لیے اپنی زندگی کا ہر تلخ وترش پہلو میرے سامنے بیان کرسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں تو میں نے پہلے ہی ایک بار آپ کو پیشکش کی تھی اور یقین دلایا تھا کہ آپ مجھے مخلص درازدار دوست پائیں گی لیکن شاید آپ نے میرے کہنے کا اعتبار ہی نہیں کیا۔" آصف خان نے اس کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور مضبوط لب ولہجے میں بولا۔

"اور شاید میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اپنی جنگ خود لڑنے کی قائل ہوں۔ آپ جس محاذ پر مجھے کامیاب کھڑا دیکھ رہے ہیں، اسے میرا آخری محاذ نہ جانیے۔ ابھی مجھے ایک دوسری بڑی جنگ لڑنی ہے اور اس جنگ میں کامیاب ہوئے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی۔ سچ پوچھیے تو بہت دن گزرے میرے لیے زندگی ختم ہو چکی ہے۔ آپ جس وجود کو اپنے سامنے چلتا پھرتا، کھاتا پیتا دیکھ رہے ہیں، یہ ایک بے روح وجود ہے جسے بس انتقام کی آگ نے زندہ رکھا ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں جو آنچ تھی اس کی تپش آصف خان نے بھی محسوس کی۔

"اگر میں کہوں کہ انتقام کی یہ آگ مجھے سونپ دیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ میں آپ کے ہر مجرم کو آپ کی خواہش کے مطابق کیفرکردار تک پہنچاؤں گا تو کیا آپ میری اس پیشکش کو بھی قبول نہیں کریں گی؟" آصف خان نے نہایت امید سے پوچھا تو وہ فوری طور پر اسے انکار نہیں کرسکی لیکن اپنی روح پر دلدار آغا کا لگایا زخم کسی کو دکھانا بھی آسان بات نہیں تھی اس لیے اس کے لبوں پر پڑا تالا نہیں کھلا اور وہ چپ چاپ بیٹھی پھول پتوں کو دیکھتی رہی۔ اس طرح وہ آصف خان سے نظریں ملانے سے بچ رہی تھی۔

"میں پٹھان زادہ ہوں اور ہم پٹھان بھی اپنی بات سے نہیں پھرتے۔ میری ہر پیشکش اور خواہش ہمیشہ آپ کے سامنے رہے گی، بس اب یہ آپ پر ہے کہ آپ کب مجھے اعتبار کے لائق سمجھتی ہیں۔" اس کی خاموشی اور تذبذب کو محسوس کرکے آصف خان نے مختصراً اس سے کہا اور خود جھٹکے سے وہاں سے اٹھ گیا۔ جولیٹ خالی خالی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس نے عارف کی برسوں کی دوستی اور محبت کو ایک لمحے میں بدلتے ہوئے دیکھا تھا، وہ بھلا کسی دوسرے پر اتنی آسانی سے کیونکر اعتبار کرسکتی تھی۔

☆☆☆

ربن کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ ایک ایک لمحہ اس پر بھاری تھا۔ ہر طرف بندے دوڑا کر بھی کسی طور چین نہیں تھا۔ لطیف ناجائی کی طرف سے ملنے والی فاروق کے اغوا کی خبر اور اغواکاروں میں پولیس کے ایک ٹاؤٹ کی شمولیت نے اس کی تشویش کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اپنی طرف سے سارے اقدامات کر ڈالنے کے باوجود اسے اطمینان نہیں تھا چنانچہ جب اور کچھ نہیں سوجھا تو الٹے قدموں دوبارہ اس ٹھکانے پر جا پہنچا جہاں انسپکٹر وکرم کو رکھا گیا تھا۔ شکم سیری کے بعد نیند سے محروم رکھا گیا انسپکٹر وکرم ربن کو اپنے سامنے پا کر بپھر گیا اور مغلظات بکنے لگا۔ گالیوں کے ساتھ وہ ربن کو خوفناک انجام کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ ربن نے ایک آدھ منٹ تو اس کی یہ بکواس سنی پھر ایک اتنا زوردار تھپڑ اس کے داہنے رخسار پر رسید کیا کہ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا اور زبان یوں بند ہوئی جیسے کہیں سے سوئچ آف کر دیا گیا ہو۔ ربن نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کے گھوم جانے والے منہ کا رخ اپنی طرف کیا تو وکرم کی یہ حالت تھی کہ گال کا اندرونی حصہ پھٹ جانے کے باعث خون بہہ رہا تھا۔ بہنے والے خون میں دو دانتوں کے ٹوٹ جانے سے نکلنے والا خون بھی شامل تھا۔ منہ سے نکل کر بہتا خون وکرم کے لباس پر ٹپک کر اسے داغدار کر رہا تھا۔ صرف ایک تھپڑ نے اس کی ایسی حالت بنا دی تھی جیسے اس پر بدترین تشدد کیا گیا ہو۔ ربن کا یہی کمال تھا۔ اول تو وہ کسی پر ہاتھ اٹھاتا نہیں تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اس کے آدمی ہی سارے معاملات دیکھ لیں لیکن اگر اس کا ہاتھ کسی پر اٹھ جاتا تھا تو اس بندے کی خیریت مشکوک ہوتی تھی۔

"اپنا شہزادہ کہاں ہے؟ پولیس نے اسے اغوا کروا کر کدھر رکھا ہے؟" وکرم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے بے پناہ سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا لیکن وہ ابھی تک تھپڑ کے صدمے کے اثر میں تھا اور منہ میں جمع ہوجانے والے خون کو تھوک رہا تھا اس لیے اس کا سوال نہیں سمجھ سکا۔

"کدھر ہے اپنا بچہ؟" اس کی طرف سے جواب نہ پا کر ربن کے اشتعال میں اضافہ ہوگیا اور اس نے مٹھی میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



جکڑے وکرم کے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے میں اتنا زور تھا کہ وکرم کے بالوں کے کئی گچھے سے ربن کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس بار وکرم کے ہونٹوں سے ایک بلند چیخ برآمد ہوئی۔

"جلدی سے اپنے کو فاروق کا پتا بتا ورنہ تیری چندیا پر ایک بال نہیں رہے گا۔ ایسے ہی کھینچ کھینچ کر کھال سمیت تیرے پورے بال نکال لے گا۔" ربن نے اسے دھمکایا۔

"اپنے کو نہیں پتا دادا۔ اپن لاسٹ ٹائم لونڈے کو کورٹ میں دیکھے تھے۔ اس کے بعد اپنے کو اس کی کوئی خبر نہیں۔" وکرم ربن کے لہجے کی خوفناکی سے ڈر گیا اور گڑگڑانے والے انداز میں بولا۔

"اپنے کو تیری یہ رام کہانیاں نہیں سننی ہیں۔ اپنے کو بس اپنا بچہ چاہیے۔" ربن دیوانہ ہو رہا تھا۔ عالمِ دیوانگی میں اس نے وکرم کی ایک نہیں سنی اور چاروں ہاتھ پیروں سے اس پر پل پڑا۔ وکرم اس وقت بندھا ہوا نہیں تھا لیکن ربن کے تابڑتوڑ حملوں کے جواب میں اپنا دفاع بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

ربن نے دو تین منٹ کے اندر اس کا بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ وہاں موجود اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اسے روک پاتا لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر وکرم اسی طرح پٹتا رہا تو اپنی جان سے چلا جائے گا۔ وہ ربن کو روکنے کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو اشارے ہی کر رہے تھے کہ خود ربن نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وکرم کی بے ہوشی اس کے ہاتھ روکنے کا سبب بنی تھی۔ وہ آنکھوں کے ڈھیلے پھیرے فرش پر کسی حقیر چوہے کی طرح پڑا ہوا تھا۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" ربن نے سرد لہجے میں اپنے پیچھے کھڑے آدمی کو حکم دیا۔ وہ تیزی سے بے ہوش وکرم کی طرف بڑھا جبکہ دوسرے نے ربن کو بیٹھنے کے لیے پھرتی سے کرسی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اسے پانی کا گلاس بھی تھمایا۔ ربن نے پانی پیا تو اس کے چہرے کے تاثرات میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔

"اپنے کو لگتا ہے دادا اسے خبر نہیں ہے۔ ورنہ تمہارے سامنے جم نہیں سکتا تھا۔" تبدیلی کو محسوس کر کے پانی پیش کرنے والے نے اپنی رائے اس کے گوش گزار کی۔

ربن جواب میں ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ ویسے اس نے خود بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ وکرم کو فاروق کے بارے میں علم نہیں ہے۔ وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اثنا میں بے ہوش وکرم کو ہوش میں لایا جا چکا تھا۔ اسے ہوش میں لانے والے نے اس کے چہرے پر پانی ڈالا تھا۔ پانی نے خون کے ساتھ مل کر وکرم کی عجیب ہی ہیئت بنا دی تھی۔ پانی کے ساتھ مل کر خون کی سرخی اس کے سارے کپڑوں پر پھیل گئی تھی۔ بائیں آنکھ تقریباً بند ہو گئی تھی۔ ہونٹوں پر سوجن آنے لگی تھی اور سر کے مختصر بال بھیگ کر پیشانی پر چپک گئے تھے۔ وہ یوں ہانپتے ہوئے سانس لے رہا تھا جیسے اسے اس عمل میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ زمین پر چپ پڑے اس انداز میں سانس لینے سے اس کی بھاری بھرکم توند بڑے مضحکہ خیز انداز میں پھول پچک رہی تھی۔

ربن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے اتنے قریب جا کھڑا ہوا کہ اس کے جوتے کی نوک وکرم کے بائیں کان کو چھو رہی تھی۔

"اپنے کو کچھ خبر نہیں ہے دادا! اپن بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہے کہ پولیس والوں نے فاروق استاد پر ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔ تم بولو تو اپن اپنی ماں کی، اپنے بچوں کی سوگند کھا کر تمہیں وشواس دلاتا ہے۔" ربن کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر وکرم خوف زدہ ہو گیا اور قسمیں کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"آخری بار سوچ لے وکرم! اگر بعد کو ثابت ہوا کہ فاروق کے غائب ہونے میں پولیس کا ہاتھ تھا تو اپن تیری پوری نسل کو مٹا دے گا۔" ربن نے خوفناک لہجے میں اسے دھمکی دی۔

"جو تمہارا من کرے وہ سزا دینا دادا، پر وشواس کرو اپن تم سے ایک دم سچ بول رہا ہے۔" وکرم کی ساری اکڑ ختم ہو چکی تھی اور وہ بالکل تیر کی طرح سیدھا ہو گیا تھا۔

"اپن مان لیتا ہے کہ تیرے کو فاروق کے بارے میں خبر نہیں ہے، پر مجو کے بارے میں تو تو اچھی طرح جانتا ہے نا۔ بتا کس بل میں چھپا کر رکھا ہے اسے۔" وہ پریشان تھا اور فاروق کے سوا اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، اس کے باوجود وہ وکرم کو یہاں لائے جانے کے اصل مقصد کو نہیں بھولا اور اس سے مجو کی بابت سوال کر ڈالا۔ اس سوال کے جواب میں وکرم نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی خاموشی کے نتیجے میں ربن کی ٹانگ چلی اور ایک زوردار ٹھوکر وکرم کی کنپٹی پر پڑی۔ یہ ٹھوکر بڑی نپی تلی تھی۔ اس نے وکرم کو بلبلانے پر ضرور مجبور کیا لیکن اس کی شدت اتنی نہیں تھی کہ وکرم اپنے حواس کھو کر بے ہوش ہو جاتا۔

"زبان نہیں کھولے گا تو اپن ٹھوکریں مار مار کر تیری کھوپڑی کھول دے گا۔ آج تک تو اپنی پھینکی ہڈی کھاتا رہا ہے پر اب تجھے یہ بھی اچھی طرح پتا لگ جائے گا کہ ربن دادا کی مار کھا کر بندے کا کیا حال ہوتا ہے۔ اپن تیرے کو

مرنے نہیں دے گا پر زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں چھوڑے گا۔''

ربن نے اپنی بات مکمل کر کے اس کی کنپٹی پر ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ اس ٹھوکر نے وکرم کو پہلے سے بھی زیادہ بلبلانے پر مجبور کر دیا اور اس کا موٹا تازہ وجود فرش پر یوں مچلنے تڑپنے لگا جیسے ذبح کیا جانے والا جانور جان کنی کے عالم میں تڑپتا ہے۔ اس کے حلق سے کسی ذبح ہونے والے جانور ہی کی طرح خرخراہٹ برآمد ہونے لگی۔

''پانی پلاؤ اسے۔'' ربن نے حکم دیا۔ فوراً ہی وکرم کے منہ میں پانی ڈالا گیا۔ پانی کا بیشتر حصہ اس کی باچھوں سے بہہ گیا لیکن جو چند قطرے حلق کے اندر گئے، انہوں نے بھی کام دکھا دیا اور وکرم کی خرخراہٹ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اسے دوبارہ پانی پلایا گیا۔ اس بار اس نے پانی پی لیا اور اس کی حالت سنبھلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ربن کھڑا خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وکرم کافی حد تک سنبھل گیا تو سرد لہجے میں بولا۔

''ابھی تو نے صرف ٹریلر دیکھا ہے۔ اپن تیرے کو جیتے جی نرک کی سیر کروا دے گا۔ اچھی طرح سوچ لے۔ کیوں اس حرام کے تپے کے لیے اپنی جندگی (زندگی) خراب کرتا ہے۔ وہ ایسا سور ہے کہ اپنے باپ کا بھی نہیں بن سکتا تو کس کھیت کی مولی ہے۔''

''اپنے کو شما کر دو دادا، اپن صرف اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ گورے افسر پر ہاتھ ڈال کر تم نے خود سرکار کو اپنے پیچھے لگایا تھا۔ سرکار بولی مجرم کو فوراً پکڑنے کا ہے۔ مجو نے اپنے کو ٹپ دے دیا کہ اس کام میں تمہارا ہاتھ ہے۔ اپنے پر اوپر والوں کا زور نہیں ہوتا تو اپن اس لفڑے میں نہیں پڑتا، پر اپنی نوکری بچانے کو اپن کو تمہارے خلاف جانا پڑا۔'' پہلے ربن کو دھمکیاں دینے والا وکرم اب اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

''جاستی بات نہ کر وکرم۔ اپنے کو سب خبر ہے کہ تیرے اوپر کتنا دباؤ تھا اور کتنا تو اپنی ترقی کے لالچ میں اندھا ہو رہا تھا۔ تو سمجھتا تھا کہ اپنے کو گورے ولیم کے کیس میں پھنسا کر تو بہت بڑا افسر بن جائے گا، پر ابھی یہ ساری باتیں جانے دے۔ ابھی تو اپنے کو صرف یہ بتا کہ مجو کدھر ہے؟'' ربن اس کی کسی وضاحت کو خاطر میں نہیں لایا اور اپنے مطالبے پر قائم رہا۔

''ادھر ہی تھا وہ جدھر اپن جاتا تھا۔'' وکرم نے بالآخر زبان کھول ہی دی۔

''ادھر..... مطلب تیری رکھیل کے مکان پر.....'' اس کے کیے انکشاف پر ربن چونکا۔

''ہاں ادھر ہی۔ ادھر اس کو چھپانے میں، یہ فائدہ تھا کہ اپن وہاں اس سے ملنے بھی جاتا تھا تو کسی کو شک نہیں پڑتا تھا اور دیکھنے والوں کو یہی لگتا تھا کہ اپن ادھر چندا سے ملنے جاتا ہے۔'' اس نے اپنی رکھیل کا نام لیا تو ربن کو بھی اس کی چالاکی تسلیم کرنی پڑی۔ واقعی خود اسے بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے مجو کو ایسی جگہ رکھا ہوگا۔

''تیرے کو ماننا پڑے گا وکرم..... تو سالا ایک نمبر کا کمینہ ہے۔ چل ٹھیک ہے تو ابھی ادھر اپنا مہمان بن کر رہ۔ اپن اس دوسرے حرام کے جنے کو دیکھتا ہے۔''

''اپنے کو جانے دو دادا۔ اپن تمہیں تمہارے کام کی بات بتا دیا اب تم اپنے کو یہاں روک کر کیا کرے گا۔ تم اپنے کو جانے دو تو اپن یہیں بات ختم کر دے گا۔ کسی کو نہیں بولے گا کہ تم اپنے ساتھ کیا کیا۔'' ربن وہاں سے ہٹا تو پیچھے سے وکرم اسے پکار پکار کر کہتا رہا۔ ربن نے اس کی ہر پکار ان سنی کر دی۔ اب اسے وہاں سے جانے کی جلدی تھی۔ فاروق والا معاملہ اپنی جگہ لیکن وہ مجو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ مجو نے اسے بڑے نقصانات سے دوچار کیا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ سانپ جیسا دشمن کس بل میں چھپ کر بیٹھا ہے۔ اب بل کا پتا مل گیا تھا تو ضروری تھا کہ فوری اسے گھیر لیا جائے۔ فاروق کے سر پر لگنے والی کاری چوٹ، کمو کا قتل اور ایک موقع پر اپنے آدمیوں کو دھوکے سے گھیر کر بری طرح زخمی کرنے کے مجو کے جرائم اسے بھولے نہیں تھے۔ اسے مجو سے اس کے ہر عمل کا حساب لینا تھا اس لیے ضروری تھا کہ فوری طور پر اس پر ہاتھ ڈالا جائے۔ وہ وہاں موجود افراد میں سے ایک کو وکرم کے بارے میں جلدی جلدی ہدایات دیتا ہوا وہاں سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ رامو وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر جوش تھا۔

''اپنے کو معلوم تھا کہ تم ادھر ہی آئے ہو گے اس لیے اپن تمہیں ڈھونڈنے کے لیے سیدھا ادھر ہی آیا۔ ادھر وہ سارے سالے تمہارے لیے پریشان ہیں۔ بڑی خبر لے کر آئے ہیں اس واسطے تمہیں ڈھونڈتے ہیں۔'' ربن کو دیکھتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''خبر تو اپن کے پاس بھی بہت بڑی ہے پر پہلے تو بول۔ فاروق کا کچھ پتا چلا کیا؟'' ربن نے اس سے دریافت کیا۔

''ہاں دادا! سن گن ملی ہے۔ ڈبل روٹی والے نے

جس بندے کا بولا تھا، وہ بندہ مل گیا ہے۔ سالا چڑھا کر کوٹھوں کی طرف ہی جارہا تھا کہ دھر لیا گیا۔ نشے میں اس نے دو چار تھپڑ کھا کر ہی اگل دیا کہ فاروق کو اٹھانے کا کام اسے بھاٹیہ سیٹھ کے منیجر نے دیا تھا۔ سالا غنڈا موالی ہے اور جو پڑی ڈالے اس کا کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اس کی طرح کرائے کے پٹھو ہیں۔ اپنے آدمیوں نے اس سے اس گودام کا پتا بھی معلوم کرلیا ہے جہاں انہوں نے فاروق استاد کو پہنچایا تھا۔ سب ادھر اس گودام کے آس پاس جمع بھی ہو گئے ہیں، پر بھاٹیہ سیٹھ کے ساتھ تمہارے معاملات چلتے ہیں اس واسطے تمہاری اجازت ملنے کے انتظار میں ہیں۔''

رامو نے اسے ساری کتھا مختصراً سنا ڈالی۔ ساری بات سن کر ربن سمجھ گیا کہ اصل میں یہ بملا بھاٹیہ کی کارروائی ہے۔ وہ بڑے تہلکہ خیز مزاج کی عورت تھی اور اپنی نوعیت کا ایک الگ ہی کردار تھی۔ ایک طرف مہذب، مخلص، تعلیم یافتہ اور دوستانہ مزاج کی نالک لگتی تھی تو دوسری طرف انا پرست اور منتقم مزاج تھی، اس کے مزاج کے دوسرے رخ کی یہ انتہا تھی کہ اس نے اس آدمی کو جس سے اس نے باپ کی مخالفت مول لے کر محبت کی شادی کی تھی، یہ پتا چل جانے پر کہ وہ اس کی دولت کے لالچ میں اس کی زندگی میں آیا تھا نہایت آسانی سے قتل کروا دیا تھا۔ پھر وہ فاروق کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی اور چاند بانو کو اپنا رقیب جان کر اس پر قاتلانہ حملہ کروا دیا تھا۔ چاند بانو کے ساتھ کی گئی اس کارروائی پر برافروختہ ہو کر فاروق نے اس کا سخت احتساب کیا تھا جو لازماً اس امیر زادی کو ناگوار گزرا تھا اور اس نے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے فاروق کو اغوا کروا لیا تھا۔ بملا کا جو کردار اب تک ربن کے سامنے آیا تھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ وہ فاروق کے اغوا میں اس کے ملوث ہونے کے شک کے بعد اطمینان سے بیٹھ سکتا۔ اس نے فوراً ہی رامو سے کہا۔

''بھاڑ میں گیا بھاٹیہ سیٹھ اور اس سے اپنے معاملات۔ اپنے شہزادے کے سامنے اپن کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا ہے۔ اپنے آدمیوں سے بولو سیٹھ کے گودام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں اور وہاں سے فاروق کو نکال لائیں۔''

''ٹھیک ہے دادا جیسے تم بولو۔'' رامو اس کے حکم پر مستعدی سے عمل کرنے کے لیے تیار تھا۔

''ایک اہم معاملہ اور ہے رامو! مجو کا پتا چل گیا ہے کہ وہ کس بل میں چھپ کر بیٹھا ہے۔'' وہ دونوں ساتھ ہی وہاں سے روانہ ہوئے اور راستے میں ربن نے رامو کو بتایا۔

''کیا بولتے ہو دادا! اس کا مطلب ہے سالے وکرم نے زبان کھول دی۔'' رامو اس اطلاع پر چونکا۔

''ہاں۔ سالا مجو ادھر وکرم کی رکھیل کے مکان پر ہی چھپا ہوا ہے۔ چار چھ بندے ادھر بھیج کر اسے بھی منگوانا ہے۔ بہت ناک میں دم کر دیا ہے اس سالے نے...... اب اس کا قصہ بھی پاک ہو جائے تو اچھا ہے۔'' ربن نے اپنا فیصلہ سنایا جس سے رامو کو اختلاف نہیں تھا۔ اڈے پر پہنچتے ہی بندے تیار کیے گئے۔ رامو نے مجو کو پکڑنے کے لیے جانے والی ٹولی کی سربراہی سنبھالی جبکہ ربن نے فاروق کی بازیابی کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ فاروق کے سیٹھ کے گودام میں ہونے کی اطلاع سن کر اس کے آدمی پہلے ہی گودام کے آس پاس جمع ہو چکے تھے اس لیے ربن کو مزید نفری اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی، البتہ اب تک کسی پیش رفت کے انتظار میں جاگتے منو اور اکبر زبردستی اس کے ساتھ چل پڑے۔ ربن انہیں منع کرنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ چند دنوں میں ہی اکبر اور منو فاروق سے کتنی محبت کرنے لگے ہیں۔ محبت کرنے والوں کو محبوب کی مشکل دور کرنے کے لیے عمل کی اجازت نہ دینا ان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے چنانچہ اس نے ان دونوں کے ساتھ چلنے پر زیادہ اعتراض نہیں کیا تھا۔ رات کے بالکل آخری پہر جب سارا شہر بے خبری کی نیند میں ڈوبا ہوا تھا، وہ لوگ بھاٹیہ سیٹھ کے گودام والے علاقے میں پہنچے تو سب سے پہلے وجے سے ٹکراؤ ہوا۔

''کیا بولتا ہے رے تو؟'' ربن نے اپنے مخصوص انداز میں اس سے رپورٹ طلب کی۔

''یہ سیٹھ کا پٹ سن کا گودام ہے دادا۔ ڈھاکے سے منگائی پٹ سن ادھر دبا کر رکھا ہے سیٹھ۔ گودام کی نگرانی کے لیے ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہے۔'' وجے نے اسے اطلاعات فراہم کیں تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گیا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

''چوکیدار کدھر ہے؟'' ذرا سے توقف کے بعد اس نے وجے سے دریافت کیا۔

''پہلے تو گودام کے آس پاس راؤنڈ مار رہا تھا لیکن اب بہت دیر سے دروازہ بند کر کے اندر ہی ہے۔ لگتا ہے سو گیا ہے۔'' وجے نے اسے بتایا پھر بے چینی سے بولا۔

''کیا بولتے ہو دادا! دروازہ توڑ کر اندر گھس جائیں؟''

''نہیں رے۔ تھوڑا شانتی سے کام لے۔ ابھی اپن

آ کے جا کر دروازہ بجاتا ہے۔ چوکیدار دروازہ کھولے گا تو اس سے نمٹ لے گا۔ تم لوگ آس پاس ہوشیاری سے رہنا۔ اپن اشارہ دے تو اندر گھس آنا۔'' ربن نے اسے اپنی سوچی ہوئی حکمت عملی سے آگاہ کیا۔

''اپن چلے تمہارے ساتھ؟'' دجے کی بے چینی برقرار تھی۔

''نہیں رے۔ جاتی آدمی دیکھ کر وہ بدک جائے گا۔ اپن بنا ہنگامے کے ہی معاملہ نمٹا لینا چاہتے ہیں۔'' ربن نے اسے انکار کیا۔ شہر کے اس علاقے میں رہائشی مکانات اتنے قریب نہیں تھے اور سیٹھ کے گودام کے آس پاس بھی زیادہ تر گودام ہی بنے ہوئے تھے۔ اس لیے رات کے آخری پہر یہاں باقی شہر کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ربن اپنے سارے ساتھیوں کو پیچھے تاریکی میں چھوڑ کر اکیلا آگے بڑھا اور گودام کے لوہے کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پل بھر کے لیے اندر کی سن گن لینے کے بعد اس نے لوہے کے بھاری کنڈے سے دروازے کو بجایا۔ اس نے کنڈا بہت زور سے نہیں کھٹکایا تھا لیکن سناٹے میں خاصی آواز محسوس ہوئی اور اندر سویا ہوا چوکیدار فوراً ہی جاگ گیا۔ ربن دستک دیتے ہی زمین پر اس انداز میں بیٹھ گیا تھا کہ اس کا سر اس کے گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔ اندر موجود چوکیدار نے دروازے کی درمیانی جھری سے جھانک کر دیکھا اور پھر حیرت بھری آواز میں پوچھنے لگا۔

''کون ہو بھائی؟ اتنی رات کو ادھر کیا کرتے ہو؟''

''اپن ادھر پیچھے چاول کے گودام پر کام کرتا ہے۔ اپن کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اپن کی مدد کرو۔'' ربن نے سر اٹھائے بغیر گھٹی گھٹی آواز میں اسے جواب دیا۔ اس کی گھٹی ہوئی آواز میں اتنا کرب تھا کہ چوکیدار احتیاط کا دامن چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے بھائی۔ اس ٹیم (ٹائم) تو ادھر سواری بھی نہیں ملتی۔'' ربن کے قریب پہنچ کر وہ تشویش سے بولتا ہوا اس پر جھکا۔ اسی لمحے ربن نے اپنی انگلیوں میں دبا ہوا چاقو سامنے کیا اور چوکیدار کی گردن سے لگا کر سیدھا کھڑا ہوتا ہوا غرایا۔

''خبردار جو آواز نکلی۔ گردن کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' اس کی غراہٹ میں ایسی کاٹ تھی کہ چوکیدار بے چارے کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ربن اسے دھکیلتا ہوا گودام کے کھلے دروازے سے اندر لے گیا۔ اسی لمحے وہ اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ تاریکی سے نکلے اور دندناتے ہوئے گودام میں گھس گئے۔

''پورے گودام کی تلاشی لو۔'' ربن نے انہیں حکم دیا اور خود سہمے ہوئے چوکیدار کی طرف متوجہ ہوا۔

''وہ لونڈا کدھر ہے جسے سیٹھ کے غنڈے یہاں لائے تھے؟'' سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد خونخوار تھا۔

''اپنے کو نہیں معلوم۔'' چوکیدار نے اٹکتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا اور شدومد سے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''کیسے نہیں معلوم۔ اپنے پاس پکی خبر ہے کہ اس کو ادھر ہی لائے تھے۔'' ربن نے چاقو کی نوک اس کی گردن میں چبھوئی۔

''لائے تھے پر صرف گھنٹا بھر کے لیے۔''

''پھر..... پھر اس کے بعد کہاں لے گئے؟'' ربن نے بے قراری سے پوچھا۔

''یہ اپنے کو نہیں معلوم۔ مہیش صاحب اپنے آدمیوں کے ساتھ آ کر اسے ادھر سے لے گئے تھے۔'' گردن میں گڑی چاقو کی نوک چوکیدار کو ہر سوال کا جواب فر فر دینے پر مجبور کر رہی تھی۔

''مہیش کون..... سیٹھ کا منیجر.....؟''

''ہاں وہی۔'' چوکیدار نے شرافت کے ساتھ تصدیق کی۔

''ادھر کوئی نہیں ہے دادا۔ اپن لوگ نے سارا گودام الٹ ڈالا ہے پر فاروق استاد کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔'' اسی وقت جانی وہاں آیا اور متوحش لہجے میں اسے اطلاع دی۔

''وہ ادھر نہیں ہے رے۔ اسے ڈھونڈنے کو ابھی تھوڑے ہاتھ پیر اور مارنے ہوں گے۔'' ربن کو بھی فاروق کے نہ ملنے سے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی لیکن اس نے اپنے لہجے سے اس مایوسی کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پرسکون لہجے میں بولا۔

''اپن سمجھا نہیں دادا۔'' جانی اس کا جواب سن کر الجھا۔

''ادھر ہی کھڑے کھڑے سب سمجھے گا کیا۔ سالا اپنا سب آدمی لوگ کو ادھر سے نکلنے کا بول۔ بس تو، دجے اور قمرو رک جا۔ تم لوگوں کو ادھر تھوڑا کام کرنے کا ہے۔'' ربن نے اسے ہلکے سے جھاڑتے ہوئے حکم صادر کیا تو وہ فوراً تعمیل کے لیے چل پڑا جبکہ ربن دوبارہ چوکیدار کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت سرد لہجے میں بولا۔

''اپن کا بچہ ادھر سے نہیں ملا پر اپن ایسے ہی کسی کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اپن جاتے ہوئے اس

گودام کو آگ لگا کر جائے گا۔ تو بول کہ تیری چتا بھی ادھر ہی جلا دیں کیا؟"

"اپنے کو شما کرو دادا! اپن ایک دم نردوش ہے۔ اپن کو تمہارے لفڑے کی کچھ خبر نہیں۔ اپن تو بس ادھر نوکر ہے۔" زندہ جلا دینے کی دھمکی پر چوکیدار بے چارہ تھرا گیا تھا اور اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ ربن کے آگے جوڑ کر اس سے رحم کی درخواست کرنے لگا تھا۔

"پہلے تو یہ بول کہ مہیش کدھر ملے گا اپنے کو؟"

"مہیش صاحب ادھر جوہو کے علاقے میں فلیٹ میں رہتا ہے۔ شادی شدہ، بیوی بچوں والا آدمی ہے۔" چوکیدار نے اسے اطلاع دی۔ ربن نے اس سے تفصیل کے ساتھ مہیش کا پتا معلوم کیا جو چوکیدار نے فرفر بتا دیا۔ اصل میں مہیش کبھی کبھار اس سے اپنے ذاتی کام بھی کروا لیتا تھا اس لیے چوکیدار کا اس کے فلیٹ پر آنا جانا تھا اور اسے ربن کو اس کا پتا سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

"تو اپنے کو بڑی کام کی باتیں بتایا ہے اس لیے اپن تیرے کو زندہ چھوڑ رہا ہے۔ پر یاد رکھ ادھر سے سیدھا اپنے گھر جانے کا ہے۔ کسی کو تجبری کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھ لینا کہ اپن کا نام ربن دادا ہے اور ربن دادا سے بیر لے کر کوئی جاستی دیر ممبئی کی زمین پر سانس نہیں لے سکتا۔" ربن نے اسے زندگی کی نوید سنانے کے ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔

"اپن ویسا ہی کرے گا دادا جیسا تم نے بولا۔ تمہارا بہت بہت دھنیواد کہ تم نے مجھ نردوش کو مکتی دے دی۔" زندگی کی نوید پا کر چوکیدار کھل اٹھا اور ربن کا شکریہ ادا کر کے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"پھونک ڈالو رے سارا گودام۔" ربن نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ وہ سب پہلے ہی غم اور غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ ربن کا حکم پاتے ہی حرکت میں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد جب ربن سمیت وہ سب وہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو بھاٹیہ سیٹھ کا گودام شعلوں کی زد میں تھا اور فضا میں پٹ سن جلنے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ربن نے وہیں سے سیدھے جوہو کے علاقے کا رخ کیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ اپنی منزل تک پہنچے تو صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔ ان کے جسموں کو چھوتی ٹھنڈی نم ہوا سمندر کی قربت کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں نیند کا نام ونشان نہیں تھا۔ ان کے دلوں میں فاروق کا کھوج نکالنے کے سوا فی الحال کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ بہت بوجھل دلوں اور غصے کی آگ میں جلتے دماغوں کے ساتھ مہیش کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ جس عمارت میں رہتا تھا، وہ چار منزلہ تھی اور اس چار منزلہ عمارت میں اس کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ عمارت کے دروازے پر چوکیدار موجود نہیں تھا البتہ وہاں رکھی کرسی کے ساتھ ٹکا بڑا سا ڈنڈا دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر قبل ہی کسی ضرورت کے تحت وہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ ربن نے قمرو کو احتیاطاً باہر ہی چھپ کر نگرانی کرنے کی ذمے داری سونپی اور خود جانی اور وجے کے ساتھ آہستہ سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

نیم تاریک سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کے فلیٹ نمبر چھتیس تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ فلیٹ کے دروازے کے اوپر برقی بلب روشن تھا۔ بلب کی روشنی میں وہ اچھی طرح دیکھ سکتے تھے کہ دروازے میں آٹومیٹک انگریزی تالا لگا ہوا ہے۔ اس تالے کو دیکھ کر ربن کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے وجے کو تالا کھولنے کا اشارہ کیا۔ وجے اپنی جیب سے ایک تار نکال کر تالے پر جھکا۔ اس کی مشاق انگلیوں نے منٹوں میں تالا کھول دیا۔ تالا کھلتے ہی اس نے ہینڈل دبا کر دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ نہایت آسانی سے بے آواز کھل گیا۔ وہ تینوں دبے قدموں اندر داخل ہوئے۔ فلیٹ میں دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور مکین یقیناً بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ یہ دو کمروں کا فلیٹ تھا جس کا لاؤنج خاصا کشادہ تھا اور اس لاؤنج میں ہی قیمتی صوفے اور قالین وغیرہ ڈال کر اسے ڈرائنگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ ربن لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر ٹک گیا جبکہ جانی اور وجے فلیٹ کا جائزہ لینے لگے۔

"رائٹ والا کمرا بچوں کا ہے۔ دو بابا لوگ ہے چھ سے آٹھ سال کا۔ لیفٹ کے کمرے میں مہیش اور اس کی بیوی سو رہے ہیں۔ ان چار افراد کے علاوہ یہاں کوئی اور نہیں ہے۔" جانی نے اسے رپورٹ پیش کی۔

"بچوں کو سوتا رہنے دے اور مہیش اور اس کی بیوی کو اٹھا کر یہاں لے آ۔" ربن نے حکم دیا تو چند لمحوں میں ہی وہ دونوں میاں بیوی اس حال میں اس کے سامنے تھے کہ جانی اور وجے کے چاقو ان کے پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے اور وہ شب خوابی کے لباس میں حواس باختہ سے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"دادا تم!" لاؤنج میں ابھی تک روشنیاں نہیں جلائی

گئی تھیں اور بس کھڑکیوں سے آتی صبح کی دھندلی سی روشنی ہی موجود تھی، اس لیے مہیش کو ربن کو شناخت کرنے میں کچھ دیر لگی۔ تاخیر کے اسباب میں دماغ پر نیند کے اثرات اور اس کی حواس باختگی بھی شامل تھی۔ ربن، بھابیہ کے لیے کام کر رہا تھا اس لیے وہ بھابیہ کے منیجر کی حیثیت سے اسے پہچانتا تھا۔

"کیوں؟ تو کیا سمجھتا تھا کہ اپن تیرے تک نہیں پہنچ سکتا ہے کیا؟" ربن اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

"تم بمبئی کا دادا ہے۔ تمہارا جہاں من بولے وہاں جاسکتا ہے پر ادھر میرے پاس ایسے اس ٹائم کیا کرنے آیا ہے؟" منیجر نے اب کسی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا اس لیے لہجے سے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"تیرے کو اپنی نیند خراب ہونے کا بہت دکھ ہے اور ادھر جو اپنے کو پوری رات پلک جھپکنے کو بھی نہیں ملی اس کا کچھ خیال نہیں۔ تو کیا سمجھا تھا کہ اپن تیرے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تو ایسا سمجھا تھا تو تو نے ربن دادا کو بہت ہلکا لیا تھا رے۔ اپن ایسا ہلکا ہوتا تو اڈے کی چوکی پر نہیں بیٹھتا، ادھر بازار میں طوائفوں کے لیے دلالی کر رہا ہوتا۔" ربن نے قہر بار لہجے میں اس سے کہا۔

"تم کیا بولتے ہو دادا، اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" مہیش نے اسے طرح دینے کی کوشش کی لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ ربن سے نظر ملانے کی ہمت نہیں کرسکا تھا۔

"ایسا کر جانی! ادھر کمرے میں جو اس کا بچہ لوگ سو رہا ہے اسے اٹھا کر یہاں لا۔ اپنے من کو لگے گی تو اس کی عقل میں خود ہی سب کچھ آجائے گا۔" ربن نے نظریں مہیش پر ہی مرکوز رکھیں اور سرد لہجے میں جانی کو حکم دیا۔ اس کا یہ حکم سن کر مہیش سے پہلے اس کی بیوی نے ردعمل دیا اور بلبلا کر بولی۔

"میرے بچوں کو کچھ نہیں کہنا۔ ان معصوموں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اگر تمہارا مہیش سے کوئی جھگڑا ہے تو اسی سے بات کرو۔"

"اپن بولا نا کہ اپنے من کو لگے تو پتا چلتا ہے۔ ابھی اپن صرف تیرے بچوں کا نام لیا ہے تو تو ایسے بلبلا رہی ہے اور ادھر اپن رات بھر سے اپنے بچے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ بول اپنے پتی سے کہ ہمیں ہمارے بچے کا پتا بتائے ورنہ خود بھی سہنے کو تیار ہو جائے۔" ربن نے زہر خند لہجے میں مہیش کی بیوی سے کہا تو وہ اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی اور سخت لہجے میں بولی۔

"یہ سب کیا ہے مہیش...... یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے۔ اس کے بچے کے غائب ہونے میں تمہارا کیا رول ہے؟"

"تم شانت رہو شلپا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔" مہیش کی اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے تھے تاہم وہ بیوی کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم کچھ بھی کرو لیکن میرے بچوں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" شلپا کا لہجہ ہذیانی ہونے لگا۔

"میں نے کہا نا کہ شانت رہو۔ میں بات کرتا ہوں۔" مہیش نے اس بار قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ بیوی کو تسلی دی اور خود ربن کی طرف متوجہ ہوا جو بہت تولنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہیش کے اپنی طرف متوجہ ہونے پر اس نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر خود بولنا شروع کر دیا۔

"اپنے کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرنا مہیش۔ اپن پکی خبر پر ادھر تیرے پاس آیا ہے۔ سیٹھ کا وہ گودام جدھر سے تو نے فاروق کا ڈیلیوری لیا ہے، اب تک جل کر بھسم ہو چکا ہوگا۔ ابھی اپنے کو اپنا بچہ نہیں ملا تو اپن پورے شہر کو بھی آگ لگا سکتا ہے اور شہر میں سب سے پہلے جلنے والا گھر اب تیرا ہوگا۔" مہیش نے اس کے لہجے کی سفاکی اور پختگی دونوں کو محسوس کیا اور ہار ماننے والے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے دادا۔ ابھی میں تم کو سب کچھ بتاتا ہوں پر تم اب اور دھمکیاں دے کر میری پتنی کو ڈرانے کی کوشش مت کرنا۔"

"اپنے کو ایسا کوئی شوق نہیں ہے پر تو اپنے سے جھوٹ بولا تو اپن خالی خولی دھمکی نہیں دے گا عمل بھی کرے گا۔"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" مہیش نے اسے یقین دلایا۔

"یہ تو نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ اپنی پتنی کے ساتھ ادھر صوفے پر بیٹھ جا پھر بتا کہ ماجرا کیا ہے؟" اسے سچ بولنے پر آمادہ دیکھ کر ربن نے بھی نرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا اشارہ پاکر جانی اور دوجے پیچھے ہٹ گئے۔ پہلوؤں سے لگے چاقو دور ہٹنے پر دونوں میاں بیوی نے قدرے سکون کا سانس لیا اور پہلو بہ پہلو ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اب بول۔ کدھر ہے اپنا شہزادہ؟"

"تم وشواس کرو دادا تو مجھے بھی اس کا پتا معلوم نہیں ہے۔ میں نے بملا میڈم کے آرڈر پر اسے اغوا کروایا تھا۔ اغوا کرنے والوں میں دو کرائے کے آدمی تھے اور دو سیٹھ کے اپنے آدمی۔ تم کو پتا ہوگا کہ سیٹھ اپنے کام نکلوانے کے

لیے ایسے کئی آدمی پال کر رکھتا ہے۔ ان آدمیوں نے تمہارے لونڈے کو اغوا کر کے گودام میں پہنچایا اور گودام سے میں نے بملا میڈم کے حکم پر نکال لیا۔ میں جس گاڑی میں اسے گودام سے لایا تھا، وہ بملا میڈم کی تھی۔ میں گاڑی لے کر میڈم کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو اس نے مجھے گاڑی سے اترنے کا حکم دیا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر اسے چلاتی ہوئی وہاں سے آگے نکل گئی۔ آگے وہ کدھر گئی اور کیا کیا، مجھے کچھ نہیں پتا۔ تم بولو تو میں اپنے بچوں کی سوگند کھا کر تمہیں وشواس دلا سکتا ہوں کہ میں جو کہہ رہا ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ مہیش دھیرے دھیرے اسے ساری تفصیل سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ ربن نے یہ سب سنا تو اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ صورتِ حال ایسی ہو چکی ہے کہ اب بھالیہ سیٹھ سے براہِ راست بات کیے بغیر چارہ نہیں رہا ہے۔ سیٹھ اس کی بات سن کر سمجھ لیتا تو ٹھیک تھا ورنہ اسے انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی آتی تھیں۔

”سیٹھ کو پتا ہے اپنی بیٹی کے ان کرتوتوں کا؟“ ربن نے دریافت کیا۔

”مجھے پکا نہیں معلوم دادا، پر شاید نہ پتا ہو۔ بیٹی خودسر ہے اور اپنی چلانے کی عادی بھی...... پرنتو میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ اس نے سیٹھ سے پرمیشن لی ہے یا نہیں۔ کچھ بھی بولو وہ مالکن ہے اور سیٹھ کے بعد سب اسی کے کنٹرول میں ہوگا۔“ منیجر نے اپنی مجبوری بیان کی۔ واقعی وہ مستقبل کی مالکن کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بیماریوں کا شکار ایک ٹانگ سے معذور سیٹھ عمر کی آخری منازل طے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کی ساری جائداد کی مالک اس کی اکلوتی بیٹی بملا ہی ہوتی اور وہ جس مزاج کی عورت تھی، اسے دیکھتے ہوئے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ آج جو لوگ اس کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، کل وہ چارج سنبھالنے کے بعد انہیں معاف کر دے گی۔ وہ بلا کی منتقم مزاج تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اپن تیرے کہے ہر شبد کو سچ مانتا ہے اور تیری اور تیرے بچوں کی جاں بخشی کرتا ہے لیکن یاد رکھنا کہ اگر بعد کو کہیں تو جھوٹا ثابت ہوا تو اپنے ہاتھ اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ تیری گردن تک نہ پہنچ سکیں۔“

”میں نے ایک ایک شبد سچ بولا ہے دادا۔ میں اپنے بچوں کی سوگند کھا کر کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔“ مہیش نے اسے یقین دہانی کرائی۔ اس بار وہ زبان سے کچھ نہیں بولا اور جانی اور وجے کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑے۔ رات بھر کی خواری کے باوجود فاروق کے نہ مل سکنے پر وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ دکھی اور مایوس تھے لیکن ربن کا خیال کر کے انہوں نے زبان سے اظہار نہیں کیا۔ وہ تینوں آگے پیچھے چلتے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ تین اجنبیوں کے عمارت سے برآمد ہونے پر وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

”اے، کدھر سے آ رہے ہو تم لوگ؟“ اس نے کڑک دار لہجے میں دریافت کیا۔

”تو اپنی ڈیوٹی ٹھیک سے کرے گا تو تجھے پتا چلے گا نا کہ ادھر کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔ چل ہٹ اب راستے سے ورنہ بہت برا ہوگا۔“ وجے نے اسے دھمکایا۔

”ایسے کیسے ہٹ جائے اپن۔ ابھی تم کو پہلے بتانا ہوگا کہ تم کدھر گیا تھا۔“ چوکیدار راستے سے نہیں ہٹا۔ اسی وقت ربن نے وجے کو شانت رہنے کا اشارہ کیا اور خود نرمی سے بولا۔

”اپن ادھر اوپر مہیش بابو کے پاس کام سے آیا تھا۔ تم کو پوچھنا ہے تو اس سے پوچھ لو۔“

”تو ایسے بولو نا۔“ چوکیدار فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ باہر نکلے تو قمروان کا منتظر تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا تو وجے دھیمی آواز میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اب وہ منتظر تھے کہ ربن کیا فیصلہ کرتا ہے۔ ربن نے واپس اڈے جانے کا حکم سنایا۔ اس وقت تک اگرچہ صبح کی روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی لیکن اس کے علم میں تھا کہ بیمار سیٹھ بھالیہ صبح نو بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔ سیٹھ سے ملنے سے قبل وہ اپنا لائحہ عمل طے کر لیتا تو اچھا تھا پھر اسے راموکی سربراہی میں مجو کی تلاش میں جانے والوں کی بھی فکر تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس معاملے کا کیا ہوا اس لیے بھی اڈے جانا ضروری تھا۔ اڈے پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کا گولو سے سامنا ہو گیا۔ وہ دروازے کے باہر ہی موجود تھا اور لگتا تھا کہ بڑی بےقراری سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔

”کدھر چلے گئے تھے بابا! صبح آنکھ کھلی تو نہ تم تھے نہ فاروق بھائی۔ پوچھا تو کوئی کچھ بتاتا بھی نہیں تھا، بس یہی بولتے تھے کہ کام سے گئے ہیں۔“ رات جلدی سو جانے والے گولو کو کسی نے بھی حالات سے آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ ربن کی شکل دیکھتے ہی اس سے شکوہ کرنے لگا تھا۔

”کاہے کو پریشان ہوتا ہے۔ تیرے کو پتا نہیں ہے کیا اپنے دھندے کا۔ اپنے لیے رات، دن سب برابر ہے۔ پر کہیں بھی جائیں لوٹ کر تو ادھر ہی آتے ہیں نا۔“ ربن

نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے تسلی دی۔

"فاروق بھائی کدھر رہ گئے؟ وہ کیوں نہیں آئے تمہارے ساتھ؟" گولو نے فاروق کی عدم موجودگی کو فوراً محسوس کرلیا۔

"وہ کہیں پھنسا ہوا ہے۔ شام تک لوٹ آئے گا۔ تُو بتا تُو نے ناشتا کرلیا کیا؟" ربن نے اسے ٹالا۔

"تمہارے اور فاروق بھائی کے بنا کیسے کرتا۔" گولو نے منہ بسورا۔

"چل پھر جا بجو سے بول اچھا سا ناشتا تیار کرے پھر سب مل کر کھائیں گے۔"

"پر فاروق بھائی....." گولو کی سوئی فاروق پر اٹکی ہوئی تھی۔

"اپن بولا نا کہ وہ شام تک آئے گا۔" ربن نے ایک بار پھر پیار سے اس کا شانہ تھپکا۔ اس بار گولو نے مزید بحث نہیں کی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ اس سے بات کرتے ہوئے ربن اس مخصوص کمرے میں پہنچ چکا تھا جہاں بیٹھ کر وہ اڈے کے معاملات نمٹایا کرتا تھا۔ اس کمرے میں تنہا رامو اس کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی مایوسی سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام لوٹا ہے۔

"کیا ہوا رے؟" ربن نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"چڑیا اڑ گئی دادا۔ ادھر مکان پر صرف وکرم کی رکھیل موجود تھی۔ اس نے مانا کہ مجو بہت دنوں سے اس کے ہاں رہ رہا تھا پر پھر اچانک ہی بھاگ لیا۔ اصل میں اس کی قسمت ایک بار پھر اس کا ساتھ دے گئی۔ اپنے بندوں نے جس ٹیم وکرم پر ہاتھ ڈالا، ٹھیک اسی سمے چندا بائی کا نوکر مٹی کا تیل لینے جانے کے لیے مکان سے نکلا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وکرم کو کچھ لوگ زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ڈر کے مارے اس نے شور تو نہیں مچایا پر الٹے قدموں واپس مکان پر پہنچ گیا اور وکرم کی رکھیل کو سارا ماجرا سنا دیا۔ اس نے مجو کو بتایا۔ مجو نے نوکر سے پوچھ تاچھ کی کہ کیسے حلیوں کے لوگ تھے۔ ان کے پاس کونسے ہتھیار تھے وغیرہ وغیرہ اور سمجھ گیا کہ اڈے والوں نے وکرم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے فوراً ہی وہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔ فیکا بھی وہیں اس کے ساتھ تھا۔ دونوں فوراً وہاں سے رفو چکر ہوگئے۔ سمجھ گئے ہوں گے کہ ادھر والوں کے ہاتھ لگنے کے بعد وکرم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا اور سارا اگلا پچھلا اگل دے گا اس لیے جان بچا کر بھاگ نکلے۔" رامو نے اسے پوری رپورٹ پیش کی۔

"بس اتنا ہی یا اور بھی کچھ کہنے کا ہے تجھے؟" ربن کی گہری نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ رامو، مجو کے ملنے پر مایوس ہونے کے علاوہ کسی اور بات سے بھی پریشان ہے اس لیے اس سے دریافت کیا۔

"ایک بری خبر اور ہے دادا....." رامو کے الفاظ نے اس کے اندازے کی تصدیق کی اور وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "ادھر وکرم کو جس ٹھکانے پر رکھا تھا، وہاں سے آدمی آیا تھا۔ بتایا کہ وکرم کی وجہ سے ادھر بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ سالا سخت زخمی اور بے حال ہونے کا مکر کرتا پڑا تھا۔ اپن کے وہاں سے نکلنے کے گھنٹا بھر بعد ہی ایسے زور زور سے آوازیں نکالنے لگا جیسے بہت تکلیف میں ہو اور سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہو۔ ادھر والوں نے سوچا مر مرا نہ جائے اس لیے اس کے ہاتھ پیر کھول کر مالش کرنے لگے۔ اسے پانی بھی پلایا۔ سالا تھوڑی دیر مکر کرکے ان کا دھیان بٹاتا رہا پھر اچانک ہاتھ مار کر ایک کا چاقو کھینچ لیا۔ چاقو ہاتھ میں آتے ہی اس کی ساری اداکاری ختم ہوگئی اور ان لوگوں کو دھمکانے لگا کہ اسے وہاں سے جانے دیں، وہ اسے ایسے کیسے جانے دیتے۔ بس ان کے بیچ ٹھن گئی۔ وکرم پولیس والا تھا۔ چاقو چلانا کیا جانے۔ اس کا اناڑی پن اس کی اپنی جان لے بیٹھا۔ ہاتھا پائی میں ایسا الٹ کر گرا کہ چاقو والا ہاتھ بدن کے نیچے آگیا اور چاقو پورے زور سے اس کے سینے میں گھپ گیا۔ لمحوں میں تڑپ تڑپ کے ختم ہوگیا۔ اب اس کی لاش ادھر ٹھکانے پر پڑی ہے اور آدمی تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے کہ تم کیا حکم دیتے ہو۔" رامو نے اسے پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا تو اس کے ماتھے پر ایک بل پڑ گیا لیکن اس نے کسی شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور پل بھر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"جو ہوا سو ہوا بلکہ اچھا ہی ہوا۔ اپن اس نمک حرام کو زندہ چھوڑتے بھی تو اپنے لیے ہی مصیبت بنتا۔ اب خالی اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا ہی کشٹ کرنا پڑے گا۔ وہ جو آیا بیٹھا ہے اس سے بول کہ رات تک کا انتظار کرے پھر رات کے اندھیرے میں کدھر بھی لاش لے جا کر پھینک دے۔ پولیس کو لاش ملے گی تو خود ہی کریا کرم کے لیے اس کے گھر والوں کے حوالے کردے گی۔"

رب نواز سے ربن تک کا سفر طے کرتے ہوئے اس نے اتنا کچھ سہا تھا کہ وقت پڑنے پر سفاکی کا مظاہرہ بھی کر بیٹھتا تھا۔ اس وقت ویسے ہی فاروق کی وجہ سے اس کے دل

ودماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا، سو کرم کے لیے بڑی بے دردی سے اپنا فیصلہ سناڈالا۔

☆☆☆

حویلی کا ماحول ہنوز وہی تھا۔ ایک طرف اسد اللہ، جولیٹ کی برسوں کی محرومی دور کرنے کے لیے اس پر اپنی محبت کے خزانے نچھاور کررہے تھے تو دوسری طرف ندرت جہاں اور ان کی اولاد شدت سے اس بات کی خواہش مند تھی کہ کسی طرح جولیٹ کو یہاں سے چلتا کریں۔ اسد اللہ کی وجہ سے براہِ راست تو اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن موقع ملتے پر طنزیہ نظروں اور مسکراہٹوں سے ضرور اسے نوازا جاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی استہزائیہ جملہ بھی اس کی طرف اچھال دیا جاتا تھا۔ جواب میں وہ ان سب کو نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی نفرت وعداوت میں یہ سب کررہے ہیں لیکن اس کا کچھ بھی بگاڑنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ برسوں پہلے حویلی میں آنے والی لاوارث لڑکی جوزفین نہیں تھی جسے انہوں نے نہایت آسانی سے سازشوں کے جال بُن کر حویلی بدر کردیا تھا۔ وہ جولیٹ تھی، اسد اللہ کی جوزفین سے محبت کی نشانی اور وہ اس نشانی کو بہت سینت سینت کر رکھ رہے تھے۔ نواب سلیم اللہ کی واپسی تک جولیٹ کی حقیقت اور حیثیت کے اعلان کو موقوف کردینے کے باوجود انہوں نے اس پر اپنی عنایتوں کو نچھاور کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ اپنے پرانے کمرے سے اسد اللہ کے کمرے کے برابر والے کمرے میں منتقل کردی گئی تھی۔ اس کے لیے تو اپنا پرانا کمرا ہی کم نہیں تھا کہ وہ کبھی اتنی پرتعیش زندگی کی عادی نہیں رہی تھی لیکن نئے کمرے کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس کمرے میں آکر وہ کتنی دیر سحرزدہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اسد اللہ اس کی کیفیت بھانپ کر دھیرے سے مسکرائے تھے اور پھر بڑی اداسی سے بتایا تھا۔

''ہم نے اپنے دل میں سوچا تھا کہ جب جوزفین ہماری زندگی میں شامل ہوگی تو ہم اس کے لیے ایسا کمرا سجائیں گے۔ اپنوں کی تنگ دلی کہیں یا قسمت کی ستم ظریفی، ہمارا ہر خواب ادھورا رہ گیا لیکن ہمیں لگتا ہے کہ ہم آپ کے لیے یہ سب کرکے جوزفین کی روح کو خوش کررہے ہیں۔''

اور واقعی انہیں یہ سب کر کے ایسا ہی لگتا تھا۔ انہوں نے ماں کی طرف سے وراثت میں ملے ہوئے سارے خاندانی زیورات جولیٹ کے حوالے کردیے تھے۔ ملبوسات کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ چند دنوں میں ہی ان کے حکم پر اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور حسین لباس تیار کیا گیا تھا۔ یہ سارے مشرقی ملبوسات تھے اور آپا بیگم کے حکم پر مشرقی لباس پہننے سے انکار کرنے والی جولیٹ اب نہایت ذوق وشوق سے ان ملبوسات کو زیب تن کررہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر جوزفین کی روح حلول کر گئی ہے اور وہ حویلی کے درودیوار سے بالکل ویسی ہی محبت کرنے لگی ہے جیسی کبھی جوزفین کو ہوتی تھی۔ وہ دولت وزر سے محبت کرنے والی عورت نہیں تھی لیکن اسے اپنے محبوب سے وابستہ ہر شے سے پیار تھا اور یہی محبت اس سے اس کی بیٹی میں منتقل ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار جولیٹ کو خود اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیسے اتنی تیزی سے بدل گئی۔ وہ تو اسد اللہ اور اس حویلی کے لیے اپنے دل میں بہت سی کدورت لے کر آئی تھی۔ اسے تو ان سے انتقام لینے کی چاہ تھی لیکن اب سب بدل گیا تھا۔ وہ جو اپنے حساب سے زندگی میں سب کچھ ہار چکی تھی، اپنے باپ کو پاکر بہت خوش تھی اور دعا کرتے دل سے اپنے دادا نواب سلیم اللہ کی واپسی کی راہ دیکھ رہی تھی کہ انہوں نے اسے اس کی قسمت کا فیصلہ سنانا تھا۔

اس کے اس انتظار نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور نواب سلیم اللہ حویلی لوٹ آئے لیکن اس حال میں کہ پوری حویلی میں صف ماتم بچھ گئی۔ وہ جو بہت رعب ودبدبے اور کروفر والے شخص تھے، اس حال میں واپس لائے گئے کہ ان کا جسم زخم زخم تھا اور وہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کو جنبش دینے سے بھی قاصر تھے۔ نواب سلیم اللہ کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا تھا، اس سوال کے جواب میں ایک ایسی داستان تھی جو کروٹ بدلتی تاریخ کا ایک اہم باب شمار کی جاسکتی تھی۔ نواب سلیم اللہ اپنے جس دوست کے ساتھ شکار پر گئے تھے ان کا خاندان جاہ وحشم اور دولت ومرتبے میں ہر طرح سے ان کے خاندان کا ہم پلہ تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ ان کے دوست دولت کی طرح تہذیب وتمدن اور کردار واخلاق کو اپنی اولاد میں پوری طرح منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اولاد ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے لیکن جب اکلوتی ہو تو اس کے کیا ہی کہنے۔ وہ بھی اپنی اکلوتی اولاد نرینہ کی محبت میں دیوانے تھے۔ صرف وہی کیا دادا، دادی اور ماں سمیت پورا خاندان اکلوتے سپوت کے صدقے واری جاتا تھا۔ محبت کی انتہا ہی تھی کہ ایک نواب زادے کو شہزادہ کمال کا نام دیا جاتا تھا۔ خاندان کا ہر فرد اس کے قدموں میں اپنی پلکیں بچھاتا تھا اور خدمت کے لیے

بے شمار ملازمین مامور تھے۔ ہر خواہش منہ سے نکلنے سے قبل ہی پوری کر دی جاتی تھی اور اگر وہ رات کو دن کہے تو بس نہ چلتا تھا کہ قدرت کے اصولوں اور طریقہ کار کو تبدیل کر کے سورج کو رات کو ہی طلوع ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ ایسے نازونعم میں پلے ہوئے لوگ اپنے آگے کب کسی کو گرواتے ہیں۔ شہزادہ کمال بھی بڑی شاہانہ طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے ماتھے پر پڑنے والا ایک بل ملازمین کی کھال اتروانے کا سبب بن جاتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان مظالم کے خلاف کلمۂ حق یا نعرۂ احتجاج بلند کر سکے۔

باپ دادا سے ورثے میں ملنے والی دولت و مرتبے کے زور پر شہزادہ کمال کمزوروں پر حکومت کیے جا رہا تھا اور وہ یہ سب سہنے پر مجبور تھے۔ زنان خانے سے ہٹ کر حویلی میں زیادہ تر ہندو ملازمین تھے جنھیں حد سے زیادہ تضحیک و ذلت کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ غربت کی چکی میں پستے ملازمین ہر ظلم و ستم سہنے پر مجبور تھے لیکن ظلم و زیادتی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ شہزادہ کمال نے جوانی کی عمر میں قدم رکھتے ہی ملازمین کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی کنواری اور بیاہی عورت، جو حسین تھی، اس کی زیادتی کا نشانہ بننے سے نہیں بچی۔ غریب آدمی کی مجبوریاں اسے بزدل بنا دیتی ہیں۔ شہزادہ کمال کے ہاتھوں پامال ہونے والی زیادہ تر عورتیں ملنے والی دھمکیوں کے باعث اپنی زبانیں سی لیتی تھیں لیکن کوئی کوئی ایسی بھی ہوتی تھیں جو اس بوجھ کو دل پر رکھنے کے بجائے کسی کے شانوں پر آنسوؤں کی صورت بہا دیتی تھیں۔ سہارا دینے والے کے شانے ان آنسوؤں کے بوجھ سے بوجھل ہو جاتے تھے لیکن بازوؤں میں اتنا دم نہیں ہوتا تھا کہ شہزادہ کمال کا گریبان پکڑ کر اس سے اس ظلم و زیادتی کا حساب لے سکیں۔

ایک بار معاملات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ شہزادہ کمال نے ایک ملازم کی دس دن کی بیاہتا نوخیز و حسین بیوی کو اٹھوا کر اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔ خوش نما سپنے پلکوں میں سجائے پیا دیس آنے والی لڑکی جو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی، اتنے بڑے ظلم کو برداشت نہیں کر سکی اور گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ اس کا محبت کرنے والا شوہر صرف دس دنوں میں اپنی خوشیوں کا چمن اجڑ جانے پر دیوانہ سا ہو گیا۔ اسے کہیں سے بیوی کی خودکشی کی وجہ کی سن گن بھی مل گئی اور اس نے اس کی چتا کو آگ لگاتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ کبھی نہ کبھی اس ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اس واقعے کے بعد اس نے شہزادہ کمال کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی اور کہیں غائب ہو گیا تھا۔ علیحدگی کی تحریک چلی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلافات بڑھنا شروع ہوئے تو رگھو نامی وہ ملازم ایک بار پھر حیدرآباد میں نظر آنے لگا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے کسی اور نواب کی ملازمت اختیار کر لی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ انتہا پسند ہندوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس گروہ کو خاص طور پر بلووں اور مسلمانوں سے لوٹ مار کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ انتقام و نفرت کی آگ میں جلتے رگھو نے بھی اس گروہ میں شمولیت اختیار کر کے لڑنے بھڑنے کا ہنر خوب سیکھ لیا تھا اور اس تاک میں تھا کہ کسی طرح شہزادہ کمال سے انتقام لے سکے۔ گروہ کو بھی اختلاف نہیں تھا بس وہ ایسے موقع کی تلاش میں تھے جب اپنا داؤ چلا سکیں۔ آخر انہیں یہ موقع مل ہی گیا۔

شہزادہ کمال کے والد شکار پر جاتے ہوئے اس کی خواہش پر اسے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ کئی ملازمین بھی موجود تھے جو خدمت گاری کے علاوہ حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ محافظین کی یہ نفری بہت زیادہ تربیت یافتہ اور چوکنا نہیں تھی۔ اصل میں صدیوں سے حکمرانی کا مزہ لوٹتے ان نوابین کا پورے حیدرآباد میں ایسا راج تھا کہ عوام ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور ہر طرف ان کا رعب و دبدبہ قائم تھا۔ دولت کو عیاشیوں پر پانی کی طرح بہانے والے ان بیشتر نوابین کو بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کا پوری طرح ادراک بھی نہیں تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ کوئی کچھ بھی کرے وہ تو اپنی جگہ جمے بیٹھے ہیں اور بیٹھے رہیں گے۔ پرکھوں سے بغیر محنت کے وراثت میں ملنے والی دولت و جائداد کو چھوڑ کر کوئی کہیں جاتا بھی تو کیوں؟ بس چند ہی سر پھرے تھے جو اس رخ پر سوچ رہے تھے۔ خواص کے مقابلے میں عوام میں البتہ پاکستان قائم ہو جانے کی صورت میں وہاں منتقل ہو جانے کا رجحان نسبتاً زیادہ تھا۔ شہزادہ کمال کے خاندان کا بھی ریاست چھوڑ کر کہیں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ بالکل پہلے جیسے انداز میں اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ شکار کا یہ پروگرام بھی ان کی طرز فکر کا واضح ثبوت تھا اور وہ ایک معمول کی طرح اس پروگرام کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

رگھو جو حویلی کے بعض ملازمین سے خفیہ تعلقات رکھے ہوئے تھا، ان کی اس روانگی سے واقف ہو گیا اور جوش و خروش سے اپنے گروہ کے سربراہ کو اس بارے میں آگاہ

کیا۔ سربراہ اور گروہ کے دیگر ارکان کو رگھو کے ذاتی انتقام سے دلچسپی ہو یا نہ ہو مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ انہوں نے شکار کے لیے جانے والی ٹولی کا تعاقب کیا لیکن فوری حملہ کرنے کے بجائے ان کے درمیان یہ طے پایا کہ ان لوگوں پر اس وقت حملہ کیا جائے جب وہ شکار اور سیر و تفریح سے فارغ ہو کر تھکے ماندے واپسی کی راہ پر ہوں۔ پروگرام کے طول کھینچ جانے کی وجہ سے انہیں انتظار بھی لمبا کرنا پڑا۔ بہر حال انہوں نے اپنے منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور واپسی کے سفر میں ہی ان لوگوں پر حملہ آور ہوئے۔

اتنے دن کی بھاگ دوڑ اور خدمت گزاری سے اکتائے ہوئے ملازمین بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں سفر کر رہے تھے اور ذرا بھی اطراف سے چوکنا نہیں تھے چنانچہ جب حملہ ہوا تو انہیں اپنے ہتھیار سنبھالنے کا موقع بھی نہیں مل سکا اور حملے کی شدت کے سامنے انہیں فوراً پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ حملہ آوروں کا اصل نشانہ یہ ملازمین تھے بھی نہیں۔ انہوں نے ملازمین سے زیادہ خواص کو نشانہ بنایا۔ نواب سلیم اللہ بھی اس حملے کی زد میں آئے۔ اپنی طرف سے حملہ آوروں نے انہیں ہلاک ہی کر دیا تھا لیکن ابھی ان کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے اس لیے شدید زخمی حالت میں بھی جسم سے سانس کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ شہزادہ کمال اور اس کے والد البتہ موقع پر ہی ہلاک کر دیے گئے تھے۔ شہزادہ کمال کو تو اتنی بری طرح نشانہ بنایا گیا تھا کہ اس کا کوئی عضو اس کے تن کے ساتھ جڑا نہیں رہ سکا تھا۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان سب کاٹ کر الگ کر دیے گئے تھے اور یوں ایک عیاش نواب زادہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا تھا۔

رگھو نے اس کی لاش کے سینے پر کھڑے ہو کر ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ آج اس نے اپنی پتنی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ساتھ ساتھ دوسری مظلوم عورتوں کا بھی بھرپور انتقام لے لیا ہے اور شہزادہ کمال کا یہ انجام ان سارے عیش پرستوں کے لیے ایک سبق ہے جو اپنی دولت کے زعم میں غریبوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ حملہ آور جاتے جاتے نوابین و خواص کا قیمتی سامان اور نقدی بھی لوٹ کر لے گئے تھے۔ ملازمین میں سے جو معمولی زخمی تھے اور جو پسپائی اختیار کر کے ادھر ادھر چھپ گئے تھے، چشمِ حیرت و خوف سے یہ سب دیکھتے رہے۔ ان بپھرے ہوئے سانڈوں کے مقابل جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ جب وہ اپنے اندر کی آگ بجھا کر وہاں سے روانہ ہو گئے تو ملازمین نے حقِ نمک یوں ادا کیا کہ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر واپس لے آئے۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پورے حیدرآباد میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا۔ رگھو کا نام سامنے آنے پر اس کی گرفتاری کے لیے بھی بھاگ دوڑ ہوئی لیکن اب وہ کوئی پہلے والا دبا ہوا اور کچلا ہوا رگھو تھوڑی تھا جو ان کے ہاتھ آ جاتا۔ وہ جن کا آلۂ کار بنا ہوا تھا وہ بہت چالاک بھی تھے اور طاقتور بھی۔ انہوں نے یہ ساری بھاگ دوڑ شروع ہونے سے قبل ہی رگھو کو منظر سے غائب کرنے کا انتظام کر لیا تھا چنانچہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بے فکرے مسلمانوں میں اس واقعے کے بعد تشویش کی لہر دوڑ گئی اور وہ اس امر پر غور کرنے لگے کہ آیا انہیں اسی زمین سے چپکے رہنا چاہیے یا یہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ جو یہاں سے نہیں جانا چاہتے تھے ان کے پاس ٹھوس دلائل تھے۔ پہلی دلیل یہی تھی کہ پاکستان بنا تو اس بات کا بہت واضح امکان ہے کہ ریاست حیدرآباد پاکستان کے ساتھ الحاق کر لے گی اور اس صورت میں ہجرت کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ ہونے والے واقعے کو غلط رنگ دیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی ہندو مسلم فساد نہیں تھا بلکہ ذاتی انتقام کا ایک سلسلہ تھا۔ شہزادہ کمال نے اپنے ملازمین خصوصاً ہندو ملازمین کے ساتھ بہت ظلم و زیادتی کی تھی اور اس ظلم کا نتیجہ اس سمیت اس کے ہم رکابوں کو بھی سہنا پڑا تھا۔ نواب سلیم اللہ کے زخمی ہونے کے حوالے سے البتہ بیشتر افراد کو بہت افسوس تھا۔ نوابانہ کروفر اپنی جگہ لیکن بہر حال وہ ایک شریف النفس انسان تھے جن کے کردار و اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد کی پاکرداری کو بھی ہر خاص و عام تسلیم کرتا تھا۔

آج کل حویلی پر ان کی عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک تو پیرانہ سالی اس پر مہلک زخم اور چوٹیں...... نواب صاحب کی حالت بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ بعض اوقات تو ان پر غشی کے دورے پڑنے لگتے تھے لیکن اس سب کے باوجود وہ اسپتال میں داخل ہونے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں معلوم ہے ان کا وقتِ آخر آ گیا ہے اور وہ اپنی زندگی کی بچی کھچی سانسیں کسی اسپتال میں لینے کے بجائے اپنی عزیز حویلی کی فضاؤں میں لینا چاہتے ہیں۔ ان کی اولاد ان کے اس فیصلے سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان کے حکم کی

تعمیل کے لیے مجبور ہو گئی تھی۔ اول اس لیے کہ انہوں نے کبھی نواب صاحب کے کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کی تھی اور دوم اس لیے کہ انہیں نواب صاحب کی بات مبنی بر حقیقت محسوس ہو رہی تھی۔ واقعی لگتا تھا کہ اب وہ جانبر نہیں ہو سکیں گے لیکن یہ نہیں تھا کہ اس ادراک کے باوجود علاج معالجے میں کوئی کمی رکھی جا رہی تھی۔ نواب صاحب اسپتال جانے کے لیے تیار نہیں تھے تو پورا اسپتال ان کے لیے یہیں جمع کر لیا گیا تھا۔ قابل ڈاکٹرز، پیرامیڈیکل اسٹاف، دوائیں اور وہ جملہ سہولیات جو انہیں اسپتال میں مل سکتی تھیں، حویلی میں ہی منتقل کر لی گئی تھیں۔ اتنی لگن اور توجہ کے باعث ہی شاید نواب صاحب بھی کبھی سنبھلے ہوئے نظر آنے لگتے تھے اور اہل خانہ کو ان کی جانبری کی امید بندھ جاتی تھی لیکن پھر جب غشی کے دورے پڑتے تھے تو لگتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

زنان خانے میں مسلسل آیت کریمہ اور دیگر وظائف کا ورد جاری تھا۔ غرباء کو اتنا صدقہ و خیرات دیا جا رہا تھا کہ اس سے قبل حویلی کی تاریخ میں شاید ہی کبھی دیا گیا ہو۔ خواتین رو رو کر ان کی زندگی کی بھیک مانگتی تھیں تو مرد اپنے آنسو دل میں اتار کر خاموش لبوں سے دعا گو رہتے تھے۔ حویلی پر اتنا سخت وقت اس سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا کہ کسی کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہے۔ عیادت کے لیے آنے والے رشتے داروں اور عزیزوں کے جم غفیر کو بھی برسوں پرانے وفادار ملازم ہی سنبھال رہے تھے۔ جولیٹ بھی ان سب حالات کو دیکھ رہی تھی اور دل میں افسردہ بھی تھی۔ اسے تو انتظار تھا کہ نواب صاحب واپس آئیں گے تو وہ ایک دادا سے پوتی بن کر اپنا حق مانگے گی لیکن اب تو اس موضوع کو چھیڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خود نواب زادہ اسد اللہ کا زیادہ تر وقت مردانے میں ہی گزر رہا تھا۔ جولیٹ سے ان کی آتے جاتے ایک آدھ سرسری سی ملاقات ہی ہو سکی تھی جس میں وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے کے سوا اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکے تھے۔

جولیٹ کو ان کی کیفیت کا اندازہ تھا اس لیے دل میں ان کے لیے کوئی شکوہ بھی نہیں تھا۔ پال پوس کر بڑا کرنے والے ماں باپ میں سے کوئی یوں ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہو تو کسے اپنا ہوش رہتا ہے۔ وہ خود بھی جوزف کی موت کے وقت اس کیفیت سے گزر چکی تھی اس لیے اسد اللہ سمیت تمام اہل خانہ کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی اور دکھ محسوس کر رہی تھی۔ زنان خانے میں ہمہ وقت جاری رہنے والے وظائف و اوراد کے سلسلے میں اس کا حصہ ڈالنا تو ممکن نہیں تھا لیکن اپنے طور پر وہ بھی نواب صاحب کی زندگی کے لیے دعا گو تھی۔ حویلی کی خواتین اپنی حواس باختگی کی وجہ سے حویلی کے انتظام و انصرام پر توجہ دینے کے قابل نہیں رہی تھیں اس لیے جولیٹ نے غیر محسوس طور پر از خود یہ ذمے داری سنبھالنی شروع کر دی تھی۔ ملازمین لاکھ وفادار اور تربیت یافتہ سہی لیکن انہیں راہنمائی کی حاجت تو رہتی ہی ہے۔ جولیٹ اپنے طور پر یہ ذمے داری ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ باورچی خانے میں کھڑی ملازماؤں کو دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں چند ہدایات دے رہی تھی کہ عشرت جہاں معلوم نہیں کیسے اس طرف آنکلیں۔

”تو تمہارے دل کی تمنا بر آئی اور تم حالات کا فائدہ اٹھا کر شوقِ حکمرانی پورا کرنے لگیں۔“ کسی ملازمہ کی غلطی پر جھنجلا کر جولیٹ اسے دھیمی آواز میں سرزنش کر رہی تھی جب انہوں نے اس کی بات میں دخل دیتے ہوئے اس پر طنز کا تیر چلایا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایسا کوئی شوق پورا نہیں کر رہی بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے یہ سب کر رہی ہوں۔ نواب صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، مجھے خود بھی اس پر گہرا رنج ہے۔“ اس نے نہایت نرمی سے عشرت جہاں کے طنز کا جواب دیا۔

”افسوس کیسا......؟ تمہارے لیے تو یہ خوشی کا مقام ہے۔ اگر ماموں جان بہ خیر و عافیت حویلی واپس آئے ہوتے تو اب تک تمہارا حویلی سے بوریا بستر گول ہو چکا ہوتا۔ ان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے باعث ہی تم اب تک حویلی میں نظر آ رہی ہو۔“ عشرت جہاں اب بھی اس پر جملوں کے تیر چلانے سے باز نہ آئیں۔ ان کی باتیں سن کر جولیٹ کو غصہ تو بہت آیا لیکن موجودہ حالات میں کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہ ہو، اس خیال سے ضبط کر گئی اور آہستہ سے فقط اتنا بولی۔

”بدگمانی اور بدزبانی دوسروں کو ہی متاثر نہیں کرتی۔ اس سے کبھی کبھی انسان کی اپنی ذات بھی زد میں آ جاتی ہے اس لیے اس سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔“

”مناسب تو یہ بھی ہے کہ تم اپنی اوقات میں رہو اور خود کو اس حویلی کی مالکن سمجھنے کی غلطی نہ کرو۔“ عشرت جہاں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ آواز ان کی بھی زیادہ بلند نہیں تھی کہ یہ ملازماؤں کو بہر حال وہ بھی اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتی تھیں۔

جنگ آزما

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر بن گئی تھی

میڈیکل ایڈ کے نام پر عالمی پیمانے پر ہونے والے جرائم کی کہی ان کہی داستان، وہ نادانستگی میں ایک بہت بڑے گروہ سے ٹکرا گیا تھا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

"میں خود کو مالکن سمجھنے کی غلطی کروں تو بھی یہ میرا حق ہے کیونکہ میرا باپ اس حویلی کے وارثوں میں سے ایک ہے لیکن یہاں تو وہ لوگ بھی اپنا سکہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں خود اپنے باپ کے گھر میں جگہ نہیں ملی اور جن کی حیثیت یہاں قابضین کی سی ہے۔" اس بار جولیٹ نے بھی کاٹ دار جواب دیا جسے سن کر عشرت جہاں بلبلا اٹھیں اور سخت لہجے میں بولیں۔

"بکواس بند کرو کافرہ کی اولاد۔ تم تو اس لائق بھی نہیں ہو کہ جس شخص کی پوتی ہونے کی دعوے دار ہو اس کے لیے دو لفظ کلام الٰہی کے پڑھ کر دعا ہی کر سکو۔"

"دعا بندے اور معبود کے درمیان کا معاملہ ہے اور دنیا کا مالک اتنا مہربان تو ضرور ہے کہ اسے جس مذہب کے لوگ بھی سچے دل سے پکاریں، وہ ان کی جائز حاجات کو سنتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی اپنے بندوں سے پیار کرنے والا نہیں ہے اور وہی جانتا ہے کہ بندے کی کس دعا کو قبول کرنے میں اس کی بہتری ہے۔" اپنی ماں کو کافرہ پکارے جانے پر اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔

"باتیں بنانے کا ہنر بھی اپنی ماں سے ہی لیا ہے تم نے۔ اس نے بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسد اللہ کو دیوانہ بنا دیا تھا اور تم بھی شاید ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تمہاری ماں بھی سبز قدم تھی جس نے برسوں پہلے اس حویلی کی خوشیاں چھین لی تھیں اور تم بھی اپنے ساتھ اپنی نحوست لے کر یہاں آئی ہو جب ہی تو اچھے بھلے اپنے قدموں پر حویلی سے جانے والے ماموں جان اس حال میں حویلی واپس لوٹے ہیں۔" عشرت جہاں کی اس سے دشمنی کی بنیاد بہت پرانی اور مضبوط تھی۔ اپنے تئیں وہ اسد اللہ کی شریک حیات بننے جا رہی تھیں کہ جوزفین درمیان میں آ گئی اور پھر سب کچھ اس طرح بکھرتا گیا کہ تمام تر سازشوں کے باوجود اسد اللہ ان کے حصے میں نہ آ سکے اور انہیں ایک سخت گیر سسرال میں خلاف مزاج دب کر زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔ ان کے لہجے میں جولیٹ کے لیے زہر ہی زہر تھا تو یہ کچھ عجب نہیں تھا۔ اس سے قبل کہ جولیٹ ان کی اس ہرزہ سرائی کے جواب میں کچھ کہہ پاتی، نواب زادی عالیہ وہاں چلی آئیں۔

"ارے آپ دونوں یہاں موجود ہیں۔۔۔! ہم دیکھنے آئے تھے کہ دوپہر کے کھانے کے کیا انتظامات ہیں۔ حویلی میں کافی زیادہ مہمان موجود ہیں اس لیے کھانے کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے۔ کیوں ماما نسرین! آپ نے سارا انتظام کر دیا ہے نا۔۔۔۔۔؟" انہوں نے پہلے جولیٹ اور عشرت جہاں کی وہاں موجودگی پر حیرت کا اظہار کیا پھر اپنی آمد کی وجہ بتاتے ہوئے ہیڈ باورچن سے مخاطب ہوئیں۔

"جی بی بی! مس صاحبہ نے ہمیں جو جو اور جیسا جیسا بولے ہم۔۔کر لیے ہیں۔ اگر کوئی کمی دکھائی دے تو آپ ہمیں بول دیں۔" دوسری ملازماؤں کے ساتھ تندہی سے کام انجام دیتی ماما نے مؤدب انداز میں نواب زادی عالیہ کو جواب دیا۔ جولیٹ اور عشرت جہاں کے درمیان جاری تکرار کے الفاظ کچھ نہ کچھ اس کے کانوں میں بھی پڑتے رہے تھے لیکن اس سمیت ساری ملازمائیں بہری بنی رہی تھیں اور اب نواب زادی عالیہ کے مخاطب کرنے پر وہ یوں ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی جیسے اب سے پہلے تو یہاں تھی ہی نہیں۔

"بہت بہت شکریہ جولیٹ! اس کڑے وقت میں حویلی کے لیے آپ کا دم غنیمت ہے۔ موجودہ حالات میں آپ نے جس اپنائیت اور خلوص سے حویلی کا انتظام و انصرام سنبھال رکھا ہے اس کے لیے ہم تہ دل سے آپ کے شکر گزار ہیں اگر اس وقت آپ کا تعاون ساتھ نہ ہوتا تو سارا انتظام چوپٹ ہو جاتا۔ آپ نے حقیقی معنوں میں اپنے ہونے کا احساس دلایا ہے۔"

نواب زادی عالیہ کے الفاظ عشرت جہاں کے لگائے زخموں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔ اپنے باپ کی طرف سے سخت تشویش کا شکار، روئی روئی آنکھوں والی عالیہ نے عشرت جہاں کی طرح اس کی ذات پر کوئی الزام نہیں دھرا تھا اور نہ ہی اس کے کسی عمل کو شک کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی خدمات کے لیے اس کی شکر گزار تھیں اور رویوں کا یہ فرق جذبات کے فرق کی وجہ سے تھا۔ نواب زادی عالیہ اسے اپنے بھائی کی بیٹی کی حیثیت سے دیکھ رہی تھیں جبکہ عشرت جہاں کے لیے وہ اس عورت کی بیٹی تھی جس سے انہوں نے خود ہی رقابت کا رشتہ قائم کر لیا تھا اور جو ان کے نزدیک ان کی زندگی کی ساری تلخیوں کی ذمے دار تھی۔ اب بھی وہ نواب زادی عالیہ کا اس کے لیے اپنائیت بھرا رویہ دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ جولیٹ نے ان سب باتوں کو محسوس کیا اور نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ نواب زادی عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کو میرا شکریہ ادا کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، اپنا فرض سمجھتے ہوئے کر رہی ہوں۔" جواب میں نواب زادی عالیہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ لیے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

وہاں سے پلٹ گئیں۔ جولیٹ بھی دوبارہ نگرانی کا فریضہ انجام دینے لگی لیکن اب اس کا ذہن خاصا منتشر ہو چکا تھا۔ عشرت جہاں کی باتیں خاص طور پر کافرہ ماں کی بیٹی ہونے کا طعنہ اس کے دل پر لگا تھا اور پہلی بار وہ اپنے صحیح تشخص کے لیے الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ربن نے گولو کے خیال سے ناشتے کے چند لقمے زہر مار کیے اور پھر بھالیہ سیٹھ سے ملاقات کے لیے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس موقع پر رامو بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھا۔ ابھی وہ دونوں اڈے کی چوکھٹ پار نہیں کر سکے تھے کہ اڈے کے آس پاس پھیلے ہوئے آدمیوں میں سے ایک دوڑتا ہوا آیا اور علاقے میں پولیس کی آمد کی اطلاع دی۔ اطلاع دینے والے کے مطابق پولیس والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور تیور بھی جارحانہ لگ رہے تھے۔ ربن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وکرم کے غیاب کا ردِعمل ہے۔ وکرم کی آج کل سب سے زیادہ ربن اور اس کے اڈے سے ہی ٹھنی ہوئی تھی چنانچہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کے غیاب کی خبر ہوتے ہی پولیس والوں کا دھیان سب سے پہلے اسی طرف آیا ہو اور انہوں نے فوراً ادھر کا رخ بھی کر لیا ہو لیکن وہ خود بھی رات بھر بڑے کرب سے گزرا تھا اور اب جو فاروق تک پہنچنے کی ایک راہ دکھائی دی تھی تو اس میں پولیس والوں کی آمد رکاوٹ کے سوا کچھ نہیں لگ رہی تھی چنانچہ اطلاع ملنے کے باوجود وہ چوکھٹ پار کر گیا۔ رامو اس کا ہم قدم تھا۔ اڈے سے نکل کر وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تانگے میں سوار ہونے لگے تھے کہ ایک دوسرا تانگا ان کے قریب آکر رکا۔ اس تانگے میں سوار باوردی پولیس والے ایک ایک کر کے پھرتی سے نیچے اترے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔

”کدھر جاتے ہو دادا۔ ابھی ادھر اپنے سے بات کر کے جاؤ۔“ ان میں سے ایک اے ایس آئی نے ہانک لگا کر ربن کو روکا۔

”اپنے پاس سے ٹیم نہیں ہے۔ ابھی اپن ایک ضروری کام سے جاتا ہے۔ آپ لوگوں کے پاس ٹیم (ٹائم) ہے تو اندر جا کر بیٹھو۔ اندر آپ کی خاطر کے لیے بہت آدمی ہے۔ اپن اپنا کام نمٹا کر تھوڑی دیر میں لوٹ کر آتا ہے۔“ وہ وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

”ایسا کیسے دادا......؟ پولیس کیا تیرے پچھلوں کی زرخرید لونڈی ہے جو یہاں تک آ کر تجھے جانے دے گی۔ تجھے تو اپنے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“ اے ایس آئی کا لہجہ بگڑا۔

”ابھی بات بڑھانے کا نہیں صاحب! دادا سمیت ادھر سب بہت پریشان ہے۔ پوری رات آنکھوں میں کٹی ہے۔ اپنے اڈے کا شہزادہ فاروق استاد رات سے غائب ہے۔ ابھی اپنے کو اس کا پتا نشان ڈھونڈنے کو جانے کا ہے۔ تم اپنی راہ کھوٹی نہ کرو اور ابھی ہم کو ادھر سے جانے دو۔ اپنا کام نمٹا کر ہم خود تھانے آجائیں گے۔ تم کو جو بھی کام ہو، اس سے بول دینا۔“ اس بار رامو نے پولیس والوں کی طرف رخ کر کے تھوڑا نرم اور تھوڑا گرم لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

”ادھر اپنے کو بھی بڑی مشکل پڑی ہے رامو استاد! ادھر انسپکٹر وکرم کی بھی رات بھر سے کوئی خبر نہیں ہے۔ سویرے سویرے اس کا بڑا لونڈا تھانے آیا تھا اس کا معلوم کرنے، جب سے ہی ہم ہر طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ادھر کے اڈے والوں سے اس کا گہرا سمبندھ ہے اس لیے ہم یہاں بھی معلوم کرنے آئے ہیں۔“ اس بار افسرانہ اکڑ کا مظاہرہ کرنے کے لیے اب تک خاموش کھڑے ایس آئی نے اپنی زبان کھولی اور معنی خیز لہجے میں اپنی آمد کی وجہ بیان کی۔

”اب کہاں کا سمبندھ صاحب! ہم تو انسپکٹر وکرم کے سیوک تھے پر انہوں نے خود ہی ہماری سیوا کو ٹھکرا کر کہیں اور کا رخ کر لیا۔ اب وہ کاہے کو ادھر آئیں گے۔“ رامو نے بڑے سلیقے سے خود کو انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ وہ اپنی خوشی سے نہیں آنے والے، پر پکا شک ہے کہ انسپکٹر کے غائب ہونے میں تم لوگوں کی کوئی شرارت ہے۔ ہم اپنا یہ شک دور کرنے ہی یہاں آئے ہیں۔“ اپنی چھوٹی سی افسری پر اکڑ کا مظاہرہ کرتا ایس آئی کڑک دار لہجے میں بولا۔

”پہلے جا کر کسی رن...... کے کوٹھے پر دیکھنا تھا۔ وہ چار پوے چڑھا کر وہ ادھر ہی کہیں لڑھکا پڑا ہوگا۔ نشہ اترنے پر وردی چڑھا کر آپ ہی تھانے پہنچ جائے گا۔“ ربن نے استہزائیہ لہجے میں وکرم کے بارے میں خیال آرائی کی۔

”ابھی تو تم کو تھانے لے جانے کو مانگتا ہے۔ ادھر تھوڑا ٹائم گزارو گے تو آپ ہی انسپکٹر وکرم کا اتا پتا اگل دو گے۔“ ایس آئی کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔

”ایسے گرمی سے کام نہیں لو صاحب! اپن آپ کو پہلے ہی بتا دیے ہیں کہ ادھر بہت پریشانی ہے۔ ابھی ہم لوگ

فاروق استاد کا پتا کرنے جا رہے ہیں۔ آپ سے بول رہے ہیں کہ لوٹ کر آپ ہی تھانے آ جائیں گے۔ اس سے آپ جو چاہو پوچھ تاچھ کر لینا۔ ہوسکتا ہے اتنی دیر میں انسپکٹر وکرم آپ ہی لوٹ آئے۔''

رامو نے اپنا لہجہ عاجزانہ رکھا تھا۔ وہ کئی منٹوں تک پولیس والوں کو قائل کرنے کی جدوجہد کرتا رہا اور انہیں باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا کہ ان کے علم میں ہے کہ پولیس والوں کے پاس ان کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں ہے اور اس عدالتی حکم نامے کی غیر موجودگی میں انہیں زبردستی تھانے لے جانے کی کوشش خود پولیس والوں کو بھی بھاری پڑ سکتی ہے۔ اڈے والوں کو یہ ساری باریکیاں وکیل اشوک بچن نے سکھائی اور سمجھائی تھیں چنانچہ بوقت ضرورت وہ اپنی معلومات کا اظہار کر کے پولیس والوں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا لیکن ظاہری طور پر ایس آئی اور اس کے اسسٹنٹ نے اپنے لامحدود اختیارات کے استعمال کی دھمکیاں دیتے ہوئے آخر کار اس شرط پر فوری طور پر تھانے لے جانے کی ضد سے دستبرداری اختیار کی کہ ربن اور رامو جہاں بھی جا رہے ہیں، پولیس کے دو اہلکاران کے ساتھ جائیں گے اور پھر فارغ ہوتے ہی ان دونوں کو پولیس اہلکاروں کے ساتھ تھانے پہنچنا ہوگا۔ رامو نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ ربن اس سارے معاملے سے بے نیاز تانگے میں جا بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رامو اس معاملے کو سنبھال لے گا اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ کچھ دیر کی خواری کے بعد ہی سہی، وہ وہاں سے روانہ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ پولیس کے دو اہلکاران کی نگرانی کے لیے ان کے ہمراہ موجود تھے۔ اڈے سے بھالیہ سیٹھ کی کوٹھی تک کا سفر خاموشی سے کٹا۔ کوٹھی پر اتر کر انہوں نے اندر اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی تو فوراً ہی انہیں اندر بلوا لیا گیا۔

''کس واسطے آیا ہے؟'' سیٹھ نے ربن کو گھورتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ اس وقت اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح دوستانہ نہیں تھا۔ وہ اس سے دوستانہ رویے کی امید لے کر آئے بھی نہیں تھے۔ رات سیٹھ کے گودام اور پھر منیجر مہیش کے فلیٹ پر انہوں نے جو کارروائیاں کی تھیں، جانتے تھے کہ اب تک اس کی اطلاع سیٹھ تک پہنچ گئی ہوگی اور وہ ان کے خلاف بھرا بیٹھا ہوگا۔

''تیرے کو تیرے کتوں نے سب بول دیا ہوگا۔ اپن رات بھر سے اپنے بچے کے لیے خوار ہو رہا ہے۔ اپنے پاس پکی خبر ہے کہ اسے تیری لونڈیا نے اغوا کروایا ہے۔ اب تو اپنی لونڈیا سے بول کہ اپنے شہزادے کو اپن کے حوالے کرے ورنہ بات اس سے بھی بہت آگے جائے گی۔ ابھی تو ایک گودام کو روتا ہے، پر اپنے کو اپنا شہزادہ ملنے میں اور دیر لگا تو اپن ایک ایک کر کے تیری ہر چیز کو آگ لگا دے گا۔'' ربن نے غضب ناک لہجے میں اسے دھمکایا۔

''تو اپنی چھت کے نیچے کھڑے ہو کر اپن کو دھمکی دیتا ہے۔ اپن ابھی کمشنر کو فون لگاتا ہے۔'' سیٹھ غصے سے بل کھانے لگا۔

''کمشنر کو فون کر کے تو اپنے کو گرفتار کروانے سے جاستی اور کیا کر سکتا ہے۔ اپن گرفتاری سے نہیں ڈرتا۔ تھانہ اپنا دوسرا گھر ہے۔ ابھی بھی اپن پولیس والوں کے ساتھ ہی آیا ہے، پولیس کے دو ہرکارے باہر بیٹھے ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر اپن کو ادھر تھانے ہی جانے کا ہے۔'' ربن اس کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا اور اسی پاٹ دار لہجے میں بولا۔

''تجھ کو کس نے بولا ہے کہ تیرے اس چہیتے کو میری بیٹی نے اٹھوایا ہے؟ اس کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ وہ تو ادھر بمبئی میں ہے ہی نہیں۔ وہ تو کل ہی اپنی جاب پر لوٹ گئی تھی۔'' اس بار سیٹھ تھوڑا دھیما پڑا اور وضاحت پیش کی۔

''وہ تیری آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے سیٹھ۔ اپن تیرے کو بولتا کہ وہ ادھر بمبئی میں ہی ہے۔ تو بہت بڑا بزنس مین ہے اور بزنس کی ایک ایک چیز پر نظر رکھتا ہے لیکن تیری اولاد کے کرتوت تجھے نہیں معلوم۔ وہ ایسی خطرناک ناگن ہے کہ خود اپنے پتی کو ڈس کر بیٹھی ہے۔ پچھلے دنوں چاند بابو پر قاتلانہ حملہ بھی اسی نے کروایا تھا اور اب فاروق کو اغوا کروانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔'' ربن ایک ایک کر کے بھالیہ پر بملا کا ایک ایک کارنامہ کھولتا چلا گیا۔

''تو بملا پر بہت بڑے بڑے الزام لگا رہا ہے دادا! اگر تیرا ایک بھی الزام جھوٹا نکلا تو اپن تیرے پر بمبئی کی زمین تنگ کر دے گا۔ تو بہت بڑا غنڈا ہے، پر اپنے کو کم نہ سمجھ۔ اپن اپنی دولت کی ڈگڈگی بجا کر پولیس کو بھی اپنے اشاروں پر نچا سکتا ہے اور تیری برادری کے لوگوں کو بھی۔'' سیٹھ کو جیسے اپنی بیٹی کے ان کارناموں پر یقین نہیں آتا تھا۔

''دادا سے سنبھل کر بات کرنے کی ہے بھالیہ سیٹھ! دادا ایسے ہی اپنے منہ سے کوئی بات نکالنے والا نہیں ہے۔'' رامو نے بھالیہ سیٹھ کے الفاظ کا ربن سے زیادہ برا مانا اور فوراً ہی اسے تنبیہ کر ڈالی۔

''ایسے ہی بات نہیں کرتا تو اپنے کو ثبوت دے۔ ایسے تو اپن کسی کی بات کا وشواس نہیں کر سکتا۔'' بھالیہ نے بھی

تندلب ولہجہ اختیار کیا۔

"ثبوت بھی تیرے کو دے سکتے ہیں پر پہلے تو سوچ کر یہ بول کہ اگر تیری لونڈیا بمبئی سے باہر نہیں گئی ہے تو ابھی ادھر کدھری ہو سکتی ہے۔ اس کوٹھی کے علاوہ بھی تو کوئی ٹھکانا ہوگا نا تیرا۔ اپنے کو یقین ہے کہ وہ ادھری ہوگی۔ فاروق کو ساتھ لے کر وہ کسی ہوٹل میں تو جا نہیں سکتی۔" رہن بالکل منطقی انداز میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایسا ویسا آدمی ہوتا تو بھابیہ سیٹھ اس کی اتنی سنتا بھی کہاں۔ اپنی دولت کے زور کے باوجود بھابیہ خود یہ بات سمجھتا تھا کہ رہن ایسے ہی اس تک چل کر نہیں آیا ہے۔ اسے اس بات کی بھی سمجھ تھی کہ رہن سے دشمنی تو اسے خود بھی خاصا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تھوڑے سے عرصے میں اس جیسے گھاگ آدمی نے رہن کی صلاحیتوں اور کام کرنے کے انداز کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اب بھی اس نے رہن کی بات توجہ سے سنی اور ذرا سا غور کرنے کے بعد بولا۔

"ادھر جوہو کے علاقے میں اپنا ایک بنگلا ہے۔ جاستی سے خالی پڑا رہتا ہے اور ادھر صرف ایک چوکیدار رہتا ہے۔ اپن ادھر فارن کنٹری سے آنے والے گیسٹ کو ٹھہراتا ہے۔ گیسٹ آتا ہے تو سروس دینے کو باقی اسٹاف بھی بھجوا دیتا ہے۔ ابھی ادھر کوئی گیسٹ نہیں ہے۔ بملا اگر بمبئی میں ہے تو ادھر ہی ہوگی۔"

"تو پھر چلو ادھر چلتے ہیں۔ سارا دودھ پانی خود ہی الگ ہو جائے گا۔" رامو نے عجلت کا مظاہرہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" سیٹھ نے انکار نہیں کیا اور ایک ملازم سے ڈرائیور کو گاڑی لگانے کا حکم بھجوا دیا۔ اپنی صحت کے مسائل کی وجہ سے وہ روزانہ دفتر جانے سے قاصر تھا چنانچہ کوٹھی میں بیٹھے بیٹھے ہی سارا کاروبار چلاتا تھا۔ اس کے خاص ملازمین یہیں آکر اسے ساری رپورٹیں پہنچا دیتے تھے اور یہیں بیٹھ کر وہ احکامات بھی جاری کر دیتا تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے کاروبار سے اس حد تک غافل ہو جائے کہ ملازمین اسے چونا لگا سکیں۔ ایک طرف اس نے مکمل خبر گیری کے لیے جاسوسوں کا جال بچھا رکھا تھا تو دوسری طرف خود بھی اچانک چھاپے مارنے کا عادی تھا اس لیے ملازمین کو لگام ڈلی رہتی تھی اور وفادار، وفادار ہی بن کر رہتے تھے۔ اب بھی ڈرائیور نے منٹوں میں گاڑی تیار کر دی اور بھابیہ سیٹھ ان کے ساتھ اپنے جوہو والے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان کے ساتھ آئے پولیس اہلکار گیٹ کے باہر ہی رکے ہوئے تھے چنانچہ اگر انہوں نے گیٹ سے نکلتی گاڑی میں رہن اور رامو کو سوار دیکھا بھی تھا تو کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس سواری کے لیے وہی تانگا تھا جس میں وہ یہاں تک آئے تھے اور ظاہر ہے تانگے سے موٹر گاڑی کا تعاقب کسی طور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فی الحال انہیں پولیس اہلکاروں کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد فاروق تک پہنچنا چاہتے تھے۔ موٹر گاڑی کی تیز رفتاری کے باوجود ان کے لیے فاصلہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہر حال مشکل سے ہی سہی راستہ ختم ہو گیا اور وہ بھابیہ سیٹھ کے خوب صورت بنگلے تک پہنچ گئے۔ سیٹھ کی گاڑی دیکھ کر گیٹ پر موجود چوکیدار فوراً مستعد ہو گیا اور پھرتی سے گیٹ کو پورا وا کر دیا۔

ڈرائیور نے گاڑی اندر لے جا کر روکی اور سیٹھ سمیت رہن اور رامو نے بھی دیکھا کہ پورچ میں پہلے سے ہی ایک گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ اس گاڑی کو دیکھ کر سیٹھ کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ یقیناً بملا کی گاڑی پہچان کر اسے اس کی یہاں موجودگی کا یقین آگیا تھا۔ گاڑی کی موجودگی کا مطلب تھا بملا بھی یہاں ہے اور بملا کے یہاں ہونے کا مطلب تھا کہ رہن اپنے دعوے میں سچا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق بملا سچ مچ بمبئی میں موجود تھی اور اپنے باپ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اپنی جاب پر واپس جا رہی ہے۔ جانے سے پہلے اس نے بھابیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی جاب چھوڑ دے گی اور کاروبار سنبھالنے میں اس کا ہاتھ بٹائے گی لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ جیسے بملا کا بمبئی سے جانا ایک جھوٹ تھا ویسے ہی کاروبار سنبھالنے کا وعدہ بھی جھوٹا ہوگا۔

"نمستے سیٹھ۔" ڈرائیور کے گاڑی اندر لا کر روکنے اور خود باہر نکلنے تک چوکیدار گیٹ بند کر کے گاڑی تک پہنچ چکا تھا اور بھابیہ کی طرف کا دروازہ کھول کر خوشامدی لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

"بملا اندر ہی ہے نا؟" چوکیدار گاڑی سے اترنے میں اسے مدد دے رہا تھا جب بھابیہ نے اس سے دریافت کیا۔

"ہاں مائی باپ! مالکن رات کو آئی تھیں، اس کے بعد باہر نہیں نکلیں۔ اپنے کو اندر آنے کا حکم نہیں تھا اس لیے اپن ناشتے پانی کا پوچھنے بھی نہیں جا سکے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر سیٹھ کو رپورٹ دی جسے سن کر اس کے چہرے کے تاثرات اور بھی گمبھیر ہو گئے۔

"مالکن کا مہمان بھی اندر ہی ہے؟" بھابیہ نے دل پر جبر کر کے دوسرا سوال کیا۔

"وہ تو ابھی تھوڑی دیر ہوئی چلا گیا۔ بولا تھا کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا۔" چوکیدار نے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں

الجھن تیز رہی تھی۔ شاید اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا لیکن سوال کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ دوسری طرف سیٹھ کے بعد گاڑی سے اترنے والے ربن اور رامو بھی الجھن کا شکار تھے۔ بھلا فاروق کو اغوا کر کے یہاں لائی تھی پھر اس کی اتنی آسانی سے یہاں سے روانگی کیونکر ہو پائی تھی۔ کسی گڑبڑ کے احساس کے ساتھ انہوں نے اندر کا رخ کیا۔

سامنے کے حصے میں کوئی موجود نہیں تھا اور وسیع و عریض لاؤنج بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ بھالیہ تیزی سے حرکت کرنے کے لائق نہیں تھا لیکن ربن اور رامو نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک ایک کر کے کمروں کے دروازے کھول کر دیکھنے لگے۔ اس دوران بھالیہ نے بھلا کو دو تین آوازیں دے ڈالی تھیں لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ ردعمل رامو نے دیا۔ تیسرے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ وہ خاموش رہ پاتا۔ اس نے بے ساختہ ہی ربن کو ہیجانی لہجے میں پکارا۔

''دادا ادھر۔'' اس کی پکار پر ربن فوراً ہی اس کمرے کی طرف لپکا۔ بھالیہ بھی اپنی جگہ رکا نہیں رہ سکا اور ربن کے پیچھے خود بھی اس کمرے کی طرف بڑھا۔ ربن کے لیے بھی اندر کا منظر ششدر کر دینے والا تھا لیکن وہ بھالیہ کو وہاں آنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ بھالیہ وہاں تک آیا اور اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ گئی۔ ربن نے بہت تیزی سے حرکت کی تھی اور اس کا منہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔ حسب معمول اس نازک صورت حال میں اس کے دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ منہ بند کیے جانے پر بھالیہ نے مچل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن ربن کے آگے بھلا اس کی کیا چلتی۔ ربن نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا ایک جچا تلا وار کیا تو وہ فوراً ہی بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ اس موقع پر رامو نے بھی پھرتی سے اسے سنبھالا۔

''اسے چھوڑ کر وہ کرسی سیدھی کر۔ اپنے کو جلدی ادھر سے نکلنے کا ہے۔'' ربن نے اسے ہدایت دی تو اس نے وہاں لڑھکی ہوئی کرسی سیدھی کی۔ کرسی کے قریب ہی رسی کے ٹکڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ بھالیہ سیٹھ کو کرسی پر بٹھا کر انہوں نے اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھے کے ساتھ باندھ دیے۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی فوری طور پر حرکت میں نہیں آ پاتا اور انہیں درکار مہلت میسر آ جاتی۔ اس کارروائی سے فارغ ہو کر انہوں نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور چہرے کے تاثرات نارمل کرتے ہوئے باہر نکلے۔ ربن کے دماغ میں کیا تھا اس نے اس سلسلے میں رامو سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کے باوجود وہ مکمل ہم آہنگی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے ربن کے دماغ میں چل رہی منصوبہ بندی سے پوری طرح آگاہ ہو۔

''سیٹھ ابھی ادھر ہی رکے گا۔ اپنے کو اس نے تیرے ساتھ موٹر میں اڈے واپس جانے کا بولا ہے۔''

پورچ میں آ کر اس نے کمال اعتماد کے ساتھ ڈرائیور سے کہا تو وہ فوراً ان دونوں کے لیے پچھلا دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ باتوں میں مصروف چوکیدار بھی دوڑ کر گیٹ تک گیا اور اسے کھول دیا۔ موٹر گاڑی سبک رفتاری سے ان کی منزل کی طرف گامزن ہو گئی۔ دوران سفر وہ دونوں بالکل خاموش اور ساکت تھے لیکن ان کے اندر کیسا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا اس کی انہیں ہی خبر تھی۔

☆☆☆

اغوا کرنے والوں نے فاروق کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ وہ اس طرح سے جکڑا ہوا تھا کہ ہاتھ پیروں کو ذرا سی حرکت بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ اسی حالت میں سفر جاری تھا اور وہ خود کو بہت اذیت میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ لوگ تقریباً پون گھنٹے تک سفر کرتے رہے، اس کے بعد جا کر گاڑی کسی ویران سی جگہ پر..... رکی اور دروازہ کھول کر اسے گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ انہوں نے اس کے بدن کو بوری وغیرہ میں لپیٹ کر رسی کی مدد سے جکڑا ہوا تھا اور وہ حرکت کرنے کے علاوہ کچھ دیکھنے سے بھی معذور تھا لیکن اس کے باقی حواس اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ شہر کے آبادی والے حصے میں نہیں ہے۔

''دروازہ کھولو۔ مال اندر رکھنا ہے۔'' اس نے کسی کی درشت آواز سنی اور فوراً ہی کوئی بھاری دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اسے اٹھانے والوں نے اسے لکڑیوں کے بے جان گٹھے ہی کی طرح اٹھا رکھا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسے گاڑی سے نکالنے کے بعد کسی عمارت وغیرہ کے اندر لے جا رہے ہیں۔

''کون ہو تم لوگ اور کیوں مجھے اغوا کیا ہے؟''

اس نے بلند آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ راستے میں بھی دو تین بار وہ ان لوگوں سے استفسار کر چکا تھا لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تو فاروق

ان کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے اغوا کرنے والے حکم کے غلام ہیں اور انہیں اس سے کسی قسم کی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ انہوں نے اسے اندر لے جا کر فرش پر لٹایا تو اس کے دماغ نے اندر داخل ہوتے ہی محسوس ہونے والی خوشبو کو شناخت کرلیا۔ وہ پٹ سن کی خوشبو تھی۔ اس خوشبو نے اس کے سامنے خودبخود ہی بہت سے نتائج پیش کرنا شروع کردیے اور اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی گودام میں موجود ہے اور یہ گودام شہر کے کسی ایسے حصے میں موجود ہے جہاں قرب و جوار میں آبادی نہیں ہے۔

وہ بمبئی کے ایسے علاقوں سے واقف تھا جہاں گودام اور کارخانے وغیرہ موجود تھے۔ وہ ان گنے چنے علاقوں میں سے ہی کسی جگہ موجود تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ یہاں اگر اس نے شور مچایا بھی تو اس کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ ویسے بھی وہ شور مچانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسے یہ کام کرنا ہوتا تو گاڑی میں بھی کرسکتا تھا۔ غیر متوقع صورتِ حال کے باوجود اس نے پورے وقار کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں بھی اتنی بات تو اسے سمجھ آرہی تھی کہ فوری طور پر اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور اغوا کرنے والے شخص کسی کے ہرکارے ہیں۔

پٹ سن کے اس گودام میں موجود وہ اس اغوا کے پیچھے شامل ہستی کو بھی اب پہچان چکا تھا۔ پہلے اس کے نزدیک بجو دادا اور بملا مشکوک تھے لیکن اب اس کا شک بملا پر قوی ہوگیا تھا۔ بملا کا باپ بھابیہ جو ڈھیروں متفرق کاروبار کرتا تھا، ان میں سے ایک پٹ سن کا کاروبار بھی تھا اور بملا کے لیے اپنے باپ کی ملکیت کسی گودام کو استعمال کرنا ذرا مشکل نہیں تھا۔ اب بس اسے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ کب بملا خود کو اس کے سامنے ظاہر کرتی ہے اور اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے کیا راہ اختیار کرتی ہے۔

بملا کی ضدی اور برہم مزاج طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ مہذب اور پڑھی لکھی عورت اپنے آپے سے باہر ہوتی تو انسانی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ فاروق نے اس کی محبت کو ٹھکرا کر اس کی انا کو چوٹ لگانے کے ساتھ ساتھ اسے آئینے میں اس کی شخصیت کا بدنما چہرہ بھی دکھا دیا تھا اور اب وہ اس کے دہرے جرم کے لیے نہ جانے اسے کون سی سزا دینے والی تھی۔ بملا کا سامنا کرنے کے لیے وہ سخت زمین پر بے حس و حرکت پڑا نہایت صبر سے انتظار کرنے لگا۔ ایسی حبس زدہ جگہ پر اور اتنی لاچاری کی حالت میں یہ انتظار خاصا صبر آزما تھا لیکن اچھی

بات یہ ہوئی کہ اس کا یہ انتظار بہت زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور اس کے کانوں نے دروازہ کھولے جانے کی آواز سنی۔ پھر فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ آنے والوں کی تعداد کم سے کم دو ہے۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں کی اس نے؟'' اسے قدرے سخت لہجے میں کیا گیا سوال سنائی دیا۔

''نہیں صاحب! جب سے ادھر آیا ہے چپ چاپ پڑا ہے۔'' اس کا اندازہ تھا کہ یہ جواب دینے والا گودام کا چوکیدار ہوگا۔

''ٹھیک ہے تم کو جیسا بولا ہے ویسا کرو۔'' پہلے والے آدمی نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور فوراً ہی فاروق کو قدموں کی چاپ اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر اس کو بندشیں کھولے جانے کا احساس ہوا۔ وہ اتنی دیر سے ایک ہی حالت میں بندھا پڑا تھا کہ اس کا جسم سن پڑنے لگا تھا اور اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ وہ بندشیں کھلنے کے بعد فوری طور پر تیزی سے حرکت کرسکے گا پھر بھی کھولنے والے نے اسے پوری طرح نہیں کھولا اور بس اتنی گنجائش پیدا کی کہ اس کے چہرے پر موجود کپڑا ہٹا سکے۔

موٹے کپڑے میں فاروق کی آنکھیں بہت دیر سے روشنی سے محروم تھیں اس لیے کپڑا ہٹانے پر بھی وہ واضح طور پر کچھ دیکھنے سے قاصر رہا۔ بس اس نے اپنے قریب دو دھندلے سے سائے ہی دیکھے۔ قریب کھڑے سائے نے اسے مزید کچھ دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا اور اپنے ہاتھ میں تھاما ایک کپڑا اس کے ناک اور منہ پر رکھ کر اتنی قوت سے جکڑے رکھا کہ فاروق باوجود سر اِدھر اُدھر پٹخنے کے اس کی گرفت سے نہیں نکل سکا۔ کپڑے پر یقیناً کوئی ایسا محلول چھڑکا گیا تھا جس نے جلد ہی اس کے حواس پر اثر ڈالنا شروع کردیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ ہوجانے کے بعد اسے رسی کی بندشوں سے مکمل طور پر آزادی دے دی گئی اور اس پر سے وہ بڑی سی کمبل نما موٹی چادر بھی ہٹالی گئی جس میں لپیٹ کر اسے بے بس کیا گیا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے گاڑی میں منتقل کیا گیا اور پسنجر سیٹ پر ایسے بٹھا دیا گیا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے ہی گاڑی میں سو گیا ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھابیہ کا منیجر مہیش موجود تھا جو بملا کے حکم پر یہ سب کررہا تھا۔

مہیش نے طے شدہ مقام پر گاڑی بملا کے حوالے کی اور بملا اسے چلاتی ہوئی اپنے باپ کے اس بنگلے تک لے گئی جو بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ وہاں موجود چوکیدار کی کیا مجال

تھی کہ سیٹھ کی اکلوتی بیٹی کی آمد پر اعتراض کرتا۔ وہ حکم کا غلام تھا۔ بملا کے کہنے پر اس نے بنا کوئی سوال کیے فرنٹ سیٹ پر بے ہوش بیٹھے فاروق کو ایک کمرے میں لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا اور بملا کے اشارے پر خود خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد بملا نے خود فاروق کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے کرسی کے ساتھ جکڑا اور خود سامنے بیڈ پر بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

بے ترتیب ہو کر ماتھے پر بکھر جانے والے سیاہ سلکی بال، عجیب سی تمکنت لیے ہوئے چہرے کے شاہانہ نقوش اور مردانہ وجاہت کا پیکر مضبوط جسم...... وہ سچ مچ ایسا تھا کہ اس پر کسی شہزادے کا گمان ہوتا تھا اور صنفِ نازک کا اس سے متاثر ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ بھی اس کی شخصیت سے گھائل ہو گئی تھی۔ اپنے سابقہ شوہر کی عیاری سے واقف ہونے اور اسے اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد اسے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی کسی مرد سے متاثر ہو جائے گی۔ شملہ میں فاروق کے ساتھ قیام کے عرصے میں وہ اس کی ظاہری شخصیت ہی نہیں باقی عادات و اطوار سے بھی متاثر ہوئی تھی اور اس کا دل اتنی شدت سے فاروق کا طلب گار ہوا تھا کہ ایسی طلب اس نے کنوار پن میں اپنے مقتول شوہر کے لیے بھی محسوس نہیں کی تھی حالانکہ کہنے کو وہ اس کی پہلی محبت تھا۔

فاروق سے مل کر اسے بالکل ایسا لگا تھا کہ اسے جس شخص کی چاہ تھی وہ تو اصل میں اسے ابھی ملا ہے اور اس کی پہلی محبت محض جوانی کی نادانی تھی لیکن فاروق نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا اور اسے اپنی زندگی میں وہ اہمیت اور مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہوا جو وہ اس سے چاہتی تھی۔ ایک امیر کبیر باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ شروع سے اپنی بات منوانے کی عادی تھی اس لیے فاروق کا یہ رویہ اس سے برداشت نہیں ہوا اور سب سے پہلے اس کے غضب کا شکار چاند بانو بنی کہ اس کے نزدیک وہ اس کی رقیب تھی۔

چاند بانو اس کی خواہش کے برخلاف زندہ بچ گئی اور فاروق نے اس روز بملا کو ہوٹل میں بلا کر اس پر واضح کر دیا کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ چاند بانو پر قاتلانہ حملہ بملا نے ہی کروایا تھا۔ فاروق اسے چاند بانو کے ساتھ کیے گئے سلوک پر سزا دینا چاہتا تھا لیکن موقع ہونے کے باوجود عین وقت پر اس نے اپنے ہاتھ روک لیے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں فاروق کے ساتھ ہونے والی اس تلخ و ترش ملاقات نے بملا پر عجیب سے اثرات مرتب کیے تھے اور اسے اپنا دل پہلے سے زیادہ گھائل محسوس ہوا تھا۔ جذبات میں شدت پسندی کی حامل بملا نے اس بار فاروق کو اپنی محبت کا یقین دلانے اور اسے اپنا بنانے کے لیے انوکھی تدبیر سوچی تھی اور اب فاروق کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آج اس پتھر کے صنم سے آخری ٹاکرا کر کے کوئی حتمی فیصلہ کر ڈالے۔

فاروق کے بے ہوش وجود کو تکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نہایت عجیب اور ناقابلِ فہم تاثرات تھے اور انگلیاں ہاتھ میں موجود اس چاقو کو بڑے پیار سے سہلا رہی تھیں جو اس نے فاروق کو باندھنے سے قبل خود اس کی جیب سے نکالا تھا۔ فاروق کے بارے میں کچھ اس نے شملہ میں جانا تھا اور کچھ معلومات بعد میں حاصل کی تھیں اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا تعلق اڈے پاڑے کی دنیا سے ہے اور وہ اس دنیا سے مختلف محسوس ہونے کے باوجود وہاں ایسا رچ بس چکا ہے کہ چاقو جیب میں ڈالے بغیر کبھی قدم باہر نہیں رکھتا۔ فاروق کے اس ہتھیار کو آج اس نے خود استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی صبح کی طرف گامزن تھی اور بملا بھی طے کر چکی تھی کہ نئی نمودار ہونے والی صبح وہ اپنی منزل تک پہنچ کر دم لے گی۔ اپنے اس عزم کو ایک بار پھر دہراتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ قدِ آدم آئینے میں اس کا پورا سراپا واضح تھا۔ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے ریشمی گاؤن قسم کے لبادے کی ڈوریاں کھولیں اور اسے اتار کر دور پھینک دیا۔ اب اس کا بہت سنبھال کر رکھا گیا وجود اپنی پوری حشر سامانی کے ساتھ نمایاں تھا۔ گاؤن کے نیچے اس نے جدید تراش خراش کا نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس میں اس کے خوب صورت جسمانی نشیب و فراز اور بھی زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔ اپنے بدن کی خوبصورتی کا جائزہ لیتے ہوئے اسے خاصا اطمینان محسوس ہوا۔ ایک شوہر کو بھگتانے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا اور وہ اب بھی کسی کنواری دوشیزہ کی طرح طرح دار تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اپنے چہرے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اچھے نقش و نگار کی مالک تھی لیکن آئینہ دیکھتے ہوئے اسے اچانک چاند بانو کا چاند چہرہ یاد آ گیا۔ چاند بانو قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار تھی اور ایسا حسن قسمت سے کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ چاند بانو کے عکس سے اپنا تقابل کرنے پر بملا کو اپنی خوب صورتی پھیکی

لگنے لگی اور بے ساختہ ہی اس نے اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے میک اپ بکس نکالا اور اپنے چہرے پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ اسے میک اپ کا سلیقہ آتا تھا چنانچہ جب اس کے مشاق ہاتھوں نے چہرے پر چلنا شروع کیا تو وہ نہایت عمدگی سے اس کے ایک ایک نقش کو سنوارتے چلے گئے۔

اس نے خاصا وقت لگا کر خود کو سنوارا۔ پورا میک اپ کرنے کے بعد جب وہ ایک بار پھر اپنی لپ اسٹک کو ٹچ دے رہی تھی تو اس نے آئینے میں نظر آتے فاروق کے عکس میں حرکت دیکھی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے اپنی تیاری کو مکمل کیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر توبہ شکن انداز میں فاروق کے عین مقابل بستر پر براجمان ہوگئی۔ اب ایک بار پھر فاروق کا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نظریں کبھی چاقو کی دھار تو کبھی فاروق کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فاروق کو مکمل طور پر ہوش آچکا تھا اور وہ آنکھیں کھولے بملا ہی کو دیکھ رہا تھا۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں آتے ہوئے پہلے مرحلے میں تو شاید اس کے احساسات نے ٹھیک سے کام نہیں کیا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے مستقل بملا کی طرف دیکھتا رہا لیکن پھر جلد ہی اسے بملا کی زہد شکن تیاری کا احساس ہوگیا اور اس نے فوری طور پر اپنی نظروں کو جھکا لیا۔ وہ باکردار تھا لیکن ایسا ولی بھی نہیں تھا کہ دعوت دیتی عورت اس کے حواس کو متاثر ہی نہیں کرتی۔

''نظریں کیوں چرا لیں۔ میں نے یہ سارا سنگار تمہارے لیے ہی تو کیا ہے۔ تم جی بھر کر دیکھو گے تو میری محنت وصول ہوجائے گی۔'' فاروق کی کیفیت کو محسوس کر کے اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ چمکی۔

''اس ساری ڈرامے بازی کا کیا مقصد ہے؟'' اسے اچھی طرح یاد آگیا تھا کہ اسے کس طرح اغوا کر کے یہاں تک لایا گیا ہے، سو قدرے سخت لہجے میں بملا سے مخاطب ہوا۔

''مجھے اس حال میں دیکھ کر بھی سوال کرتے ہو تو تم سے بڑھ کر نادان کون ہوگا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ بملا بھاٹیہ نے اپنا پورا وجود تمہارے سامنے پیش کردیا ہے۔'' بملا نے بڑے جذباتی لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''بہت خوب......! مجھے بندشوں میں جکڑ کر خود کو اس طرح پیش کرنے کی ادا تو بہت ہی نرالی ہے۔'' فاروق طنزیہ انداز میں ہنسا اور بملا پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر دوبارہ نظریں جھکالیں۔

''ان بندشوں کو کھلنے میں کتنی دیر لگے گی۔ انہیں تو بس تمہاری ایک ہاں کھول دے گی۔ میرے بن جاؤ تو مجھ سمیت سب تمہارا ہے۔'' اس کا لہجہ اب بھی جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کسی کا بننا نہ بننا آدمی کے اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے۔ یہ تو انسان کی بے اختیاری ہوتی ہے جو اسے کسی دوسرے انسان سے باندھ دیتی ہے لیکن اتنی تعلیم یافتہ اور باشعور عورت ہوتے ہوئے بھی تم اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔'' فاروق نے تاسف کا اظہار کیا۔

''کیسے نہیں سمجھوں گی میں اس بات کو، یہ میری بے اختیاری ہی تو ہے جس نے مجھے تم سے اس طرح باندھ دیا ہے کہ تمہارے سوا کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''لیکن تمہیں یہ تو سمجھنا چاہیے کہ ایسی ہی بے اختیاری کا معاملہ دوسرے فریق کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی اور بھی کسی اور کے ساتھ انوالو ہوسکتا ہے اور تمہاری شخصیت کی تمام تر رعنائیوں کے باوجود وہ تمہاری محبت کو قبول نہیں کرسکتا۔'' فاروق نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کس کے ساتھ انوالو ہو تم...... اس طوائف زادی کے ساتھ جس کے پاس حسن کے سوا کچھ نہیں اور اب تو اس کے حسن کو بھی گہن لگ چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔ تعلیم، حسن، دولت...... سب ہے میرے پاس۔ میرے بن کر تم سب کچھ پالو گے۔ تمہارا لائف اسٹائل بدل جائے گا۔ تم بمبئی کی اس تنگ اور گندی گلی سے اٹھ کر شاندار محل میں آجاؤ گے۔ آخر تمہیں یہ ساری باتیں سمجھ کیوں نہیں آتیں؟'' بملا پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''پہلی بات تو یہ ہے مس بملا بھاٹیہ کہ میں آپ کو بہت بار یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ چاند بانو کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے گریز کریں۔ رہی بات آپ کی آفر کی تو شاید میں پہلے بھی اس قسم کے لالچ کو قبول کرنے سے انکار کرچکا ہوں۔ میں جہاں ہوں، وہاں بہت خوش اور مطمئن ہوں اور بالفرض مجھے کبھی محل میں رہنے کا شوق ہوا بھی تو میں اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے آپ کا ڈھول اپنے گلے میں ڈالنے پر مجبور نہیں ہوں۔ میں جب چاہوں اپنا یہ شوق پورا کرسکتا ہوں۔'' اس کی ہٹ دھری پر فاروق کو بھی غصہ آگیا اور اس نے سختی کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''آج تم میرے ساتھ یہ انداز اختیار نہیں کرسکتے۔ آج میں ڈو اور ڈائی والی پوزیشن میں ہوں۔ میرے

موسم سرما کے سنہرے، روپہلے شب و روز کو پُرلطف بناتا پاکیزہ دسمبر 2016ء کا شمارہ

کراچی

ماہنامہ

پاکیزہ

انجم انصار اور **رفعت سراج** کے دلکش ناولوں کی پُرلطف اقساط

سحر ساجد کی اچھوتی تحریر... **من جانبازم** کی اگلی قسط

سیما رضا ردا نے کھولی بکھری گرہیں اپنے خوبصورت سے ناول... **ہم کو عبث بدنام کیا** میں......

اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل و یقین کی پُرحیرت داستان **میمونہ صدف** کے قلم سے......

نگہت سیما سے دلچسپ ملاقات کا مزید احوال جانیں...... **وہ آئے بزم میں**......

کسبِ حلال پر **اختر شجاعت** کا ایمان افروز مضمون......

نفیسہ سعید اور **رفاقت جاوید** کی خصوصی تحریریں......

شائستہ زریں نے کی بھرپور

میزبانی...... وہ بھی معروف ٹی وی اینکر **رضا نقوی** کی

پاکیزہ کے مہمان میں......

اس کے علاوہ

فرحین اظفر، سلمیٰ غزل، بشریٰ ماہا، نور عین، سنبل،

تنزیلہ زاہرہ افضل و دیگر معروف قلمکاروں کی حسین تحریریں......

دلچسپ معلوماتی و تفریحی مستقل مضامین و حسین شاعری صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد تم میری نیچر کو کچھ چکے ہوگے۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں کہ ہاتھ میں چاقو اور دل میں جان لینے کا ارادہ رکھنے کے باوجود عین وقت پر اپنی اِچھا پوری نہ کروں۔ اس روز ہوٹل کے کمرے میں یہ چاقو تمہارے ہاتھ میں تھا اس لیے موت کا فرشتہ خالی ہاتھ لوٹ گیا تھا لیکن آج ایسا نہیں ہوگا۔ آج یا تو تم میری بات مانو گے یا یہ چاقو انسانی خون بہائے گا۔"

بملا کا انداز جنونی تھا۔ وہ فاروق کا چاقو اس کی نظروں کے سامنے لہرا لہرا کر بولتی ایسی حسین ناگن لگ رہی تھی جو کسی بھی لمحے ڈس لینے کو تیار ہو۔ فاروق کو پہلی بار صورتِ حال کی سنگینی کا حقیقی ادراک ہوا۔ واقعی بملا جیسی شدت پسند عورت کے لیے انسانی جان لے لینا کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ وہ اپنے سابقہ محبوب اور شوہر کو قتل کروا چکی تھی۔ اس نے چاند بانو پر بھی قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے ہاتھ کسی انسان کے خون سے رنگے ہونے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ فاروق کا انکار سن کر اپنی دھمکی پر عمل درآمد کر ڈالے۔ وہ زندگی کی بہت زیادہ ہوس نہیں رکھتا تھا لیکن یوں ایک جنونی عورت کے ہاتھوں بے مقصد اپنی جان دے دینا بھی گوارا نہیں تھا پھر ابھی تو اسے جولیٹ کے لیے بھی بہت کچھ کرنے کی فکر تھی۔

"اس طرح کے معاملات ایسے طے نہیں ہوتے بملا! یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو تم مجھے زبردستی حاصل کر کے کیا پاسکوگی۔ مجھے زبردستی پالینا تمہارے لیے نہ پانے سے زیادہ تکلیف دہ ہو جائے گا۔" وہ اپنے طیش کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میرے لیے کیا اچھا ہوگا اور کیا نہیں، یہ میرا پرابلم ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھے یہ سب سمجھانے کے بجائے اپنا آخری فیصلہ سناؤ اور یہ سوچ کر سناؤ کہ تم صرف مجھے اپنانے یا نہ اپنانے کا فیصلہ نہیں سنا رہے ہو بلکہ تم اس سے زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والے جج ہو۔" بملا کا لہجہ اٹل تھا۔

"تم اتنی باشعور ہو کر بچوں کی طرح برتاؤ کیوں کر رہی ہو۔ ایسے فیصلے یوں کھڑے کھڑے نہیں کیے جاتے۔ تمہیں مجھے کچھ وقت دینا چاہیے۔" اس کے جنون کو ٹالنے کے لیے فاروق نے تھوڑی سی مہلت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ کرسی کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا تھا اس لیے خود کو خاصا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ جو بھی فیصلہ ہونا ہے، ابھی اور اسی سے ہونا ہے۔ تم بس مجھے بتاؤ کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے زندگی..... یا موت۔" وہ بستر پر سے اٹھ کر فاروق کے عین سامنے کچھ فاصلے پر آکھڑی ہوئی اور کھلا ہوا چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس کے اس دھمکی بھرے انداز پر فاروق اپنے دبائے ہوئے غصے کو دوبارہ ابھرنے سے نہیں روک سکا۔ ایک امیرزادی اپنی دولت اور اختیارات کے بل بوتے پر اس کے ساتھ زبردستی کا سودا کرنا چاہتی تھی اور وہ ایسا ہی خود پر دوسروں کا جبر سہنے والا اور اصولوں پر سمجھوتا کرنے والا ہوتا تو یہ زندگی کیونکر گزار رہا ہوتا۔ شادی بیاہ کے معاملات فریقین کی باہمی رضامندی سے طے پائیں، یہ ایک اصولی بات ہے لیکن بملا کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اس نے بھی اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کیا اور بغیر کسی لگی لپٹی کے تیز لہجے میں بولا۔

"تمہاری یہی ضد ہے تو پھر سن لو کہ مجھے تمہارا ساتھ قبول نہیں ہے۔ تمہارے زبردستی کے ساتھ کے مقابلے میں میرا انتخاب موت ہے۔ تم چاہتی ہو کہ موت کا فرشتہ یہاں سے خالی ہاتھ نہ جائے تو یوں ہی سہی۔"

"تمہارے اس فیصلے کو میں اپنے من اور آتما کی گہرائی کے ساتھ سویکار کرتی ہوں کیونکہ یہ میرے محبوب کا فیصلہ ہے۔" اس کا جواب سن کر خلافِ توقع بملا کے چہرے سے جنونی تاثرات معدوم ہوگئے اور وہ گویا جان کنی کی کیفیت سے نکل کر حالتِ سکون میں آکر دھیرے سے مسکرائی۔ فاروق کو اس ناقابلِ فہم عورت کی اس ادا پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اتنی سخت دل تھی کہ یونہی ہنستے ہنستے کسی کی بھی جان لے سکتی تھی۔ اس بار اگر اس کا شکار وہ تھا تو یہ کیا عجب تھا لیکن اس وقت ایک بالکل ہی عجیب بات ہوئی اور بملا اپنے ہاتھ میں تھامے چاقو سے اس پر حملہ آور ہونے کے بجائے پلٹ کر واپس بستر پر جا بیٹھی اور کچھ دیر اسے مرمٹنے والی نگاہوں سے تکتے رہنے کے بعد عجیب سے لہجے میں بولی۔

"مجھے وشواس ہے کہ تم اپنی آخری سانس تک یاد رکھو گے کہ بملا بھابیہ نے تم سے پیار کیا تھا۔" اس جملے کو ادا کرتے ہی اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آیا اور فاروق کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے جو نہ تو عمر دیکھتی ہے اور نہ ہی ذات برادری کے بندی خانوں میں قید ہوتی ہے۔ یہ نہ تو اونچی اونچی پگڑیوں کو دیکھتی ہے اور نہ دنیا کے تاج محلوں کو۔ یہ تو بس...... یونہی اچانک ہو جایا کرتی ہے۔

زندگی میں ایک چور گھڑی ایسی بھی آتی ہے جب کوئی اپنے آپ آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہے۔

اس کے ساتھ بھی میری پیار کہانی کچھ ایسے ہی شروع ہوئی تھی۔ میں آج بھی سوچتا ہوں تو خود پر ہنسی آجاتی ہے کہ

تصویر

علی اختر

کسی بھی انسان کی زندگی کا خوب صورت ترین دور اس کا بچپن ہوتا ہے اور جب خوب صورتی کو ہی گہن لگ جائے تو خوش کن لمحات کو بھی گویا دیمک لگ جاتی ہے۔ وہ جو اپنے بچپن سے صحیح طرح کھیلنے بھی نہ پایا تھا کہ غم کے پہاڑ تلے دب گیا اور جب... ایسے میں ننھے ننھے پوروں میں لرزش اور معصوم آنکھوں میں خواب کی جگہ آنسوئوں کی تپش نے لے لی تو اداسی کے اس منظر نے ہر ایک کو دل گرفتہ کر ڈالا۔

چھوٹا منہ بڑی بات اور تلخ حقائق کا عجیب امتزاج



کہاں عمر کی اترتی شام کنارے بیٹھا آدمی...... اور کہاں وہ طلوعِ صبح جیسا...... عمروں کی اتنی بڑی خلیج جسے دیکھنے اور سننے والے بھی بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر بھلا اس میں میرا کیا قصور...... شام اور صبح بھی تو کہیں نہ کہیں آکر ملتے ہی ہیں۔ بس یہی سمجھ لیں اور پھر اگر وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا تو کون سی قیامت آگئی تھی۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ میرا اور اس کا جوڑ بنتا ہی نہ تھا۔ کہاں پچاس اور ساٹھ سال کا ایک بوڑھا آدمی اور کہاں ایک کم عمر لڑکا...... اس کے ساتھ میرا دوستانہ تھا...... پیار تھا...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میری محبت تھا...... جو دو دلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لیے دیکھنے والوں کی حیرانی ایک لمحے کے لیے انہیں ساکت وصامت کر دیتی ہے۔

اس کے ساتھ میری محبت کی سانجھ کیسے ہوئی...... یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے مگر ٹھہریں...... آگے بڑھنے سے پہلے میں پڑھنے والوں سے اپنا تعارف کروا دوں تاکہ محبت کی کہانی پوری وضاحت سے آپ پر اترے۔

میرا نام واصل ہاشمی ہے۔ شہر سے ذرا ہٹ کر ایک سینما کی ذیلی سڑک پر بنی دکانوں میں سے ایک دکان واصل فوٹو گرافر کے نام سے کتنے عرصے سے کر رہا ہوں۔ دکان کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف گورنمنٹ پرائمری اسکول ہے جہاں متوسط درجے اور غریب غربا کے...... اپنی ان دھلی، بھی ادھڑی وردیوں اور بہتی ناکوں والے بچے پڑھتے ہیں۔ مجھ سے آگے اور بھی دکانیں ہیں مگر کہانی کا ان دکانوں یا ان کے مالکوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ویسے تو بچوں کے اس اسکول کا بھی میری کہانی سے کوئی تعلق نہیں مگر میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ مجھے بچے ویسے ہی بہت اچھے لگتے ہیں۔ چاہے ان کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ہو۔

میں اپنی دکان دوسری دکانوں سے ذرا پہلے کھول لیتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے گاہکوں کو دینے والی تصاویر کو بنانے سنوارنے میں بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ میری دکان کا شٹر اٹھاتے ہی پہلے شیشے کا دروازہ آتا ہے جو دکان کو خوب صورت بناتا ہے۔ اس سے آگے دروازے کے پاس ہی میرا کاؤنٹر لگا ہوا ہے جس کے پیچھے میری کرسی ہے۔ کاؤنٹر کے اوپر شیشے کے گلاس میں رکھے بڑے چھوٹے برش، ایک خوب صورت چھوٹی سی ٹرے میں پڑے رنگ اور نازک سے گلاس میں تھوڑا سا پانی، نزدیک برش صاف کرنے کے لیے ایک نمدہ...... ایک طرف بڑا ٹیبل لیمپ اور کینوس...... جہاں رکھ کر میں تصویروں کے خدوخال سنوارتا، ابھارتا ہوں۔ صبح سویرے پہلا کام دکان کی صفائی ستھرائی ہوتی ہے۔ کاؤنٹر کے نزدیک پڑی کرسیاں اور گاہکوں کے لیے قریب رکھا صوفہ بھی میں خود ہی صاف کرتا ہوں یا پھر...... دکان پر کام کرنے والا لڑکا...... جو ابھی کام سیکھ رہا ہے، آجائے تو وہ یہ کام کر دیتا ہے مگر جب تک میں یہ کام خود نہ کرلوں مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔

اس روز بھی میں پہلے کی طرح دکان کا شٹر اٹھا کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا تھا اور گاہک کو دینے والی تصویر کی ری ٹچنگ کر رہا تھا جب دکان کے شیشے والے دروازے پر ایک چھوٹی سی کنکری آکر لگی۔ شیشے کے بدن پر کنکری کے لگتے ہی شور سا ہوا۔ میں نے باہر دیکھا مگر پھر یہ سوچ کر کام کرنے لگا کہ ہوسکتا ہے باہر سے گزرنے والی کسی گاڑی کے ٹائر تلے آیا کوئی اڑتا کنکر شیشے پر آلگا ہو۔

میں دوبارہ کام میں مشغول ہوگیا کہ ایک بار پھر چھوٹا سا ایک پتھر شیشے پر آکر لگا۔ ابھی اسکول میں نہ تو وقفہ ہوا تھا اور نہ ہی چھٹی کا وقت تھا...... اور باہر کوئی بچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر یہ کس نے شرارت کی تھی؟ میں دوبارہ کام میں لگ گیا لیکن ایک بار دوبارہ یہی حرکت ہوئی۔ اب مجھے پختہ یقین ہوگیا تھا کہ کوئی جان بوجھ کر شرارتیں کر رہا ہے۔ یہ کون ہوسکتا ہے؟ میں یہ دیکھنے کے لیے اپنا کام چھوڑ کر باہر آگیا۔ اتنی دیر میں شرارت کرنے والے نے ایک اور چھوٹا سا پتھر دکان کے شیشے پر دے مارا۔

تب میں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ آٹھ یا دس سال کا ایک بچہ تھا جو مسلسل دکان کے دروازے پر پتھر تاک کر مارتا تھا۔ اب کی بار اس نے پتھر پھینکتے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظریں مجھ سے ملیں تو میں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا...... وہ کسی خوف یا ڈر کے بغیر ہولے ہولے چلتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔

''یہ پتھر آپ مار رہے ہیں، شیشے پر......؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔

''جی ہاں......!'' اس نے ڈرے بغیر جواب دیا۔

''آپ کو اس بات کا پتا ہے کہ پتھر لگنے سے شیشہ بھی ٹوٹ سکتا ہے۔'' میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''چھوٹے بھائی! کیوں پتھر مار رہے تھے...... بتا سکتے ہو؟''

''بس ویسے ہی میرا جی چاہ رہا تھا...... مارنے کو......'' اس نے آگے سے نڈر ہو کر جواب دیا۔

''آپ...... جہاں دوسرے بچے شرارتیں کرتے

ہیں، بھاگتے کودتے ہیں وہاں چلے جایا کریں یا پھر اسکول جایا کریں، چھوٹے بھائی......" میں نے پیار بھرے لہجے میں سمجھایا۔

پتا نہیں اسے چھوٹا بھائی کہہ کر میں اپنے اندر کے کس جذبے کی تسکین کر رہا تھا یا پھر اسے چھوٹا بھائی کہہ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ ویسے بھی میرے منہ سے چھوٹے بھائی کا لفظ سن کر اس کی آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگے تھے۔

"میں آپ کو فارغ نظر آتا ہوں جو آپ مجھے یوں مشورے دے رہے ہیں؟" اس نے میری سوچوں کے جسم پر چٹکی سی بھری۔ میں اس کا جواب سن کر اس کی طرف حیران آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ ایک بار پھر بولا۔

"کھیلنے کو...... تو میرا بھی بڑا دل کرتا ہے، پر میرا ابا مجھے کھیلنے نہیں دیتا...... ویسے تو میرا پڑھنے کو بھی دل کرتا ہے مگر میرا والد کہتا ہے، پڑھائی پر اٹھنے والا خرچہ کہاں سے لائیں، فالتو پیسے ہمیں بچتے ہی نہیں...... جب میں کھیلنے کا کہوں تو ابا مجھے کسی کام پر لگا دیتے ہیں۔"

"اوہو...... تو چھوٹے بھائی آپ اس عمر میں کام بھی کرتے ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو اور کیا...... یہ ساتھ سینما ہے نا...... اس کے آگے میرا والد ریڑھی لگاتا ہے۔ نان دال اور چنے چاول کی ریڑھی...... میں وہاں گاہکوں کے آگے روٹی رکھتا ہوں۔ ان کے جھوٹے برتن دھوتا ہوں اور اس کے ساتھ ادھر ادھر دکانوں پر آرڈر بھی بھگتاتا ہوں...... آپ ہی انصاف کریں، میں کام کروں یا کھیلوں...... ایک دن میں کھیل میں لگا رہا تو میرے والد نے مجھے اس قدر پیٹا کہ کچھ مت پوچھیں...... اس روز سے میں نے کھیلنے سے توبہ کر لی۔ آج تو ویسے ہی میں کچھ دیر کو فارغ تھا تو میں ادھر آ کر کھیلنے لگا...... سچ پوچھیں...... شیشے پر لگنے والے پتھر سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی، بڑا مزہ دے رہی تھی......"

"اچھا...... تو چھوٹے بھائی...... یہ آپ کھیل رہے تھے......" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"تو اور کیا......" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اور اگر تمہارے کھیلنے میں میرا نقصان ہو جاتا تو......؟" میں نے اسے ڈرانے کے لیے کہا۔

"اوہ یار چھوڑو...... کچھ نہیں ہوتا...... تم تو ویسے ہی ڈر گئے ہو۔" اس نے بڑوں کی طرح بے باکی سے کہا۔

"آپ چھوٹے بھائی...... میرے ساتھ دوستی کرنا پسند کرو گے؟" میری دلچسپی زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

"اگر آپ کہتے ہیں تو کر لیتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"تو پھر چھوٹے بھائی، دیر کس بات کی...... دکان کے اندر آ جائیں۔" میں نے اس کی دلیری سے متاثر ہو کر اسے دعوت دے ڈالی۔

"آج نہیں...... پھر کبھی آؤں گا...... آج تو مجھے فرصت نہیں۔ ویسے بھی ابا مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔" وہ یہ کہہ کر بھاگ گیا۔

اور میں دکان میں آ کر بیٹھ گیا مگر میری سوچوں کے گرداب بنتے، ٹوٹتے اور بڑھتے رہے۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ میں اسی لیے زیادہ پیار کرتا ہوں کہ ان میں ریاکاری نہیں ہوتی۔ ویسے بھی وہ نتھری اور نکھری صبح کی طرح معصوم اور کھرے ہوتے ہیں مگر یہ بچہ...... مجھے ان سب سے ہٹ کر لگا کہ اس کی باتوں میں حقیقی زندگی کی کڑواہٹ کچھ دوسروں سے بڑھ کر تھی۔ ویسے بھی وقت کے پہیے تلے روندے ہوئے لوگوں کے بچے اپنی عمر سے بڑھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اس کے ذہن میں بھی وقت نے بڑی پکی اور سیانی زبان رکھ دی تھی مگر ابھی اسے اس زبان سے کسی کو دھوکا دینے کا گر نہیں آیا تھا۔ وہ سچ تو بولتا تھا لیکن فریب کی ملمع کاری کے ساتھ نہیں۔ شاید تبھی وہ مجھے دوسروں سے بالکل الگ...... لیکن خوب صورت لگنے لگا تھا۔ میں دکان کے اندر آ کر بیٹھ تو گیا تھا مگر اپنا آپ کہیں باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔ پھر آتے جاتے گاہکوں میں اس قدر مصروف ہوا کہ میں اس کو بھول ہی گیا۔

دوسرے دن...... میں نے جب دکان کا شٹر اٹھایا تو وہ بھی اپنے والد سے نظریں بچا کر آ گیا۔ میں نے اسے دور سے ہی چھوٹی سڑک پر آتے دیکھ لیا تھا۔ میں دکان میں آ کر شیشے کا دروازہ کھول کر اپنے کام میں لگ گیا۔

آج اس نے دروازے پر پتھر نہیں مارا بلکہ کھلے دروازے سے تھوڑا سا منہ اندر کر کے اونچی آواز میں "ہاؤ" کہہ کر مجھے ڈرانا چاہا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں اندر ہی اندر ہنس دیا لیکن اس کی طرف میں نے توجہ نہ دی۔ مجھے مصروف دیکھ کر اس نے ایک بار پھر وہی حرکت کی۔

میں نے کام چھوڑا اور باہر نکل آیا۔ وہ دوبارہ ادھر آ رہا تھا۔

"چھوٹے بھائی...... یہ ڈراؤنی آوازیں تم نکال

رہے تھے؟''

''تو اور کیا...... ہم شیر کی آواز نکال کر آپ کو ڈرا رہے تھے۔'' اس نے دلیری سے مزاح پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ چھوٹے بھائی...... سچ پوچھو...... میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ یقین کریں، ابھی تک میں اندر سے کانپ رہا ہوں۔'' میں نے مصنوعی خوف سے کہا۔

''ہم بھی تو اسی خاطر ایسی آوازیں نکال رہے تھے۔'' اس نے دلیری سے جواب دیا۔

''تو چھوٹے بھائی دکان میں آجائیں۔'' میں نے دروازے کے درمیان کھڑے ہو کر اسے دعوت دی۔ تب وہ ہنستے ہوئے اندر آگیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بڑی حیران نظروں سے دکان کی ساری دیواروں کو دیکھا۔ ایک دیوار پر لگے کیلنڈر...... دکان کی مشہوری کے لیے لگائی ہوئی تصویریں...... کاؤنٹر پر رکھی مختلف اشیا...... اس نے سب کچھ بڑے غور سے دیکھا...... اتنی دیر میں میں نے صفائی ستھرائی کر لی تھی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

تبھی اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت میری طرف کی۔ میں اس کی حرکتیں بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ اس کی انگشت ابھی تک ویسے ہی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

پھر پتا نہیں، مجھ سے کس نے ایسا کرنے کو کہا۔ شاید وہ کوئی میرے اندر کا جذبہ تھا۔ میں نے بھی اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت اس کی طرف اٹھائی اور دھیرے دھیرے سے اس کی انگشت کی طرف بڑھانی شروع کر دی۔ ایک جگہ آکر ہم دونوں کی انگلیوں کے سرے مل گئے تو اس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔

''آج سے ہم دونوں ایک دوسرے کے پکے دوست ہوئے۔''

''تو پھر آج سے تم میرے چھوٹے بھائی بن گئے ہو...... ٹھیک...... اب تو تمہیں اعتراض نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے ہی سہی......'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ کچھ دیر کے توقف بعد وہ ایک بار پھر بولا۔

''اچھا...... تو پھر ہم چلتے ہیں، دادا انتظار کر رہا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اب وہ دوسرے تیسرے دن جب بھی اس کا جی چاہتا، بلا روک ٹوک دکان میں آجاتا تھا۔ میں گاہکوں میں جتنا مرضی مصروف ہوتا، اس کے لیے وقت ضرور نکال لیتا تھا۔ کبھی کبھار تو ایسے بھی ہوتا کہ جب وہ آتا اس وقت گاہک میرے سر پر کھڑے ہوتے۔ وہ بڑی تیزی سے اندر آتا۔ اشاروں میں باتیں کرتا اور چلا جاتا۔

اس روز کام کچھ زیادہ ہی تھا...... رش بھی ہو رہا تھا اور پھر آج تو کام سیکھنے والا لڑکا بھی نہیں آیا تھا۔ اوپر سے میرا ایک پرانا دوست بھی آیا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا اور گاہکوں کو بھی فارغ کر رہا تھا۔ وہ حسب عادت بڑی تیزی سے دکان میں داخل ہوا۔ میں اس کو دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دوست نے میری حرکت کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔

''معاف کرنا دوست...... میرے چھوٹے بھائی آئے ہیں۔ میں پہلے ان سے مل لوں...... پھر باتیں کریں گے۔''

میرے دوست کی نظریں چھوٹے بھائی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تب اس نے حسب عادت کوئی بات کرے بغیر اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت میری طرف بات کرنے کے انداز میں کی۔

میں نے چپ چاپ اپنی انگشت شہادت اس کی انگشت سے ملا دی۔ تب اس نے میری طرف اسی ہاتھ کی دو انگلیاں کیں۔ میں نے بھی دو انگلیاں ان سے ملا دیں۔ پھر اس نے میری طرف انگوٹھا کیا...... میں نے اس کے انگوٹھے کے ساتھ اپنا انگوٹھا ملا دیا۔ تب اس نے فوجیوں کی طرح اپنے دونوں پیروں کو زور سے جوڑ کر مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی اسے فوجی سیلوٹ مارا تو وہ باہر نکل گیا۔ میرا دوست اور دوسرے گاہک ہماری ساری حرکتیں دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

''یہ کون تھا؟'' اس کے جاتے ہی میرے دوست نے پوچھا۔

''یہی تو میرے چھوٹے بھائی تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سن کر اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اپنے شانے اچکائے۔

پیار اور محبت کے یہ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ اب وہ پوری طرح مجھے اپنا دوست ماننے کو تیار ہو چکا تھا۔ وہ آتا اور اسی طرح اشاروں کنایوں کا کھیل کھیلتا اور چلا جاتا۔ ایک روز اس نے پھر اسی طرح اشارے کیے۔

اس روز میں نہ جانے کن سوچوں میں غلطاں تھا کہ

میری انگلی..... اس کی انگلی سے روز کی طرح جڑ نہ سکی۔ اس نے دو انگلیاں کیں، تب بھی میری انگلیاں اس کی انگلیوں کا منہ نہ چوم سکیں۔

''آج آپ ہار گئے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''جی چھوٹے بھائی..... مجھے شرمندگی ہے۔ آج واقعی آپ جیت گئے ہیں۔'' میں نے ہار مانی۔

''اسی لیے..... آج ہم بہت خوش ہیں، آپ کو ہرا کر خوشی ہوئی لیکن دوست..... تیاری کیا کرو۔ ایسے ہی ہار نہیں مانا کرتے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آگے سے اسی طرح ہوگا چھوٹے بھائی..... میں تیاری رکھوں گا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

تب اس نے یہ کہہ کر مجھے سیلوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔ وہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور باتیں کر کے میری سوچوں سے لپٹتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا جیسے وہ میری آنکھوں کے راستے میرے من میں زبردستی بیٹھ گیا ہو..... جس روز وہ نہیں آتا تو مجھے لگتا تھا جیسے میری انتہائی عزیز شے کہیں گم ہوگئی ہو..... مجھے بے چینی سی ہو جاتی۔

اس روز وہ ایک بار پھر بڑی تیزی سے اندر آیا۔ ہم دونوں نے اپنا روز کا کھیل کھیلا، تب پہلی بار اس نے کہا۔

''دوست..... دوستوں کی تصویریں بناتے ہو، ہماری بھی تصویر بنا دو۔''

اس کی معصوم سی خواہش میرا اندر کھا گئی۔

''کیوں نہیں چھوٹے بھائی..... ضرور بناؤں گا لیکن آج نہیں۔'' میں نے اس کی امید بندھائی۔

پھر وہ ہنستے ہوئے چلا گیا۔ اس کے کتنے دن بعد تک وہ نہ آیا تو وہی بے چینی مجھے ستانے لگی۔ میں روزانہ کام کرتے ہوئے اور فارغ بیٹھے ہوئے بھی اس کا منتظر رہتا۔ کتنی بار دروازہ کھلتا تو اسے ڈھونڈتی نظریں اٹھتیں لیکن ناکام ہو کر پلٹ آتیں۔ تب ایک روز کام سیکھنے والے میرے شاگرد نے ہنس کر کہا۔

''استاد جی! لگ رہا ہے چھوٹے بھائی کافی روز سے نہیں آئے۔''

''تم نے کیونکر جانا؟'' میں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''استاد جی! یہ پیار بھی بڑی عجیب چیز ہے، جو نہ تو آدمی کو جینے دیتا ہے اور نہ چین سے مرنے دیتا ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا تو میں نے پہلی بار سوچا۔

وہ کس قدر سچ کہتا ہے..... پیار تو تپتے موسموں میں خنک ہوا کا وہ جھونکا ہے جو جلتے جسم کو تراوٹ دے جاتا

ہے۔ مجھے اس سے کچھ بھی نہ لینا تھا، اسے بھی مجھ سے کوئی لالچ نہ تھا اور پھر وہ میرا ہم عمر بھی تو نہ تھا۔ نہ میرے ساتھ اس کی کوئی رشتے داری تھی لیکن ایک سا تعلق ضرور تھی..... نہ جانے یہ کس طرح کا پیار تھا کہ جب تک ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے پریشان ہو جاتے تھے۔

وہ کتنے دنوں سے مجھے نظر نہیں آیا تھا تو اس کے لیے طرح طرح کی سوچوں نے میرے دل کو گھیرا ہوا تھا۔ ہزاروں وسوسے میرے اندر کے خوف کو ابھار رہے تھے۔ کوئی ہفتے، ڈیڑھ ہفتے بعد وہ ایک روز پھر میری دکان پر آیا..... اجڑا اجڑا..... بکھرا بکھرا سا.....

اس کی حالت دیکھ کر میں پریشانی میں باہر نکل آیا۔

''چھوٹے بھائی..... کہاں تھے اتنے دنوں سے؟''

وہ چپ چاپ حیرانی سے میری طرف دیکھتا رہا۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے چھوٹے بھائی!'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

تب بھی اس کی وہی حالت تھی۔

''چھوٹے بھائی! کوئی غلطی یا گستاخی ہوگئی ہے؟'' میں نے ملتجیانہ انداز اپنایا۔

''آپ ایک بات بتائیں مجھے..... جب کسی کا والد مرجائے تو اس سے بولا اور اس سے ہنسا جا سکتا ہے؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار گرنے لگے۔

مجھے پہلی بار لگا، جیسے کسی نے میرے پورے وجود کو بڑی شدت سے دھکا دے کر گرا دیا ہو..... یا کسی نے بڑے آرے کے نیچے سے میرے وجود کو گزار کر دولخت کر ڈالا ہو۔

''چھوٹے بھائی! کیا کہا؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''ابا مرگیا ہے..... میرا..... باپ مرگیا ہے..... میں کس طرح بولوں..... کیسے ہنسوں.....؟'' اس نے رک رک کر کہا۔

''مجھے بتاؤ..... کبھی ایسی تصویر بھی اتاری ہے آپ نے.....؟'' وہ بے تحاشا رونے لگا۔

اور میں..... میں بھی تو اس کے ساتھ رونے لگا تھا۔ میرے جھریوں زدہ گالوں پر آنسو آ کر خود بخود اٹک گئے تھے..... بالکل اسی طرح..... جیسے میری آنکھوں میں اس کی تصویر اٹک گئی تھی..... یہ آنسو..... اور اس کی یہ تصویر..... آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے اس روز تھی..... جانے کب تک یہ یونہی رہے.....

پشت پناہ

ملک صفدر حیات

بعض اوقات پس منظر میں رہنے والے لوگ منظر کو بہت واضح کر دیتے ہیں مگر اس فارمولے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ منظر کو واضح کرنے والے خود کو پس منظر میں رکھ کر گویا محفوظ بھی کر لیتے ہیں لیکن ایسا عموماً منفی رجحانات میں دیکھا جاتا ہے... اور اسے عام فہم زبان میں پشت پناہ کہا جاتا ہے۔ جن کے ہاتھوں میں چند کٹھ پتلیوں کی ڈوری ہوتی ہے، جنہیں نچا نچا کر وہ اپنے مقاصد حاصل کرتے رہتے ہیں اور بالآخر ایک دن ان کٹھ پتلیوں کو توڑ پھوڑ کر کاٹھ کباڑ بنا دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مٹی کے اس پتلے نے خود کو قانون کی وردی میں چھپا کر یہ سمجھ لیا تھا کہ دنیا اس کے پیروں تلے بچھی ہے مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی پیر کا جوتا بھی سر چڑھ کر بولتا ہے اور جب اسے بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑا تو گویا پیروں تلے زمین ہی کھسک لی۔
یہی تو سمجھ کا پھیر ہے جو بعض عقلمندوں کو دیر سے سمجھ میں آتا ہے
کہ صحیح اور غلط کی پہچان کیا ہے۔

قانون کے شکنجے میں زمین پر کروفر سے چلنے والوں کے

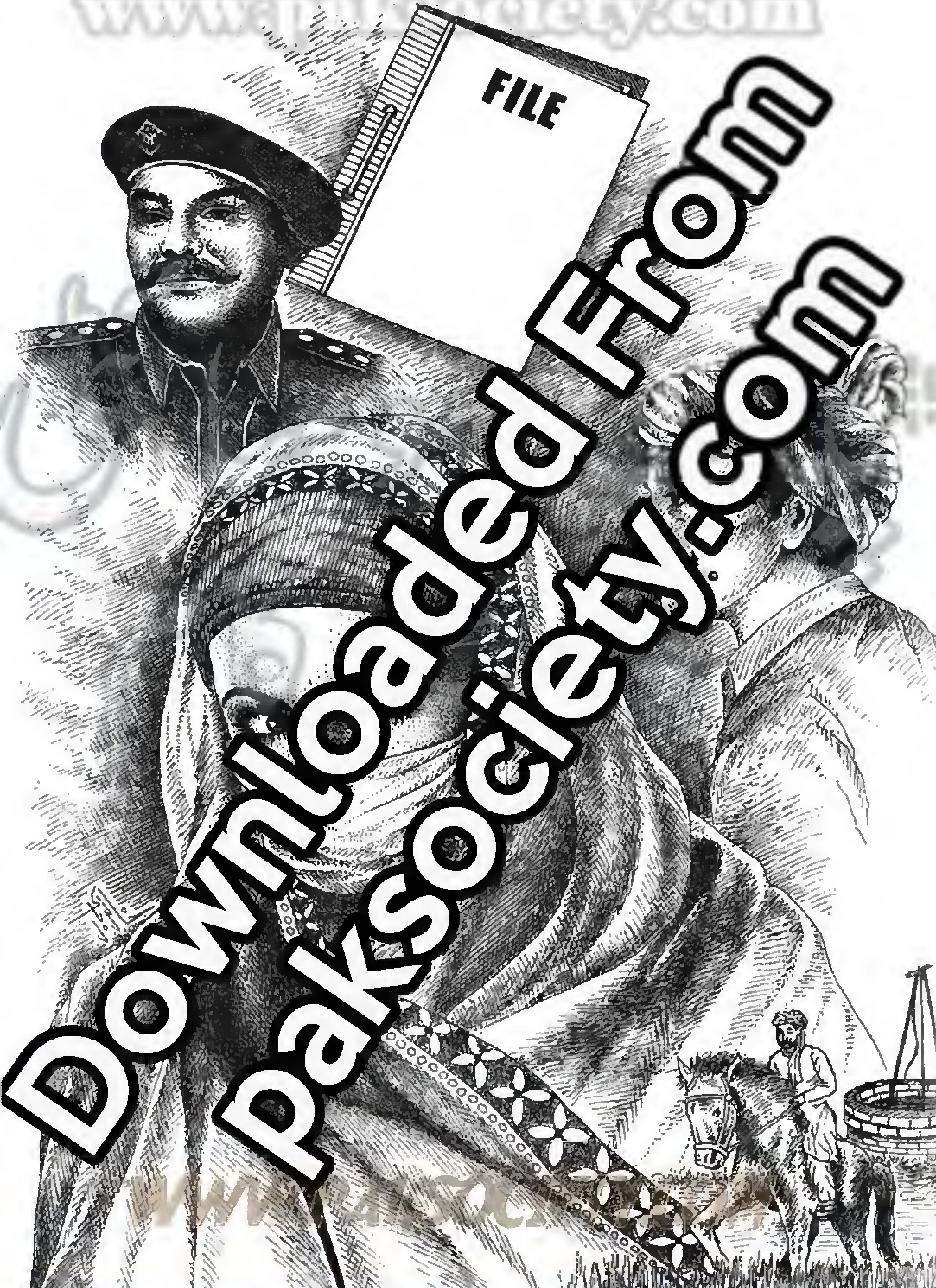
جرم کا اعتراف

جنوری کا مہینا قریب الختم تھا، سردی اپنے جوبن پر تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ موسم کی شدت نے ہر شے کی قلفی جما دی ہو۔ سورج غروب ہوتے ہی گہری دھند فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی اور اگلے روز دوپہر کے بعد ہی سورج کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ موسمِ سرما میں دن ویسے ہی چھوٹے ہو جاتے ہیں اور دن کا یہ چھوٹا پن گاؤں دیہات میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے کیونکہ ان سادہ لوح لوگوں کے پاس شام کے بعد، شہر میں بسنے والے افراد کی طرح مصروفیات نہیں ہوتیں لہٰذا ادھر رات کا کھانا کھایا، ادھر رات کا آغاز ہو گیا۔ کوئی بڈھا ٹھڈا جاگا بھی تو زیادہ سے زیادہ عشا کی نماز تک۔ اس کے بعد افراد اور مویشیوں کے ساتھ ہی گاؤں کی فضا بھی گہری نیند میں چلی جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک ٹھنڈی ٹھار رات کو میں عشا کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ موسم چاہے جتنا بھی شدید کیوں نہ ہو، میں فجر اور عشا کی نمازیں ضرور ادا کرتا ہوں۔ بچپن سے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ ایک مومن پر یہ دونوں نمازیں بہت بھاری ہوتی ہیں یعنی ان کی ادائی مشکل محسوس ہوتی ہے اور...... میں کافی مشکل پسند واقع ہوا ہوں۔

یہ جن دنوں کا واقعہ ہے ان دنوں میں جوان ہی تھا۔ ویسے نماز کی پابندی اور ادائی کے حوالے سے میں نے ساری زندگی اپنے فرائض کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ میں جائے نماز کو سمیٹ کر اٹھا اور کوارٹر کا صحن عبور کر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر دستک کی آواز ابھر چکی تھی۔

ان دنوں تھانے میں زیادہ مصروفیت نہیں تھی۔ بس اِکا دُکا روزمرہ کے واقعات ہی سے واسطہ پڑتا تھا۔ میں نے اپنے تھانے کے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ میں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوں۔ رات ہو یا دن کسی وقت بھی میری ضرورت


FILE

پیش آجائے، میں حاضر ہوں لہٰذا آدھی رات کو بھی میرے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا ہے۔

میں نے اسی خیال سے دروازہ کھول دیا کہ شاید اس علاقے میں کوئی اہم واقعہ پیش آگیا ہے لیکن کھلے ہوئے دروازے میں کسی پولیس اہلکار کے بجائے ایک عورت کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ پتا نہیں، کون سی مجبوری نے اسے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے سرتاپا گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ دراز قامت اور بھرے بھرے جسم کی مالک ایک صحت مند عورت تھی۔ اس نے خود کو ایک گرم شال میں لپیٹ رکھا تھا، صرف اس کی آنکھیں مجھے نظر آرہی تھیں۔ پردے کی اوٹ میں سے اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

''میرا نام شادو ہے جی۔''

''شادو! تم اس وقت میرے پاس کیوں آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''تم کل دن میں کسی وقت بھی یہ ضروری بات کرنے میرے پاس آسکتی تھیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اس وقت کیوں؟''

''میں دن میں آپ سے ملنے نہیں آسکتی۔'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔ ''آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔''

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم ادھر تھانے میں جاکر میرے کمرے میں بیٹھو۔ میں دس منٹ میں آتا ہوں۔''

''میں تھانے میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''آپ ادھر ہی میری بات سن لیں تو بہت مہربانی ہوگی آپ کی۔''

اس کا انداز مجھے تشویش میں مبتلا کررہا تھا۔ وہ کسی سنسنی خیز راز سے مجھے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اندر آجاؤ۔''

اور وہ محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھنے کے بعد میرے کوارٹر میں آگئی۔

موسم کی شدت کے پیش نظر میں نے اسے برآمدے یا کھلے صحن میں بٹھانا مناسب نہ سمجھا اور اندر کمرے میں لے آیا۔ میرے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں ایک چارپائی کے علاوہ دو کرسیاں بھی موجود تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شادو! بیٹھ جاؤ۔''

وہ اپنی چادر کو سمیٹتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دوسری کرسی سنبھال لی اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شادو! اب مجھے بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟''

اس نے اپنے بدن کو بڑے طریقے سلیقے سے چادر کے اندر چھپا رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا پھر دونوں ہاتھ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''تھانے دار جی! میں دراصل آپ سے گاما کی شکایت کرنے آئی ہوں۔''

میں نے پوچھا ''کون گاما؟''

''وہ...... گاما گانی والا۔'' اس نے جواب دیا۔

''گاما گانی والا......'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یہ نام کچھ سنا ہوا لگ رہا ہے...... تم اس غنڈے گاما کی بات تو نہیں کررہی ہو؟''

''جی، جی......'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔''

ان دنوں میں موضع فیض آباد کے تھانے میں تعینات تھا۔ موضع فیض آباد ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا ایک دور دراز گاؤں تھا۔ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ گاما گانی والا اس علاقے کا بدمعاش تھا۔

''بولو شادو...... تمہیں گاما سے کس قسم کی شکایت ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تھانے دار جی! پہلے آپ وعدہ کریں کہ گاما کو آپ میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ''اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے تھانے آکر آپ سے اس کی شکایت کی ہے تو وہ میری چمڑی ادھیڑ ڈالے گا۔ میں پہلے بھی ایک تلخ تجربہ کرچکی ہوں۔''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ گاما گانی والا سے اس کا کوئی قریبی تعلق تھا۔ اس سوچ کے پیش نظر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''ایک منٹ شادو۔'' میں نے ہاتھ ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ، گاما تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''وہ میرا گھر والا ہے جی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ گاما کو تمہاری

یہاں آمد کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ بتاؤ، تمہیں اس سے کیا پریشانی ہے؟''

''وہ جی..... میرے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے مارتا ہے۔ بے عزتی کرتا ہے اور طعنے دیتا ہے۔''

''طعنے دیتا ہے۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''کس قسم کے طعنے؟''

''یہ طعنے تھانے دار جی کہ..... میں نے ابھی تک اس کے لیے کوئی بچہ پیدا کیوں نہیں کیا۔'' وہ فریادی لہجے میں بولی۔ ''اگر میری گود ہری نہیں ہو رہی تو اس میں میرا کیا قصور ہے جی۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے نا، وہ جسے اولاد دے اور جسے چاہے بے اولاد رکھے!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''یہ تمام معاملات اس پروردگار کی مرضی سے ہیں۔ اگر انسان کے بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی شخص لاولد نہ ہوتا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''شادو! تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''پانچ سال ہو گئے ہیں جی۔''

''یہ تو کچھ بھی عرصہ نہیں ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''میں نے تو بعض جوڑوں کے ہاں پندرہ بیس سال بعد بھی اولاد ہوتے دیکھی ہے۔''

''لیکن یہ بات اس جنگلی گاما کی سمجھ میں نہیں آتی نا......'' وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ''وہ مجھے ہی قصوروار سمجھتا ہے۔ اسے جب غصہ چڑھتا ہے تو مار مار کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیتا ہے۔''

شادو خاصی دکھی عورت تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں ان چند دنوں میں گاما گانی والا کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل کر سکا تھا، اس کے مطابق وہ ایک اکھڑ مزاج، سرکش اور جھگڑے باز شخص تھا۔ میں نے شادو کی دلجوئی کرتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں گاما گانی والا کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

''لیکن آپ اس طرح بات کریں کہ کہیں میرا نام نہ آئے۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''آپ سے پہلے والے تھانے دار جی سے بھی میں نے گاما کی شکایت کی تھی اور ابھی تک پچھتا رہی ہوں......''

یہ پچھتانے والی بات اس نے ایک مرتبہ پہلے بھی کی تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''جب تم نے شفیق تتولی سے گاما کی شکایت کی تو کیا ہوا تھا؟''

شفیق تتولی نامی ایک پولیس آفیسر مجھ سے پہلے اس تھانے کا انچارج تھا۔ اس شخص کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ علاقہ ایس پی صاحب نے تتولی کو ہٹا کر اس تھانے میں مجھے تعینات کیا تھا۔ شفیق تتولی کے ''کارناموں'' کی ایک طویل فہرست تھی۔ وہ مجرموں کا ساتھ دینے والا ایک بدعنوان اور مرتشی پولیس اہلکار تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ آپ تتولی صاحب کے بارے میں کتنا جانتے ہیں۔'' وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''جب میں گاما کی شکایت لے کر تھانے دار کے پاس پہنچی تو اس نے مجھے تسلی دی کہ میں فکر نہ کروں۔ وہ گاما کو سیدھا کر کے رکھ دے گا لیکن اس کے لیے مجھے اس کی ایک بات ماننا پڑے گی......''

''کیسی بات؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''مجھے بتاتے ہوئے بہت شرم آ رہی ہے جی......'' اتنا کہہ کر اس نے گردن جھکا دی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس جانب تھا۔ مجھے اس تھانے میں تعینات کرتے وقت سابق تھانے دار شفیق تتولی کے کردار کے بارے میں اچھی طرح بریف کر دیا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے شادو! تمہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ تتولی نے تم سے کس نوعیت کا مطالبہ کیا ہوگا لیکن ایک بات کے حوالے سے میرا ذہن الجھ رہا ہے......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے جلدی سے پوچھ لیا۔ ''کون سی بات تھانے دار جی۔''

''شادو! تمہیں سابق تھانے دار تتولی کے حوالے سے ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اس کے باوجود بھی تم تاریک رات میں اپنے گھر والے کی شکایت لے کر میرے پاس چلی آئیں۔ وہ بھی تھانے میں نہیں بلکہ میرے کوارٹر میں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر تتولی کی طرح میں بھی ہوس کا پجاری ہوا تو پھر کیا کرو گی؟''

''تھانے دار جی! آپ کو ہمارے علاقے میں آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں لیکن یہاں کے لوگوں کو آپ کے بارے میں بہت کچھ پتا چل چکا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی شرافت، ایمان

داری اور انصاف پسندی کے قصے پورے فیض آباد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بس، اسی بات سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے آپ کے پاس آنے کی ہمت کر لی۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب اس راز پر سے بھی پردہ اٹھا دو کہ تم تھانے میں مجھ سے ملنے کے بجائے یہاں کوارٹر تک کیوں چلی آئیں اور جب تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں تھانے میں جا کر بیٹھنے کے لیے کہا تو تم نے یہیں پر بات کرنے کے لیے ضد کیوں کی؟''

''وہ جی...... بات یہ ہے کہ......'' وہ تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں ادھر تھانے کے اندر آپ سے ملاقات کرتی تو گاما کو یہاں میری آمد کا پتا چل جاتا اور پھر وہ مار مار کو میری ہڈیوں کا چورا بنا دیتا۔''

''لیکن گاما کو اس بات کا پتا کیسے چلتا؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''جناب! آپ کے تھانے میں اشتیاق نامی ایک چھوٹے قد کا کانسٹیبل ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اشتیاق کی گاما کے ساتھ یاری ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اشتیاق، گاما کو اس بارے میں ضرور بتا دیتا۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک تشویش بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''صرف شفیق تنولی ہی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

''تھانے دار جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔''

میں کرسی سے اٹھا اور کوارٹر کے صحن میں آگیا۔ میرے کوارٹر کے صحن میں ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کے اسٹینڈ پر مٹی کے دو گھڑے رکھے رہتے تھے جو ہر موسم میں وہیں پر موجود رہتے تھے۔ میں نے ایک مٹکے میں سے شادو کے لیے پانی کا گلاس بھرا اور دوبارہ کمرے میں آگیا پھر پانی والا گلاس اس کی سمت بڑھا دیا۔

اس نے میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

''تھانے دار جی! آپ میرے راز کو راز ہی رکھیں گے۔ گاما کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں آپ سے ملنے یہاں آئی تھی۔''

''تم ہر حوالے سے مطمئن ہو کر جاؤ۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں بڑی سیاست کے ساتھ تمہارے مسئلے کو حل کر دوں گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئی۔

شادو نے اگرچہ خود کو ایک بڑی چادر کے اندر خوب اچھی طرح چھپا رکھا تھا اور ابتدا میں، میں صرف اس کے ہاتھ اور آنکھیں ہی دیکھ سکا تھا لیکن جب اس نے پانی کا گلاس اپنے حلق سے اتارا تو میں اس کے ہونٹ اور چہرے کے دیگر نقوش بھی دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی جھلک دیکھ پایا اس کی روشنی میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک پرکشش اور خوب صورت عورت تھی۔ اس حوالے سے گاما گانی والا بہت ہی ناقدرا شخص ثابت ہوا تھا۔ میں نے گاما کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شادو آئی تو میرے پاس اپنے شوہر کی شکایت کرنے تھی لیکن اس کی انتہائی معمولی نوعیت کی شکایت نے میری سوچ کو ایک نئی راہ دے دی تھی۔ گاما گانی والا کا معاملہ اتنا زیادہ اہم نہیں تھا جتنا کانسٹیبل اشتیاق کا۔ میرے تھانے کے کسی بندے کا کسی غنڈے کے ساتھ گٹھ جوڑ اور دوستی بہت تشویش ناک بات تھی۔ مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے اور آئے دن ایک نئے انکشاف سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ بہرحال، ان سب معاملات کو طریقے سلیقے سے ہینڈل کرنا تھا۔

آج شام میں تھانے سے اٹھتے وقت میں چند فائلیں بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا تاکہ رات کو گرم بستر میں دبک کر ان کا مطالعہ کر سکوں۔ یہ فائلیں میری چارپائی کے پاس ہی ایک کرسی پر رکھی تھیں لیکن جب میں نے شادو کو بیٹھنے کے لیے کرسی دی تو مذکورہ فائلوں کو اٹھا کر میں نے بستر پر رکھ دیا تھا۔

میں نے فائلوں کو سمیٹ کر دوبارہ ایک کرسی پر رکھ دیا اور گرم لحاف میں گھس گیا۔ اس وقت مجھے نیند آ رہی تھی لہٰذا فائلوں کے مطالعے والے منصوبے کو میں نے موخر کیا اور سونے کا فیصلہ کر لیا۔ چند لمحات کے بعد میں نیند کی وادی میں اتر چکا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو شادو میرے ذہن میں تھی اور اسی شادو کے توسط سے گاما گانی والا اور کانسٹیبل اشتیاق میری یادداشت میں محفوظ ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں بیٹھتے ہی حوالدار قادر بخش کو بلا لیا۔

اس نہایت ہی مختصر مدتی تعیناتی کے دوران میں حوالدار قادر بخش اس تھانے میں مجھے قابلِ بھروسا شخص

دکھائی دیا تھا لہٰذا ان گمبھیر معاملات پر میں نے سب سے پہلے اسی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چار یا دس پندرہ روز میں آپ کسی شخص کی پرکھ نہیں کرسکتے لیکن کچھ لوگ اپنی شخصیت کے حوالے سے ایسے ہوتے ہیں کہ ایک نظر دیکھ کر ہی ان پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قادر بخش کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جاسکتا تھا۔

قادر بخش میرے کمرے میں پہنچا اور نہایت ہی مستعدی سے مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”حکم ملک صاحب؟“

”آؤ بیٹھو قادر بخش۔“ میں نے اپنی میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”قادر بخش! میں اگلے ایک گھنٹے میں گاما بدمعاش کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ کا مطلب ہے، گاما گانی والا......!“

”کیا اس نام کے ایک سے زیادہ بدمعاش ہیں اس علاقے میں؟“ میں نے حوالدار سے استفسار کیا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”گاما بدمعاش تو فیض آباد میں صرف ایک ہی ہے اور وہ گاما گانی والا کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے تو محض تصدیق کی خاطر پوچھ لیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”میں اسی گاما کی بات کررہا ہوں۔“

”او کے سر! میں ابھی کانسٹیبل اشتیاق کو بھیج کر گاما کو تھانے حاضر کرادیتا ہوں۔“

”کانسٹیبل اشتیاق ہی کو کیوں۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا اس کے سوا تھانے میں اور کوئی کانسٹیبل موجود نہیں؟“

”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیوٹی پر پہنچا ہے ملک صاحب۔“ حوالدار نے بتایا۔ ”رات کی ڈیوٹی والے جاچکے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر رک جاتے ہیں تو میں کسی کا انتظار کرلیتا ہوں۔“

حوالدار کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا آج رات اشتیاق ڈیوٹی پر نہیں تھا؟“

”نہیں جناب! وہ آج کل دن کی ڈیوٹی دے رہا ہے۔“ حوالدار نے بتایا۔

رات شادو کو جب میں نے یہاں تھانے آکر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو اس نے تھانے میں قدم رکھنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ تھانے میں کانسٹیبل اشتیاق موجود ہے جو اس کے شوہر گاما کا دوست ہے لیکن حوالدار قادر بخش تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ شادو نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟

اس سوال کا فوری طور پر میرے ذہن میں کوئی بھی جواب نہیں تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے، شادو کو اشتیاق کی ڈیوٹی کے ٹائم کا پتا نہ ہو۔ میں نے حوالدار کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے قادر بخش! تم کسی اور کانسٹیبل کو گاما کی طرف روانہ کردینا۔ مجھے اس سے ملنے کی ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔“

”ملک صاحب! سب خیریت تو ہے نا۔“ حوالدار ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”گاما نے کوئی نیا چاند تو نہیں چڑھادیا؟“

”کیا اس نے کچھ پرانے چاند بھی چڑھا رکھے ہیں؟“ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ملک صاحب! ایک غنڈا اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”لوگ اس سے کافی بیزار اور تنگ رہتے ہیں۔“

”آپ لوگوں نے اس سورما کو نکیل کیوں نہیں ڈالی؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا وہ قانون سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتا ہے خود کو؟“

”کوئی بھی مجرم قانون سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتا ملک صاحب!“ حوالدار نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن جب قانون کے رکھوالے ہی مجرموں پر مہربان ہوں تو پھر سب کچھ ممکن ہے۔“

میں نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تمہارا اشارہ کانسٹیبل اشتیاق کی طرف تو نہیں؟ مجھے اپنے ذرائع سے پتا چلا ہے کہ اشتیاق اور گاما گانی والا میں بڑا مضبوط گٹھ جوڑ ہے۔“ لمحاتی توقف کرکے میں نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے اشتیاق کو گاما گانی والا کی طرف بھیجنے کی مخالفت کی ہے۔“

”آپ کی معلومات کو میں غلط نہیں کہوں گا ملک صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن میرا اشارہ سابق تھانہ انچارج شفیق تنولی کی طرف تھا جناب...... تنولی صاحب گاما پر خاصے مہربان تھے بلکہ گاما عام لوگوں کے

سامنے اپنے اور تنولی صاحب کے تعلقات کے قصّے بھی بیان کیا کرتا تھا۔ اشتیاق نے جو کچھ بھی کیا ہوگا، تنولی صاحب کے حکم پر ہی کیا ہوگا۔''

''ہوں......'' میں نے پُرمعنی انداز میں ہنکاری بھری پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اشتیاق اگر سابق تھانہ انچارج کے ہاتھوں کا کھلونا رہا ہے تو اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج سے میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں کہ تم اشتیاق پر گہری نگاہ رکھو۔ اس کی کوئی بھی غیرنصابی سرگرمی تمہیں دکھائی دے تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔ میں گاما گانی والا کو ''چیک'' کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

''ہم نے مل جل کر اس تھانے کے بگڑے ہوئے نظام کو سدھارنا ہے قادر بخش۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر مجھ سے اجازت لے کر وہ میرے کمرے سے رخصت ہوگیا۔

حوالدار قادر بخش ایک محنتی اور ایمان دار شخص تھا۔ اسی وصف کی بنا پر میں قادر بخش کو پسند کرتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے قادر بخش سے ہونے والی گفتگو میں، میں نے دانستہ شادو کا تذکرہ نہیں کیا تھا کیونکہ شادو نے مجھے اس بات کو راز رکھنے کے لیے کہا تھا۔

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد گاما گانی والا میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کی عمر کم و بیش تیس سال رہی ہوگی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا مالک ایک سینڈو ٹائپ شخص تھا۔ اس نے گلے میں ایک گانی (نیکلس) پہن رکھا تھا جو کسی طوطے کی گانی کی طرح اس کی گردن میں فٹ تھی۔ اسی گانی کے باعث وہ ''گاما گانی والا'' کہلاتا تھا۔

گامانے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا پھر تشویش ناک انداز میں پوچھا۔ ''ملک صاحب! سب خیر تو ہے نا؟''

''اگر میں کہوں خیریت نہیں ہے تو......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ تو ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں جناب۔'' وہ یکدم سنجیدہ ہوگیا۔

''گاما گانی والا کو کس بات کا ڈر......'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے تو بڑے بڑے تھانے داروں سے دوستانہ تعلقات ہیں بھئی!''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ''میں سمجھ گیا جناب! آپ کا اشارہ تنولی صاحب کی طرف ہے۔''

''میں نے سنا ہے، تم نے اس پنڈ میں اور آلے دوالے کے پنڈوں میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ تنولی صاحب کا تم سے یارانہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور اسی تعلق کا حوالہ دے کر تم دھڑلے سے بدمعاشی کرتے رہے ہو لیکن......'' میں نے دانستہ توقف کیا پھر وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اب وقت بدل چکا ہے، اس بات کو اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھالو گاما گانی والا......''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں اڑا رکھی ہیں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ تنولی صاحب جب بھی کسی کام سے مجھے تھانے بلاتے تھے، میں حاضر ہوجاتا تھا۔ جیسا کہ ابھی آپ کے بلانے پر حاضر ہوگیا ہوں۔''

مجھے گاما کی بات سن کر ہنسی تو بہت آئی لیکن میں نے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کیے بغیر دل میں یہ شوق پورا کرلیا۔ واہ وا...... ایک غنڈا یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے بدنام کر رکھا ہے۔

''میرے سامنے حاضر ہوگئے ہو تو اب یہ بھی بتا دو کہ تمہارے گھر میں سب خیریت ہے نا؟'' میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''جی، خیریت ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''مگر آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''بھئی، بس ایسے ہی پوچھ لیا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''میں اس تھانے میں نیا تعینات ہوا ہوں۔ سب کی خیر خیریت دریافت کرنا میرے پیشہ ورانہ فرائض کا حصہ ہے۔ سوچا تمہارے بیوی بچوں کا بھی پوچھ لوں۔''

''بیوی بچے......!'' اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟''

''کیوں......'' میں نے اسے گھورا۔ ''کیا میں نے تمہیں کوئی گالی دے دی ہے؟''

''نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ جناب عالی......'' وہ وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔
''میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ آپ کی دعا سے اگر میری شادی ہو جاتی ہے اور کل کلاں بچے بھی ہو جائیں تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔''
''تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟''
''میری توبہ جناب۔'' وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میری کیا مجال کہ آپ سے غلط بیانی کروں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''واقعی، ملک صاحب! میں ابھی کنوارا ہوں۔''
''کیا شادو تمہاری بیوی نہیں ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔
''نہیں ملک صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''موضع فیض آباد میں شادو نامی صرف ایک ہی عورت ہے جو فیکا لوہار کی بیوی ہے۔ اس کے تو آدھے درجن بچے ہیں۔ شادو جیسی کالی کلوٹی، ٹی بی زدہ عورت میری بیوی کیسے ہوسکتی ہے۔ میں تو خواب میں بھی ایسی بھوتنی سے شادی کا تصور نہیں کرسکتا۔''
گاما گانی والا مجھے موضع فیض آباد کی وسنیک واحد شادو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا اور میرا دھیان اس شادو کی طرف چلا گیا تھا جو گزشتہ شب بڑے پراسرار انداز میں میرے کوارٹر میں آئی تھی اور مجھے اپنے شوہر گاما گانی والا کے ظلم و ستم کی کہانی سنا کر اور اس کہانی سے مجھے متاثر کرکے رخصت ہوگئی تھی۔ وہ شادو دراز قامت، ہاتھ پاؤں کی مضبوط، بھرے بھرے جسم کی مالک ایک گوری چٹی عورت تھی جبکہ گاما گانی والا جس شادو کا نقشہ کھینچ رہا تھا وہ ہرگز ہرگز رات والی شادو نہیں ہوسکتی تھی۔ گاما جتنے اعتماد سے بات کر رہا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا کیونکہ اتنا بڑا جھوٹ بولنا ممکن نہیں تھا۔ پورا گاؤں اس بات کی گواہی دے سکتا تھا کہ شادو گاما گانی والا کی بیوی تھی یا نہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ رات میرے کوارٹر میں مجھ سے ملاقات کرنے والی عورت نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرا خیال رات والی شادو کے ایک اور جھوٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے مجھ سے کوارٹر میں ملاقات کرنے پر اس لیے اصرار کیا تھا کہ اس کے مطابق اس وقت تھانے میں کانسٹیبل اشتیاق موجود تھا جو گاما کا گہرا دوست تھا۔ تھوڑی دیر پہلے حوالدار قادر بخش مجھے بتا چکا تھا کہ اشتیاق کی رات کی نہیں، دن کی ڈیوٹی تھی اور وہ ابھی صبح ہی تھانے پہنچا تھا۔
''ملک صاحب! آپ ابھی اس تھانے میں نئے آئے ہیں نا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ کسی بدخواہ نے آپ کو میرے خلاف کرنے کے لیے کچھ الٹا سیدھا بتا دیا ہو۔'' گاما گانی والا نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ پورے پنڈ میں سے کسی کو بھی بلا کر پوچھ لیں۔ ہر شخص اس بات کی گواہی دے گا کہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی...... نہ کسی شادو سے اور نہ کسی شاداں سے۔''
''ہاں، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خیر، میں دیکھ لوں گا اس معاملے کو بھی۔''
''یہ تو بتائیں سرکار...... کہ کس بندے نے آپ کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے؟'' وہ دلچسپی بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔
''تم اس چکر میں نہ پڑو۔'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہاری بات کا یقین کرلیا ہے۔ اب تم مطمئن ہوکر جاسکتے ہو۔''
''بہت شکریہ مائی باپ۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر متشکرانہ انداز میں بولا۔ ''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بندہ حاضر ہے۔''
''جب تمہاری خدمت کی مجھے ضرورت پیش آئے گی تو میں تمہیں ضرور زحمت دوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال، تم میرا ایک چھوٹا سا کام کردو۔''
''جی حکم ملک صاحب!'' وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔
''بس، اس بات کی کوشش کرو کہ تمہاری ذات کے حوالے سے مجھے کسی قسم کی شکایت نہیں ملنا چاہیے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے تھانے کی حدود میں امن وامان کا راج دیکھنا چاہتا ہوں۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔
''سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''
''چنگی طرح سمجھ گیا مائی باپ۔'' وہ کسی فرماں بردار ملازم کے مانند سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری طرف سے بےفکر ہو جائیں۔''
گاما کے جانے کے بعد میں نے حوالدار قادر بخش کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

''قادر بخش! تم گاما کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟''

''جب سے اس تھانے میں ہوں، تب سے جانتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ پانچ سال سے۔''

''پھر تو تمہیں پکا پتا ہوگا کہ گاما کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔'' میں نے گاما کے بیان کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

''جی پکا پتا ہے، اس کی شادی نہیں ہوئی۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''اس قسم کے غنڈوں سے کوئی شادی نہیں کرتا اور اس لائن کے لوگ خود بھی شادی بیاہ اور بچوں کے جھنجٹ میں نہیں پڑتے لیکن......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر پوچھا۔

''آپ گاما کی شادی کے بارے میں تحقیق کیوں کر رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''تم پولیس والے ہو اور اچھی طرح جانتے ہو گے کہ جب سب خیریت ہوتی ہے پھر تفتیش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''گزشتہ رات سے فیض آباد میں معاملات کافی گمبھیر ہو چکے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے ملک صاحب؟'' وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے قادر بخش کو اعتماد میں لے کر شادو سے لے کر گاما گانی والا اور کانسٹیبل اشتیاق تک کی ساری کہانی اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''ملک صاحب! فوری طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس شادو نامی عورت نے آپ سے سراسر غلط بیانی کی ہے اور گاما اپنی شادی کے حوالے سے جو بھی بتا رہا ہے وہ سولہ آنے درست ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''جب کوئی انسان جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کے پیش نظر تین مقاصد یا ان میں سے کوئی ایک یا دو مقاصد ہوتے ہیں۔ نمبر ایک، وہ دروغ گوئی کا سہارا لے کر دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے اور اسی دوران میں وہ اپنے کسی خفیہ منصوبے پر عمل کا ارادہ رکھتا ہے۔ نمبر دو، وہ کوئی سنگین جرم کر چکا ہوتا ہے اور غلط بیانی سے اس جرم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ نمبر تین، وہ اپنے جھوٹ کے ذریعے کوئی بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی کو بڑا نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ شادو نے کس مقصد کے حصول کی خاطر یہ شبینہ ڈراما رچایا ہے اور......''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور...... اس سے بھی پہلے ہمیں یہ پتا چلانا ہوگا کہ یہ شادو ہے کون؟''

''ملک صاحب! ایک بات تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کا اصل نام شادو ہرگز نہیں ہوگا۔ اس نے آپ کو گمراہ کرنے کے لیے اس نام کا سہارا لیا ہے۔'' حوالدار ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور آپ نے جھوٹ کے ذیل میں جو تین بڑی وجوہات بیان کی ہیں، مجھے تو ان میں سے پہلی والی درست لگتی ہے۔ شادو نامی وہ عورت اپنی اس چال سے پولیس کو گمراہ کر کے اپنے کسی خطرناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والی ہے۔''

''تم بالکل درست سمت میں سوچ رہے ہو قادر بخش۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس نے گاما گانی والا اور کانسٹیبل اشتیاق کی جانب ہماری توجہ کو مبذول کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ عین ممکن ہے، وہ ہمیں ان دو کرداروں میں الجھا کر کسی خاص موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔''

''جی ایسا ہی نظر آرہا ہے۔'' حوالدار نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ہمیں شادو کو تلاش کرنے کے ساتھ ہی ان دو کرداروں کی بھی کڑی نگرانی کرنا ہوگی تاکہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ جب شادو نے گاما اور اشتیاق کا نام لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔''

آئندہ پندرہ منٹ میں، ہم نے تازہ ترین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ایک جامع لائحہ عمل تیار کر لیا اور چند ضروری ہدایات کے بعد میں نے قادر بخش کو رخصت کر دیا۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے موجودہ صورتِ حال میں سنسنی بھر دی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا۔

''ملک صاحب! ادھر سے ایک جوان عورت کی لاش ملی ہے۔''

''ادھر کدھر سے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہر کے پار کھیتوں میں سے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی صدیق نامی ایک جوان شخص نے تھانے آکر اس واقعے کی اطلاع دی ہے۔''

میں نے صدیق نامی اس شخص کو اپنے پاس بلا لیا۔ صدیق کی عمر بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ عام سی شکل

سورت کا مالک نوجوان تھا۔ مذکورہ عورت کی لاش اسی کے کھیتوں میں سے ملی تھی۔ میں نے صدیق کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''قتل ہونے والی عورت کا نام کیا ہے؟''

''جی......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''تھانے دار صاحب! میں اس عورت کو نہیں جانتا۔''

''کیا اس کا تعلق موضع فیض آباد سے نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کئی سالوں سے اس گاؤں میں رہ رہا ہوں۔ میں نے تو اسے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ جائے وقوعہ پر چلتا ہوں۔''

میں نے حوالدار قادر بخش کو ساتھ لیا اور نہر کا پل عبور کرنے کے بعد کھیتوں کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں اس عورت کی لاش پائی گئی تھی۔

موضع فیض آباد ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔ یہ لگ بھگ آٹھ سو افراد کی آبادی کا ایک متوسط گاؤں تھا جس کے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر نگروالی گاؤں تھا جبکہ جنوب میں چار میل کی دوری پر جمال پور گاؤں واقع تھا۔ فیض آباد کے پہلو میں شرقاً غرباً ایک نہر رواں دواں تھی۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر جائے وقوعہ پر پہنچے تھے جو جنوبی سمت میں نہر کا پل عبور کرنے کے بعد سڑک سے کم و بیش پچاس گز کے فاصلے پر کھیتوں کے اندر ایک مقام تھا۔ یہ کھیت نذیر گھمن نامی ایک شخص کے تھے جو ''بابا نذیرا'' کے نام سے مشہور تھا۔ صدیق اسی نذیر گھمن کا جوان بیٹا تھا۔

وہ ایک بھرپور جوان عورت کی لاش تھی۔ جیسے ہی اس کے چہرے پر میری نظر گئی، میں چونک اٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اس عورت کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ شادو تھی گزشتہ رات جو میرے کوارٹر میں مجھ سے ملنے آئی تھی اور نگا ما گانی والا کو اپنا شوہر بتا کر مجھ سے اس کی شکایت کی تھی۔

جب اس کی فرمائش پر میں نے اسے پانی پلایا تھا تو میں اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور میں نے اس کی ناک میں سونے کی ایک لونگ دیکھی تھی۔ وہ لونگ اس لیے بھی مجھے یاد رہ گئی کہ اس کے سر کی گولائی کا پھیلاؤ کسی عام لونگ سے زیادہ تھا۔ وہ لونگ کم از کم آدھا انچ گولائی کی حامل تھی۔ لونگ تو اس کے چہرے کی نمایاں شے تھی ہی، علاوہ ازیں اس کا ناک نقشہ بھی میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا۔ میں بڑے دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ اس عورت کی لاش تھی جو پچھلی رات مجھ سے میرے کوارٹر میں ملاقات کرنے آئی تھی۔ اس کا نام شادو تھا یا نہیں، اس امر کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔

میں اکڑوں بیٹھ کر شادو کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ شادو کو اسی مقام پر قتل کیا گیا تھا جہاں پر اس وقت اس کی لاش پڑی تھی۔ کسی تیز دھار آلے کی مدد سے اس کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کٹی ہوئی شہ رگ سے خارج ہونے والا خون کھیتوں کی زمین میں جذب ہو چکا تھا اور جو خون اس کے لباس پر لگا تھا وہ ٹھنڈے موسم کی وجہ سے جم چکا تھا۔ اسے گزشتہ رات کسی وقت موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ شادو کی لاش کا منظر رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین اور پرکشش عورت تھی، موت کے بے رحم ہاتھوں کی ظالم گرفت نے جس کی ساری رعنائی اور تازگی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور موقع پر موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تم میں سے کوئی شخص اس عورت کو جانتا ہے؟''

یہ تمام افراد میرے پہنچنے سے پہلے جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ میرے سوال کے جواب میں ان کے چہروں پر ناشناسائی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ان میں سے بعض نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف بھی دیکھا لیکن پھر ان سب کی نفی میں ہلتی ہوئی گردنوں نے لاش کی شناخت سے واضح انکار کر دیا۔

میں نے ایک بندے کو گاؤں کی طرف دوڑایا تاکہ وہ مبینہ شادو کی لاش کو ڈھانپنے کے لیے کوئی چادر لے آئے۔ اس کے بعد میں نے لوگوں سے استفسار کیا۔

''یہ کھیت کس کی ملکیت ہیں؟''

پختہ عمر کا ایک شخص آگے بڑھا اور بولا۔ ''تھانے دار پتر! یہ میرے کھیت ہیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے چاچا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نذیر گھمن میرا نام ہے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن لوگ مجھے بابا نذیرا کہتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کی بات کا برا نہیں منایا۔ ساٹھ سال کا ہو جانے کے بعد بھی اگر

میں "بابا" نہیں کہلاؤں گا تو پھر کب کہلاؤں گا......"

مجھے یاد آ گیا کہ بابا نذیرا کا جوان بیٹا صدیق اسی واقعے کی اطلاع لے کر تھانے پہنچا تھا اور ہم اسی کے ہمراہ جائے وقوعہ تک آئے تھے۔ بابا نذیرا کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ گندمی رنگت والا ایک صحت مند اور جفاکش شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا نذیرا! تمہیں اس لاش کے بارے میں کب پتا چلا؟"

"میں اور میرا بیٹا صدیق آج صبح حسب معمول کھیتوں میں پہنچے اور مویشیوں کے لیے چارا کاٹنے لگے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "میں اپنی درانتی سے چارا کاٹتے ہوئے کھیتوں میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اس عورت کی لاش پر میری نگاہ پڑی۔ میں نے اسی وقت ہاتھ کو روک دیا اور آواز دے کر صدیق کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میرے پاس پہنچا اور لاش کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ہم تھوڑی دیر تک اس لاش کو دیکھتے اور سکتے رہے......" بابا نذیرا نے شادو کی لاش پر ایک نگاہ ڈالی اور خوف زدہ انداز میں جھرجھری لینے کے بعد اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہم نے پھر چیخ پکار کر کے آلے دوالے کے کھیتوں میں کام کرتے والوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب سب نے یہ مشورہ دیا کہ اس واقعے کی اطلاع فوراً تھانے دینا چاہیے تو میں نے صدیق کو آپ کے پاس بھیج دیا۔ یہ ہے کل کہانی جناب......"

میں نے بابا نذیرا کے علاوہ وہاں موجود دوسرے افراد سے بھی مختلف زاویوں سے پوچھ گچھ کی لیکن شادو کے بارے میں اور اس کے قتل کے حوالے سے کوئی مفید بات معلوم نہ ہو سکی۔ شادو کی شناخت اور اس کے قتل کے محرک کا معاملہ لٹک کر رہ گیا تھا۔

میں نے موقع کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد شادو کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گاما گانی والا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں کسی عورت کی لاش ملی ہے۔" پھر وہ شادو کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کس کی لاش ہے؟"

میری وقوعہ کی کارروائی کے دوران میں وہ جوان ایک بڑی سی چادر لے آیا تھا جسے میں نے گاؤں کی جانب روانہ کیا تھا۔ میں نے شادو کی لاش کو اسی چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ گاما کے استفسار پر میں نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ شادو کی لاش ہے۔ تم تو اسے اچھی طرح جانتے ہو گے......!"

"اوہ......" گاما ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! میں نے صبح بھی آپ کو بتایا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میں اس عورت کو نہیں جانتا......" لحاتی توقف کر کے اس نے متفکر نظر سے مبینہ شادو کی لاش کی طرف دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ مجھے اس عورت سے نتھی کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں اور وہ بھی ایک بیوی کی حیثیت سے۔"

میں نے چادر کھینچ کر شادو کی لاش کو دوبارہ ڈھانپ دیا اور گاما کو ایک طرف لے جا کر نہایت ہی مختصر الفاظ میں گزشتہ رات شادو سے ہونے والی اپنی ملاقات کے بارے میں اسے بتا دیا۔ آخر میں، میں نے کہا۔

"اب تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میں صبح تم سے شادو کے بارے میں کیوں پوچھ تاچھ کر رہا تھا؟"

"جی، سب سمجھ گیا۔" وہ گہری سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی کہ اس عورت نے میرا نام کیوں استعمال کیا؟"

"اس نے صرف تمہارا نام ہی استعمال نہیں کیا بلکہ میرے عملے کے ایک کانسٹیبل اشتیاق کا ذکر بھی کیا تھا اور بتایا تھا کہ تمہارا اشتیاق کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔"

"گٹھ جوڑ تو نہیں جناب! بس سلام دعا کہہ لیں۔" وہ کھسیانا سا ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کبھی کبھار تولی صاحب سے ملنے تھانے چلا جایا کرتا تھا تو اشتیاق سے بھی گپ شپ ہو جاتی تھی۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"بات جتنی سی بھی ہے لیکن......" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اگر اس عورت نے تم دونوں کا نام استعمال کیا ہے تو اس کے اس عمل کے پیچھے کوئی گہرا مقصد ضرور چھپا ہے۔"

"کیا مقصد جناب عالی؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"بہت جلد سب پتا چل جائے گا۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے وقوعہ کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد مبینہ شادو کی گردن کٹی لاش کو

پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا۔ اس کے بعد میں واپس تھانے آ گیا۔

گزشتہ رات میرے کوارٹر میں شادو کی آمد کے بعد جس پراسرار کہانی کا آغاز ہوا تھا، اب یہی کہانی خاصی سنسنی خیز موڑ پر آ گئی تھی۔ میں نے اس پیچ در پیچ الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کے لیے کھوجی سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور حوالدار قادر بخش کی مدد سے کھوجی دین محمد عرف بابا دینو کو اپنے پاس بلالیا۔

اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ مبینہ شادو کہاں سے چلتے ہوئے میرے کوارٹر تک پہنچی تھی اور پھر میرے کوارٹر سے رخصت ہونے کے بعد اس نے کدھر کا رخ کیا تھا تو میرے لیے اس کی آمد اور جامد کا مقصد جاننا آسان ہو جاتا۔ اس کے اس پراسرار سفر کا اختتام تو میری نظر میں تھا یعنی...... جائے وقوعہ!

کھوجی بابا دینو کی عمر لگ بھگ پینسٹھ سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں میں بلا کی چمک پائی جاتی تھی۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ کھوجی تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ اس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب! میں سمجھتا ہوں، فوری طور پر دو جگہ کا کھرا اٹھانا بہت ضروری ہے۔''

''کون سے دو مقامات دینو بابا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نمبر ایک، آپ کا کوارٹر۔ نمبر دو، جائے وقوعہ۔'' اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا پھر خود ہی وضاحت بھی کردی۔ ''شادو آپ سے ملاقات کرنے آپ کے کوارٹر پر آئی تھی اور ملنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ اگر اس کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کیا جائے تو پتا چلایا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی تھی۔ اسی طرح اگر جائے وقوعہ سے کھرا اٹھایا جائے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ قاتل اور مقتولہ کس سمت سے چلتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے اور مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد قاتل نے کدھر کا رخ کیا تھا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر مجھ سے مستفسر ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں دینو بابا! تم بالکل درست سمت میں سوچ رہے ہو۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بس اب تم اپنا کام شروع کردو مگر ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ کام نہایت ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ ہونا چاہیے۔''

''رازداری والے معاملے کی تو آپ فکر ہی نہ کریں جناب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اللہ کے حکم سے آج تک کسی تھانہ انچارج کو میرے کام سے شکایت نہیں ہوئی۔ آپ کے ساتھ کام کرنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ انشاء اللہ! آپ کو بھی نہیں ہوگی۔''

میں نے بابا دینو کو ساتھ لیا اور تھانے کے عقبی حصے میں واقع اپنے کوارٹر تک لے گیا۔ میرے کوارٹر کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا کھلا گراؤنڈ تھا جہاں شام سے پہلے گاؤں کے بچے اور جوان فٹ بال اور دوسرے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ گراؤنڈ کے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

دینو نے میرے کوارٹر کے داخلی دروازے سے اپنے کام کا آغاز کیا اور پندرہ بیس منٹ تک بڑے ماہرانہ انداز میں زمین کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کے کوارٹر تک آنے اور جانے والے بہت سے قدموں کے آثار موجود ہیں جن میں صرف ایک عورت کے قدموں کے کھرے کو میں الگ شناخت کرسکتا ہوں۔ غالب امکان یہی ہے کہ آپ نے جس عورت کا ذکر کیا ہے، یہ اسی کے قدموں کا کھرا ہے۔''

بابا دینو کے سنسنی خیز انکشاف کے جواب میں، میں نے پوچھا۔ ''اب ذرا اس کھرے کی آمد و جامد کا بھی پتا چلاؤ۔''

''جی، میں پتا چلا چکا ہوں۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب! میرے علم اور تجربے کے مطابق وہ مقتولہ عورت کھیل کے میدان والی سمت سے آپ کے کوارٹر تک آئی تھی اور آپ سے ملاقات کرنے کے بعد واپس اسی میدان کی طرف چلی گئی تھی۔''

میں نے وسیع و عریض گراؤنڈ میں دور تک نگاہ دوڑانے کے بعد استفسار کیا۔ ''بابا! تمہیں یہ کھرا نکالنا ہے کہ وہ میدان کے پیچھے کہاں سے آئی تھی اور مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد اس میدان کے اس پار کہاں غائب ہوگئی؟''

''اس کے لیے میں تھوڑا ٹائم لوں گا۔'' وہ مدبرانہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''انشاء اللہ! شام سے پہلے میں آپ کو مکمل رپورٹ دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بابا! تم اپنے ہنر کو آزماؤ اور میں اپنے

کمرے میں جا کر روزمرہ کے کام نمٹاتا ہوں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اب تم سے شام ہی میں ملاقات ہوگی۔"

میں اس کے بعد اپنے کمرے میں آکر شادو مرڈر کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے جائے وقوعہ کا بغور جائزہ لیا تھا اور دور دور تک معائنہ کیا تھا لیکن آلۂ قتل مجھے کہیں نہیں مل سکا تھا۔ شادو کے کٹے ہوئے گلے کو دیکھ کر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ شادو کو کسی تیز دھار چھری یا خنجر سے گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

آلۂ قتل کے حوالے سے میرا ذہن ادھیڑبُن کا شکار تھا کہ میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر کانسٹیبل اشتیاق کی صورت دیکھی۔ میری اس پر نگاہ پڑی تو وہ بڑے احترام کے ساتھ کراری آواز میں بولا۔

"ملک صاحب! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

جب سے میں اس تھانے میں آیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ اشتیاق براہِ راست یوں مجھ سے مخاطب ہو رہا تھا۔ میرے ریکارڈ میں اس کی رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہہ دیا۔

"بھئی! یہ تمہارا اپنا تھانہ ہے...... آؤ، آؤ......"

وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے ادب سے بولا۔

"ملک صاحب! آپ نے کہا، یہ تھانہ میرا بھی ہے......!" وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

"بات یقین کی نہیں ملک صاحب......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"میں نے پوچھا۔ "پھر کیا بات ہے؟"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھ سے ناراض ہوں۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"تمہارا یہ احساس کس وجہ سے ہے؟"

"آپ جب سے اس تھانے میں تعینات ہوئے ہیں، سب کو کوئی نہ کوئی کام بتا رہے ہیں۔" وہ اپنی شکایت کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے آپ نے کوئی ذمے داری نہیں سونپی۔ لگتا ہے، آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں!"

آخری جملہ اس نے کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا کہ میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ وہ اپنی اداکاری سے میری ہمدردیاں سمیٹ کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی "دل جوئی" کی خاطر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اشتیاق۔ کسی بھی تھانے میں تھانہ انچارج کی حیثیت باپ ایسی ہوتی ہے اور وہاں کا عملہ اس کی اولادوں کے مانند۔ میں اپنے عمل میں کسی ایک اہلکار کو کسی دوسرے اہلکار پر فوقیت دیتے وقت صرف ایک بات کا خیال رکھتا ہوں اور وہ ہے...... کارکردگی!"

"لیکن کسی اہلکار کی کارکردگی تو اس وقت سامنے آئے گی نا جب اس سے کوئی کام لیا جائے گا۔" اس نے شکایت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "تمہاری کارکردگی کو چیک کرنے کے لیے ایک کام ہے میرے پاس......"

وہ منتظر نگاہ سے مجھے تکنے لگا۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ اشتیاق سابق تھانہ انچارج شفیق تتولی کے ہاتھوں کا کھلونا رہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اب بھی تتولی کے رابطے میں نہ ہو۔ شفیق تتولی کو اس تھانے سے ہٹایا ہی اسی لیے گیا تھا کہ اس کے خلاف بدعنوانی کی متعدد شکایات افسرانِ بالا تک پہنچی ہوئی تھیں اور مجھے اس تھانے میں تعینات کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مجھے یہاں کے معاملات کو درست کرنا تھا۔ میں نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اگر کسی علاقے میں جرائم کا اوسط کم کرنا ہو یا وہاں سے جرائم کا خاتمہ کرنا ہو تو اس علاقے کا نظم و نسق جرائم پیشہ افراد کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ یہ کہاوت یا مثال بہ ظاہر بڑی عجیب سی لگتی ہے لیکن میں نے اس کے خاصے مثبت نتائج برآمد ہوتے دیکھے ہیں۔ اسی کہاوت کی روشنی میں، میں نے کانسٹیبل اشتیاق سے کہا۔

"اشتیاق! تم اچھی طرح جانتے ہو، سابق تھانہ انچارج کو کن وجوہات کی بنا پر یہاں سے ہٹایا گیا ہے۔ ابھی یہاں جو نامعلوم عورت کا پراسرار قتل ہوا ہے، اس سلسلے میں میرا شک تتولی پر جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے، اس نے مجھے الجھانے اور پریشان کرنے کے لیے اس علاقے میں قتل کی یہ واردات کرائی ہو۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی چمک دکھائی دی۔ ان لمحات میں، میں یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ وہ چمک میری بات کی تائید میں تھی یا تردید میں!

"ملک صاحب!" کانسٹیبل اشتیاق نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ "اس بارے میں، میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ کہو......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا آج سے بلکہ ابھی سے میں یہ پروجیکٹ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا جناب؟" اس نے پوچھا۔

"تم اپنے تمام ذرائع استعمال کرو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور نہایت ہی رازداری کے ساتھ یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ شفیق تتولی آج کل کن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس مشن کے لیے اگر تمہیں فیض آباد سے باہر بھی جانا پڑے تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے......"

لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس مشن کے دوران میں اگر تمہیں نامعلوم مقتولہ عورت کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہو تو فوراً مجھے رپورٹ کرنا۔ کیا تم یہ کام کرلو گے؟"

آخری جملہ میں نے چیلنج کرنے والے انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔

"کیوں نہیں جناب...... انشاء اللہ! بہت جلد میں آپ کو کوئی خوشخبری سناؤں گا۔"

"شاباش!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اور ایک بات کا خیال رہے کہ میں نے تمہارے ذمے جو کام لگایا ہے، اس کی کسی کو بھنک نہیں پڑنا چاہیے۔ تھانے کے عملے کو بھی نہیں۔ یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا جناب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے ضروری ہدایات دینے کے بعد اسے رخصت کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حوالدار قادر بخش اسپتال سے واپس آگیا۔ ہمارے درمیان کھوجی بابا دینو کے حوالے سے چند منٹ بات ہوتی رہی پھر میں نے اسے اشتیاق کے بارے میں بتایا۔

"یہ آپ نے بڑی سیاسی چال چلی ہے ملک صاحب!" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے تو جو چال چلنا تھی، وہ چل دی۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "اس سے آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔"

"جی حکم ملک صاحب؟" وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"اس وقت ہمارے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ نامعلوم عورت کے قتل کے معمے کو حل کرنے کا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "گزشتہ رات سے اب تک جو پراسرار اور سنسنی خیز حالات پیش آئے ہیں ان میں تین کردار بہت اہم ہیں......" میں لمحے بھر کو رکا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نمبر ایک، گاما گانی والا۔ نمبر دو، مبینہ مقتولہ شادو۔ نمبر تین کانسٹیبل اشتیاق۔ شادو تو موت کے منہ میں جاچکی۔ اگر ہم گاما گانی والا اور اشتیاق پر کڑی نگرانی رکھیں تو اس قتل کا کوئی سرا ہمارے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں آپ کے خیال کی تائید کرتا ہوں ملک صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور آپ نے اشتیاق کو جو کام سونپا ہے، اس کے بعد تو یہ نگرانی اور بھی ضروری ہوگئی ہے۔"

"اس نگرانی کا بندوبست تم کرو گے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اور یہ کام سادہ لباس افراد سے اس طرح لینا ہے کہ گاما یا اشتیاق کو ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب! میں آج ہی یہ بندوبست کروں گا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں ان دونوں کی نگرانی ایسے سادہ لباس افراد سے کراؤں گا جن کو یہ پہچانتے بھی نہ ہوں۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

شام میں کھوجی بابا میرے پاس آگیا۔ میرے استفسار پر اس نے جو رپورٹ پیش کی، وہ خاصی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز تھی۔ جیسا کہ پیچھے بتایا جاچکا ہے کہ مبینہ شادو گزشتہ رات میرے سرکاری کوارٹر کے عقب میں واقع کھیل کے میدان کی طرف سے آئی تھی اور پھر اسی سمت واپس چلی گئی تھی۔ اس کے بعد کی رپورٹ بابا دینو کی زبانی کچھ اس طرح تھی۔

"ملک صاحب! شادو نامی وہ نامعلوم عورت کھیل کے میدان کے اندر سے چلتے ہوئے آپ کے کوارٹر تک پہنچی تھی۔ اگر وہ واپسی میں بھی میدان کے اندر ہی سے گزرتی تو پھر اس کا کھرا پکڑنا میرے لیے مشکل ہوجاتا کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ اس میدان میں درجنوں جوان فٹ بال کھیلتے ہیں۔ ان کے قدموں کے نشانات میں سے کسی خاص شخص کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کھرے کا تعاقب کرنا تقریباً ناممکن کام ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ واپسی میں اس عورت نے میدان کا رخ نہیں کیا بلکہ میدان کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ گاؤں کے آخری حصے میں پہنچی تھی۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں گاما گانی والا کا گھر واقع ہے......''

''کیا؟'' میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''آپ حیران نہ ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ابھی تو انکشافات کا آغاز ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں، اس کے بعد کا کھرا کیا بتاتا ہے؟''

میں چونکہ نہیں جانتا تھا اس لیے فوراً کہہ دیا۔ ''نہیں۔''

''گاما گانی والا کے گھر کے سامنے پہنچ کر اس عورت کا کھرا غائب ہو جاتا ہے۔'' بابا دینو نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''یہاں میرے علم اور تجربے نے ایک دلچسپ کھرا پکڑا ہے جناب...... جو سیدھا جائے وقوعہ تک جاتا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کون سا دلچسپ کھرا؟''

''ایک گھوڑے کا کھرا جس پر کوئی قوی الجثہ شخص سوار تھا۔'' بابا دینو وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گھوڑے کے سموں کے نشانات کا دباؤ بتاتا ہے کہ اس گھڑسوار کا وزن لگ بھگ تین من ہوگا۔''

''تین من!'' میں نے بے یقینی سے دینو کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے ایک سو بیس سیر؟''

واضح رہے کہ پرانے اوزان کے پیمانے کے مطابق چالیس سیر کا ایک من ہوا کرتا تھا۔ آج کل سیر کی جگہ کلوگرام نے لے لی ہے۔ میرے سوال کے جواب میں دینو نے بتایا۔

''جی، میرا یہی مطلب ہے۔ جہاں پر شادو کے قدموں کے نشانات غائب ہوئے ہیں، وہیں سے اس گھوڑے کا سفر شروع ہوا ہے لہٰذا میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ شادو اس گھوڑے پر سوار ہوگئی تھی۔''

''ناممکن......!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''شادو پچھلی رات کم از کم آدھا گھنٹا میری آنکھوں کے سامنے رہی تھی۔ میں نہیں مان سکتا کہ اس کا وزن تین من ہوگا...... وہ زیادہ سے زیادہ سوا من کی ہوگی یعنی پچاس سیر کی۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ شادو کا وزن تین من ہے۔'' دینو زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو اس کا کھرا مجھے یہ بات ضرور بتا دیتا۔''

''پھر...... پھر تم مجھے کیا بتانا چاہ رہے ہو؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے دینو بابا کی طرف دیکھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گھوڑے پر پہلے سے کوئی پونے دو من یعنی ستر سیر وزن کا کوئی بندہ سوار ہو۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''اور شادو اس بندے کے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگئی ہو۔ اس امر کی تصدیق جائے وقوعہ پر پہنچ کر ہو جاتی ہے۔''

جب دینو نے کسی مرد گھڑسوار کا ذکر کیا تو میرا دھیان گاما گانی والا کی طرف چلا گیا۔ میں آج صبح اس سے ملاقات کر چکا تھا لیکن اس کا وزن کسی بھی طور ڈھائی من سے کم نہیں تھا اور ہو سکتا ہے، پونے تین من ہی ہو۔ بہرحال، میں نے دینو سے پوچھا۔

''جائے وقوعہ کے بارے میں تم کیا بتا رہے تھے؟''

''گاما گانی والا کے گھر کے سامنے سے جو گھوڑا چلا اس نے گاؤں کے باہر ہی باہر نہر کے کنارے چلتے ہوئے پل تک سفر کیا پھر وہ پل کو عبور کر کے جنوبی سمت بڑھ گیا۔'' دینو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے گھوڑے کے کھرے کا تعاقب جاری رکھا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سڑک سے پچاس گز اندر کھیتوں میں آپ کو شادو کی لاش ملی ہے۔ نیم پختہ سڑک کے کنارے شادو اور ایک مرد کا کھرا ملا ہے ملک صاحب۔ گھوڑے کو سڑک کے کنارے چھوڑ کر یہ دونوں کھیت کے اندر گھس جاتے ہیں۔ واپسی میں صرف مرد کے پاؤں کے نشانات ملتے ہیں جو چلتے ہوئے گھوڑے تک پہنچتا ہے اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر جمال پور کی سمت روانہ ہو جاتا ہے۔''

''اوہ......'' دینو کے خاموش ہونے پر میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس گھڑسوار نے مبینہ شادو کو کھیتوں کے اندر لے جا کر قتل کیا اور پھر جمال پور کی طرف بڑھ گیا۔''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں بھی یہی نتیجہ پایا ہوں۔''

''لیکن وہ شخص ہے کون اور اس نے شادو کو کیوں قتل کیا؟''

''یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے ملک صاحب......!''

''ٹھیک ہے، میں پتا چلا لوں گا۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے گھڑسوار کے کھرے کے حوالے سے مزید بتاؤ؟''

''میں نے اندھیرا ہونے تک جتنا کام کیا ہے، اس کی

رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''اندھیرے میں کھرا لگانا میرے بس کی بات نہیں۔ ویسے میں نے جمال پور کی طرف جانے والے راستے پر ایک جگہ خاص نشانی لگا دی ہے۔ کل صبح انشاء اللہ! میں وہیں سے اپنے کام کا آغاز کروں گا۔ جمال پور، فیض آباد سے چار میل کی دوری پر ہے۔ میں کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے اس گھڑسوار کی منزل کا سراغ لگالوں گا۔''

''یہ ضروری تو نہیں کہ وہ گھڑسوار سیدھا جمال پور ہی گیا ہو!'' میں نے ایک امکان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل، یہ ضروری نہیں ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ جہاں بھی جائے گا، مجھ سے بچ نہیں پائے گا۔''

''ٹھیک ہے بابا، تم کل صبح ہی اپنے کام سے لگ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''آگے جو اللہ کو منظور!''

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا تو میں نے حوالدار قادر بخش کو ایک بار پھر اپنے پاس بلا لیا۔ سب سے پہلے میں نے اسے بابا دینو کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ اس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور پھر کہا۔

''ملک صاحب! ان حالات میں تو گاما کی نگرانی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔''

''یہ کام تو تم کر رہے ہو نا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل، میں نے ایک سادہ لباس بندے کو اس کی کڑی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں مزید چند منٹ تک شادو مرڈر کیس کے حوالے سے حوالدار قادر بخش کے ساتھ تبادلہ خیال کرتا رہا پھر تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ وہ فائلیں ابھی میرے پاس ہی تھیں جو کل ہی میں تھانے سے اٹھا کر اپنے کوارٹر پر لے آیا تھا تاکہ رات کو تسلی سے میں ان کا مطالعہ کر سکوں۔ یہ کل پانچ فائلیں تھیں جن کے اندر نہایت ہی اہم کیسوں کی تفصیلات درج تھیں۔ یہ کیس اس تھانے کی حدود میں ہونے والے سنگین جرائم سے متعلق تھے۔ میں گزشتہ رات ان فائلوں کو خاطر خواہ دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ ابھی مجھے ان کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ شادو اپنی کہانی سنانے آ گئی تھی۔ بہرحال، آج کی رات مجھے ان پانچ فائلوں کا لازمی مطالعہ کر ڈالنا تھا۔

میں نے حسب معمول رات کا کھانا کھانے کے بعد عشا کی نماز ادا کی اور فائلوں کو لے کر بیٹھ گیا لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کل پانچ فائلیں تھیں مگر اس وقت مجھے چار نظر آ رہی تھیں۔ اس میں میری نظر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تھیں ہی چار جبکہ گزشتہ رات میں باقاعدہ گن کر انہیں کوارٹر پر لایا تھا۔ خیر اس خیال کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے، مجھ سے گننے میں غلطی ہو گئی اور میں تھانے سے چار فائلیں ہی لے کر آیا ہوں، میں ان فائلوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ کل صبح تھانے جا کر الماری میں فائلوں کو چیک کیا جا سکتا تھا۔ جب میں نے اس تھانے کا چارج لیا تھا تو تمام اہم فائلوں کو گن کر میں نے ایک فہرست تیار کر لی تھی۔ اس فہرست میں ہر فائل کے نام کے آگے اس میں موجود کیسوں کا حوالہ بھی درج تھا۔ یہ تمام اہم فائلیں میرے کمرے میں رکھی ایک آہنی الماری کے اندر محفوظ رہتی تھیں جس کی چابی صرف اور صرف میرے پاس ہوتی تھی۔ اگر وہ پانچویں فائل میں اپنے کوارٹر پر نہیں لایا تھا تو یقیناً اس وقت وہ آہنی الماری کے اندر موجود ہوتی... اور مذکورہ فہرست میں باقاعدہ اس کا اندراج بھی ہوگا۔

رات گیارہ بجے کے قریب میں نے فائلوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور جیسے ہی سونے کے لیے بستر کی جانب بڑھا، کوارٹر کے دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں شادو کا نام چمکا، اس کے ساتھ ہی اس کا ''سراپا'' میری یادداشت میں تازہ ہو گیا۔ میری یادداشت میں شادو کے دو سراپے محفوظ تھے۔ ایک سراپا وہ جب میں نے اسے اپنے کوارٹر میں دیکھا تھا اور دوسرا سراپا وہ جب میں نے اسے بابا نذیرا کے کھیتوں میں کٹی ہوئی گردن کے ساتھ لاش کی صورت میں دیکھا تھا لیکن ظاہر ہے، موت کی آغوش میں گہری نیند سونے والی شادو دوبارہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتی تھی۔ یہ میرے تھانے کے عملے میں سے کوئی ہو سکتا تھا۔

میں نے کوارٹر کا صحن عبور کرنے کے بعد دروازہ کھول دیا اور حوالدار قادر بخش کی صورت دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا قادر بخش؟''

''بے حد معذرت چاہتا ہوں ملک صاحب۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آدھی رات میں آپ کو بے آرام کر رہا ہوں۔ بس، کچھ بات ہی ایسی تھی کہ سوچا، آپ کے علم میں لے آؤں۔''

''اندر آ جاؤ۔'' میں نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے

سوچنے کی باتیں

☆حسن اگر خریدنے کی چیز ہوتی تو سارے غریب بدصورت ہوتے۔

☆دنیا میں سب سے غریب وہ ہے جس کا کوئی پرخلوص دوست نہیں۔

☆اچھا دوست رکھنے والا خوش نصیب انسان ہے۔

☆بچھو کی دم میں زہر ہوتا ہے، سانپ کے دانت میں اور مچھر کے سر میں...... لیکن انسان اگر ڈستے پہ آجائے تو اس کے پورے جسم میں زہر ہوتا ہے۔

رشتے

رشتے درختوں کے مانند ہوتے ہیں بعض اوقات ہم اپنی ضرورتوں کی خاطر انہیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور آخرکار خود کو گھنے سائے سے محروم کر دیتے ہیں۔ رشتوں کی حفاظت کریں چاہے یہ خون کے ہوں یا احساس کے۔

مرسلہ۔ ڈاکٹر ظفر اسلام جام، علی پور

ہوئے کہا۔ ”یہاں ٹھنڈے ٹھار موسم میں کھڑے ہو کر بات کرو گے تو برف کی طرح جم کر رہ جاؤ گے۔“

وہ میرے کوارٹر کے اندر آ گیا پھر جب وہ کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں پہنچ کر بیٹھ چکا تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اب بتاؤ، کون سی بات تمہیں اس وقت میرے پاس لے آئی ہے؟“

”میرے سادہ لباس مخبر نے تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع دی ہے کہ اشتیاق آج جمال پور کی طرف گیا ہے۔“ حوالدار نے بتایا۔

”اوہ......“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”اشتیاق کی تو دن کی ڈیوٹی ہے۔ کیا اس نے آج ایسی کوئی بات کی کہ کل وہ تھانے نہیں آئے گا؟“

آج اشتیاق سے میری بھی اچھی خاصی بات ہوئی تھی جس میں، میں نے اسے سابق تھانہ انچارج تفتیش تنولی کا کھوج لگانے کا کام سونپا تھا۔ قادر بخش نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”نہیں ملک صاحب! اس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

”اس کا مطلب ہے، وہ صبح سے پہلے واپس آجائے گا۔“ میں نے پرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”اس وقت آدھی رات کا عمل ہے۔ کیا تم نے اپنے مخبر سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اشتیاق جمال پور سے واپس آگیا ہے یا نہیں؟“

”جی، میں نے پوچھا تھا اس بندے سے۔“ حوالدار نے اثبات میں جواب دیا۔ ”اس کے مطابق اشتیاق ابھی تک فیض آباد کی حدود میں داخل نہیں ہوا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس کی واپسی اب صبح ہی ہوگی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”کسی طرح اپنے اس بندے سے یا کسی بھی اور شخص سے ایک کام کروا سکتے ہو؟“

”جی، آپ حکم کریں ملک صاحب۔“ وہ بڑے ادب سے بولا۔

”تم نے مجھے بتایا تھا کہ اشتیاق کی رہائش بھی ادھر فیض آباد ہی میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس کے گھر والوں سے کسی طرح معلوم کروانے کی کوشش کرو کہ اشتیاق کہاں گیا ہے اور کب واپس آئے گا؟“

”یہ کام ہو تو جائے گا مگر اس کے لیے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔“ حوالدار نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”رات کے اس پہر پورا فیض آباد گہری نیند کے مزے لے رہا ہے۔

ویسے......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جس آدمی کو اشتیاق کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہے، اسے میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی یہ ہدایات کر چکا ہوں۔ وہ علی الصباح مجھے اس حوالے سے رپورٹ دے گا۔“

”شاباش!“ میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کاش پولیس کے محکمے سے وابستہ ہر شخص اتنا ہی فرض شناس ہوجائے!“

”آمین......!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے پوچھا۔ ”اور گاما گانی والا کا کیا حال ہے؟“

”وہ گاؤں کے اندر ہی موجود ہے۔“ حوالدار نے بتایا۔ ”اور امن وامان بھی سے ہے۔“

”امن و امان سے تو اسے ہونا ہی چاہیے۔ صبح میں نے اچھی طرح اس کے کان کھینچے تھے۔“ میں نے کہا پھر استفسار کیا۔ ”کیا تمہارے پاس ایسی کوئی رپورٹ ہے جس سے پتا چلے کہ آج گاما گانی والا اور اشتیاق میں کوئی ملاقات ہوئی ہو؟“

”جی بالکل نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی آپس میں ملے ہوتے تو میرے مخبر فوراً مجھے اطلاع کرتے۔

"نامعلوم عورت شادو کی شناخت کے حوالے سے کوئی پیش رفت ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی ایسا آدمی یا تعلق تمہارے رابطے میں آیا جس کی انگلی پکڑ کر ہم مقتولہ کی شناخت اور قاتل کے مقاصد تک پہنچ سکیں؟"

"نہیں جناب۔" وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرے ذہن میں ایک تجویز ہے......"

"ہاں ہاں، کہو......" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟"

"بابا دینو نے شادو کے کھرے کی جو رپورٹ دی ہے اس کے مطابق، شادو کسی مرد کے ساتھ گاما گافی والا کے دروازے کے سامنے سے گھوڑے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی طرف گئی تھی۔" قادر بخش نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر ہم فرض کرلیں کہ شادو کے ساتھ دوسرا گھڑسوار گاما گافی والا تھا تو پھر میری نظر میں، گاما کا ٹرائل ضروری ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس سے یہ تو پوچھا جا ہی سکتا ہے کہ وہ گزشتہ رات کے اس حصے میں کہاں تھا جب شادو آپ کے کوارٹر میں موجود تھی اور جس وقت شادو کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ان لمحات میں وہ کدھر تھا؟"

"بہت عمدہ تجویز ہے قادر بخش۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، تم صبح گاما گافی والا کو بھی بلا لو تھانے۔ اس کا انٹرویو شنٹرویو بھی کرلیتے ہیں۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں قادر بخش کو رخصت کرنے کے بعد گرم لحاف میں گھس گیا۔

جب میں نیند کی وادی میں اتر رہا تھا تو میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام تھا اور وہ نام تھا...... جمال پور! کھوجی بابا دینو نے شادو کے متوقع قاتل کا کھرا جہاں تک اٹھایا تھا اس کے مطابق وہ گھڑسوار شادو کو قتل کرنے کے بعد جمال پور کی طرف گیا تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے حوالدار نے بھی مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ کانسٹیبل اشتیاق نے جمال پور کا رخ کیا تھا۔ یہاں پر یہ سوال سر اٹھاتا تھا کہ...... یہ محض اتفاق تھا یا اشتیاق اور قاتل کے بیچ کوئی سمبندھ موجود تھا؟

یہ خاصا خطرناک سوال تھا......!

☆☆☆

اگلی صبح بہت دھواں دھار ثابت ہوئی۔

رات کے آخری پہر اچانک بارش شروع ہوگئی تھی۔ موسم پہلے ہی سخت سرد ہو رہا تھا۔ اس بارش نے موسم کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ موسم کی زیادتی تو اپنی جگہ لیکن اس ناگہانی بارش نے بابا دینو کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اس تجربہ کار بڈھے نے کل شام تک پیشہ ورانہ محنت کے نتیجے میں قانون کی جو مدد کی تھی وہ ایک مقام پر آ کر رک گئی تھی۔ گزشتہ رات تین چار گھنٹے مسلسل ہونے والی بارش نے کچی اور پکی زمین کے سینے کو اس طرح دھو ڈالا تھا کہ اب وہاں سے کسی کا بھی کھرا نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ گویا قاتل کے تعاقب کے سلسلے میں میری تفتیش کی گاڑی جائے وقوعہ سے چند قدم کے فاصلے پر، نیم پختہ سڑک کے کنارے رک گئی تھی۔ میں یہ تو جان گیا تھا کہ گھڑسوار قاتل جمال پور کی طرف گیا تھا لیکن یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ وہ جمال پور پہنچا بھی تھا یا راستے میں ہی کسی اور سمت نکل گیا تھا۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ اس رپورٹ کے مطابق شادو کی موت گزشتہ رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اسے کسی تیز دھار خنجر کی مدد سے گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے اس اندازے کی بھی تصدیق کی تھی کہ قاتل شادو کے لیے قابل بھروسا شخص تھا ورنہ وہ اتنی رات کو یوں راضی خوشی اس کے ساتھ کھیتوں کے بیچ نہ چلی جاتی۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ میں اس خوب صورت مقتولہ عورت کا ذکر کرتے ہوئے بار بار اس کا نام "شادو" لے رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا، اس کا اصل نام کیا تھا اور جب تک مجھے معلوم نہیں ہوتا، میں اسے شادو ہی کہوں گا۔

دوپہر کے وقت حوالدار گاما گافی والا کو پکڑ کر تھانے لے آیا اور حوالات میں بند کر دیا پھر میرے پاس آ کر اس نے بتایا کہ وہ گاما کو پوچھ گچھ کے لیے لے آیا ہے۔

آج صبح تھانے آتے ہی مجھے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ کانسٹیبل اشتیاق ڈیوٹی پر نہیں آیا لیکن اس کے حوالے سے مجھے حوالدار سے تفصیلی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا لہٰذا میں نے کہا۔

"قادر بخش! تم نے گاما کو حوالات میں بند کر دیا ہے تو اس سے میں بعد میں بات کروں گا۔ پہلے مجھے اشتیاق کے بارے میں بتاؤ۔"

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اشتیاق آج ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہے۔" حوالدار نے بتایا۔ "اور میری اطلاعات کے مطابق وہ اب کل ہی ڈیوٹی پر آئے گا۔"

"تمہاری ان اطلاعات کی تفصیل کیا ہے۔" میں نے گہری

سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اس کے گھر سے کیا رپورٹ آئی ہے؟''

''اس کے گھر کی رپورٹ میرے مخبر کی فراہم کردہ اطلاعات سے لگّا نہیں کھاتی ملک صاحب۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''وہ اپنے گھر میں یہ بتا کر گیا ہے کہ وہ اپنی چاچی سے ملنے نگر والی جا رہا ہے جبکہ میرے مخبر کے مطابق وہ جمال پور گیا ہے اور...... آپ جانتے ہیں کہ نگر والی اور جمال پور نامی یہ دونوں گاؤں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں واقع ہیں۔''

''ہوں......'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور پوچھا۔ ''اشتیاق کے گھر والے اس کی واپسی کے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟''

''انہوں نے یہی بتایا ہے کہ وہ آج کسی وقت فیض آباد واپس آجائے گا اور کل صبح ڈیوٹی پر آئے گا۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''ادھر نگر والی میں اشتیاق کی چاچی مقصودہ رہتی ہے جس کی بیٹی رخسانہ سے اشتیاق کی منگنی ہو چکی ہے۔''

''اور کیا جمال پور میں بھی اس کے کوئی رشتے دار وغیرہ رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں ملک صاحب۔'' حوالدار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''بالکل نہیں۔''

''ٹھیک ہے، اشتیاق جب واپس آئے گا تو اس سے سوال دجواب کرلیا جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس امر کی تصدیق کرنا چنداں مشکل نہیں ہوگا کہ وہ اپنی چاچی سے ملنے نگر والی گیا تھا یا نہیں۔ ویسے تم اپنے مخبر کو ہدایت کردو کہ وہ اشتیاق کی واپسی پر بھی گہری نظر رکھے۔''

''جی، میں نے اس بندے کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''وہ اس سلسلے میں خاصا چاق وچوبند ہے۔''

''اوکے!'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب تم گاما گائی والا کو یہاں لے آؤ۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ وہ کیا کہتا ہے شادو کے بارے میں۔''

''جی...... ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' حوالدار یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاما دست بستہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر، عقب میں قادر بخش بھی چاق وچوبند استادہ تھا۔ گامانے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ملک صاحب! آج آپ نے پھر مجھے تھانے بلالیا۔ کیا کسی اور عورت نے میری بیوی ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے؟''

میں نے گھور کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تھانے دار تم ہو یا میں؟''

''تھانے دار تو آپ ہی ہیں سرکار۔'' وہ میرے جارحانہ انداز سے گھبرا کر بولا۔

''پھر تھانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''جس رات شادو کو قتل کیا گیا، تم کہاں تھے؟''

''مم...... میں اپنے گھر پر ہی تھا جناب۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا تم جانتے ہو، شادو کو اس رات کتنے بجے قتل کیا گیا تھا؟''

''نہیں جناب...... میں کیسے جان سکتا ہوں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں رات نو اور دس بجے کے درمیان شادو کو بابا نذیرا کے کھیتوں میں قتل کر دیا گیا تھا اور قاتل ایک گھوڑے پر سوار ہو کر جمال پور کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔''

''آپ تو بڑی حیرت انگیز بات بتا رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''سوال نہیں، صرف جواب...... کیونکہ تھانے دار میں ہوں، تم نہیں۔'' میں نے اسے دبکا مارا۔ ''یہ بتاؤ، اس رات نو اور دس بجے کے بیچ تم کہاں تھے؟''

''اپنے گھر میں مائی باپ۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''یہ بات میں نے آپ کو پہلے بھی بتائی ہے۔''

''یہ بات بتا کر تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' میں نے برے طریقے سے اسے ڈانٹ دیا۔ ''میں ایک ہزار مرتبہ بھی یہ سوال کروں تو تمہیں جواب دینا پڑے گا...... کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا جی...... سب سمجھ گیا۔'' وہ یتیم سی صورت بنا کر بولا۔

''تو تم اس وقت اپنے گھر میں تھے۔'' میں نے گاما کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اسی کی فراہم کردہ معلومات کو دہرایا اور پوچھا۔ ''اس وقت گھر میں تمہارے ساتھ اور کون تھا؟''

''کوئی بھی نہیں جناب! میں اپنے گھر میں اکیلا ہی

رہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اگر تم سچ بولو گے تو میں تمہارے لیے گنجائش نکالنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''اور اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو تو پھر مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں شادو کے قتل میں گرفتار کر کے سیدھا جیل بھجوا دوں گا۔''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھانے دار صاحب!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں بے قصور ہوں۔ آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے......؟''

''ملک صاحب! آپ اسے میرے حوالے کردیں۔'' حوالدار نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''میں اسے چند منٹ میں رواں کردوں گا پھر یہ آپ کے ہر سوال کا جواب فرفر دے گا۔''

''جناب! آپ لوگوں کو میری سچائی کا یقین کیوں نہیں آرہا۔'' وہ روتی صورت بنا کر بولا۔ ''میں قاتل نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ تم قاتل نہیں ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ تم قاتل کو جانتے نہیں ہو گے۔''

''جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''میں قاتل کو کیسے جانتا ہوں گا۔ میرا قاتل سے کیا تعلق واسطہ......؟''

''تمہارا قاتل سے یہ تعلق واسطہ ہے گاما......'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا پھر وہ حقائق اس کے گوش گزار کر دیے جو بابا دینو کی پیشہ ورانہ کاوشوں کے نتیجے میں مجھ تک پہنچے تھے۔ آخر میں، میں نے کہا۔ ''گاما! مقتولہ اور قاتل تمہارے گھر کے دروازے سے گھوڑے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور تم اس معاملے سے لاعلمی ظاہر کر رہے ہو۔ میں کیسے مان لوں کہ تم صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟''

''جناب! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مجھے ان واقعات کی کچھ خبر نہیں۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو مجھے اسی وقت موت آجائے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں......''

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ دروغ گوئی کا سہارا نہیں لے رہا تھا۔ اس کے الفاظ سے سچائی کی مہک آتی تھی لیکن یہ معاملہ اتنا سنگین تھا اور حالات و واقعات کی صورت اس بے رحمی سے اس کی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ میں سر پر ہاتھ پھیر کر اسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

''گاما گانی والا!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ''تم بڑی سے بڑی قسم کھاؤ یا چھوٹی سے چھوٹی قسم پیو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا اور اگر ابھی، اسی وقت تمہاری موت واقع ہو جاتی ہے تو بھی اس سے شادو واپس زندہ نہیں ہو سکتی......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں قادر بخش کے حوالے کرتے ہوئے سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اس موقع کو گنوا دیا تو پھر تم باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزارو گے......''

وہ میری منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے حوالدار کے سپرد کر دیا تاہم میں نے قادر بخش کو اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا کہ گاما سے تفتیش کے سلسلے میں ابھی ہاتھ ذرا ہولا ہی رکھے۔ صرف نفسیاتی حربوں اور زبانی کلامی دھونس دھمکی سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کرے۔

قادر بخش نے اپنے سر کو کچھ اس انداز میں جنبش دی جیسے وہ میرا مقصد سمجھ گیا ہو، پھر وہ گاما گانی والا کو اپنے ساتھ ٹارچر روم کی طرف لے گیا اور میں ایک اہم معاملے کو نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ معاملہ تھا...... ایک غیر حاضر فائل کی تلاش!

میں آج صبح کوارٹر سے تھانے آتے ہوئے وہ چار فائلیں اپنے ساتھ لے آیا تھا جن کا رات میں نے مطالعہ کیا تھا اور مجھے اس پانچویں فائل کی تلاش تھی جو میری یادداشت میں سے غائب ہو گئی تھی۔ آج تک میری یادداشت نے کبھی گڑبڑ نہیں کی تھی اسی لیے مجھے تشویش تھی کہ وہ فائل کہاں چلی گئی؟

میں نے اہم فائلوں والی الماری کو کھول کر تمام فائلیں باہر نکال لیں۔ اس کے بعد میں نے وہ فہرست کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لی جس میں ان تمام فائلوں کا اندراج تھا۔ پھر میں ایک ایک فائل کو مذکورہ فہرست کے مطابق چیک کرنے لگا۔ اس چیکنگ کا آغاز میں نے انہی چار فائلوں سے کیا جو میں کوارٹر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

لگ بھگ آدھے گھنٹے کی تحقیق و جستجو کے بعد میں ایک تشویش ناک نتیجے پر پہنچ گیا۔ ایک فائل گم تھی۔

یہ خاصی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ میں نے تمام

فائلوں کو دو تین مرتبہ ری چیک کیا لیکن نتیجے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ جو فائل غائب تھی، میں نے فہرست میں اس کی کیفیت کو چیک کیا۔ فہرست کے اندراج کے مطابق جو فائل نہیں مل رہی تھی اس کے اندر چند ایسے جرائم کے خطرناک دستاویزی ثبوت موجود تھے جن کا تعلق کسی چودھری رب نواز جنجوعہ سے تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس الماری کی چابی صرف میرے پاس رہتی تھی۔ کوئی بھی فائل الماری کے اندر رکھنا ہو یا باہر نکالنا ہو یہ کام میرے ہی ہاتھ سے انجام پاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے چودھری رب نواز جنجوعہ کی فائل نکال کر کسی کو نہیں دی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب میں نے وہ فائل کسی کو نہیں دی تو پھر فائل کہاں چلی گئی؟ سب سے تشویش ناک بات یہ تھی کہ میری یادداشت مجھے بتا رہی تھی کہ میں نے الماری میں سے پانچ فائلیں نکالیں اور مطالعے کے لیے انہیں اپنے کوارٹر پر لے گیا۔ پہلی رات میں شادو کی آمد کے باعث ان فائلوں کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ دوسری رات یعنی گزشتہ شب جب میں نے ان فائلوں کا مطالعہ کیا تو وہ چار ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ایک فائل کم ہو گئی تھی اور فائل بھی وہ جس میں کسی چودھری رب نواز جنجوعہ کے جرائم کے ثبوت موجود تھے۔ میں اس چودھری کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس تھانے میں میرے لیے سب سے زیادہ قابلِ بھروسا شخص صرف اور صرف حوالدار قادر بخش ہی تھا۔

میں نے تمام فائلوں کو ایک ترتیب کے ساتھ دوبارہ الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا اور قادر بخش کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میرے کمرے میں آ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! ابھی تو میں نے گاما گانی والا ''پرکام'' شروع بھی نہیں کیا اور آپ نے بلا لیا ہے......''

''گاما گانی والا پر تم تھوڑی دیر کے بعد کام شروع کرنا۔'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی ایک ایمرجنسی کام نکل آیا ہے۔''

''ایمرجنسی کام......'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا کام ملک صاحب؟''

''تم چودھری رب نواز جنجوعہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''چودھری رب نواز جمال پور کا وڈا چودھری ہے جناب۔'' قادر بخش نے بتایا۔ ''اور سابق تھانہ انچارج صاحب کے ساتھ اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

قادر بخش نے مجھ سے پوچھا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے ملک صاحب؟''

''کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ شفیق تتولی اور چودھری رب نواز میں گہری دوستی تھی؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

''جی...... بظاہر تو یہی لگتا تھا۔'' وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''ویسے تتولی صاحب ڈبل کراس کے ماہر تھے۔''

''یعنی دوستی اور دشمنی ایک ساتھ کرتے تھے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کبھی واری صدقے جانا اور کبھی بلیک میلنگ؟''

''جی، آپ تتولی صاحب کی فطرت کی بالکل صحیح عکاسی کر رہے ہیں۔'' حوالدار تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر الجھن بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''ملک صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے کسی ایمرجنسی کا ذکر کیا تھا......؟''

''ہاں، ایمرجنسی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے والے ہیں......'' لمحے بھر کو رک کر میں نے حوالدار کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سب محض اتفاق ہے کہ بابا دینو کے کھرے کے مطابق شادو کا قاتل اسے بابا نذیرا کے کھیتوں میں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جمال پور کا رخ کرتا ہے...... کانسٹیبل اشتیاق اپنے گھر والوں کو ٹکر والی جانے کا بتاتا ہے اور تمہارے مخبر کی رپورٹ کے مطابق جمال پور پہنچ جاتا ہے...... جمال پور کے چودھری رب نواز جنجوعہ کے جرائم کے ثبوت والی فائل میری الماری سے غائب ہو جاتی ہے۔''

''جی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' حوالدار نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''کوئی فائل آپ کی الماری میں سے کیسے غائب ہو سکتی ہے جبکہ اس الماری کی چابی صرف آپ کے پاس رہتی ہے۔''

''اس بات پر غور کیا جا سکتا ہے کہ وہ فائل میری الماری کے اندر سے کس طرح غائب ہوئی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ فائل غائب ہو چکی ہے اور مجھے شک ہے کہ اب تک وہ فائل چودھری رب نواز جنجوعہ تک پہنچائی جا چکی ہے۔''

''میں سمجھ گیا ملک صاحب!'' قادر بخش معنی خیز انداز

میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا ذہن اشتیاق کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

''میں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں قادر بخش۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کانسٹیبل اشتیاق کی ہسٹری بتاتی ہے کہ وہ شفیق تنولی کے بہت قریب رہا ہے اور تم بتا رہے ہو کہ چودھری رب نواز جنجوعہ سے تنولی کے دوستانہ مراسم تھے۔ جو فائل میری الماری سے غائب ہوئی ہے، اس میں چودھری رب نواز کے خلاف بڑے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ عین ممکن ہے، دوستی کے پردے میں انہی ثبوت کی بنا پر تنولی، چودھری کو بلیک میل بھی کرتا رہا ہو۔ تنولی کے تبادلے کے بعد چودھری کو یہ فکر لگی ہو کہ نیا تھانے دار کہیں اس کا بینڈ باجا نہ بجا دے لہٰذا اس نے ہمارے عملے کے ایک آدمی کانسٹیبل اشتیاق کو مہرے کے طور پر استعمال کر کے یہ فائل چوری کرالی ہو۔''

''آپ کی باتوں میں بہت وزن ہے ملک صاحب۔'' حوالدار نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اشتیاق تو ہماری توقعات سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔''

''دیکھو، یہ میرا شک ہے۔ تم اسے میرا قیاس بھی کہہ سکتے ہو۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اصل حقیقت تو اشتیاق سے پوچھ گچھ کے بعد ہی سامنے آئے گی لہٰذا وہ جیسے ہی فیض آباد میں قدم رکھے، میں اسے اپنی نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں کل صبح اس کے ڈیوٹی پر آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں آپ کی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

''اور ابھی ایک بندہ گکروالی کی طرف بھی روانہ کر دو۔'' میں نے کہا۔ ''جو شام سے پہلے واپس آئے اور آکر بتائے کہ اشتیاق اپنی چاچی سے ملنے گکروالی گیا تھا یا نہیں اور اگر گیا تھا تو کب..... اور وہاں کتنی دیر رکا۔ مجھے جلد از جلد مکمل رپورٹ چاہیے۔''

''جی، ملک صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی تیز رفتار گھوڑے پر کسی بندے کو گکروالی بھیجتا ہوں۔'' قادر بخش نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''انشاء اللہ! شام سے پہلے آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔''

''قادر بخش!'' میں نے آگے جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''فائل کے غائب ہونے والی بات میں نے صرف تمہیں بتائی ہے.....''

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ راز میرے دل میں محفوظ رہے گا۔''

''ٹھیک ہے، اب تم اپنی کارروائی شروع کر دو۔''

''گاماگانی والا کا کیا کرنا ہے؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''اس سے تفتیش جاری رکھو۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''بعض اوقات کوڑے کے ڈھیر میں سے بھی کوئی نایاب شے برآمد ہو جاتی ہے۔''

''سمجھ گیا جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

فائل کی گمشدگی والا معاملہ میرے لیے ایک چیلنج کی سی حیثیت کا حامل تھا اور اس مسئلے کو مجھے جلد از جلد حل کرنا تھا۔

☆☆☆

شام سے تھوڑی دیر پہلے حوالدار نے مجھے خوش خبری سنائی کہ اشتیاق واپس آ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''فوراً اسے تھانے بلالو۔''

''جی، میں نے ایک کانسٹیبل کو اس کی طرف روانہ کر دیا ہے۔''

''اور گکروالی کی کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ رپورٹ ہماری توقع کے عین مطابق ہے ملک صاحب!'' حوالدار نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''اشتیاق گکروالی گیا ہی نہیں۔ اس بات کی تصدیق میرے اس مخبر نے بھی کی ہے جسے میں نے اشتیاق کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اشتیاق نے پچھلی رات جمال پور میں چودھری رب نواز کی حویلی پر گزاری ہے۔''

''اوہ..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ گمشدہ فائل کے حوالے سے میرا اشتیاق پر شک غلط نہیں تھا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! میری آپ سے ایک درخواست ہے۔'' حوالدار گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں بتاؤ قادر بخش؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ اشتیاق سے جو بھی پوچھ گچھ کریں، وہ میرے سامنے نہ کریں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ میں نے اب تک اس کے حوالے سے جو بھی کارکردگی دکھائی ہے، وہ اس سے بھی

باخبر نہیں ہو سکے گا۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ اس کیس میں کسی بھی مرحلے پر تمہارا نام نہیں آئے گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں بہت طریقے سلیقے سے اشتیاق کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔''

''بہت شکریہ ملک صاحب۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''گاما گانی والا نے زبان کھولی یا ابھی تک وہ خود کو ان معاملات سے لاتعلق ہی ظاہر کر رہا ہے؟''

''جی، آپ کی دوسری بات درست ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''وہ اپنے بیان پر ڈٹا ہوا ہے۔ آپ نے سختی برتنے سے منع کر رکھا ہے ورنہ......''

قادر بخش نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے اس کے ''ورنہ'' کی تہ میں پہنچتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔

''اگر گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے تو پھر انگلی کو ٹیڑھا کرنے کا خیال دل میں نہیں لانا چاہیے۔ پہلے ہم اشتیاق کو چیک کر لیں۔ اس کے بعد گاما گانی کی طبیعت پوچھ لی جائے گی۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا کہ اشتیاق تھانے پہنچ گیا ہے۔ میں نے اطلاع لانے والے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے فوراً میرے پاس بھیج دے۔

تو قادر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''میں چلتا ہوں ملک صاحب۔''

''اوکے۔ ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

ادھر قادر بخش میرے کمرے سے نکلا، ادھر اشتیاق نے انٹری دی۔ اس نے بڑی کراری آواز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھنے کے بعد بولا۔

''خیریت تو ہے ملک صاحب! آپ نے مجھے گھر سے بلایا ہے؟''

''خیر و عافیت پر تو ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے بالکل نارمل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔

''آج تم ڈیوٹی پر بھی نہیں آئے......؟''

''بس ملک صاحب! کیا بتاؤں آپ کو۔'' وہ ہوشیاری سے بولا۔ ''میں ایک جگہ پھنس گیا تھا۔''

''کیا مطلب!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کہاں پھنس گئے تھے بھئی...... میں تو سمجھا تم تنولی صاحب کے پیچھے ہی کہیں نکل گئے ہو!''

آخری جملہ میں نے تفریحِ طبع کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔

''تنولی صاحب کے بارے میں بھی آپ کو جلد ہی کوئی رپورٹ دوں گا۔ فی الحال تو میں ککروالی میں پھنس گیا تھا۔''

''ککروالی......!'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''یہ گاؤں تو یہاں سے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ تم ادھر کہاں چلے گئے تھے؟''

''ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ادھر ککروالی میں میری چاچی کا گھر ہے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''اسی چاچی کی بیٹی سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ کل ڈیوٹی سے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ذرا ککروالی جا کر چاچی سے مل آؤں۔ وہ بہت بلاتی رہتی ہے......''

''میں سمجھا نہیں اشتیاق۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔ ''چاچی اور مستقبل میں ہونے والی ساس کے گھر جا کر تم کس طرح پھنس گئے تھے؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں جناب!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میرا ارادہ تو یہی تھا کہ رات وہاں گزارنے کے بعد علی الصباح ککروالی سے نکلوں گا اور ڈیوٹی ٹائم تک فیض آباد پہنچ جاؤں گا لیکن پچھلی رات ہونے والی بارش نے بہت گڑبڑ کر دی۔'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس خطرناک بارش کی تاب نہ لاتے ہوئے چاچی کے گھر کے ایک کمرے کی چھت گر گئی۔ یہ تو خدا کا شکر کہ اس کمرے میں کوئی سو نہیں رہا تھا، ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ میں نے جس کمرے کا ذکر کیا ہے اس میں چند جانور بندھے ہوئے تھے۔ ایک بکری اللہ کو پیاری ہو گئی اور دو بھینسیں شدید زخمی ہوئی ہیں۔ بس اس ناگہانی صورتِ حال کی وجہ سے میں صبح جلدی ککروالی سے نہ نکل سکا۔ پھر میں نے سوچا کہ آدھا دن تو گزر ہی چکا ہے۔ اب کل ہی ڈیوٹی پر جاؤں گا۔ بس میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فیض آباد پہنچا ہوں۔ یہ ہے میری کل کہانی جنابِ عالی!''

میں اس مکار کانسٹیبل کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ جو شخص ککروالی گیا ہی نہیں تھا، وہ وہاں کی کہانیاں بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے سنا رہا تھا۔ اب مجھے اس

بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اشتیاق نہایت ہی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اگر وہ جمال پور گیا تھا اور وہاں چودھری رب نواز کی حویلی میں رات گزار کر آیا تھا تو اس کا یہ دورہ خوامخواہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اگر وہ اپنی سرگرمیوں کو چھپانے کے لیے مجھ سے غلط بیانی کر رہا تھا تو یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے براہِ راست گھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اشتیاق! تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ کل شام تک کھوجی دینو نے شادو مرڈر کیس کے سلسلے میں کیا کارنامہ انجام دیا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''نن...... نہیں جناب......'' تھوڑے تذبذب کے بعد وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہیں۔''

میری نظر چونکہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی لہٰذا اس کے چہرے اور آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ مجھ سے چھپے نہ رہ سکے۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک سو ایک فیصد جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اتمامِ حجت کے طور پر پوچھ لیا۔

''تمہیں یہ تو پتا ہی ہوگا کہ کل کھوجی دینو تھانے آیا تھا اور میں نے اسے مقتولہ شادو کا کھرا نکالنے کا کام سونپا تھا؟''

''جی، میں نے اسے آپ کے کمرے میں دیکھا تھا۔'' وہ شاطرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پھر وہ آپ کے ساتھ آپ کے کوارٹر کی طرف گیا تھا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں حتی الامکان سنجیدگی شامل رکھتے ہوئے کہا۔ ''دینو نے شادو کا ہی نہیں بلکہ اس کے قاتل کا کھرا بھی نکال لیا ہے۔ اس کی رپورٹ کے مطابق قاتل اور مقتولہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ پھر قاتل نے شادو کو موت کے گھاٹ اتارا اور خود اسی گھوڑے پر سوار ہو کر جمال پور کی سمت نکل گیا......''

''اوہ......'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''اگر قاتل کا تعلق جمال پور سے ہے تو پھر ہمیں وہاں ریڈ کرنا چاہیے۔''

''کیا تمہاری جمال پور کے لوگوں سے جان پہچان ہے؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''نہیں جناب...... میرا کبھی ادھر جانا نہیں ہوا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے بڑا سرسری سا جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے، جمال پور کے چودھری رب نواز جنجوعہ کی شفیق تتولی سے بڑی گہری دوستی تھی۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم چودھری رب نواز کو تو جانتے ہی ہو گے؟''

''جی، یہاں تھانے ہی میں ایک دو بار انہیں دیکھا ہے۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جب چودھری صاحب تتولی صاحب سے ملنے آئے تھے۔''

''میں نے تمہیں شفیق تتولی کے حوالے سے ایک کام سونپا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ کہ تم میرے بھروسے پر پورا اترو گے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا بھروسا غلط تو نہیں ہے؟''

''آپ فکر نہیں کریں ملک صاحب!'' وہ اپنے لہجے میں مضبوطی بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''شادو کے قاتل کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ تتولی اور جنجوعہ کی ملی بھگت کا نتیجہ تو نہیں۔ انہوں نے مجھے پریشان کرنے کے لیے تو یہ ڈراما نہیں رچایا؟''

''ہو سکتا ہے، یہ واقعہ کسی سازش کا نتیجہ ہو۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولا پھر بات بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''ابھی میں نے دیکھا ہے، آپ نے گاما گانی والا کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ کیا شادو کے قتل سے اس کا کوئی تعلق ثابت ہو گیا ہے؟''

بات ختم کر کے اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ اس امید میں ایک خواہش بھی دبی ہوئی تھی...... گاما کے قاتل ثابت ہونے کی خواہش!

''ہاں!'' میں نے وقتی طور پر اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایسے شواہد ملے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قاتل نے شادو کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے گاما کے گھر میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے۔''

اشتیاق کے چہرے پر خوشی چمک اٹھی۔ اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ آپ گاما کو ٹرائل روم کی سیر کرائیں تو وہ اصل قاتل کا نام اگل دے گا اور......'' وہ اس طرح رکا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گاما ہی نے شادو کی زندگی کا چراغ گل کر دیا ہو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔'' میں نے اس کی اندرونی خوشی

کو چار چاند لگاتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تو تمہیں میں نے ایمرجنسی میں بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم اپنی نگرانی میں گاما کی زبان کھلوانے کا مشن مکمل کرو۔''

''میں کیا کروں گا جناب۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''ٹرائل روم کے معاملات تو حوالدار صاحب کے ہاتھ میں ہیں۔''

''ٹرائل روم کے معاملات کو تو قادر بخش ہی دیکھے گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم حوالات میں جا کر گاما کو اقرارِ جرم کے لیے راضی کرو گے۔ اگر تمہاری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو پھر اسے ٹرائل روم کی سیر کرائی جائے گی۔''

''جی، یہ ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اشتیاق کو لے کر حوالات کی جانب بڑھا۔ راستے میں، میں نے آنکھ کے اشارے سے قادر بخش کو بلا لیا تھا۔ میرے حکم پر قادر بخش نے اس حوالات کا دروازہ کھولا جہاں گاما گالی والا فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

اشتیاق نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اشتیاق، تم اپنا کام شروع کر دو۔''

اشتیاق بلاخوف وخطر حوالات کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے قادر بخش کو حکم دیا۔

''حوالات کو لاک کر دو!''

قادر بخش نے چشم زدن میں حوالات کے دروازے کو بند کر کے کنڈی میں تالا لگا دیا۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ اشتیاق کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب...... یہ سب...... کیا ہے...... جناب عالی......؟''

میں نے اشتیاق کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے گاما کو مخاطب کیا پھر اشتیاق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا تم اس بندے کو جانتے ہو؟''

''جی سرکار! یہ آپ کے تھانے کا ایک سپاہی ہے۔''

''اس وقت یہ ایک سپاہی نہیں بلکہ مجرم ہے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''یہ خطرناک مجرموں کا آلہ کار بنا ہوا ہے، ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر اپنے پیشے سے غداری کر رہا ہے۔ اس نے میرے اعتماد کا خون کیا ہے اور......

تمہیں شادو کے قتل میں پھنسانے کا منصوبہ بنایا ہے......''

گاما حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کبھی مجھے اور کبھی اشتیاق کی طرف دیکھنے لگا۔ اشتیاق جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بڑبڑایا۔ ''ملک صاحب! شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے......''

''اوئے غلط فہمی کی اولاد!'' میں نے اسے ایک دبکا مارا۔ ''میں تھانے دار ہوں، تو را وکھری ٹائپ کا۔ وردی والے مجرموں کے ساتھ میں کچھ زیادہ ہی برا سلوک کرتا ہوں۔ محکمے سے غداری کے جرم میں، میں تمہارا جو حشر کروں گا اسے تمہاری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔''

''لیکن جناب...... آپ میرا جرم تو بتا دیں۔'' وہ نیم احتجاجی لہجے میں پکارا۔

''کوئی ایک جرم ہو تو میں بتاؤں نا......'' میں نے نفرت بھری نظر سے اسے گھورا۔ ''شفیق تتولی کے زمانے میں تم جو گل کھلاتے رہے ہو، میں فی الحال ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم میرے اعتماد کو پاش پاش کر کے اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ پچھلی رات تم نے چودھری رب نواز جنجوعہ کی حویلی پر گزاری ہے اور مجھے کر والی کا راگ سنا رہے ہو...... اس کے علاوہ بھی جو معاملات ہیں ان پر میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' پھر میں نے گاما گانی والا سے مخاطب ہوتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''گاما! تتولی کے دور میں تمہاری اشتیاق کے ساتھ بڑی گہری دوستی رہی ہے مگر اب یہ شخص تمہارے لیے آستین کا سانپ ثابت ہوا ہے۔ اس نے تمہیں شادو کے قتل کے کیس میں پھنسانے کی سازش کی ہے۔ آج کی رات میں اسے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ تم بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو نا...... میں دیکھنا چاہتا ہوں، تمہارے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔ بس اس کی ہڈی پسلی سلامت رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ تم اپنے پرانے ہنڈی وال کی زبان کھلوانے کے لیے جو بھی طریقہ اپنانا چاہو، تمہیں میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔ تم اپنی ''محنت'' سے اس کانسٹیبل کو اس قابل بنا دینا کہ صبح میں اس سے جو بھی سوال کروں، یہ بندے دے پتر کی طرح اس کا سیدھا جواب دے۔''

گاما بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں نے قانون پر ہاتھ اٹھایا تو کہیں آپ مجھے جیل تو نہیں بھجوا دیں گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اشتیاق کے ساتھ تم آج کی رات جتنی بھی بدمعاشی کرو گے، میں اس کا نوٹس نہیں لوں گا لیکن اگر تم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر تمہاری خیر نہیں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ اپنے شکار کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''صبح آپ کو یہ سپاہی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتا ہوا ملے گا۔''

''شاباش......!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

دراصل، میں اشتیاق کو گاما سے پٹوانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خلاف میرے پاس بڑے ٹھوس ثبوت تھے۔ میں اگر چاہتا تو اس کے خلاف کسی بھی قسم کی قانونی کارروائی کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ ڈراما محض اشتیاق کو ذلیل کرنے اور گاما کی نظر میں اسے گرانے کے لیے کیا تھا تاکہ بعدازاں ان کے بیچ گٹھ جوڑ نہ رہ سکے۔ میری یہ چال صد فیصد کامیاب رہی۔ میں جیسے ہی جانے کے لیے مڑا، مجھے اپنے عقب میں کانسٹیبل اشتیاق کی آواز سنائی دی۔

''ملک صاحب! میں تنہائی میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی باتیں شاتیں نہیں۔'' میں نے اس کی طرف روئے سخن پھیرتے ہوئے کہا۔ ''صرف اقبالِ جرم!''

میرے الفاظ میں اتنی زیادہ طاقت تھی کہ اس نے رضامندی والے انداز میں گردن جھکا دی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس نے مجھ سے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک غنڈے کے ہاتھوں رات بھر درگت بنوانے کے بعد اس نے جو کام کرنا تھا، وہ اگر تنہائی میں باعزت طریقے سے میرے ساتھ بیٹھ کر ہو سکتا تھا تو پھر اشتیاق کے اس فیصلے کو دانشمندانہ ہی کہا جا سکتا تھا۔

اس رات کانسٹیبل اشتیاق نے تنہائی میں مجھ سے ملاقات کر کے جو انکشاف کیے میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اشتیاق کے اقبالی بیان کے بعد شادو مرڈر کیس والا معاملہ حل ہو گیا تھا۔ اس گھناؤنی سازش کے پیچھے جنجوعہ کا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

چودھری رب نواز جنجوعہ کے جرائم کے ثبوتوں والی وہ فائل کانسٹیبل اشتیاق نے چودھری تک نہیں پہنچائی تھی بلکہ اس کام کے لیے ان سازشی عناصر نے شادو کو استعمال کیا تھا۔ شادو کا اصل نام سلطانہ تھا۔

چودھری رب نواز کسی بات پر سلطانہ سے سخت

ناراض تھا۔ اس کی جاں بخشی کے لیے چودھری نے یہ شرط عائد کردی تھی کہ اگر وہ فیض آباد کے تھانے دار کے کوارٹر میں گھس کر ایک مخصوص فائل چرانے میں کامیاب ہوجائے تو وہ نہ صرف اس کی تمام خطائیں معاف کردے گا بلکہ اسے انعام داکرام سے بھی نوازدے گا۔ سلطانہ نے یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ یہ معلومات اشتیاق نے فراہم کرتھیں کہ میں کب وہ فائل الماری میں سے نکال کر اپنے کوارٹر پر لے جاؤں گا۔ گویا اشتیاق نے شروع ہی سے مجھ پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ میں جب سے اس تھانے میں آیا تھا، اِکادُکا فائلیں مطالعے کے لیے اپنے کوارٹر پر لے جاتا تھا۔

اشتیاق کی زبانی پتا چلا کہ گاما گانی والا ایک حوالے سے چودھری رب نواز کا معتوب تھا۔ وہ ایک تیر سے دوشکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لہٰذا سلطانہ (شادو) نے مجھے گاما کے حوالے سے ایسی دردناک کہانی سنائی کہ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور گاما کے لیے نفرت پیدا ہوگئی۔ اسی دوران میں مجھے پانی لینے بھیج کر اس نے اپنی مطلوبہ فائل چپکے سے اٹھا کر اپنی چادر میں چھپالی۔ ان لمحات میں میرا ذہن سلطانہ کے معاملے میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ میں نے فائلوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

سلطانہ اس مشن پر اکیلی فیض آباد نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ چودھری کا ایک خاص بندہ بھی تھا۔ اس بندے کا نام الیاس معلوم ہوا اور اسی شخص نے چودھری رب نواز کی ہدایت کے مطابق سلطانہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور چودھری کے جرائم والی فائل لے کر جمال پور کی طرف روانہ ہوگیا۔

گاما گانی والا کو اس کیس میں ملوث کرنے کے لیے سلطانہ نے اس کی بیوی کے حوالے سے مجھے ایک فرضی کہانی سنادی تھی۔ بعدازاں الیاس نے شاطرانہ چال چلتے ہوئے سلطانہ کو گاما کے گھر کے سامنے سے گھوڑے پر سوار کرایا تھا تاکہ اگر پولیس کھرا نکالنے کی کوشش کرے تو سارا شک گاما گانی والا پر ہی جائے اور بابا دینو کے کھرے کی رپورٹ کے بعد کسی حد تک میرا دھیان گاما کی طرف گیا بھی تھا اور پھر جب اشتیاق نے زور دیا کہ گاما کو کڑی تفتیش سے گزار کر اس کی زبان سے سلطانہ کے قتل کا اقرار کرانا چاہیے تو اشتیاق کی اس خواہش کے بعد صورتِ حال مجھ پر واضح ہوگئی تھی۔

اشتیاق نے مجھے بتایا کہ شفیق تتولی نے چودھری رب نواز جنجوعہ کے خلاف کچھ ایسے ثبوت جمع کرلیے تھے کہ وہ نہایت ہی خفیہ طریقے سے ڈاکوؤں کی پشت پناہی کیا کرتا تھا۔ ڈاکازنی کی وارداتوں سے حاصل ہونے والے "مالِ غنیمت" میں آدھا حصہ جنجوعہ کا ہوا کرتا تھا۔ جب چودھری رب نواز کی یہ دکھتی ہوئی رگ شفیق تتولی کے ہاتھ لگی تو لوٹ کے مال میں وہ بھی حصے دار بن گیا اور یہی کاروبار تتولی اور جنجوعہ کی دوستی کا سبب بھی تھا۔ چودھری نے کئی بار تتولی کو پیشکش بھی کی تھی کہ وہ منہ مانگی رقم لے کر ان تمام ثبوتوں کو تلف کردے مگر تتولی، چودھری سے زیادہ کائیاں اور سیانا تھا۔ وہ ہر مرتبہ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا۔

"چودھری صاحب! آپ ان کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ یہ تو کسی بھی وقت تلف کیے جاسکتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ڈاکوؤں کے جرائم کے ثبوت ہیں، آپ کے نہیں۔"

چودھری رب نواز جنجوعہ، شفیق تتولی کی اس ڈیڑھ ہوشیاری کے سامنے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور تھا لیکن جب چودھری کو پتا چلا کہ تتولی کو اس تھانے سے ہٹا کر ایک ایمان دار پولیس آفیسر کو تعینات کردیا گیا ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے اپنے خاص آدمی کانسٹیبل اشتیاق کی مخبری پر اپنے خلاف ثبوتوں سے بھری اس فائل کو چوری کرانے کا منصوبہ بنایا اور پھر اس خطرناک منصوبے پر عمل بھی کرڈالا۔

میں نے اشتیاق سے سوال کیا۔ "ایک فائل کے حصول کے لیے اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ فائل ہی تھانے سے چرا کر اپنے پرائیویٹ باپ جنجوعہ تک پہنچادیتے......"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر وہ مریل سی آواز میں بولا۔ "ملک صاحب! پہلے میں نے ایسا ہی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ بہت ہوشیار تھانے دار ہیں۔ آپ نے مجھے ایسا کرنے کا موقع نہیں دیا اور جب میں نے دیکھا کہ آپ فائلوں کا مطالعہ کرنے کے لیے انہیں اپنے کوارٹر پر لے جاتے ہیں تو میرے ذہن میں فائل کو چرانے کا یہ آئیڈیا آیا۔ میں نے اپنے خیالات سے چودھری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔"

"یہ سب بتاتے ہوئے تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آرہی ہوگی۔" میں نے ناپسندیدہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اس گھناؤنے کردار پر تو پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سر ندامت سے جھک گیا ہے۔"

وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی کی میں

نے ذرا سی پروا نہیں کی اور دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

”تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے لیے کسی رورعایت کے بارے میں سوچوں گا بھی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم نے صرف میرے اعتماد کا ہی خون نہیں کیا بلکہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے دامن پر بھی دھبا لگایا ہے۔“

وہ معافی تلافی پر اتر آیا۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ جب تک میں چودھری رب نواز جنجوعہ کو نہیں چھاپ لیتا، اسے حوالات ہی میں بند رکھوں گا اور اگر بعدازاں ضرورت پڑی تو اسے چودھری کے خلاف سلطانی گواہ بنا کر عدالت میں پیش کر دوں گا۔ اس طرح اس کی سزا نرم ہو جائے گی اور میرا کیس مضبوط......!

اگلی صبح میں نے موضع جمال پور پر چڑھائی کر دی۔ میں اپنے ساتھ تین پولیس اہلکاروں کو لے گیا تھا اور ہم نے کوشش کی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو، ہم جمال پور پہنچ جائیں۔ اشتیاق نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ اسے بابا دینو کے کمرے والے معاملے کی پوری خبر تھی اور وہ جمال پور اسی لیے گیا تھا کہ چودھری رب نواز کو یہ رپورٹ دے سکے کہ سلطانہ کے قاتل الیاس کا کھرا پکڑا گیا ہے لہٰذا مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ کہیں چودھری، الیاس کو ادھر ادھر نہ کر دے۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس روز چودھری رب نواز جنجوعہ کو گرفتار کرنے میں مجھے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ بہرحال میں نے جمال پور میں چودھری سے کسی قسم کا مکالمہ نہیں کیا اور اسے گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ جب چودھری نے حوالات کے اندر اپنے نمک خوار کانسٹیبل اشتیاق کو دیکھا تو ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چودھری کی بدقسمتی اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ وہ قاتل ابھی تک ضائع نہیں کی گئی تھی جس کے اندر چودھری کے جرائم کے ثبوت موجود تھے۔ میں نے مذکورہ قاتل کو حویلی سے برآمد کر کے فوراً اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

جب چودھری کو یقین ہو گیا کہ وہ بری طرح قانونی شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے اور میں کسی بھی طرح اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں تو وہ مجھے بڑے بڑے افسروں سے اپنے تعلقات کی دھمکی دینے لگا لیکن میں اس کی دھونس میں نہ آیا اور پتھریلے لہجے میں کہا۔

”چودھری! میں صرف اپنے خدا سے ڈرتا ہوں اور وہی کرتا ہوں جو قانون کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس لیے تم کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔“

”یہ تم اچھا نہیں کر رہے صفدر حیات۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں رب نواز جنجوعہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”جو تمہارے ساتھ ساجھے داری کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا سرکوب ہوں، سرپَل نہیں۔ تم جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہو اور میں نے معاشرے کو تمہارے جیسے کرداروں سے پاک کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور جہاں تک نتائج کو بھگتنے کا تعلق ہے تو.....!“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے جس دن پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن کیا تھا اسی روز اپنی زندگی کو اس محکمے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انسان کے لیے اس کی جان سے زیادہ قیمتی اور کوئی چیز تو نہیں ہوتی نا......!“

وہ چند لمحات تک خالی خالی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کی کسی دھونس دھمکی میں آنے والا نہیں تو وہ ایک دم نرم پڑ گیا اور منت خوشامد پر اتر آیا۔

”ملک صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ اس کیس کو رفع دفع کر دیں۔“

”آئندہ شکایت پیدا ہونے کا سوال تو اس وقت اٹھے گا جب میں شفیق تتولی کی طرح تم سے دوستی کرنے پر تیار ہو جاؤں گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور یہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے تو تمہاری پشت پر اتنے جوتے برسانے کا پروگرام بنا رکھا ہے کہ تمہارے ذہن کی ڈکشنری میں سے ”پشت پناہی“ کا لفظ ہی غائب ہو جائے۔“

کانسٹیبل اشتیاق، چودھری رب نواز کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کے لیے تیار تھا لہٰذا چودھری کو فٹ کرنے میں مجھے دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ چودھری ہی کی نشاندہی پر میں نے سلطانہ کے قاتل الیاس کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ اس کارروائی کے نتیجے میں آقا اور غلام دونوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔

(تحریر: حسام بٹ)

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

پھندا

ثمر عباس

کسی کے ساتھ زیادتی کرنے سے پہلے اگر ہمیں مکافاتِ عمل کا خیال آجائے تو شاید کوئی بھی اس پھندے میں کبھی نہ پھنسے مگر... درسِ عبرت کا تسلسل پھر کیسے ممکن ہوگا۔ اس کے گرد بھی مکافات کا پھندا دھیرے دھیرے تنگ ہوتا جارہا تھا حتیٰ کہ اس کے پاس ازالے کا اور نہ ہی معافی کا وقت رہا... بالآخر اس مکافات کی گرہیں بھی آہستہ آہستہ کھل گئیں۔

یادوں سے وقت کی گرد صاف کرنے والے ایک شکاری کا انتقام

ہم کورڈیلیرا اسنڈل کی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ تین ہزار میٹر کی بلندی پر پہنچ کر ہمارے گائڈ اور ڈاکٹر بنجمن نیس ڈیل نے گھوڑوں سے اترنے کے لیے کہا اور تیز بہاؤ والی ندی کی طرف چل دیا۔ میری عمر بیالیس سال ہے اور مجھے حال ہی میں طلاق ہوئی ہے۔ یوں لگنے لگا تھا جیسے میں ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار ہوتی جارہی ہوں، وہ مجھ سے عمر میں ایک یا دو سال ہی بڑا ہوگا۔ اس کا قد لمبا اور جسم متناسب تھا۔ عموماً درمیانی عمر کے لوگ اتنے اسمارٹ نہیں ہوتے۔ وہ



ہمیشہ پُرسکون نظر آتا اور محتاط گفتگو کیا کرتا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔

مولز کے ہمارے گھوڑوں پر سے ساز و سامان اتار کر انہیں دریا کے بہاؤ کی جانب لے گئے اور انہیں علیحدہ علیحدہ باندھ دیا۔ میرے ساتھ جو مہم جو عورتیں تھیں ان کا تعلق پام لیکو ساؤنڈ برڈنگ سوسائٹی سے تھا اور ٹور کمپنی نے معمول کے مطابق ڈاکٹر نیس ڈیل کی خدمات دوہری حیثیت میں حاصل کی تھیں۔ وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ ہمارا گائیڈ بھی تھا۔ اتنی اونچائی پر آنے سے ساتوں عورتوں کی سانس پھولی ہوئی تھی کیونکہ ہم سب سطح سمندر پر رہنے والے تھے۔ میری بہترین دوست این بن اسٹوک دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہانپ رہی تھی۔ اب ہمیں رسیوں سے بنے ہوئے ایک پل سے گزرنا تھا۔

گو کہ ڈاکٹر نیس ڈیل نے اسے دکھایا تھا کہ کس طرح سب سے اوپر کی رسی کو پکڑنا ہے۔ اس کے باوجود نہ صرف اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی بلکہ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پل پار کرتے ہوئے غیر معمولی خوف میں مبتلا ہے، اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں گرنے والی ہوں۔“

”تم نہیں گرو گی۔“ ڈاکٹر نیس ڈیل نے اسے یقین دلایا۔

میں نے اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”این! تم بالکل محفوظ ہو۔ ڈاکٹر نیس ڈیل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

ڈاکٹر اب بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہاری دوا ڈایاموکس کی خوراک بڑھا دوں تاکہ بلندی پر چڑھنے کی وجہ سے تمہاری جو کیفیت ہو رہی ہے، اس پر قابو پایا جاسکے۔“ پھر وہ پورے گروپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”این پہلے نہیں جانا چاہتی۔ تم میں سے کون اس کی جگہ لینے کے لیے تیار ہے؟“

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں جاؤں گی۔“

نیس ڈیل نے جھک کر نیچے والی رسی کو دائیں اور اوپر والی رسی کو بائیں ہاتھ سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آؤ۔“

میں نے حفاظتی بیلٹ باندھی اور آگے بڑھنے لگی۔ اس نے رسیاں پکڑ رکھی تھیں اس لیے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اس طرح میں ندی کے دوسرے کنارے پر بحفاظت پہنچ گئی۔ دوسری عورتوں نے بھی کسی دشواری کے بغیر یہ مرحلہ سر کرلیا۔ اب آخر میں این ہی رہ گئی تھی۔

میں دوسری جانب سے دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کس طرح میری دوست کو پیار سے منا رہا تھا لیکن وہ اپنی کیفیت پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اسے دعوے کے ساتھ بتا رہا تھا کہ حفاظتی بیلٹ کتنی موثر ہے۔ اس کے سمجھانے کا یہ اثر ہوا کہ این بالآخر آگے بڑھنے پر تیار ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ سب کچھ ٹھیک رہے گا اور وہ اپنے خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی نامناسب سطح کے باوجود یہ پل عبور کرلے گی لیکن عین اس وقت ڈاکٹر نیس ڈیل نے اچانک جوش میں آتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ نیچے والی رسی سے ہٹایا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ان چوٹیوں کی طرف دیکھو۔ امریکا کا بڑا گدھ۔ تم اپنے فیلڈ گلاس لگالو۔“

ہم نے جلدی جلدی وہ مخصوص چشمے چڑھائے اور اس جانب دیکھنے لگے جہاں ڈاکٹر نے اشارہ کیا تھا۔ ہماری پشت ڈاکٹر اور این کی طرف تھی۔ میں نے بلندیوں پر تلاش کیا لیکن مجھے وہاں کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ اس کے باوجود میں بار بار اس جانب دیکھتی رہی۔ شاید ڈاکٹر کا کہا ہوا جملہ اس کا محرک تھا۔ میری نظریں مسلسل آسمان کا جائزہ لے رہی تھیں کہ میں نے ایک چیخ کی آواز سنی اور میرے عقب میں ایک چھپاکے کی آواز ابھری۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ این پہاڑی ندی میں گر گئی تھی۔ اس کی حفاظتی بیلٹ نکل چکی تھی اور پانی کا بہاؤ اسے خطرناک رفتار سے ہم سے دور لیے جا رہا تھا۔ پتھروں پر گرنے سے اسے شدید ضرب لگی تھی اور اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پل چھوڑ دیا اور اس کے تعاقب میں ندی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا پھر وہ صنوبر کے درختوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔ سب عورتوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کیونکہ اب ہمیں این کے علاوہ ڈاکٹر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ان کی تلاش میں چل دی پھر میں نے انہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ ڈاکٹر نیس ڈیل میری دوست پر جھکا ہوا اس کے ماتھے پر لگے ہوئے گہرے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ این پانی میں بھیگ چکی تھی اور بری طرح کپکپا رہی تھی۔

”گرنے سے اس کا بایاں ٹخنا مڑ گیا ہے اور اس میں موچ آئی ہے۔ اس پر سوجن آرہی ہے۔ مجھے ماتھے پر لگے ہوئے زخم سے زیادہ اس کے ٹخنے کی فکر ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا تو میں اپنی دوست پر جھک گئی۔ وہ اپنی دہشت زدہ نیلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔“

میں ڈاکٹر کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے فوراً ہی میں نے اپنی دوست کی بات سنی ان

سی کردی اور ڈاکٹر کی رضا کارانہ شاگرد بنتے ہوئے بولی۔
''کیا بلندی پر جاتے سے اس کی طبیعت دوبارہ بگڑ گئی ہے؟''
اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ اس کی ڈایاموکس کی خوراک بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''
اکتیس سو میٹر کی بلندی پر جانے کے بعد ہمیں ایک جگہ ڈیڑھ دن کے لیے قیام کرنا تھا۔ این کو یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکٹر ولیم ہے اور ڈاکٹر نیس ڈیل کی یقین دہانی کے باوجود اس کا یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا۔
''میں نے کبھی تمہیں ڈاکٹر ولیم کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس سے میری ملاقات کیلی فورنیا میں ہوئی تھی۔''
''کیا یہ قرین قیاس لگتا ہے کہ وہ اپنا نام تبدیل کر کے تمہارے پیچھے جنوبی امریکا چلا آئے؟''
اس نے ندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر ولیم نے میرے پیروں کے نیچے سے رسی کھینچ لی تھی۔ اسی لیے میں پھسل کر نیچے جا گری تھی۔''
اس کی مسلسل الزام تراشی سے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا اور میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
''اس کا نام ڈاکٹر ولیم نہیں ہے۔''
''وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس کے بعد میری ملاقات سام سے ہوئی تھی۔''
''لیکن وہ تمہیں کیوں ڈھونڈے گا؟''
''اس لیے کہ میں نے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔''
میں نے اس کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کی کوشش کی کہ وہ ایک بیماری میں مبتلا ہے اور کہا۔ ''ڈاکٹر نیس ڈیل کا خیال ہے کہ بلندی پر چڑھنے کی وجہ سے تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے اور اس بیماری میں مغالطہ ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔''
اس نے میری بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''میرے گھٹنے میں شدید درد ہو رہا ہے۔''
''میں جا کر دیکھتی ہوں۔ شاید وہ تمہیں درد دور کرنے کے لیے ایک اور گولی دے سکے۔''
میں اسے چھوڑ کر ڈاکٹر کے خیمے کی طرف چل دی۔ وہاں چھ عدد خیمے کیمپ فائر کے گرد نصف دائرے کی شکل میں لگائے گئے تھے۔ کچھ لڑکیاں آگ کے پاس بیٹھی مشروب سے دل بہلا رہی تھیں اور ساتھ ہی پرندوں کے بارے میں اپنی معلومات کا تبادلہ بھی کر رہی تھیں۔ آسمان بالکل صاف اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے خیمے کے باہر کھڑے ہو کر اسے پکارا۔ ''ڈاکٹر نیس ڈیل؟''
اس نے چند لمحوں بعد اندر سے ہی جواب دیا۔ ''ہاں جینی، کیا بات ہے؟''
''مجھے افسوس ہے کہ اس وقت تمہیں زحمت دی۔''
''کوئی بات نہیں۔ اندر آ جاؤ۔''
میں نے اندر جا کر کہا۔ ''این کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کیا اسے درد کم کرنے کے لیے ایک اور گولی دی جا سکتی ہے؟''
اس کے خیمے میں ایک میز کرسی اور مٹی کے تیل کا لیمپ رکھا ہوا تھا۔ اس کا بستر فوجی طرز کا تھا۔ اس کے علاوہ پورے خیمے میں کوئی اور چیز نہیں تھی اور وہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرم پتلون، لینن کی قمیص اور نیلے رنگ کا سوئٹر پہنا ہوا تھا اور وہ اپنے آئی پیڈ پر دن بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ لکھ رہا تھا۔
''میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ چوٹ اس کے لیے مزید تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔''
''تم اس کے چہرے سے اس کی تکلیف کا اندازہ لگا سکتے ہو۔''
اس نے لمحے بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''کیا اب بھی وہ یہی سمجھتی ہے کہ میں ڈاکٹر ولیم ہوں؟''
''ہاں۔''
''یہ ڈاکٹر ولیم کون ہے؟''
''اس کا کوئی محبوب...... اب وہ کہتی ہے کہ اس نے ڈاکٹر کی زندگی برباد کر دی تھی۔''
وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔''
مجھے ان باتوں کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ اس لیے اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔
''اس کے دماغ میں پانی جمع ہو گیا ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ ڈایاموکس اضافی مقدار میں لے رہی ہے؟''
''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''
''وہ ڈاکٹر ولیم سے کب ملی تھی؟''
''پندرہ سال پہلے۔''
وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''کیوں نہ میں خود جا کر دیکھوں کہ اب اس کی کیا حالت ہے؟''
اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہم واپس جانے ہی والے تھے کہ میں نے اسے ڈاکٹر ولیم کے بارے میں کچھ اور

باتیں بتائیں۔ وہ ہیزل کا نام سن کر چونک پڑا اور بولا۔ ''آج کل اس طرح کے نام نہیں رکھے جاتے۔''
''یہی بات میں نے بھی این سے کہی تھی۔''
''اور وہ کہتی ہے کہ میری شادی ہیزل سے ہوئی تھی؟''
''ہاں!''
''اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ میں نے ندی پار کرتے وقت اسے مارنے کی کوشش کی تھی؟''
''ہاں!'' میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''مجھے ایک بار پھر اس کی دوا کو چیک کرنا پڑے گا۔'' وہ تشویش ناک انداز میں بولا۔ ''ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ہی یہ مسئلہ ہو رہا ہو۔ بعض اوقات تشخیص میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زائد المیعاد دوا لے رہی ہو۔''
جب ہم اپنے ٹینٹ میں واپس آئے تو این اونگھ رہی تھی۔ ہماری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی اور جب اس نے ڈاکٹر کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا اور وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ ''تمہاری زندگی برباد کرنے میں مجھ سے زیادہ سام قصوروار ہے۔ اسی نے تم پر مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔''
میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر ڈاکٹر نیس ڈیل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس نے ابھی تک مقدمے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''
این اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی خوشی کے لیے لوگوں کی زندگی تباہ نہیں کرتی۔ میں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ سام نے ہی مجھے اکسایا تھا۔''
نیس ڈیل آگے کی طرف جھکا اور این کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''جینی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔ میں تمہیں ایک اور دوا دے رہا ہوں جو پچھلی گولی کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے۔ تمہیں خواب آور گولیوں سے الرجی تو نہیں ہے؟''
''تم اس بارے میں اچھی طرح جانتے ہو آئن ولیم۔ جب میں پہلی بار تمہارے پاس آئی تو نرس نے میری ہسٹری لی تھی۔''
''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک گولی دے رہا ہوں۔'' اس نے اپنے بیگ سے سفید گولیوں کی بوتل نکالی اور اسے ایک گولی نگلنے کے لیے دے دی۔ ''اب میں تمہاری دوا ڈایاموکس دیکھنا چاہوں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان میں کوئی خراب یا زائد المیعاد گولی تو شامل نہیں۔ تم یہ دوا کہاں رکھتی ہو؟''
اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بیگ میں۔''
نیس ڈیل اٹھ کر گیا اور اس نے بیگ کھول کر وہ بوتل نکال لی۔ پھر ایک کیپسول اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے پلاسٹک کے انڈے جیسا تھا جس کا آدھا حصہ اورنج اور آدھا شفاف تھا۔ اس میں درجنوں چھوٹے رنگین ذرات تھے۔ اس نے کیپسول اٹھا کر ناک سے لگایا۔ اسے سونگھا اور مطمئن ہو کر دوبارہ شیشی میں رکھ دیا۔
''اس کی بو سے تو نہیں لگتا کہ یہ خراب یا زائد المیعاد ہے۔'' اس نے شیشی واپس بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''این! تمہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ میرے لیے یہ یقین کرنا کتنا عجیب ہے۔ تم کہتی ہو کہ میں کوئی اور ڈاکٹر ہوں جس سے تمہاری ملاقات کیلی فورنیا میں ہوئی تھی جبکہ میں کبھی بھی کیلی فورنیا میں نہیں رہا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم مکمل آرام کرو۔ یہ سب آکسیجن کی کمی سے ہو رہا ہے۔ آرام کرنے سے تمہاری آکسیجن کی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ میں اور دوسری خواتین مل کر کیمپ کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم کوئی کام کرو۔ ہم اس مقام پر اگلے چھتیس گھنٹوں تک رہیں گے۔ ڈایاموکس کی خوراک بڑھانے اور یہاں رک کر آرام کرنے کے بعد تم جلد ہی بہتری محسوس کرو گی۔''
ایک بار پھر این کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''مقدمہ چلانے کا آئیڈیا سام کا تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ رہی ہوں آئن!''
ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔
بعد میں، میں جب اسے این کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں بتانے کے لیے گئی تو خیمے کے اندر داخل ہوتے ہوئے میری عجیب سی کیفیت تھی، جیسے میں کسی غیر سے نہیں بلکہ بہت ہی اپنی اور پیاری شخصیت سے ملنے آئی ہوں۔
نیس ڈیل نے اپنی جیکٹ میرے کندھوں پر ڈال دی اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی جو ایک چھوٹی سی کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے لیے ایک گلاس میں فرانسیسی مشروب ڈالا۔ میں نے اسے این کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے ایک اور گلاس بنا کر دیا۔ جب میرا جسم اچھی طرح گرم ہو گیا تو جانے کے لیے اٹھی اور میں نے خیمے کا پردہ ایک طرف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں باہر جاتی، وہ میرے پیچھے آیا۔ اس نے میرے کندھوں

پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ میں نے پردہ برابر کر دیا۔ میں خود بھی اس سرد موسم میں باہر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

اگلی صبح کیمپ فائر کے گرد بیٹھی خواتین ڈاکٹر کے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر پر پرندوں کی چہچہاہٹ سن رہی تھیں تاکہ انہیں جنگل کے پرندوں کی آواز کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔ اس ٹیپ ریکارڈر کی آواز بہت اچھی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ پرندے کیمپ میں ہی موجود ہیں۔ این ہمارے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اب اس کی طبیعت قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”میں نے گزشتہ شب ڈاکٹر نیس ڈیل کے بارے میں جو کچھ کہا، اس پر وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

اس دوران ڈاکٹر نیس ڈیل کیمپ کے دوسرے سرے پر اپنے دو معاون گائیڈز سے ان کی مادری زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ مقامی باشندے تھے اور غالباً ان کا تعلق جنوبی امریکا کے ملک پیرو سے تھا۔ وہ تینوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے پھیکی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا۔ شاید کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی۔

”وہ رحم دل اور سمجھدار شخص ہے این۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”یہ بہت پرانی بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح میرے دماغ میں آ گئی۔ میں کسی ڈاکٹر پر کوتاہی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ ویسے بھی مجھے انشورنس کی رقم مل چکی تھی۔ سام کے وکیل احمق تھے لیکن اس مقدمے کی وجہ سے آئن کا کیریئر اور اس کی ازدواجی زندگی تباہ ہو گئی۔“

ناشتے پر نیس ڈیل نے اعلان کیا۔ ”ایلویو کا کہنا ہے کہ موسم خراب ہو رہا ہے۔ گو کہ ہم نے یہاں ڈیڑھ دن ٹھہرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ اس خراب موسم سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیں۔ مٹی کے تودے گرنے سے یہ علاقہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ این! میں ایک بار پھر تمہاری دوا کی خوراک بڑھاؤں گا تاکہ تم چڑھائی پر جانے کے قابل ہو سکو اس کے علاوہ میرے پاس آکسیجن کا سلنڈر بھی ہے جو جزوی طور پر تمہاری تکلیف کم کر دے گا۔“

اس کے بعد ہم نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ہم صبح سے لے کر سہ پہر تک چڑھتے رہے۔ میں بار بار پیچھے کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید وہ طوفان ہمارا پیچھا کر رہا ہو جس کے بارے میں ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا لیکن پہاڑی کی نچلی سطح پر صاف ہوا چل رہی تھی اور طوفان کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم نے تین بجے اپنے گھوڑوں کو چارا اور پانی دیا۔ یہ جانور اسی علاقے میں پیدا ہوئے اور انہیں پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس لیے ان پر تھکن اور سانس پھولنے کے کوئی آثار نہیں تھے جبکہ دوسری جانب میرے ساتھ سفر کرنے والی عورتیں اونچائی پر چڑھنے سے متاثر ہوئی تھیں۔ وہ سب سر درد کی شکایت کر رہی تھیں۔ کچھ نے سر چکرانے، آنکھوں کے آگے دھند اور متلی کے بارے میں بھی بتایا۔ ہمارے گروپ کی سب سے معمر عورت ایلس نڈھال ہو کر ایک جھاڑی میں لیٹ گئی۔

شاید سب سے زیادہ خراب حالت این کی تھی گو کہ ڈاکٹر نے اس کے لیے ڈایاموکس کی خوراک بڑھا دی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی ذہنی حالت معمول پر نہیں تھی اور وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ اڑتیس سالہ این ہمارے گروپ میں دوسری سب سے کم عمر عورت تھی اور دیکھنے میں صحت مند نظر آتی تھی جو ہر سال باقاعدگی سے ایک مہینے کے لیے کینیڈا کا سفر کرتی تھی لیکن اب وہ ایلس کی طرح بوڑھی لگ رہی تھی۔ اس کی جلد سرمئی ہو گئی تھی، آنکھیں نیم وا تھیں اور اس کی نقل و حرکت سے لگ رہا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی شدت سے سر چکرانے، متلی اور ماحول کی ناشناسی کو محسوس کر رہی ہے۔ ڈاکٹر نیس ڈیل نے اسے آکسیجن لگائی لیکن اس کی حالت میں بہتری واقع نہیں ہوئی۔

”تمہیں یقین ہے کہ ناب صحیح طریقے سے لگائی تھی؟“ ایلس نے تیز آواز میں کہا۔ وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے نرس کے طور پر کام کرتی تھی۔

ڈاکٹر نے طبی اصطلاح میں اسے جواب دیا جسے میں نہ سمجھ سکی۔ ”میں اسے ڈھائی تک لے گیا تھا۔“

”پھر اس کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ میں نے ڈائل کو حرکت کرتے نہیں دیکھا۔“

”ڈائل خراب ہو گیا ہے۔ سمٹ کیمپ پہنچ کر ہم اسے تبدیل کر دیں گے۔“

”کیا وہ ناب کام کر رہی ہے؟“

ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔ ”بالکل کام کر رہی ہے۔“

این اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر ولیم کے بارے میں مزید کچھ سن سکوں گی لیکن اس کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا کہ وہ اندرونی بیماریوں کا

علاج کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میں کوئی نئی بات نہیں جان سکی۔ وہ صرف یہی کہہ رہی تھی کہ یہ چڑھائی اس کے لیے سخت مشکل رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہم سب کے لیے ایک سخت مشق تھی۔

ہم سب عورتیں ایڈونچر کی شوقین تھیں اور شاید ہمیں اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ گو کہ منتظمین نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں جس میں ہمارے لیے ایک ڈاکٹر اور گائڈ کا بندوبست کرنا بھی شامل تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس غیر گنجان ماحول میں کسی چیز کو جانچنا مشکل لگ رہا تھا۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے پہاڑ کا قدرتی منظر خوابوں کی سرزمین لگنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نیس ڈیل نے وہاں کئی پرندوں کی نشان دہی کی۔ میں نے اس سے پہلے یہ پرندے نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے یہ سب کچھ میرے لیے پریوں کی کہانی جیسا تھا۔

ہم نے ایک بار پھر پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد این کی حالت بگڑ گئی اور اس نے اپنا سارا بوجھ گھوڑے کی پیٹھ پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ دیکھ کر گائڈ اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ ڈاکٹر نیس ڈیل نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے گھوڑے سے اتارا۔ فوری طور پر زمین پر ایک گدا بچھایا گیا اور اس پر این کو لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے جھک کر دیکھا پھر اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اسے سلنڈر سے تھوڑی سی آکسیجن دی۔ این نے آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹر اس فوری طبی امداد سے مطمئن ہو گیا۔

اس کے فوراً بعد وہ اسے چھوڑ کر ایک بھورے رنگ کی گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی زین کے ساتھ لگے ہوئے پرانے تھیلے کو کھول کر اس میں سے ایک ٹرانسمیٹر نکالا۔ اس نے اسے ایک چٹان پر رکھا۔ یہاں سیل فون کے سگنل نہیں آرہے تھے۔ اس نے ٹرانسمیٹر آن کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کئی بار کوشش کرنے کے بعد اس کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے پچھلا حصہ کھول کر بیٹری نکالی جو کافی پرانی ہو چکی تھی۔ بیٹری کے دونوں سرے چیک کیے۔ مجھے وہاں دھبے نظر آئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ بیٹری کا تیزاب لیک ہو گیا ہے۔

"میں اس کے ذریعے پیغام بھیج کر این کے لیے ہیلی کاپٹر منگوانا چاہ رہا تھا۔" ڈاکٹر کی آواز ایسی تھی جیسے وہ کسی لمبے پائپ کے دوسرے سرے سے بول رہا ہو۔

اس نے گھوڑی کے ساتھ بندھا ہوا ایک اور بیگ نکالا اور اس میں جھانک کر دیکھا۔ بیگ میں اضافی سیل موجود تھے۔ اس نے انہیں ٹرانسمیٹر میں ڈالا اور اسے آن کر دیا۔

اس بار بھی وہ ساکن رہا۔ اس میں کوئی آواز نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے اس کی فریکوئنسی تبدیل کی پھر بھی اس میں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ ایک بار پھر اس نے سیل تبدیل کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر نے آخری کوشش کے طور پر ٹرانسمیٹر کا بغور معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بیٹری کا تیزاب اس کے اندرونی حصوں تک پہنچ گیا ہے۔ مایوس ہو کر اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا اور اپنے ساتھی گائڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"الیویو! مجھے اپنا ٹرانسمیٹر دو۔ اس سے کوشش کرتا ہوں۔"

لیکن الیویو کا ٹرانسمیٹر کم فاصلے تک پیغام رسانی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کے واکی ٹاکی جیسا تھا۔ ان اونچی پہاڑیوں اور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر وہ زیادہ فاصلے تک کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح ہمارا رابطہ بیرونی دنیا سے بالکل ختم ہو گیا تھا۔

"تمہارے پاس کوئی دوسرا سیٹ نہیں ہے؟" ایلس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر نیس ڈیل کے چہرے پر سختی آگئی۔ "اگر ہوتا تو تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

سورج غروب ہونے پر میں، ڈاکٹر اور ایلس سر جوڑ کر بیٹھے۔ "ایک کارآمد ٹرانسمیٹر کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔" ایلس نے کہا۔ "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ہم واپس پہاڑی سے نیچے اترنا شروع کر دیں۔"

"بالکل، اس وقت ہمارا انحصار صرف ہیلی کاپٹر پک اپ پوائنٹ پر ہے جس کے لیے ہمیں مزید سات سو میٹر اوپر جانا ہوگا۔"

"کیا یہ این کے لیے خطرناک نہیں ہوگا؟"

"مجھے اس کے اوپر چڑھنے سے پریشانی ہو رہی ہے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ دوا کا اثر کیوں نہیں ہو رہا لیکن ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارا ایک گائڈ پہلے چلا جائے اور ہمارے لیے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر دے۔ تم ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھی تو یہی پیغام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"میں تھوڑا سا کنفیوز تھا۔ دراصل ہم سب پر اس ماحول کا اثر ہو رہا ہے۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا کہ اس علاقے میں کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں ہیلی کاپٹر اتر سکے۔ قدم قدم پر ناہموار ٹیلے اور ابھری ہوئی چٹانیں ہیں۔

یہاں بجلی کا پڑ کا اثر نا انتہائی خطرناک ہوگا۔''
''پھر ہم کیا کریں؟''
''بہترین اور وقت بچانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم سب سمٹ کیمپ کی جانب اپنا سفر جاری رکھیں۔''
''وہاں ہمیں ٹرانسمیٹر مل جائے گا؟'' ایلس نے پوچھا۔
''ہاں۔''
''تمہاری کیا رائے ہے۔ اس کے لیے اوپر جانا بہتر ہوگا یا نیچے؟'' ایلس کی آواز میں بے اعتباری کی جھلک محسوس کر کے میں یہ سوچنے لگی کہ کیا اسے بھی این کے لگائے ہوئے الزامات پر یقین آ گیا ہے۔
''مجھے یقین ہے کہ اگر میں ایک بار پھر اس کی دوا کی مقدار بڑھا دوں تو فوری طور پر اوپر جانا اس کے لیے بہتر ہوگا۔ اس طرح اس کی بروقت نگہداشت ہو سکے گی۔''
''پھر میں کہوں گی کہ ہمیں گھوڑوں کے ذریعے آہستہ روی سے اوپر کی جانب جانا چاہیے۔'' ایلس نے کہا۔
نیس ڈیل حیران نظر آنے لگا کہ اس کی طبی رائے کو اس بے دردی سے مسترد کر دیا گیا۔ ایلس اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہ سارا معاملہ کچھ مشکوک لگ رہا ہے ڈاکٹر۔ پہلے وہ حادثاتی طور پر ندی میں گری۔ تم نے یہ کہہ کر ہمیں اوپر چڑھنے پر مجبور کیا کہ طوفان کی آمد آمد ہے لیکن کوئی طوفان نہیں آیا۔ تم نے این کی دوا کی مقدار بڑھا دی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تمہارے آکسیجن سلنڈر کا میٹر کام نہیں کر رہا۔ اسی طرح تمہارا ٹرانسمیٹر بھی ناقابلِ استعمال ہے اور تمہارے پاس دوسرا متبادل بھی نہیں ہے جو میرے حساب سے بہت بڑی اور احمقانہ غلطی ہے۔ تم جانتے تھے کہ یہاں سیل فون کام نہیں کرتا پھر تم نے متبادل ٹرانسمیٹر کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ ڈاکٹر نیس ڈیل! کیا واقعی یہ تمہارا اصلی نام ہے؟''
ڈاکٹر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ این کی طرح تمہیں بھی مغالطہ ہو گیا ہے۔''
''اب ہم اسے مزید اونچائی پر لے جا کر ایک مہلک کیفیت سے دوچار کرنا چاہتے ہیں۔ این نے مجھے بتایا ہے کہ مقدمہ ہارنے کے بعد تم نے سب کچھ گنوا دیا تھا۔ اسی لیے شاید تم اس سے انتقام لینا چاہ رہے ہو۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔''
''میں کسی مقدمے کے بارے میں نہیں جانتا۔''
''کیا ہیزل تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی؟''
''میری کبھی بھی ہیزل نامی عورت سے شادی نہیں

دانش وروں کی
دانش مندانہ باتیں

حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں......
☆ جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔
☆ دنیا کا عذاب یہ ہے کہ تمہارا دل مُردہ ہو جائے۔
☆ جو کام حکمت سے خالی ہے، وہ آفت ہے۔
☆ جو خاموشی سے خالی ہے، وہ غفلت ہے۔
☆ جو نظر حکمت سے خالی ہے، وہ ذلت ہے۔
☆ جو شخص دنیا میں رہ کر اس کی محبت سے بچتا رہے، اس نے اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچایا اور دوسروں کو بھی۔
حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں......
☆ کوئی کمزور شخص تمہاری بے عزتی کرے تو اسے بخش دو۔ اس لیے کہ بہادری کا کام تو معاف کرنا ہے۔
☆ ہر اچھا کام پہلے ناممکن ہوتا ہے۔
☆ بانٹنے سے خوشی اس طرح بڑھتی ہے جس طرح زمین میں بویا ہوا بیج فصل کے لیے۔
☆ جھگڑا بڑھنے سے پہلے تم اس سے الگ ہو جاؤ۔
انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہوئی۔ تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو ایلس؟''
وہ بوڑھی عورت تھوڑی سی شرمندہ نظر آنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے ڈاکٹر لیکن تمہیں اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ سب کچھ عجیب ہو رہا ہے۔''
ایلس کے جانے کے بعد میں اور ڈاکٹر خوش گپی میں مشغول ہو گئے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے یہ عورت بالکل بھی پسند نہیں۔''
''لیکن وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔''
اسے میری بات اچھی نہیں لگی اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی اس کی حمایت کر رہی ہو؟''
''اس نے پے در پے ہونے والے ناخوشگوار واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔''
''میں ایک ڈاکٹر اور گائیڈ ہونے کی حیثیت سے جو کر سکتا تھا، وہ کر رہا ہوں لیکن اس صورتِ حال کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔''
''ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ این جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں کتنی سچائی ہے؟''
ڈاکٹر نے خیمے کے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ''میں ڈاکٹر ولیم نہیں ہوں۔ میں نے کبھی پوشیدہ امراض کا علاج نہیں کیا۔ میں نہیں جانتا کہ سام کون ہے اور نہ ہی مجھے اس مقدمے کا کچھ پتا ہے جس کا ذکر این کر رہی ہے۔ میں جنرل فزیشن اور نارتھ یونیورسٹی کولمبیا میں میڈیکل پروفیسر ہوں۔ مجھے قیمتی اور نایاب پرندوں کی تلاش سے دلچسپی ہے۔ یہ ہے میرا مکمل تعارف۔'' اس نے میری توقع کے مطابق تھوڑا سا غصہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی کیلی فورنیا میں نہیں رہا۔ کسی نے مجھ پر غلط علاج کرنے کا مقدمہ دائر نہیں کیا اور نہ ہی اس کی وجہ سے میرا کیریئر تباہ ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہیزل نام کی کسی عورت سے میری شادی نہیں ہوئی۔''

میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی جب میں نے ایک بہت زور کی چیخ سنی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کے بدکنے کی آواز سنی۔ چلانے کی آواز میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی۔ گھوڑوں نے ہنہنانا شروع کر دیا۔ پھر میں نے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں سنیں۔ ان میں ڈاکٹر اور اس کے ساتھی گائیڈز کی آوازیں شامل تھیں۔

''جیگوار..... جیگوار۔''

یہ سنتے ہی میرا جسم پتھر کی طرح اکڑ گیا۔ یہ تیندوے کی نسل کا ایک خون آشام درندہ ہے اور دیکھنے میں ایک بڑی بلی کی طرح لگتا ہے۔ پھر میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھگدڑ میں تبدیل ہو گئی۔ ڈاکٹر نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''عورتیں اپنے خیموں میں چلی جائیں۔ ورنہ گھوڑے انہیں روند ڈالیں گے۔''

آہستہ آہستہ ٹاپوں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میں اپنی جگہ پر تقریباً ایک گھنٹے بے حس و حرکت لیٹی رہی تب کہیں جا کر میرے اعصاب پرسکون ہوئے۔ دوسری صبح تمام عورتیں اکٹھی ہوئیں تو پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے لیکن ہم اس مہم کو بھول چکے تھے جو ہم نے ان پرندوں کی خاطر شروع کی تھی۔ صبح بیدار ہونے پر معلوم ہوا کہ تمام گھوڑے جا چکے تھے اور ان کی پیٹھ پر سوار ہو کر آہستہ روی سے اوپر جانے کے فیصلے پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چونکہ یہ فاصلہ بہت زیادہ تھا اور اسے پیدل نہیں طے کیا جا سکتا تھا۔ این کی بگڑتی ہوئی حالت کے باوجود ڈاکٹر ہمیں بلندی کی جانب چلنے کی ترغیب دے رہا تھا جبکہ ایلس کو اس پر شدید اعتراض تھا۔

ہم نے کیمپ فائر کے گرد بیٹھ کر ہی ناشتا کیا۔ حالات ایسا رخ اختیار کر رہے تھے کہ اب میں بھی کسی بات پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے نیس ڈیل سے کہا دونوں گائیڈ کہاں ہیں۔ اس نے میرے لہجے کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''وہ گھوڑوں کے پیچھے گئے ہیں۔''

''اب ہم کیا کریں گے؟'' میں نے ایک جھلائی ہوئی بیوی کی طرح پوچھا۔

''ہم ایک گھوڑا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔''

''صرف ایک؟'' میں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کیا ہو گا؟''

''جینی پلیز! یہ بحث کا موقع نہیں ہے۔ ہم وہی کر سکتے ہیں جو عملی طور پر ممکن ہے۔ ایلس کو ایک گھوڑا ندی پر پانی پیتے ہوئے مل گیا تھا۔ ہم این کو اس پر بٹھا کر چوٹی کی جانب چل دیں گے جہاں ہمیں ہیلی کاپٹر بلوانے کے لیے ٹرانسمیٹر مل جائے گا۔''

میں پریشانی کے عالم میں بولی۔ ''کیا یہ این کے لیے نقصان دہ نہیں ہو گا؟''

''ڈایا موکس کی اضافی خوراک سے وہ یہ سفر کرنے کے قابل ہو جائے گی۔''

جب میں خیمے میں واپس آئی تو این نے مجھ سے کہا۔ ''سام نے ہی مجھے ایک وکیل سے ملوایا تھا جو اس قسم کے مقدمے لیا کرتا تھا۔ سام کو اپنے پارٹنر کو ادائیگی کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔ سام کے کہنے میں آ کر میں نے ڈاکٹر ولیم کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور اس کی زندگی برباد ہو گئی۔ جب ہیزل اسے چھوڑ کر گئی تو وہ آٹھ ماہ کی حاملہ تھی۔ اس سے ڈاکٹر کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچی اور اس کے لیے میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔''

اگلے روز میں نے پہلی بار اس کا نوٹس لیا۔ ہم چوٹی سے تین سو میٹر کے فاصلے پر تھے اور این کو اس اکلوتے گھوڑے پر بٹھا رکھا تھا جو بڑی تلاش کے بعد ہمیں ملا تھا۔ وہ بار بار اپنا بایاں بازو اوپر اٹھا رہی تھی جیسے شدید تکلیف میں ہو۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی زبان منہ سے باہر نکل آئی تھی، چہرہ پیلا پڑ گیا اور ناک سے خون بہہ رہا تھا پھر وہ گر پڑی اور زمین پر گرتے ہی اس کی سانسوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نیس ڈیل کا خیمہ جتنا صاف ستھرا تھا، اس کے اپارٹمنٹ کی حالت اتنی ہی ابتر تھی۔ ہر جگہ کتابیں

اور کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر پھیلے کپڑے اور بستر کے نیچے چادروں اور تکیوں کا ڈھیر تھا۔ گو کہ برتن دھوئے جا چکے تھے لیکن کچن بہت گندا ہو رہا تھا۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے، اس وقت سے اب تک نیس ڈیل کو پولیس کی تفتیش کی وجہ سے چیزوں کو ٹھیک سے رکھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس لیے اپارٹمنٹ کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمے داری بھی مجھ پر آن پڑی تھی۔ تفتیش مکمل ہونے کے آخری روز وہ گھر آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''نورا آپریٹر نے جن خطرات کی نشاندہی کی تھی، وہ درست ثابت ہوئی۔ میری پوزیشن اس معاملے میں بالکل صاف ہے۔''

گو کہ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ اس کے باوجود میرے ذہن میں کئی سوالات مچل رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''ڈایاموکس نے کام کیوں نہیں کیا جبکہ تم نے اسے اضافی خوراک بھی دی تھی؟''

اس نے معصومیت سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ جس مریض کو یہ دوا دی جائے، وہ اپنا ردعمل ظاہر نہ کرے۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں لیکن میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔''

اس مہم اور بعد میں ہونے والی تفتیش کی وجہ سے ڈاکٹر نیس ڈیل کا بہت کام جمع ہو گیا تھا اور اسے روزانہ بارہ سے چودہ گھنٹے یونیورسٹی کیمپس میں گزارنا پڑ رہے تھے۔ اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ اپنا سامان ہی کھول سکے جو وہ اس مہم پر اپنے ساتھ لے کر گیا تھا اور یہ سب سامان سامنے والے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ این کی موت کی وجہ سے میں کئی روز تک اس سامان کو کھولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میرا خیال تھا کہ ان بیگز میں ایسی کئی چیزیں ہوں گی جنہیں دیکھ کر اس تکلیف دہ سفر کی یادیں میری نگاہوں کے سامنے آجائیں گی۔ ان کا سامنا کرنے سے پہلے مجھے کچھ وقت درکار تھا۔

میں نے کئی دنوں تک اس سامان کو ہاتھ نہیں لگایا، یہاں تک کہ اس میں سے ایک ناگوار بو اٹھنے لگی جیسے اس میں کوئی لاش رکھی ہو۔ اس کے باوجود میں نے اس سامان کو ایسے ہی پڑے رہنے دیا پھر بارش کا موسم شروع ہو گیا اور میں اس سامان کو کھولنے بیٹھ گئی تاکہ چیزوں کو کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر سکوں۔

سب سے پہلے میری نظر ٹرانسمیٹر پر گئی جس کے ذریعے نیس ڈیل نے ہیلی کاپٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسے کئی سیکنڈ تک دیکھتی رہی۔ گو کہ میں کسی بھی اعتبار سے ٹیکنیکل عورت نہیں ہوں اور مجھے مشینری کے بارے میں کچھ علم نہیں لیکن پھر بھی اس کا پچھلا حصہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے ناکارہ بیٹری کو دیکھا جس کے دونوں سروں پر کیمیکل کے دھبے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے ایلس کی بات سے متفق ہونا پڑا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس خطرناک چڑھائی پر ایک ایکسٹرا ٹرانسمیٹر ساتھ نہ رکھا جائے یا کم از کم روانہ ہونے سے پہلے اسی ٹرانسمیٹر کو درست حالت میں رکھا جاتا۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک حقیقت یہ تھی کہ چند منٹ بعد ہی مجھے ایک دوسرا ٹرانسمیٹر بھی مل گیا جو بالکل عمدہ حالت میں تھا۔

اس ٹرانسمیٹر کو دیکھ کر میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور مجھے یوں لگا کہ ایک بار پھر بلندی پر چڑھنے کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہوں۔ یہ بات نہیں کہ میں خوفزدہ تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ حالات جیسے بھی ہوں، وہ مجھ سے محبت کرتا رہے گا اور مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اس وقت جو میں نے دیکھا اس کی وجہ سے کئی سیکنڈ تک سانس نہیں لے سکی۔

میں نے اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ خود بھی بلندی پر چڑھتے وقت کچھ کچھ بیمار لگ رہا تھا اور اضافی بیٹریاں تلاش کرتے وقت وہ اسی طرح گھبراہٹ میں بھول گیا تھا جیسے اسے یہ یاد نہیں رہا کہ ہیلی کاپٹر اس علاقے میں نہیں اتر سکتا۔ اسی طرح وہ دوسرے ٹرانسمیٹر کے بارے میں بھی بھول گیا ہوگا لیکن میرا یقین متزلزل ہو رہا تھا اور میرے لیے اسے بحال رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے آکسیجن...سلنڈر دیکھا۔ ایلس نے اس کی ناپ کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اسے گھما کر دیکھا کہ یہ کام کر رہا ہے یا نہیں لیکن سلنڈر سے گیس خارج نہیں ہوئی۔ گویا سلنڈر خالی تھا۔ میں نے اس کی گنجائش چیک کی اور تھوڑا سا حساب کتاب کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ این کو دی جانے والی گیس کی مقدار اس سلنڈر کی گنجائش کے مقابلے میں بہت کم تھی اور وہ خالی ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر پر میرا یقین اور زیادہ متزلزل ہو گیا۔

میں نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر کا ٹیپ ریکارڈر نکالا جس کے ذریعے اس نے ہمیں پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی تھی۔ نہ جانے کیسے ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں اس ٹیپ ریکارڈر کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور اس کو پلگ ساکٹ میں لگا دیا کیونکہ اس میں سے

بیٹری سیل نکالے جا چکے تھے۔ میں نے پلے کا بٹن دبایا اور پہلی آواز جو میرے کانوں میں آئی، وہ ایک خوفناک چیخ تھی۔ بالکل ویسی ہی جسے سن کر اس رات گھوڑے بھاگ گئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر سے برآمد ہونے والی آوازوں کو سن کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تیندوا کمرے میں ہی موجود ہے۔ واقعی اس ریکارڈر کی کوالٹی بہت عمدہ تھی۔

میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس میں نیس ڈیل کا کوئی قصور نہیں اور یہ کہ وہ آواز واقعی تیندوے کی تھی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ڈاکٹر نے اپنے ٹیپ ریکارڈر میں اس کی آواز بھی محفوظ کر رکھی تھی۔ آخر میں اس کے دواؤں کے بیگ کو کھولا اور مجھے ڈایاموکس کی بوتل مل گئی۔ اس کے علاوہ ایک دوسری بوتل میں بالکل ڈایاموکس جیسے کیپسول موجود تھے۔ اس کے لیبل پر لکھا ہوا تھا...... سیبوکیپ نمبر آٹھ۔ نقلی دوا۔ میں کوئی طبی ماہر نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ نقلی دوا کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک بے ضرر مادہ ہے جو مریض کے اطمینان کے لیے دیا جاتا ہے۔ میں نے ڈایاموکس اور سیبوکیپ کی بوتلوں میں سے ایک کیپسول نکال کر انہیں برابر رکھا۔ وہ دونوں ایک جیسے تھے اور ان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے ڈایاموکس کا کیپسول بوتل میں واپس ڈال دیا اور سیبوکیپ کے کیپسول کو ایک صاف کاغذ میں رکھ کر ڈائننگ روم کی میز پر لائی پھر میں نے اس کیپسول کو توڑا۔ اس میں سے چھوٹے اور رنج رنگ کے ذرات سفید کاغذ پر بکھر گئے۔ میں نے انگلی کی مدد سے انہیں اٹھا کر زبان پر رکھا اور ان کا ذائقہ چکھنے لگی۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں بری طرح خوفزدہ ہوگئی۔ اس کیپسول میں دوا نہیں بلکہ چینی بھری ہوئی تھی۔ اس کے بعد میری نظر اس فہرست پر گئی جو ٹور آپریٹر نے بنائی تھی۔ اس میں این بن اسٹوک سمیت پام لیکو ساؤنڈ برڈنگ سوسائٹی کی تمام خواتین کے نام درج تھے۔ البتہ ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اس میں این کے نام کے گرد نیلے رنگ کے بال پوائنٹ سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا اور اس کے آگے لکھا ہوا تھا۔ ”دماغ کی شریان پھٹنا اور فالج خاندانی امراض ہیں۔“ اسے پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ڈاکٹر کو یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں جبکہ وہ پہلے کبھی این سے نہیں ملا تھا۔

میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہ رہی تھی کہ اب تک جو انکشافات ہوئے، وہ محض اتفاقات بھی ہوسکتے ہیں۔ لہذا میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش جاری رکھی جس سے میرے اندازے غلط ثابت ہوسکیں لیکن اس کے بجائے مجھے نیس ڈیل کے ذاتی بیگ سے ایک ایسا ثبوت مل گیا جس نے میرے شبہات پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

وہ ایک پرانی تصویر تھی جس میں نوجوان ڈاکٹر نیس ڈیل ایک خوب صورت عورت کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ تصویر ایک تیرا کی کے تالاب پر لی گئی تھی اور پیچھے پہاڑیاں اور سبزہ نظر آرہا تھا۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جنوبی کیلی فورنیا میں واقع کوئی جگہ ہے۔ میں نے ہمیشہ ڈاکٹر کو خاموش اور پرسکون دیکھا لیکن اس تصویر میں وہ خاصا پرجوش نظر آرہا تھا۔ اس عورت نے حاملہ ہونے کے باوجود پیراکی کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کی موجودہ حالت کی مناسبت سے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے تصویر پلٹ کر دیکھی۔ اس کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ ”میں اور سات ماہ کی حاملہ ہیزل۔ مقام گلینڈیل!“

اب کچھ دیکھنے اور تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان پر قابو پایا اور اپنا سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔ نیس ڈیل یونیورسٹی میں مصروف تھا اور اس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں ٹیکسی کے ذریعے ائرپورٹ پہنچی اور پہلی دستیاب پرواز سے دوسرے شہر کا ٹکٹ خرید لیا پھر میں نے ڈیپارچر لاؤنج کے پبلک ٹیلی فون سے پولیس کو فون کرکے ڈاکٹر نیس ڈیل کے جرم کے بارے میں بتایا اور کہا کہ انہیں تمام ثبوت اس کے اپارٹمنٹ سے مل جائیں گے جس کا دروازہ میں نے کھلا چھوڑ دیا ہے۔

گوکہ پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد ڈاکٹر نیس ڈیل کو بے قصور قرار دیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ جن ثبوتوں کی میں نے نشان دہی کی ہے، اس کے بعد ڈاکٹر کا بچنا بہت مشکل ہے۔ گوکہ اس نے این کو مارنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے ایک بے داغ اور شفاف منصوبہ بنایا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی مصروفیت کے سبب ان ثبوتوں کو ضائع نہ کرسکا جو اس کے لیے پھندا بن گئے تھے۔ پرواز کی روانگی کا اعلان ہوا۔ میں اطمینان سے چلتی ہوئی جہاز میں سوار ہوئی اور نشست کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا اور میں مطمئن تھی کہ اپنی عزیز دوست کے قاتل کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔



شوق

شاکر لطیف

تغیر موسم کا ہو یا مزاج کا... ہمیشہ حیران کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تو ناقابلِ اعتبار ہی ٹھہرا دیتا ہے۔ اس کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ کے مانند رنگ بدلتا رہتا تھا اور اسی بدلاؤ نے اس چور کے ہنر کو زنگ آلود کر ڈالا... اور اس کے لیے یہ ایک ایسا اونٹ ثابت ہوا جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ ایسے میں اس کے سارے وار بے کار گئے۔

فتح کے قریب جا کر شکست کھانے والے ایک منصوبہ ساز کا قصہ

مارٹن اس وقت پروفیسر تھامسن کے وسیع و عریض بنگلے کا بڑے بھرپور انداز میں جائزہ لے رہا تھا۔ یہ اس کا اس طرف آٹھواں چکر تھا اور حسبِ معمول آج بھی اس کا اندر گھسنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ احتیاط پسندی کا تقاضا تھا کہ کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے وہ ہر پہلو کا اچھی طرح سے جائزہ لے لے۔

پروفیسر تھامسن کے بارے میں اب تک اس نے جو معلومات اکٹھی کی تھیں، ان کے مطابق اسے اس علاقے

میں ایک خبطی اور نیم پاگل شخص کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جسے نت نئے شوق اپنانے کی عجیب وغریب عادت تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے جب بھی کوئی نیا شوق لاحق ہوتا تو اسے اپنے پچھلے شوق سے نفرت ہوجاتی، مثال کے طور پر پروفیسر کو کچھ عرصہ پہلے تک بچے بہت پسند تھے۔ وہ اپنے بنگلے پر بچوں کو مفت میں پڑھایا بھی کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ اس کام کو ناپسند کرنے لگا اور اب کسی بچے کو اس کے بنگلے میں آنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ حسب معمول شوق ختم ہوتے ہی اسے بچوں سے نفرت ہوچکی تھی اور وہ برملا اپنی اس نفرت کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان بچوں نے اس کے بنگلے کا نہ صرف بہت سا قیمتی سامان توڑ ڈالا بلکہ اس کا لان بھی تباہ وبرباد کرڈالا ہے۔

بچوں کے ہاتھوں اپنے لان کی تباہی کے بعد پروفیسر کو باغبانی کا شوق لاحق ہوا اور اس کے لان میں دلفریب اور خوب صورت رنگ برنگے پھول کھلنے لگے مگر اب وہاں موجود کافی پودے سوکھ چکے تھے کیونکہ پروفیسر کو اب باغبانی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ جو تھوڑے بہت پودے اس کے لان میں نظر آتے تھے، وہ بھی اس لیے کہ پروفیسر کا سیکیورٹی گارڈ کبھی کبھی انہیں پانی وغیرہ دے دیتا تھا۔

کچھ عرصے تک پروفیسر کے گھر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ کیونکہ اسے نایاب نسل کے کتے پالنے کا شوق ہوگیا اور اس نے انتہائی اعلیٰ نسل کے کتے اپنے گھر میں رکھنا شروع کردیے تھے مگر اب یہ بات بھی پرانی ہوچکی بلکہ پروفیسر کو کتوں کے بھونکنے کی آواز سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔

مارٹن کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ پروفیسر کو اب حال ہی میں کون سا شوق لاحق ہوا ہے مگر اب تک حاصل ہونے والی معلومات سے اسے اتنا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر لوگ پروفیسر کو خبطی اور پاگل کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مارٹن کی اس بارے میں اپنی رائے یہی تھی کہ پروفیسر کسی نفسیاتی مرض یا ذہنی کج روی کا شکار ہے۔ بہرحال اسے پروفیسر کے اس نفسیاتی مرض سے کوئی سروکار نہیں تھا اسے سروکار تھا تو اس خبر سے کہ پروفیسر تھامسن کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اس بات کا صاف مطلب یہ نکلتا تھا کہ وہ اپنا سارا پیسا اپنے بنگلے میں ہی کہیں رکھتا تھا۔ پروفیسر ایک دولت مند شخص تھا ورنہ وہ اس طرح کے مہنگے شوق کیسے پال سکتا تھا۔

وہ اس شاندار اور وسیع وعریض بنگلے میں اپنے ایک سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ رہتا تھا، اس کی بیوی مرچکی تھی اور کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ دوبارہ شادی بھی نہیں کی تھی وہ تقریباً پچھتر سال کی عمر کا ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس لیے مارٹن کو یقین تھا کہ اگر وہ چوری کے وقت گھر پر موجود بھی ہوا تو اس سے نمٹنا زیادہ مشکل نہ ہوگا مگر مارٹن کی راہ کی اصل رکاوٹ وہ تنومند گارڈ تھا جو بنگلے کے گیٹ پر اس وقت بھی بڑی مستعدی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کرخت اور تنومند جسامت دیکھ کر پہلی ہی نظر میں خوف محسوس ہوتا تھا۔

اگرچہ مارٹن نے موٹے کالر والا کوٹ پہن رکھا تھا مگر اس کے باوجود ٹھنڈ کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔ اس لیے اس نے واپسی کا فیصلہ کیا! اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس بنگلے میں اس سیکیورٹی گارڈ کی نظروں میں آئے بغیر داخل ہونا خاصا مشکل ہوگا۔ اگرچہ بنگلے کے پچھلے حصے کی جانب سے اندر داخل ہوا جاسکتا تھا مگر دیواروں پر خاردار تاروں کی وجہ سے یہ کام خاصا مشکل تھا اور پھر مارٹن کو یقین تھا کہ ان تاروں میں کرنٹ بھی دوڑ رہا ہوگا۔ اس لیے اس نے دیوار کے راستے اندر داخل ہونے کا پلان ترک کردیا تھا کیونکہ اس میں خاصا خطرہ تھا۔ برقی کرنٹ کا ایک ہی جھٹکا کسی بھی انسان کو موت کی نیند سلانے کے لیے کافی تھا لہٰذا اس بنگلے میں سب سے آسان راستہ سامنے کی طرف سے ہی تھا مگر وہاں وہ سیکیورٹی گارڈ موجود تھا۔ اس کے علاوہ بنگلے کے اندرونی دروازوں پر حفاظتی الارم اور دیگر سائنسی شعبدوں سے بھی اس کا سامنا ہوسکتا تھا۔

وہ اس بات کی تسلی کرچکا تھا کہ پروفیسر شام سات بجے سے لے کر رات دس بجے تک گھر میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ وقت وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے ایک مشہور کلب میں گزارتا تھا۔ مارٹن کو یقین تھا کہ پروفیسر کے دوست بھی اسی کی طرح خبطی اور نیم پاگل ہوں گے۔

بہرحال اس نے پروفیسر کے گھر میں داخل ہونے کے لیے یہی وقت طے کیا تھا مگر بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے اسے سیکیورٹی گارڈ سے نمٹنا تھا۔ اس کی جسامت دیکھ کر مارٹن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہوگا کیونکہ وہ اس گارڈ کے مقابلے میں عام سی جسامت کا مالک تھا، اس جسمانی تضاد کے باوجود اسے اس سیکیورٹی گارڈ کو اس طرح بے ہوش کرکے بنگلے کے اندر گھسیٹ کرلے جانا تھا کہ آس پاس کسی کو پتا نہ چلے۔ بظاہر یہ ایک مشکل کام نظر آرہا تھا مگر مارٹن نے وہاں کی صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد اس سڑک پر کوئی بھی نظر نہ آتا تھا

کیونکہ ٹھنڈ کی شدت میں خاصا اضافہ ہو جاتا تھا اور پھر دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھ پانا بھی ممکن نہیں رہتا تھا۔ ایسے وقت اِکا دُکا گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں۔

مارٹن نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ پروفیسر کا سیکیورٹی گارڈ خاص طور پر کسی کی طرف اسی وقت متوجہ ہوتا تھا جب کوئی پروفیسر کے بنگلے کے بالکل سامنے چلا جاتا۔ سڑک پر گزرنے والے افراد کی طرف وہ کم ہی توجہ دیتا تھا۔ مارٹن پچھلے کافی دنوں سے اس جگہ آرہا تھا مگر اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ اس سیکیورٹی گارڈ نے اس کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔ ایک تو وہ بنگلے کے قریب جانے کے بجائے دور سے اس کا جائزہ لیتا رہا تھا اور دوسرے لمبے کالر والے کوٹ میں ایک سائڈ سے اس کا چہرہ نظر آنا ناممکن تھا۔

مارٹن یہ بات بھی چیک کر چکا تھا کہ مین گیٹ کی چابی اس گارڈ کے پاس ہی ہوتی ہے۔ شدید ٹھنڈ کے باوجود وہ ایک دفعہ پروفیسر کی واپسی تک یہاں رکا رہا تھا۔ پروفیسر، مین گیٹ پر اپنی گاڑی سے نیچے نہیں اترا تھا جس سے مارٹن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یا تو مین گیٹ کی چابی سیکیورٹی گارڈ کے پاس ہوتی ہے یا پھر گیٹ لاک ہی نہیں ہوتا۔

وہ اب اپنے فلیٹ میں واپس پہنچ چکا تھا۔ اسے واپس آنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی پروفیسر کے گھر سے تقریباً دو کلومیٹر دور کھڑی کی تھی اور پھر پیدل وہاں تک گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس کے علم میں یہ بات آئے کہ پروفیسر کے گھر واردات ہونے سے ایک دو دن پہلے اس کی گاڑی آس پاس موجود تھی۔ وہ ایک پیشہ ور چور تھا اور پولیس کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ موجود تھا۔

اس نے اپنے کام کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اگلی رات منتخب کر لی تھی کیونکہ اب مزید دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس کے پاس موجود رقم ختم ہو چکی تھی اور اب کوئی بڑا ہاتھ مارنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ چوری کرنا ہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ پچھلے دس سال سے وہ یہی کام کر رہا تھا اور کئی دفعہ پکڑے جانے کی وجہ سے جیل کی ہوا بھی کھا چکا تھا تاہم اس نے اپنے ماضی کی غلطیوں کو دہرانے کے بجائے ہمیشہ ان سے سبق سیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پچھلے تین سالوں میں وہ قانون کی گرفت سے محفوظ رہا تھا۔ وہ اب پچاس سال کا ہو چکا تھا اور اچھی طرح سے جانتا تھا کہ آنے والے وقتوں میں اس کام کو مزید جاری رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہے گا۔ وہ اس آنے والے وقت سے دل ہی دل میں خوفزدہ تھا جب وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جائے گا اور اپنی گزر بسر کرنے کے لیے یا تو اسے بھیک مانگنا پڑے گی یا پھر بڑھاپے کے باوجود محنت و مشقت کرنا پڑے گی۔

اس لیے اب وہ کوئی بڑا ہاتھ مارنا چاہتا تھا جس میں اتنی رقم اس کے ہاتھ لگ جائے کہ اسے باقی عمر کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ پروفیسر کے بارے میں جاننے کے بعد اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ اس کی مراد بر آئی ہو اور ہو سکتا ہے یہ اس کی آخری واردات ثابت ہو کیونکہ پروفیسر کے گھر سے اتنی رقم اس کے ہاتھ لگ جانے کی امید تھی کہ پھر باقی زندگی کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

سوچتے سوچتے اسے نیند آنے لگی۔ نہ جانے کیوں آج وہ سخت اعصابی دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ آج سے پہلے اسے چوری کی واردات کا کوئی بھی پلان بناتے ہوئے کبھی پریشانی محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اس بار اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ جال میں پھنستا جا رہا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ پروفیسر کو اب کون سا شوق لاحق ہوا ہے۔ اس سنکی آدمی کے شوق بدلتے رہتے تھے۔ بہرحال اب جو بھی ہوتا اس نے کل پروفیسر کے گھر میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کل وہ حسب معمول سات بجے کلب روانہ ہو جائے گا اور پھر دس بجے سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی اتنا وقت مارٹن کے لیے کافی تھا۔ پروفیسر کا بنگلا بھی دوسرے گھروں سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ اگلی صبح وہ اٹھا تو اس کا سر خاصا بھاری ہو رہا تھا، شاید اعصابی دباؤ کی وجہ سے رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ اس نے سر درد کی گولی کھائی اور پھر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

وہ غیر شادی شدہ تھا اور اس فلیٹ میں تنہا رہتا تھا کیونکہ وہ پہلے بھی قانون کی گرفت میں آچکا تھا، اس لیے اب وہ بہت زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ اس کا نام پولیس ریکارڈ میں موجود تھا۔ اس لیے اس کے پاس اب غلطی کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں دوبارہ جیل کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اب اپنے کام کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے رات کا انتظار تھا۔ اس نے آج تک کسی بھی واردات میں پستول کا استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ ایک پیشہ ور چور تھا، کوئی ڈاکو نہیں اور اس وجہ سے اسے عدالت سے بھی رعایت مل جاتی تھی۔ اسے کبھی زیادہ لمبی سزا نہیں ہوئی تھی۔

تقریباً سات بجے کے قریب وہ اپنے فلیٹ سے روانہ ہو گیا کیونکہ پروفیسر کے گھر تک پہنچنے میں بھی خاصا وقت لگ جاتا تھا۔

حسب معمول اس نے گاڑی کافی دور کھڑی کی، اس

کی یہ کھٹارا کار بہت پرانے ماڈل کی تھی اور مارٹن جانتا تھا کہ یہ زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ اسے بہرحال کچھ عرصے بعد کسی کباڑ خانے کی نذر ہو جانا تھا۔

اس کے کوٹ کی جیب میں اس کا تمام مطلوبہ سامان موجود تھا۔ اس کے پاس ربڑ کے دستانے اور چہرے پر پہننے والا ماسک بھی موجود تھا۔ پولیس کے پاس اس کے فنگر پرنٹس کا ریکارڈ تھا اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ واردات کے وقت اس گھر میں اس کی انگلیوں کے نشانات محفوظ رہ جائیں۔ چہرے کا ماسک پروفیسر کے گھر میں کسی متوقع کیمرے سے بچنے کے لیے ضروری تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کو بے ہوش کرنے کے لیے اس کے پاس کلوروفارم کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی موجود تھی۔ اسے اب اچانک اور غیر متوقع طور پر اس گارڈ کے سر پر پہنچ کر اسے بے ہوش کرنا تھا۔ اگرچہ مارٹن ایسا اس کے سر پر کوئی آہنی چیز مار کر بھی کرسکتا تھا مگر اس نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس کی تو کوشش ہوتی تھی کہ کسی سے سامنا ہی نہ ہو اس لیے کسی جگہ جاتے ہوئے پہلے وہ اس بات کی پوری تسلی کرلیتا تھا۔

تاہم اس سیکیورٹی گارڈ کی کڑیل جسامت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ دھند کی وجہ سے آس پاس کچھ نظر نہیں آئے گا اس لیے وہ اس گارڈ کو کسی کی نظروں میں آئے بغیر بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس کے بعد اس کو وہیں سڑک کے پاس تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ مارٹن کو اس کے جسم کو گھسیٹ کر بنگلے کے اندر لے کر بھی جانا تھا اور یہ خاصا مشقت طلب کام تھا۔ اس بھاری بھر کم عفریت کو گھسیٹنا آسان نہیں تھا۔ سب سے اہم بات یہی تھی کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر... ایسا کرنے میں کامیاب رہے۔

اس نے اپنا مطلوبہ سامان کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ پہلے بھی وہ ایک گھر میں چوری کرتے ہوئے اسی وجہ سے پکڑا گیا تھا کہ وہاں کا حفاظتی الارم بج اٹھا تھا۔ اس لیے جیل سے واپس آکر اس نے اپنی اگلی وارداتوں میں ان حفاظتی الارمز کو ناکارہ کرنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے رومال کو کلوروفارم سے اچھی طرح تر کیا اور اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ چہرے پر پہننے والا ماسک اور ربڑ کے دستانے اس نے علیحدہ سے جیب میں ڈال رکھے تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے رومال پر لگے کلوروفارم کا اثر اس کے ماسک پر بھی آجائے اور وہ اسے پہنتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ اس کے بعد وہ گاڑی سے باہر نکل کر پروفیسر کے بنگلے کی جانب روانہ ہو گیا کیونکہ اس نے اپنی کار پروفیسر کے بنگلے سے کافی دور کھڑی کی تھی اس لیے اسے وہاں تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ دھند اور سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اب وہ بنگلے کے قریب پہنچ گیا تھا مگر پہلے اس نے اس بات کی تصدیق کرنا تھی کہ پروفیسر آج کلب گیا ہے یا نہیں۔ ویسے تو اسے یقین تھا کہ وہ جا چکا ہوگا مگر پھر بھی تصدیق کرلینا ضروری تھا۔ وہ ایک قریبی ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا۔ سکے ڈالنے کے بعد اس نے اس مشہور کلب کا نمبر ڈائل کر دیا۔ یہ نمبر اس نے آج صبح ہی حاصل کیا تھا۔

''ہیلو.....'' چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ آواز نسوانی تھی۔

''ہیلو، میرا نام رچرڈ ہے۔'' مارٹن نے اپنا فرضی تعارف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ٹی وی چینل کی طرف سے پروفیسر تھامسن کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آپ کے کلب میں ہوتے ہیں۔ کیا آپ میری ان سے دو منٹ کے لیے بات کرواسکتی ہیں؟''

''پروفیسر تھامسن اس وقت کلب میں موجود تو ہیں لیکن میں آپ کی ان سے بات نہیں کرواسکتی۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ ''ہم اپنے کلب کے ممبر کو کسی ایمرجنسی کے علاوہ ڈسٹرب نہیں کرتے۔ بہتر ہے کہ آپ ان سے ان کے گھر پر ملیں۔'' یہ کہتے ہوئے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا جبکہ مارٹن نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ اسے کون سی پروفیسر سے بات کرنی تھی۔ اسے تو بس یہ کنفرم کرنا تھا کہ پروفیسر گھر پر موجود نہیں ہے۔

وہ فون بوتھ سے باہر نکلا اور اس کے بنگلے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اب بالکل بنگلے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر ہلکی سی حیرت ہوئی کہ شدید سردی کے باوجود بنگلے کا سیکیورٹی گارڈ ابھی تک اپنے کیبن میں نہیں گھسا تھا۔ مارٹن نے آس پاس کا جائزہ لیا اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ یہ مناسب موقع تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا، تیزی سے کرنا تھا کیونکہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو اس کا سارا پلان ہی فیل ہو جاتا۔ وہ سیکیورٹی گارڈ بھی کسی اور طرف متوجہ تھا۔ مارٹن نے پھرتی سے اپنے چہرے پر ماسک پہنا، ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے چڑھائے، کلوروفارم سے تر کیا ہوا رومال ہاتھ میں لیا اور پھر دبے پاؤں چلتا ہوا اس سیکیورٹی گارڈ کی پشت پر پہنچ گیا جو ابھی تک اپنے پیچھے کسی کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اب

مارٹن کو جو بھی کرنا تھا، فوری کرنا تھا کیونکہ اگر وہ سیکیورٹی گارڈ پلٹ کر اسے دیکھ لیتا اور مزاحمت پر اتر آتا تو مارٹن کے لیے اس گرانڈیل کو قابو کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اب اس کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس دوران اس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اس کے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔

اس نے ایک نظر اس سیکیورٹی گارڈ کی چوڑی جسامت پر ڈالی اور پھر اچھل کر اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ اس نے کلوروفارم سے تر کیا ہوا رومال مضبوطی سے گارڈ کے منہ پر جما دیا۔ اس ناگہانی افتاد پر گارڈ کے منہ سے غوں غاں کی گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہوئیں اور اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگانا شروع کر دیا۔ مارٹن کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے لیے اس گارڈ کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا، لحہ بھر کے لیے اسے ایسا لگا جیسے وہ جسیم اور تنومند انسان اسے اپنی پشت سے اچھال کر پھینک دے گا مگر پھر اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور اس کے دونوں ہاتھ بے تابانہ انداز میں فضا میں گردش کرنے لگے۔ شاید وہ اپنا بگڑتا ہوا توازن سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مارٹن نے اس سیکیورٹی گارڈ کی جسامت کے پیشِ نظر وافر مقدار میں کلوروفارم اس رومال پر انڈیل رکھا تھا۔ اس سیال کے زود اثر بخارات نے گارڈ کے ذہن اور اعصاب پر تیزی سے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ تیورا کر کسی بے جان لاش کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مارٹن نے خود کو بڑی مشکل سے اس کے گرتے ہوئے بدن کی زد میں آنے سے بچایا۔

سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا تھا اس دوران مارٹن اپنے آس پاس سے بھی غافل نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی تک اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اگرچہ دھند اب خاصی گہری ہو چکی تھی مگر بنگلے کے گیٹ پر کنکریٹ کے دونوں ستونوں پر موجود لائٹس روشن ہونے کی وجہ سے اس بات کا یقینی خطرہ تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں آجاتا۔ اس نے پھرتی سے گارڈ کی تلاشی لی اور چند لمحوں میں اس کی جیب سے گیٹ کی چابی برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے فوراً گیٹ کھولا اور سیکیورٹی گارڈ کے وزنی وجود کو گھسیٹ کر بنگلے کے اندر لے آیا۔ گیٹ بند کرتے ہی اس کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ اس واردات کے سب سے مشکل مرحلے سے گزر چکا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کے بھاری بھرکم وجود کو گھسیٹ کر اندر لانے میں اسے دانتوں پسینا آگیا تھا۔ اسے اب اس سیکیورٹی گارڈ سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ زود اثر کلوروفارم کی وجہ سے وہ اب تین بجے چار گھنٹے تک بے ہوش رہے گا۔ کچھ دیر تک اپنی بے ترتیب سانسوں کو اعتدال پر لانے کے بعد اس نے بنگلے کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا۔ ویسے تو وہ پہلے ہی پروفیسر کی کلب میں موجودگی کی تصدیق کرچکا تھا مگر پھر بھی تسلی ضروری تھی بادی النظر میں بنگلا خالی ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی بند روشنیاں مارٹن کے اندازے کو مزید تقویت دے رہی تھیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک پروفیسر تھامسن کو کتے پالنے کا شوق لاحق ہوا تھا۔ اگر اس کا یہ شوق اب بھی برقرار ہوتا تو مارٹن کو بنگلے کے وسیع وعریض صحن میں ہی لینے کے دینے پڑ سکتے تھے مگر یہ بات باعثِ غنیمت تھی کہ پروفیسر کا وہ شوق ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ اگر وہاں کوئی کتا ہوتا تو گیٹ کے آس پاس ہی ہوتا۔ پچھلے چند ثانیوں میں وہاں جو غیر معمولی واقعات رونما ہوئے تھے، وہ کسی بھی واچ ڈاگ کو ادھر متوجہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

مارٹن آگے بڑھ گیا اب اسے اندر داخل ہوکر پروفیسر کے بیڈروم تک پہنچنا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کو اس نے گیٹ کے پاس ہی پڑا رہنے دیا۔ جب تک کوئی گیٹ کے اوپر سے اندر جھانک کر نہ دیکھتا، وہ اسے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

مارٹن بنگلے کے چاروں اطراف کا جائزہ لینے کے بعد ایک سائڈ پر موجود کھڑکیوں کے پاس رک گیا۔ پروفیسر کے اعتماد یا بے احتیاطی کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی کھڑکی مضبوطی سے بولٹ نہیں کی گئی تھی۔ پہلی کھڑکی کی لکڑیاں پھول کر چوکھٹ میں پھنسی ہوئی تھیں۔ تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد وہ کھل گئی۔ ویسے اگر یہ کھڑکی بولٹ بھی ہوتی تو مارٹن کی جیب میں اسے کھولنے کے لیے ضروری سامان موجود تھا کیونکہ وہ ایک پیشہ ور چور تھا، اس لیے ایسے کاموں میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ پروفیسر کے گھر میں موجود کسی بھی متوقع سائنسی شعبدے سے بچنے کا پورا پورا بندوبست کرکے آیا تھا تاہم ابھی تک سب کچھ آسانی سے ہی ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس معاملے میں قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

اس نے چوکھٹ پر ہاتھ ڈالا اور آرام سے اندر کود گیا۔ اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑا تھا۔ شاید یہ کمرا ڈرائنگ روم یا برآمدے سے متصل تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا تا کہ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ اس نے کمرے کی بتی جلانے سے گریز کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ مناسب نہ تھا۔ بنگلے کے اندر جلتی ہوئی لائٹ کا کافی دور سے بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس نے کمرے کا اندرونی دروازہ کھول دیا۔ اب وہ ایک راہداری میں کھڑا تھا۔ ویسے تو اسے یقین تھا کہ وہاں کوئی نہیں مگر پھر بھی وہ اندر کی سن گن لیتا رہا۔ ہر طرف مکمل سکوت کا راج تھا۔

اسے اب پروفیسر کا بیڈروم تلاش کرنا تھا۔ اس کے پاس اب بھی خاصا وقت تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فوری طور پر اس سیکیورٹی گارڈ کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی پروفیسر کی جلدی آمد متوقع تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سے ٹارچ نکال کر روشن کی اور کمروں کو چیک کرنا شروع کردیا۔ چھت پر جانا اس نے ضروری نہ سمجھا کیونکہ ٹارچ کی روشنی میں اسے زینے کی دیواروں سے لے کر چھت تک مکڑیوں کے تنے ہوئے جالے صاف نظر آگئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے کافی عرصے سے چھت کا رخ نہیں کیا تھا۔

ایک کمرے کے سوا تمام کمرے کھلے ہوئے تھے۔ مارٹن کو یقین تھا کہ یہی بند کمرا پروفیسر کا بیڈروم ہے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے لاک کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی کیونکہ اس نے چیک کرلیا تھا کہ اگر وہ اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا تو کمرے میں موجود حفاظتی الارم خاصی زوردار آواز میں بج اٹھتا۔ پروفیسر کے گھر میں یہ پہلا سائنسی شعبدہ تھا جس سے اس کا سامنا ہوا تھا تاہم اس کے لیے اس سے نمٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

اس نے اپنی جیب سے ایک مخصوص طرز کا کٹر نکالا اور کچھ ہی دیر میں الارم کی تار کاٹ کر اسے ناکارہ بنا دیا۔

اس کے بعد اس نے لاک کھولنے کی کوشش شروع کردی اور تقریباً دس منٹ میں وہ دروازہ کھولنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔

آخر کار وہ پروفیسر کے بیڈروم میں داخل ہو ہی گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں کسی خفیہ سیف میں خاصی بھاری رقم موجود ہوگی۔

کمرے میں خاصا قیمتی سامان موجود تھا تاہم اس کی ترتیب کی وجہ سے سلیقہ مندی کا فقدان بھی نظر آرہا تھا۔ یہاں روشنی قدرے زیادہ تھی کیونکہ کمرے میں نیلی روشنی والا ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس لیے مارٹن کو ٹارچ کی روشنی ڈالے بغیر سب کچھ نظر آرہا تھا سامنے موجود بیڈ پر کتابیں پڑی تھیں مگر مارٹن کو وہاں کسی قسم کا سیف نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے کمرے کی بڑے بھرپور طریقے سے تلاشی لینی شروع کردی اور پھر اس کی نظریں سامنے موجود دیوار پر

پروفیسر کی بڑی سی فریم شدہ تصویر پر ٹنگ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر تصویر کو ہٹایا تو اس کا شبہ حقیقت کا روپ دھار گیا۔ تصویر کے پیچھے ایک بڑا سا آہنی سیف موجود تھا جسے باقاعدہ دیوار میں فٹ کروایا گیا تھا۔ پروفیسر نے اپنا مال محفوظ کرنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ بظاہر اس فریم شدہ تصویر کو دیکھ کر اس بات کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی آہنی تجوری موجود ہو سکتی ہے مگر مارٹن چونکہ ایک پیشہ ور چور تھا اس لیے وہ اس طرح کے لوگوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے تو ایسی ایسی جگہوں سے بھی پیسے ڈھونڈ نکالے تھے جہاں عام طور پر کسی کا تصور بھی نہ جا سکتا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر تجوری کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

وہ جیسے جیسے سیف کا جائزہ لیتا گیا اس کے بشرے پر مایوسی کے آثار گہرے ہوتے چلے گئے۔ یہ قدیم طرز کا ایک پرانا اور مضبوط سیف تھا۔ اسے بڑی مہارت سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا۔ مارٹن جانتا تھا کہ اس کی چابی بھی عام چابیوں سے بڑی اور مختلف ہوتی ہے اب تو اس طرح کی تجوریوں کا رواج ہی ختم ہو چکا تھا اور جدید نمبروں والے سیف آ چکے تھے۔

مارٹن کے لیے اصل مسئلہ اس کا قدیم ہونا نہیں تھا بلکہ اس کی پریشانی کا باعث یہ بات بھی کہ وہ جانتا تھا کہ اس قدیم طرز کے سیف کو چابی کے بغیر کھولنا انتہائی مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن ہی تھا۔ اس سنکی پروفیسر نے ایک دفعہ پھر اسے مشکل میں ڈال دیا تھا ورنہ اس کا خیال تھا کہ اس واردات کا سب سے کٹھن مرحلہ اس سیکیورٹی گارڈ کو قابو کرنا ہی ہو سکتا تھا مگر اب اس تجوری کو دیکھنے کے بعد اسے اپنی ساری محنت رائگاں جاتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اگر پروفیسر اپنے معمول کے مطابق واپس آتا تو اس کی آمد میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس تجوری کو تو ویسے بھی نہیں کھولا جا سکتا تھا اور اتنے قلیل وقت میں تو بالکل بھی نہیں۔

مارٹن کو ایک ہی طریقہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اس سیکیورٹی گارڈ کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر ایک سائڈ پر کر دے تاکہ پروفیسر آ کر گیٹ سے جھانک کر اندر دیکھے تو وہ اسے نظر نہ آئے۔

اس کے بعد کلوروفارم پروفیسر پر بھی آزمایا جا سکتا تھا اور پھر آسانی سے اس کی جیب سے تجوری کی چابی حاصل کی

نہلے پہ دہلا

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ ایک تانگا بان اپنے تانگے پر ویران روڈ سے گزر رہا تھا۔ اچانک چھن چھن کی آواز آئی پھر ایک دم ایک خوب صورت عورت تانگے کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو زیورات سے لدی پھندی کھڑی تھی۔ زرق برق لباس اس حسینہ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ عورت کو دیکھ کر تانگے والے نے اس عورت سے پوچھا۔ ”بی بی کون ہو؟ کہاں جانا چاہتی ہو؟“

وہ عورت بولی۔ ”میں چڑیل ہوں۔ تمہیں کچا چبا کے کھانا چاہتی ہوں۔“

تانگے والا بولا۔ ”یہاں سے بھاگ جاؤ اے حسینہ مہ جبینہ! ورنہ پچھتاؤ گی۔“

وہ چڑیل بولی۔ ”تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟“

تانگے والا بولا۔ ”میں جواری ہوں، اپنی بیوی جوئے میں ہار کے آ رہا ہوں۔ یہ نہ ہو، تمہیں بھی جوئے میں ہار جاؤں۔“ چڑیل یہ سنتے ہی وہاں سے غائب ہو گئی۔

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

نمک پارے

لیڈر کے تقریر کرتے وقت اگر مجمع سو جائے تو لیڈر کو ان کو جگانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

تنخواہ میں اضافے کا اعلان!

☆☆☆

سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے پیچھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوتا ہے۔ اس سے منچلے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ گاڑی کتنی پرانی ہے۔ نئی گاڑیوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے.....دیکھ چکوری کی چال! جو ذرا پرانی ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے لکھا ہوتا ہے.....میرے پیچھے پیچھے آنا! اور جو بے چاری ذرا زیادہ پرانی ہوتی ہے اس کے پیچھے لکھا ہوتا ہے.....نہ چھیڑ ملنگاں نوں!

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

لطیفہ

سردار نے امرود لیے تو اس میں سے کیڑا نکلا۔

سردار دکاندار سے۔ ”اس میں کیڑا نکلا ہے۔“

دکاندار۔ ”سردار صاحب! یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کیا پتا اگلی بار موٹر سائیکل نکلے۔“

سردار۔ ”پانچ کلو اور دے دو۔“

مرسلہ۔ محمد شہباز ناز، سرگودھا

جاسکتی تھی۔
مگر اس میں خطرہ بھی تھا کیونکہ اگر پروفیسر تھامسن کو گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ کو نہ دیکھ کر کسی گڑبڑ کا احساس ہو جاتا تو وہ پولیس کو بھی بلاسکتا تھا۔ مارٹن اس طرح کا رسک لینے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا پروفیسر کی آمد سے پہلے ہی کرنا تھا مگر سامنے موجود تجوری دیکھ کر اسے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جدید نمبروں والے سیف کھولنے کا ماہر تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا پڑ گیا تھا۔ اس پاگل پروفیسر کی عادتیں اور شوق عجیب تھے۔ اب اس دور میں اس طرح کا قدیم سیف رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ خاموشی سے کھڑا اپنے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ پروفیسر چابی ہر وقت اپنے پاس ہی رکھتا ہو، یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اس نے سیف کی چابی کمرے کے اندر ہی کہیں رکھی ہو اگر واقعی ایسا تھا تو اسے تلاش کیا جاسکتا تھا۔ امید کی کرن جاگتے ہی اس نے نئے سرے سے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی، اس بار وہ بڑی باریک بینی سے ہر جگہ کو چیک کر رہا تھا اور پھر اس کی نظریں تجوری کے بالکل پاس رکھے ہوئے چینی کے ایک لمبے اور صراحی نما گلدان پر آکر ٹھہر گئیں اگر انسانی نفسیات کو مدنظر رکھا جاتا تو پروفیسر کے پاس تجوری کو بند کر کے فوری طور پر چابی چھپانے کے لیے اس گلدان سے بہتر کوئی چیز نہ تھی۔

تاہم یہ مارٹن کا صرف اندازہ ہی تھا۔ ضروری نہیں کہ حقیقتاً بھی ایسا ہی ہوتا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس گلدان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ خاصا پرانا تھا۔ شاید پروفیسر کو پرانی چیزیں جمع کرنے کا بھی شوق رہا تھا۔ چینی کے اس گلدان پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دھندلے پڑ چکے تھے۔ اس گلدان کی صراحی نما گردن بالکل سیدھی نہ تھی۔ مارٹن کا خیال تھا کہ شاید ایسا نیچے گرنے کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ گلدان کے اوپر پھول کے ڈیزائن کا ایک چھوٹا سا ڈھکن بھی موجود تھا جس میں چھوٹے چھوٹے باریک سوراخ موجود تھے۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سوراخ کسی ڈرل مشین سے کیے گئے ہوں تاہم ایسا کیوں کیا گیا تھا، اس کی کوئی وجہ مارٹن کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔

اس نے ڈھکن ایک طرف ہٹایا اور ٹارچ کی روشنی میں گلدان کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا مگر اس صراحی نما چینی کے گلدان کی گردن ٹیڑھی ہونے کی وجہ سے ٹارچ کی روشنی پیندے تک نہ جاسکی۔ اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا۔ پیندے تک پہنچنے کے لیے اس کا سارا بازو اندر چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ چابی وہاں موجود ہوگی اور پھر اس کا ہاتھ اچانک کسی چیز سے ٹکرایا۔

☆☆☆

سارجنٹ رابرٹ اس وقت اپنے ماتحتوں کے ہمراہ پروفیسر تھامسن کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرے کی صورت حال دیکھ کر سارجنٹ رابرٹ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں بھرپور طریقے سے تلاشی لی گئی ہے۔ ایک طرف صوفے پر پروفیسر تھامسن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے ہلکی سی پریشانی مترشح تھی۔

اسی لمحے سارجنٹ رابرٹ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے فون کان سے لگالیا۔ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر پروفیسر تھامسن کی طرف متوجہ ہوا۔

''اسپتال میں آپ کے سیکیورٹی گارڈ کو ہوش آگیا ہے۔ اب اس کا بیان لیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہاں کی صورت حال سے مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ یہاں کیا ہوا ہوگا۔''

''یہ اچھا ہوا کہ اسے ہوش آگیا ہے۔'' پروفیسر تھامسن نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا بہت پرانا ملازم تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔''

پروفیسر جب کلب سے واپس آیا تو سیکیورٹی گارڈ کو گیٹ پر نہ دیکھ کر حیران ہوا پھر اس نے سوچا کہ شاید قریبی مارکیٹ تک گیا ہوگا۔ وہ سگریٹ نوشی کا عادی تھا اس لیے کبھی کبھی رات کے وقت بھی سگریٹ خریدنے کے لیے مارکیٹ تک چلا جاتا تھا مگر جب کافی دیر تک وہ .... نہ آیا تو پروفیسر کو کچھ تشویش لاحق ہوئی اس نے گاڑی سے نیچے اتر کر گیٹ کے اوپر سے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے گارڈ زمین پر پڑا ہوا نظر آگیا جس پر اس نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دی جس کے نتیجے میں سارجنٹ رابرٹ اپنے ماتحتوں سمیت موقع واردات پر موجود تھا۔ مین گیٹ اندر سے بند تھا۔ اس لیے سارجنٹ کے ایک ماتحت نے گیٹ پھلانگ کر اسے کھولا تھا۔

''آپ کو یہ نیا شوق کب سے لاحق ہوا پروفیسر تھامسن....؟'' سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ کے شوق بدلتے رہتے ہیں۔'' سارجنٹ رابرٹ کیونکہ کافی عرصے سے اس علاقے

میں تعینات تھا اس لیے وہ پروفیسر تھامسن کے بارے میں جانتا تھا۔ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی کہ اس علاقے کے رہائشی، پروفیسر کو ایک نیم پاگل اور خبطی شخص سمجھتے ہیں۔

"یہ میرا اپنا شوق ہے سارجنٹ!" پروفیسر تھامسن نے ایسے لہجے میں کہا جیسے سارجنٹ نے اس کا پسندیدہ ترین موضوع چھیڑ دیا ہو۔ "میں نے اس سلسلے میں اپنے کلب میں آنے والے سانپوں کے ایک ماہر سے تقریباً ایک ماہ تک تربیتی لیکچر بھی لیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ انتہائی قیمتی اور زہریلے سانپ خرید کر لاؤں گا۔ یہ زہریلا سانپ تو میں ابتدائی طور پر خرید کر لایا تھا فوری طور پر میرے پاس اسے رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اسے اس گلدان کے اندر ہی رکھ دیا اور ہوا کے انعکاس کے لیے ڈرل مشین کے ذریعے اس کے ڈھکن میں سوراخ بھی کر دیے۔ میرا خیال تھا کہ ایک دو دن تک مزید سانپ خرید کر لاؤں گا تو انہیں رکھنے کا کوئی باقاعدہ بندوبست کروں گا۔ یہ اس قدر زہریلا سانپ ہے کہ اس کے کاٹنے سے ایک منٹ کے اندر اندر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں خود بھی اسے ہاتھ لگانے کے لیے چمڑے کے مخصوص اور موٹے دستانے پہنتا ہوں۔ اگرچہ اس چور نے بھی ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے پہن رکھے تھے مگر وہ بہت باریک تھے اس لیے سانپ کے کاٹنے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ بہرحال مجھے اس شخص کی موت پر افسوس ہے۔"

پروفیسر نے سامنے موجود مارٹن کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جسے اب سارجنٹ کے ماتحت اٹھانے کا بندوبست کر رہے تھے۔ لاش کے چہرے پر موجود ماسک اور ہاتھوں میں پہنے ربڑ کے دستانے پہلے ہی اتار لیے گئے تھے۔ زہر کے اثر سے مارٹن کا چہرہ نیلا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مرتے وقت اس نے کافی تکلیف برداشت کی ہو۔ اس کے مرتے وقت کے آخری تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔

"ویسے میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے سارجنٹ سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ اس چور نے اس سیف پر زور آزمائی کی کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ اسے اندازہ ہو جاتا کہ اس کا لاک خراب ہے اور یہ آسانی سے کھل جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی زور آزمائی کرتا تو آسانی سے اچھی خاصی رقم کا مالک بن سکتا تھا۔"



محفلِ شعروسخن

❁ وزیر محمد خان......بٹل ہزارہ
کہتی ہے میری قبر پہ رو رو کے محبت
یوں خاک میں ملتے ہوئے ارمان نہیں دیکھے

❁ رانا بشیر احمد ایاز......احسان پور، ضلع رحیم یارخان
میں لوگوں سے ملاقاتوں کے لمحے یاد رکھتا ہوں
میں باتیں بھول بھی جاؤں تو لہجے یاد رکھتا ہوں
میں یوں تو بھول جاتا ہوں خراشیں تلخ باتوں کی
مگر جو زخم گہرے دیں وہ رویے یاد رکھتا ہوں

❁ وسیم اکرم......مہر شاہ، خانیوال
یادِ یار کا موسم اور سرد ہوا کا عالم
اے دل تیار ہوجا دسمبر آنے والا ہے

❁ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
بس ایک شعلہ جلا دوں کسی صداقت کا
زمانہ آپ ہی صدیوں تلک ہوا دے گا

❁ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
ایک صبح کہ ویراں ہے گزرگاہ خیال
ایک وہ صبح، جہاں بال سنورتے ہوں گے

❁ عبدالجبار روی انصاری......چوہنگ، لاہور
تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے
شاخوں پہ چٹکتے ہوئے غنچوں کو مبارک
اس زلفِ پریشان سے کچھ بھول ہوئی ہے

❁ محمد شہباز اکرم توئی......پاک پتن شریف
کوئے محبوب میں ہوگا کہیں مصروفِ طواف دلنشین
دل اگر سینے میں ہوتا تو دھڑکتا ہوتا

❁ دانش عمیر......کراچی
پتھر ہو کہیں تم تو کہیں خار بہت ہو
جس روپ میں ہو باعثِ آزار بہت ہو
غیروں کا بھی غم رکھتے ہو تم دل میں ہمیشہ
کہنے کو تو تم میرے وفادار بہت ہو

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
وعدہ کیا تھا آئیں گے رات خواب میں
مارے خوشی کے نیند نہ آئے تو کیا کریں

❁ مدحت......کراچی
تم نے اندازِ محبت تو دیکھا ہے اندازِ وفا نہیں
پنجرہ کھلنے کے باوجود کچھ پنچھی اڑا نہیں کرتے

❁ محمد جاوید بے وفا......تحصیل علی پور
جانے کی اجازت تو دیے دیتے ہیں لیکن
راستے میں کہیں آتے ہوئے شام نہ کرنا

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
وقت کا طوفاں شاید ہم کو ساحل پہ لے جائے
لیکن اس پل جان بچانا مشکل لگتا ہے
اپنی کہانی اپنی زبانی خود سے کہتے رہتے ہیں
دکھ اپنے غیروں کو سنانا مشکل لگتا ہے

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
ہر لفظ کتابوں میں تیرا عکس لیے ہے
اک پھول سا چہرہ مجھے پڑھنے نہیں دیتا

❁ عالیہ خان.....سیالکوٹ
تم کہہ رہے ہو خواہشیں، میں کہہ رہی ہوں بندشیں
تم کہہ رہے ہو خواب ہیں، میں کہہ رہی ہوں سازشیں
مجھ کو عزیز اپنی انا، ہے زعم تم کو حسن پر
میں جانتی ہوں پیار میں کیوں بڑھ رہی ہیں رنجشیں

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
خوف میں ہو رہی ہے بسر زندگی
آج دشوار ہے کس قدر زندگی
بے خطا چھین لے کون کب کس جگہ
آج کتنی ہے نامعتبر زندگی

❁ ذوالفقار احمد.....لاہور
اکثر ساون رت میں بادل گھر گھر کر تو آئے بہت
لیکن بوند نہ برسا پائے مستی میں اترائے بہت
کھیل تماشا سمجھے تھے وہ میرے سارے جذبوں کو
دیکھی عشق کی جب گہرائی، آخر میں گھبرائے بہت

❁ مرجا گل، رمنا گل.....درابن کلاں
صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

❁ ملائکہ حریم.....اوکاڑہ
بکھروں گا ایک بار تو نہ آسکوں گا ہاتھ
اے دوست احتیاط سے ٹھوکر لگا مجھے

❁ آصف علی.....سکھر
بارود برستا ہو جہاں روز زمیں پر
اُس دیس میں پھولوں کے زمانے نہیں آتے
جس دیس میں ہوں نوحہ کناں گلشن وصحرا
پنچھی وہاں آزادی کے نغمے نہیں گاتے

❁ اشفاق شاہین.....لاہور
تمہیں بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں
جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے!

❁ محمد خواجہ.....کورنگی، کراچی
وجہِ رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کردے کہیں غربت میری

❁ جاوید صدیقی.....ٹنڈوالہیار
نکل آئیں نہ گھبرا کر کہیں ہم اپنی تربت سے
سنا ہے فاتحہ کے واسطے وہ آنے والے ہیں

❁ محمد طلحہ.....ملتان
رقابتوں کے شہر میں عداوتوں کا دور ہے
دھواں دھواں ہوئے بدن قیامتوں کا دور ہے
ہے ابر کیوں تنا ہوا کہ بستیاں تو بہہ چکیں
کہ گر چکی ہیں بجلیاں، یہ ہجرتوں کا دور ہے

❁ صائمہ غزل.....فیصل آباد
انسانوں کی بستی میں کچھ ایسے ہیں دیوانے لوگ
اللہ کے نائب بن بیٹھے پر انساں کو نہ جانے لوگ
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں ہر اک دامن چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

❁ عمران علی.....مانسہرہ
مصروف زندگی میں یہ سوچتے ہیں اکثر
فرصت ملے تو چل کر روٹھے ہوئے منائیں
یہ کہہ رہی ہے کونپل موسم بھی ہیں بدلتے
آؤ نا ہم بھی مل کر اجڑا نگر بسائیں

❁ بلقیس خان.....واہ کینٹ
یہ سال بھی پچھلے کئی برسوں کی طرح ہے
اس سال بھی ہر سانس گراں بار بہت ہے

❁ خواجہ نعیم جاوید.....بھلوال
ہم مان چکے ہیں دل سے یہ بات بھی
ہم دل سے جسے چاہیں وہ اپنا نہیں رہتا

❁ رعنا رضوی.....یو کے
ذرا رک جا نہ اٹھ اے دل مسیحاؤں کی محفل سے
جہاں زخموں کی بخشش ہو وہاں مرہم بھی ملتے ہیں

❁ سید عرفان علی.....راولپنڈی
بے نام اداسی میں دیکھے ہیں کئی چہرے
ہر چہرہ حقیقت میں پُردرد کہانی ہے
موسم کے تغیر نے تقدیر سے پوچھا ہے
ان خانہ بدوشوں نے کیوں کوچ کی ٹھانی ہے

❁ محمد آئی کے سی مدہوش.....لسبیلہ، بلوچستان
عشق جن کا صادق ہو، وہ کہاں فریاد کرتے ہیں
زباں خاموش رہتی ہے دلوں سے یاد کرتے ہیں

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... ڈاہرانوالہ
قاضیِ شہر نے کیا حکم سنایا لوگو
شاہ مجرم ہے اسے پابندِ سلاسل کردو

❄ محمد کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
شال پہنائے گا اب کون دسمبر میں تمہیں
بارشوں میں کبھی بھیگو گے تو یاد آؤں گا

❄ چودھری احمد علی...... جودھپور، کبیر والہ
نہ جانے کیوں ساتھ اپنا، فقط اک موڑ تک کا تھا
ابھی جینا ہی سیکھا تھا، حکم آیا کہ مرجاؤ

❄ احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف بائی پاس
مجھے بھی سکھا دو بھول جانے کا ہنر
مجھ سے راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا نہیں جاتا

❄ آمنہ رشید سیال...... شاہ فیصل کالونی، کراچی
میری انگلی پکڑ لینا مجھے تنہا نہ کرنا
یہ دنیا ایک میلا ہے تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں

❄ جبران احمد ملک...... گلشن اقبال، کراچی
نہیں خبر مجھے اے دوست زندگی کیا ہے
جو پوچھنا ہے تو پوچھو کہ بندگی کیا ہے

❄ جہانزیب...... کوئٹہ
کہاں کے عشق ومحبت کدھر کا ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

❄ سرفراز احمد...... پشاور
میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
اجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ ہوا کر
حالات کی قبروں کے کتبے بھی پڑھا کر

❄ محبوب مصور سومرو...... لاڑکانہ
کس قدر کرتی تھی وہ محبت مجھ سے
اس وقت کا قصہ اب نہ پوچھو دوستو

❄ زرین آفریدی...... حیدرآباد
میری منزلیں بھی عجیب تھیں میرا یقین بھی تھا کمال پر
کبھی سب کچھ ملا بنا طلب، کبھی کچھ نہ ملا سوال پر

❄ بینش صدیقی...... حیدرآباد
نہ جانے اگلی گھڑی کیا سے کیا میں بن جاؤں
ابھی تو چاک پہ ہوں...... دست کوزہ گر میں ہوں

❄ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
بہت سے لب پر شکوے ہیں، اجازت ہو اگر ان کی
بہت کچھ ان سے کہنا ہے اگر ان تک رسائی ہو

❄ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
تم کو دل کے اجڑنے کا کیا احساس
تم تو کبھی گزرے ہی نہیں ویرانے سے

❄ قاضی عرفان احمد، ماسٹر جمیل انور...... آرہ چوا سیدن شاہ
ریزہ ریزہ کرکے بکھیر دیتی ہے
بے پروا لوگوں سے بے پناہ محبت

❄ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
تمہیں تو آرزو تھی میرا حال بد سے بدتر ہو
وہ دن آیا تو اب کیوں کہہ دیا دیکھا نہیں جاتا

❄ مہتاب احمد...... حیدرآباد
کیوں وقت بدل جانے کی امید رکھوں میں
جب وقت ہی حالات کو الجھائے بہت ہے

❄ مدثر علی...... سیالکوٹ
ساون آیا گرجے بادل جاگ اٹھے ارمان
سیج سجا کے یہ آشا ہے آئے گا مہمان

❄ احمد علی...... ملتان
تخت وتاج کی بازی میں کب جیت ہوئی غم خواروں کی
یہ کھیل بھی ہے زرداروں کا، یہ بازی ہے سرداروں کی

❄ آریز ملک...... کراچی
ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

کوپن برائے شمارہ جنوری 2017

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

مشغل

منظر امام

دنیا سے جانے والے تو چلے ہی جاتے ہیں مگر رخصت کرنے والوں کی آنکھوں میں جو بے بسی اور بے کسی رنگ جماتی ہے اس سے کوئی بھی ایک قدم اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ چاہے جانے والے خوابوں میں پلٹنا بھی چاہیں تو آنسوئوں کی دھند ان کا ہر منظر دھندلا دیتی ہے۔

آنسوؤں کی برسات میں دیا جلانے والی ایک بچی کی التجا



اندازہ بھی نہیں تھا کہ میری گڑیا اس طرح چلی جائے گی۔

میں ایک باپ ہوں۔ ایک اچھی خوب صورت سی زندگی ہمارے پاس تھی۔ میں نے بانو سے محبت کی شادی کی تھی۔ یہ محبت کی شادی بھی کیسے کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔

اس کے دو ہی پہلو ہوا کرتے ہیں، یا تو ایسی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں جو کہ اکثر ہو جاتی ہیں یا پھر بہت کامیاب رہتی ہیں۔

تو ہماری شادی بہت کامیاب رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ خدا نے ڈھیر ساری خوشیاں ہمارے دامن میں ڈال دی تھیں۔

شادی کے دوسرے سال ہمارے یہاں ایک پیاری سی بچی ہوئی تھی۔ ہم نے اس کا نام علیشا رکھا تھا اور پیار سے اسے گڑیا کہتے تھے۔ وہ تھی بھی گڑیا ہی جیسی۔ نرم و نازک اور خوب صورت۔ جو بھی دیکھتا اس پر فدا ہو جاتا۔ اس کو پیار

کرنے لگتا جبکہ میرا یہ حال تھا کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ گڑیا میرے لیے سب کچھ تھی۔

میرے موبائل میں اس کی تصویر تھی۔ دفتر میں بھی اسے دیکھتا رہتا۔ گھر آتا تو بس اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا کہ اس کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

بانو بھی مذاق میں کہا کرتی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجنوں نے بھی لیلیٰ سے اتنی محبت نہیں کی ہوگی جتنی آپ گڑیا سے کرتے ہیں۔''

''ارے مجنوں میرے سامنے کیا بیچتا ہے۔'' میں جواب دیتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے ہر ماں باپ کے ایسے ہی تجربے ہوتے ہوں گے۔ اولاد کو پروان پاتے دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کا ہنسنا مسکرانا، پھر اس کا باتیں کرنا سیکھنا، اس کا چلنا، اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں۔ یہ سب ان کے دلوں میں اتر جاتی ہوں گی۔

تین سال کے بعد ایک بیٹا شہزاد پیدا ہوا۔ وہ بھی گڑیا ہی کی طرح خوب صورت تھا۔ خدا نے اب ہمارا خاندان تقریباً مکمل کر کے سب کچھ دے دیا تھا۔ اپنا گھر، گاڑی، اچھا ہم سفر، اچھی ملازمت، پیار کرنے والے پیارے پیارے بچے۔ گڑیا اب اسکول بھی جانے لگی تھی۔ اسکول گھر کے قریب ہی تھا۔

بانو اسے اپنے ساتھ لے جاتی اور واپس لاتی۔ اس بارے میں میرا نظریہ یہ تھا کہ اگر کوئی اسکول گھر کے قریب ہو تو بچے کو وہیں داخل کرائیں۔ اسے دور نہ بھیجیں۔ حالات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔

ایک شام جب میں گھر واپس آیا تو بانو بہت پریشان بیٹھی تھی۔ گڑیا اس کے سامنے کھیل رہی تھی۔ شہزاد کمرے میں سویا ہوا تھا۔

''کیا ہوا، خیریت تو ہے نا؟'' میں نے بانو سے پوچھا۔

''آج ایک عجیب بات ہوئی ہے۔'' بانو نے بتایا۔ ''میں تو اس وقت سے اسی طرح پریشان بیٹھی ہوئی ہوں۔''

''کیسی بات، خدا خیر کرے۔'' میں بانو کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ گڑیا آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ جو لوگ صاحب اولاد ہیں اور درد بھرا دل بھی رکھتے ہیں، انہیں اس کیفیت کا اندازہ ہوگا کہ جب بچے آ کر لپٹتے ہیں تو کچھ دیر کے لیے ساری پریشانیاں ہوا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ گڑیا کچھ دیر تک میرے ساتھ کھیلتی رہی پھر اپنے کھلونوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ہاں بانو، اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آج جب گڑیا کو اسکول سے واپس لا رہی تھی تو ایک عجیب سا شخص ہمارے راستے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔''

''عجیب سا شخص سے کیا مراد ہے، کیا اس کے سینگ نکلے ہوئے تھے؟''

''او ہو، سن تو لیں۔ وہ کچھ مجذوب یا ملنگ قسم کا آدمی تھا۔'' بانو نے بتایا۔ ''اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں میں اتنا جلال تھا کہ میں آنکھ بھر کر اسے دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں گڑیا کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اس سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ میں نے چاہا کہ میں گڑیا کا ہاتھ تھام کر تیزی سے آگے نکل جاؤں لیکن اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔''

''اوہ۔'' اب تو میں بھی سیریس ہو گیا تھا۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔ بانو کے چہرے سے ابھی تک خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا کہا تھا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بچی جس کی امانت ہے، وہ اسے واپس لینا چاہتا ہے۔ اس کی کچھ دنوں تک اور خدمت کر لے اور یاد رکھ، یہی بچی تم دونوں کے لیے نجات کا سبب بنے گی۔ جا، اب لے جا اس کو۔ اس کی خدمت کر۔ بس اور کچھ نہیں کہنا۔''

''کیا... کیا بکواس ہے۔'' میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ ''اور کیا کہا تھا اس نے؟''

''بس اتنا کہہ کر وہ ایک طرف چل دیا تھا۔'' بانو نے بتایا۔ ''میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ خدا جانے وہ کون تھا، اس نے ایسی بات کیوں کہہ دی تھی؟''

''صدقہ دو اس کا۔'' میں نے کہا۔ ''اور دل میں کوئی بات نہ لاؤ۔ اس قسم کے لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ اس پر پڑھ کر پھونکتی رہا کرو، کچھ نہیں ہوگا۔''

بانو اچانک رونے لگی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''ساجد! بتاؤ میری گڑیا کو تو کچھ نہیں ہوگا نا؟''

''ارے بابا، کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ویسے تمہاری تسلی اور اطمینان کے لیے میں اپنے دوست منیر سے بات کرتا ہوں۔''

''منیر اس معاملے میں کیا کر لیں گے؟''

''منیر تو کچھ نہیں کریں گے لیکن ان کے مرشد ایک ولی اللہ ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''ہم گڑیا کو ان کے پاس لے جائیں گے۔ وہ اس کے حق میں دعا کر دیں گے۔ خدا نے چاہا تو یہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔''

''ہاں، جلدی چلے جائیں، میں تو دن بھر روتی رہی ہوں۔'' بانو نے کہا۔

"آج نہیں، کل جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کل منیر کے دفتر چلا جاؤں گا۔"

بانو تو خیر پریشان تھی ہی لیکن بانو سے کہیں زیادہ خود میں پریشان ہو گیا تھا۔ گڑیا میری جان تھی۔ زندگی تھی میری۔ اگر اس کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو پھر میرا کیا ہوتا۔ میں کہاں کا رہتا۔

ساری رات خدا جانے کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاید خواب میں رویا بھی تھا۔ نہ جانے ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔

بانو نے مجھے جگا دیا تھا۔ "ارے کیا ہوا ہے آپ کو؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تو بالکل ٹھیک ہوں، کیا ہوا ہے مجھے؟"

"آپ خواب میں رو رہے تھے۔ کیا دیکھ لیا تھا خواب میں، کیا گڑیا کے لیے سوچتے رہے تھے؟"

"ارے نہیں یار۔" میں جلدی سے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہوگا۔ چلو سو جاؤ، خدا خیر کرے گا۔"

دوسرے دن میں منیر کے دفتر پہنچ گیا.... وہ مجھے اتنی جلدی اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کیونکہ میں عام طور پر اس کے پاس لنچ کے وقت جاتا اور پھر دونوں مل کر کہیں لنچ کر لیا کرتے تھے۔

"یار، میں آج تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں بتاؤ، کیا کام ہے؟"

"تم مجھے اپنے مرشد کے پاس لے چلو۔" میں نے کہا۔

"مرشد کے پاس...... صفی اللہ صاحب کے پاس؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، ان ہی کے پاس۔"

"خیریت تو ہے، میرے مرشد سویرے سویرے کیسے یاد آ گئے؟"

"یار، گڑیا کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"خدا خیر کرے، اپنی بچی کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" پھر میں نے اسے بتا دیا کہ بانو جب اسے اسکول سے لے کر آ رہی تھی تو کیا ہوا تھا۔

"ارے، یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس قسم کے ملنگ لوگ پریشان کرنے کے لیے اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔" منیر نے کہا۔ "ویسے تمہاری تسلی کے لیے چلو مرشد کے پاس بھی چلتے ہیں۔ کئی دنوں سے ان کی طرف جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا ہے۔"

منیر کے مرشد واقعی ایک درویش کامل اور عالم تھے۔ اللہ والوں کو دیکھتے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ اللہ کی خاص رحمتیں ہوں گی۔ کیا نورانی چہرہ تھا ان کا۔ کیا جلالی آنکھیں تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مزاج میں بے انتہا انکساری تھی۔ بہت خلوص اور گرم جوشی سے ملے تھے۔ حالانکہ میں ان سے پہلی بار ملا تھا۔ ذکر تو بہت سن چکا تھا۔

"حضرت! یہ میرے دوست ہیں۔" منیر نے میرا تعارف کروایا۔ "یہ اپنا ایک چھوٹا سا مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔"

"جی فرمائیں۔" صفی اللہ صاحب نے میری طرف دیکھا۔

"حضرت! پتا نہیں، یہ کوئی مسئلہ ہے بھی یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "بہرحال قصہ کچھ یوں ہے۔" میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"ہوں۔" انہوں نے ایک ہنکاری لی۔ "مسئلہ تو ہے لیکن ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ لوگ نہ جانے کیوں وقت سے پہلے بہت کچھ بول جاتے ہیں۔ وہ احتیاط بھی نہیں کر سکتے۔ خیر، آپ ایسا کریں، اس بچی کو کسی دن میرے پاس لے آئیں۔"

اب میرا ماتھا ٹھنک اٹھا تھا۔ "کیا یہ کوئی ایسی ہی بات ہے حضرت کہ تشویش ہو جائے؟"

"ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔" انہوں نے کہا۔ "ویسے خدا سے دعا کرتے رہیں۔ اس بچی کو کچھ نہیں ہوگا۔"

گھر جا کر میں نے بانو کو صرف اتنا بتایا کہ منیر صاحب کے مرشد نے گڑیا کو دم کرنے کے لیے بلایا ہے۔

"ضرور لے جائیے۔" بانو جلدی سے بولی۔ "اللہ والوں کی نظر کرم سے بھی بہت کچھ بدل جاتا ہے۔"

تین چار دنوں تک مجھے ٹائم نہیں مل سکا۔ دفتر کی کچھ ایسی مصروفیات نکل آئی تھیں۔ ایک شام منیر کا فون آ گیا۔

"ارے بھائی، کیا ہو گیا...... تم ابھی تک بچی کو کیوں نہیں لے گئے؟"

"یار، فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔"

"فرصت نکال کر لے جاؤ، مرشد یاد فرما رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے، کل ہی لے جاؤں گا۔"

میں دوسری شام گڑیا کو صفی اللہ صاحب کے پاس لے

گیا۔ وہ گڑیا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن میں نے اس دوران جو بات نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ وہ کچھ پریشان بھی تھے پھر انہوں نے کاغذ نکال کر کچھ حساب کتاب بھی کرنا شروع کر دیا جو ظاہر ہے میری سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے میری طرف دیکھ کر ایک عجیب سی بات کی۔ ”خدا جانے کچھ لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی راز چھپایا کیوں نہیں جاتا، شاید ان کا ظرف ہی نہیں ہوتا۔“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا حضرت۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔“ وہ اس طرح چونک پڑے جیسے نیند سے بیدار ہوگئے ہوں۔ ”کچھ نہیں، میں تم سے نہیں کہہ رہا تھا۔ میں پڑھ کر دم کر رہا ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

خدا جانے اس وقت مجھے ایسا کیوں لگا جیسے وہ مجھے جھوٹی تسلی دے رہے ہوں۔ ان کے لہجے کا کھوکھلا پن مجھ سے چھپا نہیں رہ سکا تھا پھر وہ جملہ کہ کچھ لوگوں میں ظرف نہیں ہوتا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کس کے لیے یہ بات کہی گئی تھی؟

کہیں اس مجذوب کے لیے تو نہیں؟ جو بانو کو راستے میں ملا تھا اور جس نے کہا تھا کہ یہ بچی جس کی امانت ہے، وہ اسے واپس لینا چاہتا ہے، اس کی خدمت کرو۔

شاید صفی اللہ صاحب کا اشارہ اسی مجذوب کی طرف ہو گا جس نے گڑیا کو دیکھتے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ گڑیا موت کے منہ میں جانے والی ہے۔ صفی اللہ صاحب نے اسی کے لیے کہا ہوگا کہ اس کا اتنا ظرف ہی نہیں تھا۔ اگر یہ بات اسے معلوم بھی ہو گئی تھی تو اظہار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

نہ جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے خیالات آرہے تھے اور میرا دل ڈوبتا جارہا تھا۔ صفی اللہ صاحب گڑیا پر دم کر رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ان کا کیا حاصل ہوگا۔

گڑیا بالکل خاموش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے کہاں اور کیوں لایا گیا ہے۔ بابا اتنے پریشان کیوں ہیں، وغیرہ۔

صفی اللہ صاحب نے کچھ دیر بعد اپنا دم ختم کیا اور اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی گرفت ایسی تھی جیسے وہ دوستانہ انداز میں مجھے تسلیاں دے رہے ہوں، کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن کہہ نہیں پا رہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”جائیں، لے جائیں بچی کو اور اس کی ماں سے کہیں کہ وہ اس کے لیے دعائیں کرتی رہے۔ ماں کی دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“

میں نے گھر آکر بانو کو کچھ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے یہ سب بتانے والی بات بھی نہیں تھی۔ ورنہ نہ جانے اس کے دل کی کیا کیفیت ہو جاتی۔ البتہ میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ گڑیا پر دم کرتی رہا کرے۔

ایک مہینا گزر گیا۔ گڑیا نے پھر سے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اپنے پرانے انداز میں لوٹ آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ خواب تھا۔ جو کچھ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ جو لکھ دیا جاتا ہے، وہ اٹل ہوتا ہے۔ چاہے اس کو ٹالنے کی لاکھ کوششیں کی جائیں۔ ہوتا وہی ہے جو مقدر میں ہوتا ہے۔

ایک رات گڑیا کو تیز بخار چڑھ گیا۔

ہم تو اس کی طرف سے فکر مند ہی رہتے تھے۔ اس کی صحت کی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھا کرتے۔ اس رات جب اسے اچانک تیز بخار ہوا تو ہم ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اسے لے کر اسپتال پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ دماغی بخار ہے اور کیفیت شدید ہے۔ اس کو اسپتال میں رکھنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ گڑیا کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔

ہم دونوں کا بہت برا حال تھا۔ رہ رہ کر اس مجذوب اور صفی اللہ صاحب کی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ کیا واقعی ایسا ہو جائے گا؟ کیا ہماری گڑیا، ہماری جان ہم سے الگ ہو جائے گی؟

دو دنوں تک سخت بخار کے عالم میں گڑیا کو ہوش نہیں آسکا تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے میرے اور بانو کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔

بہت مہنگا علاج تھا اس کا لیکن جب زندگی داؤ پر لگی ہو تو پھر ایسی باتوں کی پروا کون کرتا ہے۔ انسان کے بس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

گڑیا ہم سے رخصت ہو گئی۔

ڈاکٹرز کی کوششیں اور ہماری دعائیں اسے بچانے میں ناکام رہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کس دل اور جگر کے ساتھ میں نے اس پھول کو مٹی میں دبایا ہوگا۔ کتنے لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ انہوں نے کیا کیا کہا ہوگا، کچھ ہوش نہیں تھا۔

ہم تو صرف روتے ہی رہتے تھے۔ آنسوؤں کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتے، دلاسے دیتے اور رونے لگتے۔

عزیز رشتے دار، دوست، پڑوسی آتے اور ہمیں صبر کی

تلقین کر کے چلے جاتے۔ میرے دوست منیر کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی آتا، مجھ سے ملتا اور میری اور بانو کی حالت پر افسوس کر کے چلا جاتا۔

میرا خیال ہے کہ جس کے گھر میں بھی کوئی موت ہوتی ہے تو آہستہ آہستہ گھر کے حالات نارمل ہو ہی جاتے ہیں کیونکہ یہی قانونِ قدرت ہے لیکن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو رہا تھا۔

جانے کہاں سے ہم دونوں نے اپنی آنکھوں میں سمندر بھر لیے تھے۔ پانی خشک ہونے یا رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

ایک دن منیر نے آ کر کہا۔ ''تمہیں حضرت نے یاد کیا ہے، وہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''یہ میں نہیں جانتا لیکن کوئی ضروری بات ہو گی۔ کیونکہ بہت بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے فون کر کے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر فوراً آ پہنچوں۔''

بانو نے کہا۔ ''جائیں، ہو سکتا ہے وہ کوئی خاص دعا بتانا چاہتے ہوں۔''

منیر مجھے لے کر صفی اللہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ نہ جانے کیوں بھڑک سے گئے۔ ''کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں میاں بیوی اپنی بچی کے دشمن کیوں ہو گئے ہو؟ کیا چاہتے ہو کہ وہ اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی رہے..... اس کو راستہ نہ ملے؟''

''حضرت! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں کئی دنوں سے تمہاری بچی کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔

''خواب میں دیکھ رہے ہیں؟''

''ہاں اور جانتے ہو کیا دیکھ رہا ہوں؟''

''نہیں حضرت! آپ ہی بتائیں۔''

''یہ خواب مجھے کئی دنوں سے آ رہا ہے۔ آج مجبور ہو کر تمہیں بلایا ہے۔'' صفی اللہ صاحب نے کہا۔ ''وہ خواب یہ ہے کہ ایک بہت بڑا میدان ہے۔ سامنے ایک بہت بڑا پہاڑ ہے۔ پہاڑ کے دوسری طرف کا منظر تو خواب میں دکھایا نہیں گیا لیکن اتنا ضرور احساس ہے کہ پہاڑ کی دوسری طرف کوئی بہت خوب صورت جگہ ہے۔ کوئی پُرسکون مقام۔ اس میدان میں سیکڑوں کی تعداد میں بچے اور بچیاں جمع ہیں۔ ان سبھوں کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل ہے جس کی روشنی میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کے دوسری طرف جانے کے لیے بہت سی سرنگیں ہیں۔ وہ بچے اور بچیاں مشعل کی روشنی کے سہارے اندھیری سرنگ سے گزر کر دوسری طرف پہنچ رہے ہیں لیکن......''

صفی اللہ صاحب چپ ہو گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ صفی اللہ صاحب کیا کہنا چاہتے تھے۔

''حضرت! کیا میری گڑیا بھی دکھائی دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ بھی تھی۔ بہت خوب صورت لباس پہنے ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک مشعل تھی لیکن بجھی ہوئی۔''

''بجھی ہوئی مشعل؟''

''ہاں، وہ بے چاری بار بار سرنگ سے گزر کر دوسری طرف جانا چاہتی ہے لیکن اندھیرے سے ڈر کر واپس آ جاتی ہے۔''

''جی حضرت! میری گڑیا کو اندھیروں سے بہت ڈر لگتا تھا۔'' میں پھر رونے لگا۔

''آگے بھی تو سنو، کیا ہوا۔''

''جی حضرت، فرمائیں۔''

''میں اس میدان میں راستہ بناتا ہوا تمہاری بچی کے پاس پہنچ گیا، میں نے پوچھا۔ بیٹا! تم اپنی مشعل کیوں نہیں جلاتی ہو تاکہ اندھیرے سے گزر سکو..... تو معلوم ہے اس نے کیا جواب دیا؟''

''نہیں حضرت۔''

''اس نے جواب دیا کہ میں یہ مشعل جلاتی تو ہوں لیکن امی اور بابا کے آنسو اسے بار بار بجھا دیتے ہیں۔ جب تک ان کے آنسو اسے بجھاتے رہیں گے، میں یہ سرنگ پار نہیں کر سکوں گی۔''

پھر اچانک جیسے کسی نے میرے دل کو باندھ دیا ہو، میرے آنسو رک گئے۔ میں اپنی گڑیا کو اندھیرے میں بھٹکتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس کی مشعل کو روشن ہونا تھا تاکہ وہ اندھیری سرنگ پار کر کے روشنیوں اور مسرتوں کی وادی میں پہنچ سکے اور اس کی مشعل کو جلانے کا صرف ایک طریقہ تھا جو مجھے صفی اللہ صاحب نے بتا دیا تھا۔ یعنی صبر..... صرف صبر۔

ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسا کوئی خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی اب نارمل ہو گئے ہیں۔

صفی اللہ صاحب نے بڑی حکمت سے کام لیتے ہوئے ہمیں سمجھا دیا ہے۔ راستہ دکھا دیا ہے۔ وہ راستہ جو صبر کا ہے اور جس راستے کی تلقین ہمارے مذہب نے بھی کی ہے۔

محی الدین نواب

سینتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چھپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت واحترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی مٹھاس جلن، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر و اور چاچی ختی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ ان کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، بربادکر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منشی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا آ کبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کوبوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ TMET قیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر میجی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قابو کر کے اس کی سرجری کروا دی اور ایک انجکشن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ مرینہ اور مراد میں بحران بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرا لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ورگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مرادی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوا لیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہمزاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک

حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغواکاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کرگئی۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کوبوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ حماد کے پیچھے شائستہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرادیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ائیرپورٹ پر شائستہ پر حملہ ہوا، عابی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کرکے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان تون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ ان تون نے یہ جھوٹا بیان دیا کہ ماریہ کو اس نے ہلاک کیا ہے۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دین اسلام کی طرف مائل ہوکر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہوکے غائب ہوجاتی تھی۔ نیلماں نے عابی کی مدد کرکے ان تون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ باردوا اسے عابی کے شکنجے سے نکال کرلے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے پھانس کر مراد سے نکاح کرلیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگہی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سامنے آگئی۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہونا بھول گئی تھی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کردیا۔ مراد دھوکا کھا گیا۔ وہ لاوارث بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر اس کی پرورش کرنے لگا۔ اسی کو حقیقت کا علم تھا مگر اس نے رضائے الٰہی سے یہ بات عیاں نہیں کی۔ عابی نے ریسلر کا روپ دھار کر ٹیلی پیتھی جاننے والوں باردوا اور ایبی مالا کو ہلاک کیا۔ یہودیوں نے پھر چال چلی اور عابی کا ہم شکل بنا کر اسے ٹی وی چینل کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ہم شکل اعلان کر رہا تھا کہ اس کی ماں سے ملتی جلتی عورتوں کی مدد کرے گا۔ لاکھوں ڈالرز دے گا۔ آئندہ دیکھنا تھا کہ ۔ ۔ ۔ کیا ہونے والا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کیا ہونے والا ہے، یہ مراد اور عابی کی سمجھ میں بھی آنے والا نہیں تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ ”بابا جانی! دشمن یہ کیا تماشا کر رہے ہیں؟ میری ماما کو اور میرے جذبات کو منظر عام پر کیوں لا رہے ہیں؟“

مراد نے کہا۔ ”فی الوقت میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا ہے۔ دشمن تو کیچڑ اچھالتے ہیں لیکن یہ لوگ ممتا کے پھول برسا رہے ہیں۔ تمہاری ماما کی ہم شکل عورتوں کی توعید ہونے والی ہے۔“

”میں کئی پہلوؤں سے سوچ رہا ہوں۔ کسی بھی پہلو سے مجھے نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ میری واہ واہ ہوگی۔ میری طرف سے وہ دشمن لاکھوں کروڑوں ڈالرز ماما کی ہم شکل کو دیں گے۔ وہ اتنی بڑی رقومات کیوں ضائع کریں گے؟“

مراد نے سپر پاور کے اعلیٰ حکام سے فون پر پوچھا۔ ”یہ کیا چالیں چلی جارہی ہیں؟ یہ جعلی پرنس عابی کون ہے؟ اسے تم نے یا یہودی اکابرین نے یا پھر ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے پیدا کیا ہے؟ ارادہ بتاؤ۔ کیا کرنے والے ہو؟“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے' وہ پرنس عابی اصلی ہے یا جعلی؟ تم کہہ رہے ہو تو جعلی ہوگا۔ ہم معلوم کریں گے کہ یہ کھیل کون کھیل رہا ہے؟“

مراد نے جن زبان سے بھی پوچھا۔ ”تم لوگوں نے یہ جعلی پرنس عابی کیوں پیش کیا ہے؟ ارادے کیا ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس عابی نے جینی کی ہم شکل عورتوں سے رابطے کے لیے فون نمبر دیے ہیں۔ آپ ان نمبروں پر کال کریں۔ اس سے براہ راست پوچھیں کہ وہ کون ہے اور اچانک کہاں سے پیدا ہوگیا ہے؟“

تمام دشمن ٹال رہے تھے۔ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے وہ نہ سمجھ میں آنے والا گیم شروع کیا ہے۔ مراد نے جعلی عابی کے بتائے ہوئے نمبروں میں سے

ایک پر رابطہ کیا پھر اس کے سیکریٹری سے کہا۔ ''میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ اس فراڈ پرنس عابی سے بات کراؤ۔''

ادھر سے جواب ملا۔ ''میں ہی پرنس عابی ہوں۔ میں ہی اپنا پرسنل سیکریٹری ہوں۔ کیسے بابا جانی ہو اپنے بیٹے کو بیٹا تسلیم نہیں کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے نہ کرو۔ آئندہ مجھے کال نہ کرنا۔ یہ فون نمبرز میری ماما کی ہم شکل خواتین کے لیے ہیں۔''

ادھر سے فون بند کر دیا گیا۔ عابی نے کہا۔ ''بابا جانی! فی الحال یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ دشمن مجھے ڈھونڈ نہیں پائے۔ اب مجھے ڈھونڈنے کے لیے ماما کی ہم شکل خواتین کو میرے پیچھے لگا رہے ہیں۔ وہ خواتین اس سے ملنے کی یعنی مجھ سے ملنے کی ضد کریں گی۔ چینل کے ذریعے کہا جائے گا کہ جب مام کی ہم شکل سے ایسا دلی لگاؤ ہے تو مجھے ان کے روبرو آکر ملنا چاہیے اور اپنی ماں کے چہرے کو چومنا چاہیے۔''

''بیٹے! وہ ایسا سوچ کر یہ چال چل رہے ہیں تو بہت کمزور چال ہے۔ تم لوگوں کے اصرار کرنے کے باوجود اپنی ماں کی کسی ہم شکل سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ ان کی یہ چال ناکام رہے گی۔ بہرحال نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ یہ وقت دعا کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔''

وہ باپ بیٹے ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھے لیکن نماز کے وقت ایک ہی سمت قبلہ رو ہو گئے۔

☆☆☆

ماروی دن رات کا زیادہ سے زیادہ وقت درس گاہ نورانی میں گزارتی تھی۔ وہاں مستقل طلبہ و طالبات کے لیے ایک کمرے اور دو کمروں کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ وہ اپنے بھائی وارث علی منگی کے ساتھ ایسے ہی ایک کوارٹر میں رہتی تھی۔

وارث دو برس کا ہو چکا تھا۔ ماروی کی آغوش میں اس کے سائے میں کلام الٰہی سنتا رہتا تھا۔ ماروی کی ذہانت اور سنجیدگی رفتہ رفتہ اس میں منتقل ہو رہی تھی۔ وہ بہت ذہین تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ عابی اور ماروی کی طرح اس کی ذہانت اور حاضر دماغی بھی بے مثال ہوگی۔

وہاں مختلف تعلیم و تربیت کے شعبے تھے۔ وارث وقت کے اور اپنی عمر کے ساتھ کئی شعبوں سے، کئی تعمیری مراحل سے گزرنے والا تھا۔ اس کے برعکس مراد کا اپنا بیٹا دانش تاریک دنیا کے ایسے ماحول میں تھا جہاں انسانی نہیں شیطانی تعلیم و تربیت تھی۔ ماروی دن میں ایک بار ضرور اس کے پاس آتی تھی لیکن اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

وہ اس کی آوازیں سنتا تھا اور لارا سے کہتا تھا۔ ''مام! وہ بولنے والی کبھی نظر آتی ہے، ابھی نظر نہیں آرہی ہے؟''

لارا اور کاہن وغیرہ تشویش میں مبتلا تھے۔ عین عبادت کے وقت جب وہ معبد میں شیطان کے روبرو ہوتے تھے تب دانش کاہن کے پیچھے اپنی ماں سے لگا رہتا تھا۔ ماں اسے طاغوتی دعائیں پڑھاتی تھی۔ ایسے وقت ماروی اس کے اندر کلام پاک کی کوئی ہدایت اسے سناتی تھی اور سمجھاتی تھی۔ وہ لارا سے بولتا تھا۔ ''مام! ادھر تم بول رہی ہو۔ ادھر وہ بول رہی ہے۔''

لارا خیال خوانی کے ذریعے بیٹے کے دماغ میں آتی تھی لیکن ماروی کی آواز اسے سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ کاہن سے کہتی تھی۔ ''ہم خیال خوانی کرنے والے دماغ سے ابھرنے والی آوازیں بھی سن لیتے ہیں اور بے آواز سوچ کی لہروں کو بھی پڑھ لیتے ہیں لیکن دانش کے دماغ میں نہ کسی کی آواز ہے نہ کوئی سوچ کی لہریں ہیں۔ یہ روحانیت کا کیا جادو ہے؟ ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔ اس کا توڑ کرنا چاہیے۔''

کاہن نے کہا۔ ''میں نے برسوں پہلے پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہماری تاریک دنیا میں بیرونی دنیا کا کوئی فرد کبھی نہیں آسکے گا۔ صرف ایک ہستی آئے گی اور کسی اہم معاملے میں ہمارے لیے دردِ سر بنتی رہے گی۔ ہم سب نے دیکھا تھا۔ مراد کی بیٹی ماروی پیدا ہوتے ہی یہاں آگئی تھی۔ تاریکی میں ہماری طرح اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بھی اندھیرے میں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کی آمد نے سمجھا دیا ہے کہ وہ بھی غائب ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جب نیلاں زندہ تھی، تب وہ آیا کرتی تھی لیکن ہمیں نظر نہیں آتی تھی۔ آج بھی اس وقت بھی دانش کے اندر موجود ہے یا اس کے پاس بیٹھی ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آرہی ہے۔ میں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ ایک اہم معاملے میں ہمارے لیے دردِ سر بنتی رہے گی اور وہ اہم معاملہ ہے' دانش کی یہاں موجودگی...... اس کا باپ نہیں جانتا لیکن وہ جانتی ہے کہ اصل بیٹا یہاں ہے۔ یہ اپنے بھائی کے پاس آتی رہتی ہے۔ ہم سے کچھ بولتی نہیں ہے۔ ہمیں چیلنج نہیں کرتی ہے۔ اس کی خاموش آمدورفت کے پیچھے یقیناً ایک بڑا طوفان چھپا ہوا ہے۔ ہم اس سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ اس کے روحانی عمل کا توڑ کریں گے۔ اس سے پہلے میں اس سے بولتا ہوں۔ اے لڑکی......! بول۔ تو مراد علی منگی کی بیٹی ماروی ہے؟ بول اور ہمارے سامنے آ......''

جواب میں خاموشی رہی۔ نہ اس کی آواز سنائی دی۔

نہ وہ سامنے آئی۔
اس نے کہا۔ ''شیطان معظم نے مجھے آگہی دی ہے۔ یہاں آنے والی صرف ایک ہستی ہے جو پیدا ہوتے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ نیلماں کے ساتھ رہنے والی صرف ماروی ہی ہو سکتی ہے۔ تو جانتی ہے کہ تیرا باپ دھوکا کھا رہا ہے۔ اس کا بیٹا یہاں ہے۔ تو اس کے پاس آتی ہے۔ جب یہ بھید کھل گیا ہے تو تیرا باپ ہم سے دشمنی کیوں نہیں کر رہا ہے؟''
لارا نے کہا۔ ''یہ واقعی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ باپ وہاں ایک لاوارث بچے کو گود لے کر مطمئن ہے اور بیٹی اصل بیٹے کے پاس آتی رہتی ہے۔ کیا اس نے مراد کو ہمارے فراڈ کے بارے میں نہیں بتایا ہے؟''
کاہن نے کہا۔ ''شیطان بہت قوی ہے۔ بڑی قوت والا ہے۔ وہ ماروی کو حقیقت بیان کرنے سے روک رہا ہے۔ جس طرح ابھی ہمارے سامنے گونگی بہری ہو گئی ہے، کچھ نہیں بول رہی ہے، اسی طرح اپنے باپ سے اور دنیا والوں سے دانش کے بارے میں کچھ بول نہیں پا رہی ہے۔ اس کی مجبوریاں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ یہ اپنے بھائی کو شیطان پرست نہیں بنانا چاہتی۔ اس لیے دانش کے اندر اپنے دین کی باتیں بولتی رہتی ہے۔''
لارا نے کہا۔ ''یہ کسی دن اچانک اسے یہاں سے لے جائے گی۔''
''اس تاریک دنیا سے کوئی کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ تم نے دانش کو جنم دیا ہے۔ اسے اپنا دودھ پلاتی ہو اس لیے بیرونی دنیا میں اپنے ساتھ اسے لے جاتی ہو اور لے آتی ہو۔ ماروی ایسا کر سکتی تو بہت پہلے ہی دانش کو یہاں سے چرا کر لے جاتی۔''
دانش نے کہا۔ ''مام! جب میں گھر میں رہتا ہوں تو وہ نظر آتی ہے۔ بہت اچھی لگتی ہے۔ کہتی ہے میں بڑی بہن ہوں۔ مجھے آپی کہا کرو۔''
''خبردار! وہ تمہاری کوئی نہیں ہے۔ دشمن ہے۔ ہمارے شیطان معظم کی بھی دشمن ہے۔ اسی لیے ابھی عبادت کے وقت تمہیں دعائیں پڑھنے نہیں دے رہی ہے۔ خبردار! مام کی بات مانو۔ اسے بھگا دو۔''
دانش نے کہا۔ ''آپی! ماما کہتی ہیں بھاگ جاؤ۔''
لارا نے غصے سے کہا۔ ''اسے آپی مت بولو۔''
''پھر کیا بولوں؟''
''کچھ مت بولو۔''
''اے! میں کچھ نہیں بولوں گا۔ مت بھاگو۔''
وہ اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ کر بولی۔ ''میں نے بھگانے کو منع نہیں کیا ہے۔''
''آپ نے بھگانے کو منع نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھا۔ کیا اسے نہ بھگاؤں؟''
وہ جھنجلا کر دانش کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولی۔ ''اے چڑیل! چل بھاگ یہاں سے......''
''مام! تم مجھے چڑیل کہہ رہی ہوں۔''
''تمہیں نہیں۔ اسے کہہ رہی ہوں۔''
''وہ تو نہیں ہے۔ بہت دیر سے آواز نہیں آ رہی ہے۔''
وہ کاہن سے بولی۔ ''کچھ کریں۔ اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔ یہ کسی وقت بہت بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔''
''ہاں۔ ہم یہ سوچ کر مطمئن نہیں رہ سکتے کہ یہ ہم سے دانش کو چھین کر لے جانے میں ناکام ہو رہی ہے۔ ناکامی کے باوجود آتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب ہے چپکے چپکے سرنگ کھود رہی ہے۔ کبھی کسی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔''
''میں نے کالیا سے کہا تھا کہ وہ کالی شکتی سے اسے قابو میں کرے۔ جب وہ پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس کی ماں زیب النساء دہلی گئی تھی، تب کالیا نے پیٹ میں رہنے والی کو اپنے طلسمی شکنجے میں لینا چاہا تھا اور ناکام رہا تھا۔''
کاہن نے کہا۔ ''وہ بھلا پیدا ہونے سے پہلے کیسے شکنجے میں آتی؟ کالیا کو اب اس پر عمل کرنا چاہیے۔ وہ تمہارے بیٹے کو اپنے شکنجے میں رکھنے کے بعد ماروی کو اہمیت نہیں دے رہا ہے۔''
وہ بڑے صدمے سے بولی۔ ''کالیا میرے دماغ کا پھوڑا بنا ہوا ہے۔ پتا نہیں اپنے بیٹے کے ساتھ کب تک اس کے شکنجے میں رہوں گی۔ وہ کب مرے گا اور کب اس سے پیچھا چھوٹے گا۔ اس کی داسی اس کے پاؤں کی دھول بن کر زندگی گزار رہی ہوں۔''
وہ سرد آہ بھر کر مزید بولی۔ ''اس سے تو اچھا تھا کہ میں مراد کی گھر والی بن کر رہتی۔ وہ مجھے پاؤں کی دھول بھی نہ بناتا۔''
''مگر تمہیں مسلمان بنا دیتا۔ شیطان معظم سے تمہیں دور کر دیتا۔ مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ توبہ کرو۔ اپنے شیطان کی پناہ مانگو۔''
''میں تو اس کی پناہ میں ہوں پھر رہائی کیوں نہیں مل رہی ہے؟''
''ملے گی۔ صبر کرو۔ کالیا ہمارے شیطان سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ ایک بار ماروی کو ٹریپ کرنے میں ناکام

رہا ہے۔ ابھی اس سے بولو کہ اس لڑکی کو اپنی گرفت میں لے۔ اگر وہ ناکام ہوگا تو ہم ایک دوسری چال چلیں گے۔''

''میں بہت مایوس ہوگئی ہوں۔ اس کے خلاف کوئی چال بھی کامیاب نہیں ہوگی۔''

''یہ نہ بھولو کہ ابھی ہم نے روحانی قوتوں کو اس کے خلاف نہیں آزمایا ہے۔''

لارا نے چونک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ہم کالیا کے خلاف ناکام رہے ہیں اور کالیا ماروی کے خلاف ناکام رہا ہے۔ کیا یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ روحانی قوت سے مات کھا گیا تھا؟''

''ہاں۔ میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔''

''اب سوچو۔ اب اسے ماروی کے پیچھے لگاؤ۔ اگر وہ اس کے شکنجے میں آئے گی تو تمہارے بیٹے دانش کو اس سے نجات مل جائے گی۔ اگر کالیا مات کھا جائے گا تو تم ماں بیٹے کو اس کی طلسمی گرفت سے رہائی مل جائے گی۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''او مائی گڈنس۔ یہ سیدھی سی بات پہلے سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ کالیا کو ماروی اور مراد کے پیچھے لگانا چاہیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اسی لمحے میں خیال خوانی کی پرواز کرتی ہوئی کالیا کے پاس آئی۔ وہ اسے اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ہوا آگئیں۔ میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔ اپوزیشن پارٹی کے غنڈے لیڈر شکتی شرما نے میری ریاست کی ایک سپر مارکیٹ میں بم دھماکا کرایا ہے۔ میں اسے کال کر رہا ہوں۔ تم اس کے اندر جاکر اس کو اور اس کے حواریوں کو نرک میں پہنچا دو۔''

وہ لارا کو اپنے کسی نہ کسی کام سے لگائے رکھتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جو کہتے ہو، وہ کرتی ہوں۔ وہ شکتی شرما ضرور نرک میں پہنچے گا، اس کے بعد تم میرا ضروری کام کرو گے۔ تمہیں ہمارے مشترکہ دشمن سے آج اور ابھی نمٹنا ہے۔''

''ہمارا مشترکہ دشمن تو مراد علی منگی ہے۔ نہ وہ ریاست سے باہر آرہا ہے، نہ ہم اس سے نمٹ سکیں گے۔''

''تم اس کی بیٹی ماروی کو اس کی ماں کے پیٹ میں ٹریپ نہ کرسکے۔ اب وہ دنیا میں آگئی ہے اور تم برسوں سے اسے نظرانداز کررہے ہو۔''

''اس لیے کہ وہ بھی ریاست سے باہر نہیں آتی ہے۔''

''آجائے گی۔ وہ میرے دانش کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میں دانش کو لے کر روشن دنیا میں آکر رہوں گی تو وہ وہاں بھی آئے گی۔ وہ روز ہی میرے بچے کے پاس آتی ہے۔''

''پھر تو سمجھو، میری چٹکی میں آگئی ہے۔ تم اس کے سر کے کچھ بال اور بدن کی اترن میرے پاس پہنچا دو پھر تماشا دیکھو۔''

''یہ تو ممکن نہیں ہے۔ وہ آتی ہے مگر نظر نہیں آتی ہے، صرف دانش کو دکھائی دیتی ہے۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''ہے درگا میا......! اسے پیدائشی روحانی شکتی حاصل ہے پھر تو اسے قابو میں کرنا بہت مشکل ہوگا۔''

''پھر تو وہ کسی دن میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔''

''اس کا باپ بھی نہیں لے جاسکے گا۔ دانش میرے طلسمی شکنجے میں ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ میرے طلسم کو نہیں توڑ سکے گی۔ مجھ سے ٹکرانے کے لیے آئے گی تو اس سے نمٹ لوں گا۔ اگرچہ اس سے نمٹنا مشکل ہوگا مگر ناممکن نہیں ہوگا۔ آج سے ایسے منتروں کا جاپ کرتا رہوں گا جن کے نتیجے وہ غائب رہنے والی دکھائی دینے لگے گی۔''

''کیا ہماری طرح تم بھی اس ریاست میں نہیں جاتے ہو؟ کیا وہاں جاکر نقصان اٹھاسکتے ہو؟''

''میں اس لیے نہیں جاتا کہ وہاں قدم قدم پر مراد کے لیے سیکیورٹی ہے۔ وہاں ان کی روحانی قوتیں زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ اس ریاست میں میری کالی شکتی کمزور پڑجائے گی۔''

''تم اپنی ایسی کالی شکتی آزماؤ جس کے نتیجے میں وہ تمہیں نظر آنے لگے۔ میں کوشش کروں گی کہ کسی طرح اس کے سر کے بال اور اس کی اترن حاصل ہوجائے۔''

''ابھی تو میرا کام کرو۔ میں شکتی شرما کو کال کررہا ہوں۔ تم اس کے دماغ میں پہنچو۔''

وہ تابعدار تھی۔ اس کے کام سے لگ گئی۔ ماروی وہاں شیطان کی عبادت گاہ میں دانش کے قریب تھی۔ اس کی خاموشی سے گمان ہورہا تھا کہ وہ جاچکی ہے۔ خیال خوانی کے وقت سوچ کی لہریں گونگی ہوتی ہیں لیکن لارا کاہن کو اپنی اور کالیا کی باتیں سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولتی رہی تھی اور ماروی سنتی رہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ ابھی وہ دونوں کس معاملے میں مصروف رہنے والے ہیں۔

وہ کالیا کے دماغ میں پہنچ گئی۔ اس وقت لارا وہاں موجود تھی۔ اس لیے کالیا ماروی کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہ کرسکا۔ اس نے فون پر شکتی شرما سے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''مجھے نقصان پہنچا کر سکون سے بیٹھے ہو۔ میں کیسے برداشت

کر سکتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مجھے کالے جادو کی دھمکی نہ دینا۔ ایک تانترک مہاراج نے میرے آگے رکشا ریکھا کھینچ دیا ہے۔ تمہارا کوئی منتر مجھے چھو بھی نہیں سکے گا۔"

"اچھا تو لو۔ میری شکتی دیکھو۔"

پھر وہ لارا سے بولا۔ "جاؤ۔ اسے نچا نچا کر تڑپا تڑپا کر مارو۔"

لارا شکتی شرما کے دماغ میں آئی تو ماروی بھی اس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ لارا نے کہا۔ "میں ایک چھوٹا سا حملہ کر رہی ہوں۔ بلا اپنے تانترک مہاراج کو......"

اس نے سوچ کی لہر سے ایک جھٹکا پہنچایا تو وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، فرش پر گر پڑا۔ وہ قہقہے لگا رہی تھی۔

ماروی نے سوچ کی لہروں سے اس کے سر کو سہلایا پھر شکتی شرما کی سوچ میں بولی۔ "تانترک مہاراج کا جادو ٹیلی پیتھی کے حملے کو روک نہیں سکے گا۔ اب میں سانس روک کر اسے بھگا دوں گا۔"

ماروی نے اس کی سانس روک کر پھر سانس بحال کی تو لارا اس کے دماغ سے نکل گئی۔ وہ حیران ہوئی پھر اس کے دماغ میں آئی تو اس نے پھر سانس روک لی۔ وہ کالیا کے دماغ میں آکر بولی۔ "وہ سانسیں روک کر مجھے اپنے اندر آنے سے روک رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو؟ وہ دارو پیتا ہے۔ اتنی پیتا ہے کہ ٹن ہو جاتا ہے۔ ایسا نشہ کرنے والا سانسیں کیسے روک سکتا ہے؟"

"میں دوبارہ جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ گئی پھر تھوڑی دیر میں واپس آگئی۔ کالیا سے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے، تانترک مہاراج کا جادو ٹیلی پیتھی کے حملوں کو بھی روک رہا ہے۔"

اسی وقت شکتی شرما نے اسے کال کی۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم یوگا کے ماہر کب سے ہو گئے؟ تم تو پکے نشے باز ہو۔ سانسیں کیسے روک رہے ہو؟"

وہ ماروی کی سوچ کے مطابق بولا۔ "میں نہیں، میرے اندر تانترک مہاراج سانس روک رہے ہیں۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ کیا ان کا نام نہیں پوچھو گے؟"

"ضرور پوچھوں گا اور اسے نرک میں بھی پہنچاؤں گا۔ کون ہے وہ؟"

"تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ فون پر زیادہ نہیں بولتے۔ جیسے ہی تم فون کو کان سے لگاتے ہو، وہ کہتے ہیں، آ...... آ...... آخ تھو......"

جیسے تھوک سیدھا منہ پر آیا ہو۔ وہ پھر حلق پھاڑ کر چیخ پڑا پھر غصے اور جنون میں پاگل ہونے لگا۔ ماروی اس کے اندر آگئی۔ غصے کی شدت ایسی تھی کہ اسے اپنے اندر محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے مرا کو گالی دی تو ماروی نے ایک زور کی پھونک ماری۔ وہ پھونک ایسی تھی جیسے منہ زور آندھی اس کے دماغ کو لے اڑی ہو۔ وہ اچھل کر فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

لارا ابھی اس کے دماغ میں موجود تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کالیا کے ساتھ اچانک کیا ہو رہا ہے؟ اس سے کون دشمنی کر رہا ہے؟

ویسے جو بھی اس کے ساتھ ہو رہا تھا' وہ لارا کی عین مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ خبیث مر جائے۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے دماغ میں اور زلزلہ پیدا کرنا چاہا تو اس نے اچانک ہی سانس روک لی۔ وہ دماغ سے باہر آگئی۔

یہ شدید حیران کرنے والی بات تھی کہ تکلیف سے نڈھال ہونے والے نیم مردہ کالیا نے سانسیں روک کر اسے باہر کر دیا تھا۔ وہ پھر اس کے اندر آئی۔ وہ واقعی نیم مردہ سا پڑا ہوا تھا۔ جیسے آدھی جان نکل گئی تھی۔ باقی اب تب میں نکلنے والی تھی۔

لارا نے پھر اسے مار ڈالنا چاہا پھر وہی عجیب تماشا ہوا۔ اس بار اس نے دیکھا کہ کالیا نے سانس نہیں روکی تھی۔ کوئی اور وہاں تھا۔ اس کی سوچ کی لہروں نے کالیا پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس نے لارا کو پھر بھگا دیا۔

وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟ لیکن اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ دماغ میں پہنچتے ہی اس کی سوچ کی لہروں کو لات ماروی جاتی تھی پھر اسے کاہن کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "لارا! بچے کو دیکھو۔ یہ کیوں رو رہا ہے؟" ماروی اسے رلا کر چلی آئی تاکہ ماں اپنے بچے سے لگی رہے۔ لارا کو وہاں سے ٹال کر اس نے کالیا کی حالت دیکھی۔ ایک اور زلزلے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ دوسری سانس لینے کے قابل نہ رہتا۔ وہیں دم توڑ دیتا۔

لیکن اس بار ماروی اس کے دماغ سے نکل آئی۔ وہ اس خبیث کو ختم کر دینا چاہتی تھی مگر اس کے دماغ میں

نہ جا سکی۔ اس کے ذہن میں بات آئی۔ گویا آگہی ملی کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔ آگے اسے جینا ہے۔ تقدیر کے کھیل کچھ اور ہیں۔

وہ اس نیم جان ہونے والے دشمن سے کچھ فاصلے پر سر جھکائے کھڑی تھی۔ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا تھا، اسی کے مطابق عمل کرنا تھا۔ وہاں سے واپس جانا تھا۔

پھر اسے آگہی ملی۔ ان لمحات میں کالیا کی جادوئی شکتی کمزور پڑ گئی ہوگی۔ میں اپنے بھائی کو اس کے شکنجے سے نکال سکتی ہوں۔

وہ پلک جھپکتے ہی تہ خانے میں پہنچ گئی۔ سامنے ایک اسٹینڈ پر شیشے کا وہ شوکیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے اندر ماں بیٹے لیٹے ہوئے تھے۔ اب سے پہلے بھی وہ وہاں آئی تھی۔ اس شوکیس کو چھو بھی نہ سکی تھی۔ ناکام واپس گئی تھی۔

اس بار اس نے چھو لیا۔ واقعی جادوئی شکتی کمزور ہو گئی تھی۔ اس نے شیشے کے ایک پٹ کو کھول کر بھائی کے پتلے کو نکال لیا۔ لارا کے پتلے کو وہیں رہنے دیا پھر اس شوکیس کو بند کر دیا۔ وہ ایسے وقت زیر لب سورۃ فلق اور سورۃ الناس پڑھ رہی تھی پھر پڑھتے پڑھتے دانش کے پاس آگئی۔

لارا اسے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ ماروی نے پتلے کی گردن کو دبوچتے ہوئے آیت کے الفاظ ادا کیے۔ ''یا اللہ! جادو ٹونہ کرنے والوں سے تحفظ اور سلامتی عطا فرما۔''

سلامتی مل چکی تھی۔ وہ پتلا جادوئی اثرات سے نکل چکا تھا۔ اس کی گردن دبوچنے سے دانش کو تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ ماروی نے خدا کا شکر ادا کیا پھر اس پتلے کو کہیں مٹی میں دبانے کے لیے وہاں سے دور لے گئی۔

فی الحال اس کی مصروفیات دو بھائیوں کے درمیان تھیں۔ اس نے دانش کے حق میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی پھر کسی وقت اس کے پاس آنے والی تھی۔ وہ اس پتلے کو مٹی میں دبانے کے بعد وارث کے پاس آگئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر درس گاہ نورانی کے وسیع و عریض صدر دروازے پر پہنچی۔ وہ فولادی دروازہ ان کے لیے کھل گیا۔ اس صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد درس گاہ میں پہنچنے کے لیے پھر ایک دروازے سے گزرنا لازمی ہوتا تھا۔ اس دروازے کی پیشانی پر جلی حرفوں سے لکھا ہوا تھا۔

''باب اول۔ بابا صلاح الدین اجمیری......''

بابا صاحب اس دنیا میں تھے یا نہیں تھے؟ مراد علی منگی کے دل و دماغ میں اور ان کے دین و ایمان میں ان کی تعلیمات جاری و ساری تھیں۔

☆☆☆

اس دنیا کی زمین پر، اس دنیا کے آسمان تلے پھر ایک بار پرنس عالی کا نام گونجنے لگا۔ تمام چینلز ان عورتوں کو پکار رہے تھے' جو اس کی ماں جینی کی ہم شکل تھیں۔ ٹی وی' اخبارات اور رسائل کے ذریعے جینی کی مختلف زاویوں کی تصاویر نشر کی جارہی تھیں۔ جب وہ سولہ برس کی تھی۔ جب بیس پچیس برس کی ہوئی تھی۔ جب ہم زاد کی زندگی میں آئی تھی اور جب ماں بننے والی تھی۔ ہر دور کی تصاویر جیسے گھر گھر پہنچ رہی تھیں اور جینی کی ہم شکل عورتیں تو ہڑبڑا کر اپنے گھروں سے نکل آئی تھیں۔

یہ دشمنوں کا کھیل تھا۔ عالی کے کاندھے پر اگر گن رکھ کر غبارے پھوڑ رہے تھے۔ ویسے اس بار عالی کی بہت رومانی اور جذباتی بلاوا نہیں تھا۔ وہ کسی محبوبہ اور گرل فرینڈ کو نہیں اپنی ماں کی صورت شکل کو پکار رہا تھا۔ خواتین کو مایوسی ہوئی تھی لیکن دل میں یہ چور خیالات تھے کہ وہ ماں کی صورت دیکھنے آئے گا تو شاید کسی جذباتی لمحے میں محبوبہ بنا لے گا۔

پھر یہ کہ معاملہ محض جذباتی نہیں تھا۔ مالی منافع بھی تھا۔ جینی کی ہر ہم شکل لڑکی یا عورت کو ایک لاکھ ڈالرز ملنے والے تھے۔ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ کوئی فراڈ نہیں ہے۔ سچ مچ پرنس عالی ہے۔ اپنی ماں کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے اس کی ہم شکل عورتوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔

مراد اور عالی کو یہ سوال چبھ رہا تھا کہ ان کے مخالفین عالی کو ایک مہرہ بنا کر کروڑوں ڈالرز کیوں لٹا رہے ہیں؟ وہ ایسا تماشا کر کے کیوں نقصان اٹھا رہے ہیں؟

وہ ایسی حماقت کر کے عالی کو نہ ڈھونڈ سکتے تھے، نہ ہی اسے مقابلے پر آنے کے لیے مجبور کر سکتے تھے۔ مراد نے کسی کتاب میں یہودیوں کے متعلق پڑھا تھا کہ وہ بہت ہی چالاک منافع خور ہوتے ہیں۔ کسی کو ایک ڈالر دیتے ہیں تو اس کے عوض دس ڈالرز وصول کر لیتے ہیں۔

اور وہ کچھ پانے کے لیے ہی جینی کی ہم شکل عورتوں کو تماشا بنا رہے تھے اور بظاہر نقصان اٹھا رہے تھے۔ جس دن اعلان ہوا تھا' اسی دن سے جینی کی ہم شکل عورتیں فون کے ذریعے اور اسپیشل چینل کے ذریعے رابطہ کرنے لگیں۔ سب سے پہلے اٹھارہ برس کی ایک لڑکی اسپیشل چینل کی اسکرین پر نظر آئی۔

اس لڑکی کے اطراف دیواروں پر جینی کی بڑی بڑی تصویریں چسپاں تھیں۔ دیکھنے والے تسلیم کررہے تھے کہ وہ ہر زاویے سے جینیفر عرف جینی ہے۔ مراد اور عابی بھی اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرا نام روبی واٹسن ہے۔ اٹھارہ برس کی ہوں۔ اسکول جاتی ہوں۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہوں اور پرنس عابی کے سپنے دیکھتی ہوں۔ قدرت نے مجھے اس کی مام کی ہم شکل بنایا ہے۔ میں اس کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہوں۔ پلیز عابی! مجھے تھری ان ون بنالو۔ ماں بھی محبوبہ بھی اور بیوی بھی۔“

ایک گھنٹے کے بعد اسی اسکرین پر دوسری لڑکی نظر آئی۔ وہ ہو بہو جینی نہیں تھی۔ کسی حد تک اس سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہائے عابی! مجھ میں جو کمی ہے، وہ پوری ہو جائے گی۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مکمل تمہاری مام دکھائی دوں گی۔ بائی دا وے مکمل ہونا نہیں چاہتی ادھوری رہوں گی تو میری ذات میں ایک اور ادھوری کو پاتے رہو گے۔ مجھ سے ایک بار ملو تو سہی۔“

ایک عمر رسیدہ عورت ہو بہو اس کی مام دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ ماں بننے والی تھی، عابی کو جنم دینے والی تھی تو ویسی ہی بیماری دکھائی دیتی تھی۔

اگرچہ دشمن تماشا کررہے تھے۔ تاہم عابی اس خاتون کو دیکھ کر تڑپ گیا۔ دل اس کی طرف کھنچا جانے لگا۔ اس نے فون پر کہا۔ ”بابا جانی! آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ خاتون بالکل میری مام دکھائی دے رہی ہیں۔“

”ہاں بیٹے! ہماری دنیا میں ایک دوسرے کے بے شمار ہم شکل ہوتے ہیں۔ ابھی اور ایسی کئی خواتین تمہاری مام کی طرح دکھائی دیں گی۔ خود پر قابو رکھو۔ دشمن تمہارے جذبات سے کھیلنے کے لیے ہی یہ کھیل تماشا کررہے ہیں۔“

وہ خاتون کہہ رہی تھی۔ ”میں ایک بھارتی ناری ہوں۔ میرا نام رادھیکا ہے۔ میرے بیٹے عابد علی منگی! بھگوان تمہاری مام کی آتما کو شانتی دے۔ تم ان کی آتما کی سکھ شانتی کے لیے مجھ جیسی ضرورت مند ماں کو ایک لاکھ ڈالر دو گے تو میرے جوان بیٹے کو ایک نئی زندگی مل جائے گی۔ میرے بیٹے ہری رام کو بلڈ کینسر ہے۔ میں اس کے علاج کے لیے اپنا ایک گردہ بیچنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں علاج مہنگا ہے۔ ایک گردے کی رقم سے بیٹے کو زندگی نہیں ملے گی۔ بیٹے عابی! میرے جوان بیٹے کو بچالو۔“

یہ ایسی بات تھی کہ مراد سن کر تڑپ گیا۔ وہ عابی کو سمجھا رہا تھا کہ جذباتی نہ بنے۔ خود اس نے فون پر کہا۔ ”بیٹے! میں ابھی ماتاجی (جگنی بائی) سے بات کرتا ہوں۔ اس خاتون کو جتنی بھی رقم کی ضرورت ہوگی فوراً ادا کی جائے گی۔“

پھر اس نے جگنی بائی سے رابطہ کیا۔ اسے رادھیکا کا نام اور پتا بتایا پھر کہا۔ ”ماتاجی! آپ ابھی اس خاتون سے ملیں۔ اس کے صحیح حالات معلوم کریں۔ اسے جتنی رقم کی ضرورت ہوگی، وہ میں آن لائن بینکنگ سے ادا کرتا رہوں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹے! میں ابھی اس عورت کے پاس جاتی ہوں۔“

رادھیکا پرانی دلی کی ایک تنگ سی گلی میں رہتی تھی۔ جگنی بائی نے وہاں جانے سے پہلے گھا گھرا پلٹن کی ایک مخبر کو وہاں بھیجا۔ اس نے آدھے گھنٹے میں معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ رادھیکا ایک غریب بیوہ ہے۔ اس کا ایک بیٹا پندرہ برس کا ہے۔ دو بیٹیاں بارہ برس اور دس برس کی ہیں۔ بیٹا صحت مند ہے۔ اسے کینسر نہیں ہے اور رادھیکا بھی جھوٹی اور بے ایمان نہیں ہے۔ کپڑے سلائی کرکے اپنے اور بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔

وہ ہو بہو جینی دکھائی دیتی تھی۔ یوں ہم شکل ہونے کے باعث وہ مصیبت میں پڑ گئی۔ اس علاقے کے غنڈے باسودیو نے اس سے کہا۔ ”اس عابد علی منگی کو پکارو۔ چینل والوں سے بات کرو۔ وہ ایک لاکھ ڈالرز میں حاصل کروں گا۔“

رادھیکا نے کہا۔ ”میں عابی کو اس کی ماں کی بھرپور ممتا دوں گی لیکن ایک ماں ہوں اس کے بدلے ایک پیسا بھی نہیں لوں گی۔“

باسودیو نے اس کے بیٹے ہری رام کو گن کے نشانے پر لے کر کہا۔ ”میں بکواس نہیں سنوں گا۔ اپنا سمے برباد نہیں کروں گا۔ اس پلّے کو گولی ماردوں گا اور چلا جاؤں گا۔ بول عابی کو پکارے گی یا اسے گولی ماردوں۔“

ماں نے بیٹے کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ وہ مجبور ہو گئی۔ باسودیو نے کہا۔ ”عابی سے رقم مانگنے والیاں کتنی ہی ہم شکل مائیں آرہی ہوں گی۔ تو دکھ بھری کہانی سنائے گی تو وہ فوراً ایک لاکھ ڈالر دے گا۔“

رادھیکا نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے باسودیو کے کہنے پر جو جھوٹی کہانی سنانے کو کہا، وہ اس نے چینل کے ذریعے سنادی۔ جگنی بائی نے اس مکان میں آکر باسودیو کو دیکھا۔ وہ اپنے لباس میں گن چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ بولی۔ ”باسودیو! میں نے تمہارا بڑا نام سنا ہے۔ کہتے ہیں، آدھی دلی تم سے خوف زدہ رہتی ہے۔ پولیس تمہارا نام سن کر کترا جاتی ہے۔“

وہ بولا۔ ”جگنی! میں نے بھی تیرا بہت حرچا سنا ہے۔ بول یہاں کس لیے آئی ہے؟“

”تجھے سمجھانے آئی ہوں۔ اس غریب ایماندار عورت کو شرافت سے جینے دے۔ یہاں سے چلا جا۔“

وہ اپنے لباس سے گن نکالتے ہوئے بولا۔ ”اگر تو پانچ منٹ میں نہیں جائے گی تو گولی ماردوں گا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی گولی چلی پھر اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ اس کی مسلح شوٹرز دو کھڑکیوں کے باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے زخمی بازو کو تھام کر گن کو اٹھانا چاہتا تھا۔ دوسری گولی نے اسے ٹوٹی ہوئی پرانی کرسی سے نیچے گرادیا۔

اس وقت مکان کے باہر گلی میں فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کماگمرا پلٹن کی شوٹر عورتیں باسودیو کے حواریوں سے فائرنگ کا تبادلہ کررہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی حواری وہاں سے فرار ہوگئے۔ جگنی بائی کی شوٹرز زخمی باسودیو کو ایک گاڑی میں ڈال کر وہاں سے لے گئیں۔ اس کے بعد کوئی نہ جان سکا کہ موت کا فرشتہ بننے والا وہ غنڈا کہاں گم ہوگیا ہے۔

مراد کو یہ پوری روداد معلوم ہوئی تو اس نے رادھیکا سے فون پر بات کی۔ اسے بڑے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ”آپ جیسی نیک ہستیوں سے ہماری دنیا میں ایمان اور دھرم باقی ہے۔ آپ صرف اپنے بیٹے ہری رام کی ہی نہیں، میرے بیٹے عابی کی بھی ماں ہیں۔ آپ میری طرف سے، ایک بھائی کی طرف سے ایک لاکھ ڈالرز قبول کریں۔“

مراد نے اس نیک ہستی کو اس کی شرافت اور دیانت داری کا انعام بھیج دیا۔ دوسری طرف سے بن زیان نے رادھیکا سے فون پر کہا۔ ”میں پرنس عابی بول رہا ہوں۔ یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے بیٹے کو کینسر ہے۔ آپ اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر ارسال کریں۔ ہم آپ کو......“

رادھیکا نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟ میرے بیٹے کو بھگوان سلامت رکھے۔ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔“

”کیا تم نے چینل کے ذریعے جھوٹ کہا تھا؟“

”ہاں بہت مجبور ہوکر جھوٹ کہا تھا پھر جب سچ کہا تو پرنس عابی کے باپ نے مجھے سچائی کا انعام دے دیا۔ پورے ایک لاکھ ڈالرز ادا کردیے۔“

بن زیان کے لیے یہ معلومات اس کے منصوبے کے مطابق تھیں۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ باپ بیٹے فراڈ عابی کا تماشا چینل کے ذریعے دیکھ رہے ہیں اور جینی کی ہم شکل عورتوں کے معاملات سے دلچسپی بھی لے رہے ہیں۔

وہ ایسی ہی عورتوں کے ذریعے عابی کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ سکتے تھے۔ بن زیان نے رادھیکا سے کہا۔ ”یہ سن کر خوشی ہوئی کہ پرنس عابی نے اپنے وعدے کے مطابق تمہیں رقم ادا کی ہے۔ پلیز اس کا فون نمبر بتائیں۔“

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ پرنس عابی بول رہے ہیں اور اب پرنس کا نمبر مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ بھگوان کے لیے مجھ غریب عورت کو پریشان نہ کریں۔“

اس نے فون بند کردیا۔ بن زیان نے اپنے یہودی اکابرین، سپرپاور اور اس کے اتحادیوں کو بتایا کہ وہ باپ بیٹے جینی کی ہم شکل عورتوں سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا تو وہ جلد ہی جینی کی کسی ہم شکل کے ذریعے عابی کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔

ویسے دشمنوں کا کھیل صرف عابی تک پہنچنے کے لیے نہیں تھا۔ وہ جو لاکھوں کروڑوں ڈالرز جینی کی ہم شکل عورتوں کو دینے والے تھے اس رقم کو منافع کے ساتھ وصول کرنے والے بھی تھے اور جلد ہی یہ وصولی شروع ہونے والی تھی۔ یہ وصولی عابی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بننے والی تھی۔

جینی کی ہم شکل چالیس عورتوں نے ایک ہفتے میں رابطہ کیا۔ ان میں دوشیزائیں بھی تھیں اور عمر رسیدہ خواتین بھی تھیں۔ اور ان میں صرف سات عورتیں ہوبہو جینی تھیں۔ باقی جینی سے مشابہت رکھتی تھیں۔

اسپیشل چینل پر دکھایا گیا۔ ان سات عورتوں کو ایک ایک لاکھ ڈالرز ادا کیے گئے۔ جو مشابہت رکھتی تھیں، انہیں صرف پچیس ہزار ڈالر دیے گئے۔ وہ عورتیں بیان دے رہی تھیں کہ پرنس عابی رقم ادا کرنے کے علاوہ ان کے کئی مسائل بھی حل کررہا ہے۔

یوں عابی کی واہ واہ ہورہی تھی۔ اس کی نیک نامی میں اضافہ ہورہا تھا۔ دشمن عجیب دشمنی کررہے تھے۔ اسے شہرت کی بلندی پر پہنچا رہے تھے۔

بس بہت ہوچکا تھا۔ بہت آسمان پر چڑھا دیا تھا۔ اب گرانے کا مرحلہ آگیا۔

جعلی عابی نے مراد سے فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں ایک بہت بڑا دھماکا' ایک بہت اہم انکشاف کرنے والا ہوں۔ آپ اسکائپ کے ذریعے باتیں کریں اور عابی کو بھی اسکائپ سے منسلک کریں۔ مجھے بتائیں۔ کتنی دیر میں رابطہ ہوگا؟“

آدھے گھنٹے بعد رابطہ ہوگیا۔ رابطے کے دوران اسکرین آن نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے صرف سن رہے تھے۔

جعلی عابی نے کہا۔ ''پرنس عابد علی منگی! میں تم سے مخاطب ہوں۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ تمہاری ماں نے کس طرح اپنی جان پر کھیل کر تمہیں جنم دیا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ تم اپنی ماں سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہو۔ افسوس جتنی محبت کرتے ہو، اتنے ہی بدنصیب بھی ہو۔ اپنی ماں کو اس کی وفات کے بعد بھی تباہ ہونے سے اور لٹنے سے بچا نہ سکے۔ وفات کے بعد اس کی لاش بھی برباد ہوگئی...... بڑی رازداری سے اس کا دل، گردے اور آنکھیں نکال لی گئیں۔ وہ لوٹنے والے ان تمام اعضا کے ذریعے آج بھی زندہ ہیں۔ وہ مرنے والی کہاں ہے؟ تم بیٹے ہو کر نہیں جانتے کہ ماں کی قبر کہیں ہے بھی یا نہیں؟ کسی کو کیا ہمدردی ہوگی کہ اسے کہیں دفن کرنے کی زحمت اٹھائی ہوگی؟''

عابی نے کہا۔ ''بس اور کچھ نہ بولو۔ میری ماں پر جو بھی ظلم ہوا وہ میری لاعلمی میں اور میری غیر موجودگی میں ہوا۔ اگر ان ظالموں کا پتا معلوم ہوجائے تو میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''ڈینگیں نہ مارو۔ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ وہ آج بھی تمہاری ماں کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو پہلے کر چکے ہیں۔ ہم ثابت کریں گے کہ تم بے بس اور کمزور ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے پھر سے تمہاری ماں کو زندہ کیا گیا ہے۔ ابھی چھ ہم شکل مائیں منظر عام پر آگئی ہیں۔ اب سے چوبیس گھنٹے کے بعد پہلے ایک ہم شکل کو اغوا کرکے اس کا دل، گردے اور آنکھیں نکالی جائیں گی۔''

عابی نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''ہم گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔ ہم نے ایک لاکھ ڈالرز اسے دیے ہیں۔ اس سے پہلے اس کے اعضا کی قیمت لگا چکے ہیں۔ ہمیں دو لاکھ ڈالرز ملیں گے۔ تم روپوش رہ کر ہمارے لیے دردِسر بنتے ہوئے ہو۔ کیا اب روپوش رہ سکو گے؟ تمہاری ماں اس ہم شکل لڑکی میں زندہ ہے۔ اسے پھر مرنے سے اور اپنے اعضا سے محروم ہونے سے نہیں بچا سکو گے۔''

مراد نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''یہ کیسی دشمنی اور درندگی ہے؟ ایک زندہ لڑکی کے دل، گردے اور آنکھیں نکالو گے؟''

وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ ''پھر اس کی کھوکھلی لاش کو کہیں دفن نہیں کریں گے۔ اسے چیل کوؤں اور گدھ کی خوراک بننے کے لیے پھینک دیں گے۔ جینی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اب منظر عام پر آنے والی ہر جینی کے ساتھ، پرنس عابی کی ماں کی ہر ہم شکل کے ساتھ یہی ہوگا۔''

عابی نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''تم سب حرام موت مرو گے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ کون ہو؟''

''ہمیں دھمکی نہ دو۔ ہمارے خلاف ثبوت کے بغیر قانونی گرفت میں آؤ گے۔ یہ بھی ثابت نہیں کرسکو گے کہ اس دنیا کے معزز اور معتبر لوگ پھر سے تمہاری ماں کے بدن کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ تم باپ بیٹے کو سوچنے سمجھنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی جارہی ہے۔ اگر عابی اپنی غیر معمولی شہ زوری کو بھول کر ہمارے آگے گھٹنے ٹیک دے گا، ہمارا تابعدار بن کر رہے گا تو ہم اس کی ماں کی کسی ہم شکل کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اگر تم اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آؤ گے۔ ہمارے لیے عذاب بن کر رہو گے تو ہر چوبیس گھنٹے کے بعد اپنی ایک ماں کی زندگی کو ہارتے رہو گے۔''

ادھر سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ وہ باپ بیٹے تھوڑی دیر تک گم صم رہے۔ ایک دوسرے سے کچھ بول نہ سکے۔ عابی کی نگاہوں کے سامنے ماں کی صورت تھی۔ آئندہ جو بھی ہم شکل اپنی زندگی ہارتی تو گویا اس کی ماں اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بار بار مرتی رہتی۔

دشمن ایک بیٹے کے جذبات سے کھیلنے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ بیٹا جان پر کھیل کر ان عورتوں کو بچائے گا۔ ان پر ظلم ہونے نہیں دے گا۔ ان کے لیے جذباتی اور جنونی جنگ لڑنے کے دوران شکنجے میں آجائے گا یا مارا جائے گا۔

بہرحال انہوں نے عابی کو خفیہ پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بابا جانی! آپ پریشان نہ ہوں۔ درس گاہ نورانی کے معاملات کو ملتوی کرکے میرے پاس نہ آئیں۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ ابھی جارہا ہوں آئندہ اپنے حالات سے آگاہ کرتا رہوں گا۔''

دشمن نے وقت مقرر کردیا تھا۔ عابی کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اپنی ماں کی کسی ہم شکل کو ہلاکت سے بچانا تھا۔ اسے اس کے تمام جسمانی اعضا کے ساتھ زندہ رکھنا تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے؟ پہلے کس ہم شکل کی شامت آئی ہے؟

اس کا نام روبی وانسن تھا۔ اسی لڑکی نے سب سے پہلے اسپیشل چینل کے ذریعے خود کو پیش کیا تھا۔ وہ ہو بہو جینیفر عرف جینی دکھائی دیتی تھی اور دشمنوں نے وعدے کے مطابق اسے ایک لاکھ ڈالرز بھی پیش کیے تھے۔

وہ بہت خوش تھی۔ بار بار عابی سے ملنے کی التجا کررہی تھی۔ اس سے کہا گیا تھا کہ عابی اس کے اصرار اور ضد سے مجبور ہو گیا ہے لیکن وہ بہت راز داری سے اپنی رہائش گاہ میں ملے گا۔ وہ تنہا وہاں جائے گی اور کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہیں کرے گی۔

وہ بڑے ہی ماہر اور مکار شکاری تھے۔ انہوں نے کسی دردسری کے بغیر اسے شکار کرلیا۔ اسے جس رہائش گاہ کا پتا بتایا گیا وہاں خود ہی پہنچ گئی تھی۔

اگرچہ وہ عابی کی ماں کی ہم شکل تھی لیکن ایک محبوبہ کے دل سے سوچتی تھی۔ یوں دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی تو معلوم ہوا وہ کوئی رہائش گاہ نہیں ہے عقوبت خانہ ہے۔

وہاں بن زیان چار گن مینوں کے ساتھ موجود تھا۔ روبی سے اس کا فون چھین لیا گیا۔ اس کے ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر منہ پر ٹیپ لگا کر کہا گیا۔ ''تمہاری زندگی صرف دس گھنٹوں کی ہے۔ اگر عابی ہمارے آگے گھٹنے ٹیک دے گا تو تمہاری موت ٹل جائے گی۔ ہم نے اسے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ چودہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

پھر بن زیان نے جعلی عابی کے لب و لہجے میں مراد سے فون پر کہا۔ ''تمہارے بیٹے کی پہلی ماں ہمارے شکنجے میں آگئی ہے۔ اسے بولو کہ اب ہم سے پردہ نہ کرے۔ مجھ سے اس نمبر پر بات کرے۔ صرف ساڑھے نو گھنٹے رہ گئے ہیں۔''

عابی نے اس کے فون پر رابطہ کیا۔ بن زیان نے روبی کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر کہا۔ ''پہلے اپنی ماں سے بات کرو اور یقین کرو کہ مقررہ وقت پر تمہاری ماں کی ہسٹری دہرائی جائے گی اور تم ایک بار پھر اپنی ماں کے جسمانی اعضا کی لوٹ مار کو نہیں روک سکو گے۔''

عابی نے روبی کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''میں نہیں جانتی تم کون ہو؟ یہ کہہ رہا ہے کہ پرنس عابی ہو۔ مجھے پرنس کے نام سے دھوکا دے کر یہاں بلایا گیا ہے۔ فارگاڈ سیک، پرنس ہو تو مجھے ان لوگوں سے رہائی دلاؤ۔ دنیا جانتی ہے کہ تم فولاد ہو۔ انہیں کچل کر رکھ دو گے۔ آؤ پرنس! فارگاڈ سیک آؤ۔ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے مجھے بچالو۔''

بن زیان سن رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ عابی نے کہا۔ ''میں نے تمہیں ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ تم ہو بہو میری ماں ہو۔ آنسو پونچھ لو۔ تم زندہ رہوگی۔ فون اس خبیث کو دو۔''

چند لمحوں کے بعد بن زیان کی آواز سنائی دی۔ اس نے عابی سے پوچھا۔ ''کیا یقین ہو گیا کہ تمہاری ماں پھر ایک بار دل گردے اور آنکھیں لٹانے کے لیے آگئی ہے؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نوزائدہ بچہ تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ میری ماں پر کیسے مظالم ڈھائے جارہے ہیں۔ اب یہ ذرہ پہاڑ بن گیا ہے۔ اس پہاڑ کو عبور کرکے میری ماں کی کسی ہم شکل تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔''

بن زیان کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ اس لڑکی کو یہاں سے زندہ سلامت لے جاؤ گے؟''

''میں نہیں لے جاؤں گا۔ تم خود اسے گھر پہنچاؤ گے۔''

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ عابی کے چیلنج میں بڑی توانائی تھی۔ اس کے لہجے کی چمک کہہ رہی تھی کہ وہ مجوبہ ہے، کسی وقت کچھ بھی کرسکتا ہے۔

وہ غصے سے بولا۔ ''مجھے چیلنج کررہے ہو؟ میں اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچاؤں گا؟ یونان سنس! میں ابھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔''

''اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے یہ دیکھو کہ تم تمام یہودیوں، سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے حکمرانوں نے کتنی بھیڑ لگا رکھی ہے۔ ایسی بھیڑ میں کوئی گم ہو جائے تو فوراً پتا نہیں چلتا۔ میری ماں کی اس صورت کو ہاتھ لگانے سے پہلے معلوم کرو کہ تمہارے درمیان سے کون سی اہم ہستی، کون سا وی آئی پی گم ہو گیا ہے۔''

''آل رائٹ! ابھی معلوم کرتا ہوں، ابھی کال بیک کروں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ بن زیان نے اپنے تمام اتحادیوں سے عابی کے تمام دشمنوں سے پوچھا۔ ''کیا ہمارے درمیان سے کوئی گم ہو گیا ہے؟''

معلوم ہوا کہ صیہونی تنظیم کا ایک اہم عہدیدار کریگ ہوسٹن غائب ہو گیا ہے۔ یہ وہی کریگ ہوسٹن تھا جو مالدوا سے پیرس تک عابی کی نگرانی کرتا اور اسے یہودی بنائے رکھنے کے جتن کرتا رہا تھا۔ اسی نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے پہلی بار شہزاد پر حملہ کرایا تھا۔ وہ بہت ہی فعال رہنے والا عہدیدار تھا۔ صیہونی تنظیم میں بڑی اہمیت کا حامل تھا اور اب لاپتا ہو گیا تھا۔ اس کا پتا عابی ہی بتا سکتا تھا۔

ہزاروں مخالفین چیخ پڑے۔ بن زیان نے فون پر

پوچھا۔ ’’کریگ ہوسٹن کہاں ہے؟‘‘

عابی نے کہا۔ ’’فون کا وائڈ اسپیکر آن کرو۔ اگر تمہارے آس پاس کئی اکابرین اور اعلیٰ عہدیدار ہیں تو زیادہ لاؤڈ اسپیکرز لگاؤ۔‘‘

وہ لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ ایک بڑے سے ہال میں ہر سمت اسپیکرز لگائے گئے۔ تب انہیں کریگ ہوسٹن کی آواز سنائی دی۔ ’’مجھے بچاؤ۔ یہاں سے رہائی دلاؤ۔ میں نہیں جانتا کہ کس چار دیواری میں ہوں۔ اس وقت آپریشن بیڈ پر پڑا ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں بیڈ سے بندھے ہوئے ہیں۔ میرے ایک طرف چیرنے پھاڑنے کے خوفناک اوزار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یہ دو ڈاکٹروں کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔ میں نہیں بول سکتا کہ یہ کون ہے؟ بولوں گا تو آپریشن شروع ہوجائے گا۔ ابھی خیریت ہے۔ زندہ ہوں۔ ادھر تم لوگ جینی کی کسی ہم شکل کے بدن سے اوزار لگاؤ گے تو یہاں میرے جسم میں بھی اوزار پیوست ہوجائیں گے۔ جتنے اعضا اس کے نکالے جائیں گے، اتنے ہی اعضا سے مجھے بھی محروم کیا جائے گا۔ فارگاڈ سیک، اسے فوراً یقین دلاؤ کہ کسی بھی جینی کے جسم پر ہلکی سی خراش نہیں آئے گی۔‘‘

وہ سب گم صم سے ہوکر کریگ ہوسٹن کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ عابی اپنی مام کی کسی ہم شکل کی سلامتی کے لیے ان کی ایک بہت بڑی اور بہت اہم ہستی کو موت کے بستر پر پہنچا دے گا۔

بن زیان نے کہا۔ ’’مسٹر عابد علی منگی! ہم ابھی روبی واٹسن کو رہا کر رہے ہیں۔ تم کریگ ہوسٹن کو فوراً رہائی دو۔‘‘

عابی نے کہا۔ ’’ہماری یہ باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں پرنس عابد علی منگی ہوں اور میں نے کریگ ہوسٹن کو اغوا کرکے اسے موت کے بستر پر پہنچایا ہے؟‘‘

’’ہاں۔ تم پرنس عابد علی منگی ہو۔ ہم سے دشمنی کر رہے ہو۔ کریگ ہوسٹن جیسی معزز ہستی کو مار ڈالنا چاہتے ہو۔‘‘

’’میں ہوسٹن کو کیوں مار ڈالنا چاہتا ہوں؟ یہ روبی واٹسن کون ہے جسے تم نے پکڑ رکھا ہے، جسے رہائی دو گے تو ہوسٹن کو بھی رہائی ملے گی؟‘‘

ادھر تھوڑی دیر کے لیے چپ لگ گئی۔ ان کی باتیں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ وہ جواب دیتا تو دنیا والوں کو معلوم ہوجاتا کہ جینی کی ہم شکل کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرکے پرنس عابی سے دشمنی کی جارہی تھی۔

یہ بھی ثابت ہوجاتا کہ پرنس عابی گوشہ نشین رہ کر پُرامن زندگی گزار رہا ہے اور یہودی اسے اس کی مرحوم ماں کے حوالے سے چھیڑ کر جنگ و جدل سے بھرپور دشمنی پر مجبور کر رہے ہیں۔

بن زیان نے کہا۔ ’’ہم تمہارے سوالات کے جوابات دیں گے، پہلے مسٹر ہوسٹن کو رہا کرو۔‘‘

’’پہلے جوابات دو گے پھر ہوسٹن کو رہائی ملے گی۔‘‘

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ’’پرنس! تم اس ریکارڈنگ کے ذریعے دنیا والوں کو حقیقت بتانا چاہتے ہو تو ہم حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ تم نے طویل خاموشی اور روپوشی کے دوران بھیس بدل کر ریسلر بگ ہنٹر بن کر ہمیں نقصان پہنچانے کی ابتدا کی۔ ہمارے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے بارودا کو اور دوسری خیال خوانی کرنے والی ابھی مالا کو مار ڈالا۔ تم اب سے پہلے بھی بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو لیکن کبھی قانونی گرفت میں نہیں آئے۔ تمہیں مجبور کرنے اور گرفت میں لینے کے لیے ہم نے تمہاری مام کی ہم شکل کو ابھی قیدی بنایا ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ابھی کریگ ہوسٹن کے تبادلے پر اس لڑکی کو رہا کر دیا جائے گا۔‘‘

’’میں نے تمہارے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو نہیں، شیطان کے پجاریوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ یہ دنیا جانتی ہے کہ وہ تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے ہماری دنیا کے تمام مذاہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ان خیال خوانی کرنے والوں کو اپنا حامی اور اتحادی کہہ رہے ہو تو تم بھی ہمارے مذہب کے دشمن اور شیطان کے چیلے ہو۔ لہٰذا کریگ ہوسٹن کی رہائی کے سلسلے میں تم سے کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔‘‘

کریگ ہوسٹن نے آپریشن بیڈ پر سے چیخ کر کہا۔ ’’بات نہ بڑھاؤ۔ پرنس عابی سے ہر قیمت پر سمجھوتا کرو۔ مجھے فوراً یہاں سے رہائی دلاؤ۔‘‘

بن زیان نے کہا۔ ’’ویل مسٹر عابد علی منگی! ہمارے درمیان جو اختلافات ہیں، وہ کبھی ختم نہیں ہوں گے لیکن دشمنی کے دوران عارضی طور پر سمجھوتا ہوجاتا ہے۔ آؤ ہم ان شرائط پر سمجھوتا کرلیں کہ آئندہ ہم ایک دوسرے کے معاملات میں نہ مداخلت کریں گے، نہ کسی معاملے میں کسی کو انتقام کا نشانہ بنائیں گے۔ یہ جھگڑا ختم کرو۔ ہم تمہاری مام کی ہم شکل روبی واٹسن کو رہا کر رہے ہیں۔ اسے خیریت سے اور عزت سے اس کے گھر پہنچا رہے ہیں۔ تم ابھی مسٹر ہوسٹن کو رہا کرو۔‘‘

عابی نے کہا۔ ''جب روبی والسن اپنے گھر پہنچ کر مجھے کال کرے گی تو ہوسٹن کو رہا کر دیا جائے گا۔''

سمجھوتا ہو گیا۔ اس پر عمل بھی ہو گیا۔ روبی اپنے گھر میں اور ہوسٹن اپنے لوگوں میں پہنچ گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اسے کیسے اغوا کیا گیا تھا اور لندن میں پرنس عابی کے ذرائع کیا ہیں؟

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''میں آفس سے نکل کر اپنی کار میں آ کر بیٹھا تو انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں ویرانی تھی۔ اچانک چار گن مینوں نے آ کر مجھے نشانے پر رکھ لیا۔ میرے برابر اور میرے پیچھے آ کر بیٹھ گئے۔ میں ان کے حکم کے مطابق کار ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ آگے جا کر مجھے ایک ویگن کار میں لے آئے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ وہ چاروں افریقی باشندے تھے۔ فون پر کسی سے اپنی زبان میں بول رہے تھے۔''

بن زیان نے کہا۔ ''پھر تو وہ ماسٹر گوبوبو کے آدمی ہوں گے۔''

سپر پاور کی آرمی کے ایک افسر نے کہا۔ ''ہماری دنیا کی دو خطرناک تنظیمیں دی ماسٹر سنڈیکیٹ، ریڈ الرٹ اور ان کی اتحادی تنظیمیں مراو کی وفادار ہیں۔ اس کی ایک کال پر دوڑی چلی آتی ہیں۔ دنیا کے جس علاقے میں اسے ضرورت ہوتی ہے وہاں ہتھیار، گاڑیاں اور جاں نثاروں کی فوج پہنچا دیتی ہیں۔''

ہوسٹن نے کہا۔ ''مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچایا گیا تھا جہاں جدید مشینیں اور آپریشن کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ وہ باپ بیٹے جہاں چاہتے ہیں، وہاں ان کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ہم کبھی کبھی بھول جاتے ہیں۔ انہیں تنہا اور اپنے مقابلے میں کمزور سمجھنے لگتے ہیں جبکہ وہ وقتِ ضرورت وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل کر لیتے ہیں۔''

انہوں نے جینی کی کئی ہم شکل عورتوں کو منظر عام پر لا کر ان کے جسمانی اعضا فروخت کر کے بیٹے کے جذبات کو مشتعل کرنے کا زبردست ڈراما رچایا تھا پھر اپنی توقع کے خلاف اتنی ہی زبردست شکست بھی کھائی تھی۔

اب وہ سنبھلنے اور پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی باتیں کر رہے تھے۔ دوسرے دن اسپیشل چینل سے اعلان ہوا کہ عابی نے گوشہ نشینی ترک کر دی ہے۔ وہ شام چھ بجے اس چینل کے ذریعے ناظرین سے باتیں کرے گا۔

ایک بار پھر ہلچل پیدا ہو گئی۔ دوشیزائیں اور خواتین بیوٹی پارلرز میں پہنچنے لگیں جبکہ عابی ان کے پاس آ کر انہیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ بن سنور کر اسے اسکرین پر دیکھنے والی تھیں۔

تمام ممالک کے مخالف حکمران یہ اعلان کر رہے تھے کہ پرنس عابی کو ان کے ملکی قوانین کے مطابق رہنا ہوگا۔ آئندہ اسے کسی بھی ملک میں پندرہ دنوں سے زیادہ رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

وہ شام چھ بجے اسکرین پر نظر آیا۔ سب سے پہلے اس نے سلام کیا۔ ''میرے محبوب ناظرین! السلام علیکم۔ میں ایک طویل غیر حاضری کے بعد اپنی اصل صورت شکل کے ساتھ حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی چاہتا ہوں۔ جواب میں بے شمار ناظرین نے وعلیکم السلام کہا ہوگا۔ یعنی مجھ پر بھی سلامتی بھیجی ہوگی۔ تو اے دشمنو! دیکھ لو تمہاری بدترین دشمنی کے باوجود ناظرین کی دعاؤں نے مجھے سلامت رکھا ہے۔ میں ایک نئے عزم اور نئے حوصلوں سے منظر عام پر آیا ہوں اور آئندہ آزادی سے بے خوف و خطر سب کے درمیان رہوں گا۔ ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان آئیں اور میرے خلاف اپنے حربے آزمائیں۔ انشاء اللہ انہیں منہ توڑ جواب ملے گا۔ ایسا کون سا بڑا اور طاقتور ملک ہے جو مجھ سے عداوت نہیں رکھتا ہے۔ وہ سب ہی میری موت چاہتے ہیں۔ ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہو رہی ہے۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے ملک کے کسی بھی علاقے میں پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں رہنے دیں گے۔ میں اقوام متحدہ سے، عالمی عدالتوں سے گزارش کرتا ہوں کہ مجھے ہر ملک میں غیر معینہ مدت تک رہنے کی اجازت دی جائے۔ میری موجودگی سے کسی بھی ملک کا امن و امان اس وقت غارت ہوتا ہے جب میرے دشمن مجھ سے دشمنی کرتے ہیں اور وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ پولیس کے مجرمانہ رویوں کو تسلیم کیا جائے اگر میں تخریب کار ہوتا تو کسی بھی ملک میں صرف ایک ہی دن کے لیے جاتا اور وہاں قیامت برپا کر کے چلا آتا جبکہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔ میرے دل میں خوفِ خدا ہے۔ میرے ایمان کو اور شرافت کو تسلیم کیا جائے اور مجھے اس شہر میں اس وقت تک برداشت کیا جائے جب تک میں یہاں سے نہ جاؤں۔ میں ابھی اس چینل کے اسٹوڈیو سے نکل کر ساؤتھ ہال براڈوے کی مسجد میں جا کر عشا کی نماز ادا کروں گا۔ وہاں رات نو بجے تک رہ کر اپنی رہائش گاہ میں جاؤں گا۔ یوں قانون کے محافظوں کو بتاتا رہوں گا کہ اس شہر میں دن رات کہاں ہوں اور کیسے وقت گزار رہا

ہوں۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی یقیناً میری نگرانی کرتے رہیں گے۔"

تمام مخالفین اس کی یہ بات سن رہے تھے کہ وہ ابھی لندن میں نامعلوم عرصے تک رہے گا اور وہاں کا قانون اسے شہر چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکے گا۔ پولیس، انٹیلی جنس اور آرمی کے افسران نے کہا کہ وہاں قانون کے خلاف رہنے والا مجرم کہلائے گا۔ پرنس عابی کو بیس گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے، وہ لندن سے چلا جائے ورنہ اسے حراست میں لے کر جبراً اس ملک سے باہر کر دیا جائے گا۔

پھر اس میں اور مخالفین میں ٹھن گئی تھی...... پھر چوبیس گھنٹوں کے بعد اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

☆☆☆

رگوناتھ کالیا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ اپنے محل کی خواب گاہ میں تھا۔ ایک ڈاکٹر اور اس کے دو خاص چیلے بیڈ کے قریب تھے۔ اسے یاد آیا کہ اس کے دماغ میں کسی نے زلزلہ پیدا کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا اور اب ہوش میں آ کر خود کو اپنے محل میں دیکھ رہا ہے۔

اس کے دونوں چیلے سرہانے اور پائینتی کھڑے ہوئے زیرلب منتر پڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کو ناقابلِ برداشت دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ میں آپ کو ہوش میں لے آیا ہوں۔ آپ معروف تجربہ کار برین اسپیشلسٹ سے رجوع کریں۔"

کالیا کو یاد آ رہا تھا۔ اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے اندر اپنے دشمن شکتی شرما کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے دشمنی کی تھی۔ اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کر کے جیسے مار ہی ڈالا تھا اور وہ زندہ رہ کر حیرانی سے سوچ رہا تھا کہ شکتی شرما کا باپ بھی ٹیلی پیتھی نہیں جانتا ہے پھر وہ کیسے اس کے دماغ میں دشمنی کرنے آ گیا تھا؟

یہ ابھی معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ ماروی نے نادیدہ ہاتھوں سے اٹھا کر اسے پٹخ دیا ہے۔ اسے بیمار بنا کر چلی گئی ہے۔

وہ لارا، آبنوس اور طاغوتا پر ہی شبہ کر سکتا تھا۔ وہی تین ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے اندر آ سکتے تھے۔ یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ لارا نے اس کے کالے جادو سے خود کو اور اپنے بیٹے دانش کو نجات دلانے کے لیے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کیا تھا۔ ابھی اسے دماغی طور پر کمزور بنا دیا ہے۔ وہ فی الحال منتر پڑھنے کے بھی قابل نہیں رہا ہے۔ پھر اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ نہیں، لارا نے ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ ادھوری دشمنی کیوں کرے گی؟ جب اس قدر کمزور بنا چکی ہے تو اسے ہلاک بھی کر سکتی تھی۔ پھر زندہ چھوڑ کر کیوں گئی ہے؟

اس کے دونوں چیلے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ چونکہ گرو دیو منتر پڑھنے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے وہ دونوں پڑھ رہے تھے تاکہ اس کی بیماری اور کمزوری کے دوران میں لارا یا اور کوئی دشمن اسے مزید نقصان نہ پہنچائے۔

اس نے ایک چیلے سے کہا۔ "لارا کو کال کرو، میں بات کروں گا۔"

ادھر لارا الجھن میں تھی۔ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اچانک کالیا کی شامت کیسے آ گئی تھی؟ ایسا کون دشمن تھا جو اس کے دماغ میں آ گیا تھا؟ جبکہ اس دنیا میں وہی تاریک دنیا کے تین ٹیلی پیتھی جاننے والے تھے، چوتھا کوئی نہیں تھا پھر کالیا کے دماغ میں کون تھا؟

ایسے وقت لارا نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ کالیا کے دماغ میں زلزلے پیدا کر کے اسے مار ڈالنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی کی سوچ کی لہروں نے اسے بھگا دیا تھا۔

یہ شدید حیرانی کا مقام تھا۔ کس نے ایسا کیا تھا؟ کون ٹیلی پیتھی جاننے والا پیدا ہو گیا تھا؟ وہ پھر کالیا کے اندر گئی تھی پھر کسی نے بھگا دیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے آ گئی تھی۔ خوف یہ تھا کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا نہیں ہے۔ کالیا کی جادوئی شکتی اسے بھگا رہی ہے۔ جب اس کی طبیعت سنبھلے گی تو وہ اسے دشمنی کی سزا دے گا۔

وہ اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر ہو کر بڑی دیر تک سہمی رہی۔ انتظار کرتی رہی کہ وہ سزا دینے کے لیے پھر ماں بیٹے کے پتلوں پر منتر پھونک سکے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

تب وہ ہمت کر کے پھر اس کے دماغ میں گئی تو معلوم ہوا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ اس کی سوچ کی لہریں پڑھنے کے قابل نہیں تھیں۔ وہ معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کب تک ہوش میں آئے گا؟ ایسے وقت پھر دماغ میں بات آ گئی کہ اسے مار ڈالے۔ وہ بے دست و پا ہے۔ آدھا مر چکا ہے۔ اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گا۔

وہ سوچ کر رہ گئی۔ کالیا کی دہشت طاری تھی۔ یہ خیال آیا کہ بے ہوشی کے دوران میں اس کے چیلے اس کی نگرانی اور حفاظت کر رہے ہوں گے پھر یہ خیال آیا کہ اس نے ماں بیٹے کو کہیں جادوئی جکڑ بندی میں رکھا ہے۔ وہ

مرے گا تو وہ بھی بیٹے کے ساتھ مر جائے گی۔

کالیا نے اسے بری طرح دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ وہ بہترین موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اسے مار ڈالنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

اب اس نے کال کی تو وہ فوراً ہی بولی۔ ”گرودیو! تم ہوش میں آگئے؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”دشمنی کر کے پوچھتی ہو مجھے کیا ہو گیا تھا۔ تم نے میرے دماغ کو پھوڑا بنا دیا تھا۔“

”میں اپنے شیطان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں نے تم سے دشمنی نہیں کی تھی۔“

”پھر اور کون ٹیلی پیتھی جاننے والا ہے جو مجھ سے دشمنی کرے گا؟“

”میں خود حیران ہوں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ بہت طاقتور تھا۔ میری سوچ کی لہروں کو بھگا رہا تھا۔ میں نے اس کا مقابلہ کیا تھا لیکن تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ایسے وقت دوست یا دشمن کوئی دماغ میں نہیں رہ سکتا۔ میں باہر ہو گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آکر دیکھا تو تم بے ہوش تھے۔ پلیز! مجھ پر شبہ نہ کرو۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ میں نے کئی پہلوؤں سے سوچا ہے۔ اگر تم دشمنی کرتیں تو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر نہ جاتیں۔ مجھے مار ڈالتیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا، میرے دشمن شکتی شرما کی آواز میں بول رہا تھا۔“

”اس دنیا کا کوئی شکتی شرما ہماری طرح ٹیلی پیتھی نہیں جانتا۔ ذرا سوچو، کیا وہ دشمن کالے جادو کے ذریعے بول رہا تھا۔“

”نہیں، ایسا کوئی جادوگر نہیں ہے جو دماغ کے اندر پہنچ کر بولتا ہو۔ میری کھوپڑی میں یہ خیال آرہا ہے کہ کوئی روحانی شکتی سے میرے اندر آکر دشمنی کر رہا تھا۔“

”پھر تو وہ کوئی مسلمان ہوگا۔“

کالیا نے کہا۔ ”کیا وہ مراد ہوگا؟“

”نہیں، اگر مراد کے اندر ایسی روحانی قوتیں ہوتیں تو وہ مجھے بہت پہلے ہلاک کر کے دانش کو لے جاتا۔ روحانی قوت والا دھوکا کھا کر ایک لاوارث بچے سے نہ بہلتا۔“

”درست کہتی ہو۔ اب تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا پیدا ہو گیا ہے۔“

”لیکن وہ پیدا ہوتے ہی تم سے کیوں دشمنی کر رہا ہے؟“

”میرا دماغ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ سر دکھ رہا ہے۔ تم جاؤ۔ میں چپ رہنا چاہتا ہوں۔“

وہ چلی گئی۔ کالیا کا دماغ تھک گیا تھا۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے الجھا دینے والی دشمنی کی تھی۔ نہ دشمن سمجھ میں آرہا تھا، نہ دشمنی کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔

لارا نے بن زیان کو کالیا کی حالت زار بتائی تھی۔ وہ بھی یہ سن کر پریشان ہوگیا کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا پیدا ہوگیا ہے اور وہ کالیا کا دشمن ہے۔ یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ شیطان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے مقابلے میں کوئی روحانی ٹیلی پیتھی جاننے والا آگیا ہے۔

بن زیان نے کہا۔ ”ہمیں جلد سے جلد معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کون ہے؟ وہ اچانک آیا اور کالیا کو بے ہوش کر کے چلا گیا۔ ایسا کرنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ وہ کوئی پاگل تو نہیں ہوگا کہ آیا اور پتھر مار کر گزر گیا۔ ابھی کالیا کے پاس جاؤ۔ اس سے بولو، اپنے تمام موجودہ اہم معاملات پر توجہ دے۔ اس پراسرار دشمن کا تعلق اس کے کسی معاملے سے ضرور ہوگا۔“

”اس کا سر دکھ رہا ہے۔ وہ ابھی مجھ سے بات نہیں کرے گا۔ خود ہی مجھے بلائے گا۔“

وہ بولا۔ ”یہ نیا ٹیلی پیتھی جاننے والا خنجر کی نوک کی طرح سینے میں پیوست ہوگیا ہے۔ اگر یہ کوئی مسلمان ہوگا تو ہمارے مسائل اور بڑھ جائیں گے۔ ہم نے جینی کی ہم شکل عورتوں کے ذریعے عالی کے جذبات سے کھیلنے کی زبردست پلاننگ کی تھی۔ مگر ہمیں بری طرح ناکامی ہوئی ہے۔ اب وہ ایک نیا چیلنج بن کر منظر عام پر آگیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد لندن میں اس کی رہائشی سہولتوں کو ختم کیا جائے گا۔ اس کے گزرنے کے تمام راستے بند کیے جائیں گے۔ ایسی رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی کہ اسے مجبور ہو کر یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ مجبور ہوگا یا نہیں؟“

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دشمن ہی دشمن تھے۔ ان کے درمیان صرف وہ باپ بیٹے تھے۔ ایک تنہی ماروی بھی تھی لیکن ریاست کے باہر کم تھی۔ وہ پہلی بار کالیا پر حملہ کر کے واپس چلی گئی تھی۔

کالیا دماغی تھکن کے باعث گہری نیند سو گیا تھا۔ کئی گھنٹے کی نیند کے بعد اچانک ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے خواب میں مراد کے بیٹے دانش کو دیکھا تھا۔ اس بیٹے کا پتلا شوکیس کی چار دیواری میں تھا۔ وہ جادوئی شکنجے سے نکل نہیں سکتا تھا لیکن وہ جادو خواب میں پانی ہوگیا۔

اس نے دیکھا، اس بے جان پتلے نے حرکت کی تھی اور شیشے کی دیوار کو ایک لات ماری تھی۔ وہ پورا شوکیس ایک چھناکے سے ٹوٹ کر دور تک بکھر گیا تھا۔ وہ پتلا وہاں سے اٹھ کر جا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت کالیا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ دیدے پھیلا کر خلا میں تکنے لگا۔ سوچنے لگا کہ ایسا سپنا کیوں دیکھا ہے؟ وہ بیڈ سے اچھل کر اترا اور تیزی سے چلتا ہوا ایک چور دروازے سے گزر کر تہ خانے میں آیا۔

سپنے کے مطابق شیشے کا شوکیس ٹوٹا نہیں تھا، سلامت تھا لیکن اسے لات مار کر توڑنے والا پتلا نہیں تھا۔ یہ ایسا نقصان تھا کہ وہ صدمے سے چکرا کر فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی۔ اس کی عقل نے سمجھایا کہ مراد نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اسے بے ہوش کر کے اپنے بیٹے کو لے گیا تھا۔ لارا سے دشمنی تھی۔ اس لیے اسے چھوڑ گیا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ شوکیس پر دونوں ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگا۔ شیشے کی چار دیواری میں لارا کا پتلا تھا۔ وہ سوئیاں بھی رکھی ہوئی تھیں جنہیں پتلوں میں پیوست کرنے سے وہ ماں بیٹے شدید جلن اور اذیتوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہاں تمام سامان موجود تھا۔ لے جانے والا صرف دانش کے پتلے کو لے گیا تھا۔

وہ دانش کی خالی جگہ کو دیکھ رہا تھا اور بڑے جوش و جذبے سے منتر پڑھ رہا تھا۔ وہ منتر اسے بتا سکتے تھے کہ اس پتلے کو کہاں لے جایا گیا تھا اور اسے منتروں کی شکتی سے واپس شوکیس میں لایا جا سکتا تھا۔

ماروی اسے مٹی میں ملاتے وقت معوذتین پڑھتی رہی تھی۔ کالے منتر ہوا کے دوش پر آرہے تھے اور بھٹک رہے تھے لیکن کلام الٰہی کی تاثیر تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔

وہ گھنٹے بھر تک پاؤں پٹخ پٹخ کر منتروں کا جاپ کرتا رہا پھر تھک کر بیٹھ گیا۔ ناکامی نے سمجھا دیا کہ جو بھی روحانی عامل ہے، وہ بہت پہنچا ہوا ہے۔ اس نے بیڈروم میں آکر لارا کو فون پر کہا۔ ”میرے پاس آؤ۔“

وہ آگئی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے بہت بڑا دھکا لگا ہے۔ دانش میرے شکنجے سے نکل گیا ہے۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”گرودیو! کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میرا بیٹا اب تمہارے جادوئی شکنجے میں نہیں ہے؟“

”نہیں، مراد نے اپنے کسی دینی عامل سے عمل کرایا ہے۔ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا دشمن نہیں ہے۔ اسی عامل نے میرے اندر آکر مجھے نیم مردہ کیا تھا پھر دانش کے پتلے کو

میری جکڑ بندی سے نکال کر لے گیا۔"

لارا خوشی سے لہرا گئی۔ اپنی مسرتوں کو چھپاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اسے دوبارہ گرفت میں نہیں لاسکو گے؟"

"نہیں، تمہارا بیٹا ان کی فولادی گرفت میں ہے۔ میں اسے دوبارہ گرفت میں نہیں لاسکوں گا۔ وہ تمہیں چھوڑ گیا ہے۔ صرف تم میرے شکنجے میں رہو گی۔"

وہ دل برداشتہ ہوکر بولی۔ "میری عقل کہتی ہے کہ مراد نے یہ عمل نہیں کرایا ہے۔ اسے معلوم ہوتا کہ دانش اس کا بیٹا ہے تو وہ ابھی بن زیان کی موت بن جاتا اور میرے پیچھے بھی پڑ جاتا۔ یہ صرف ماروی جانتی ہے کہ مراد کا اپنا بیٹا دانش میرے پاس ہے۔ اس نے باپ کو یہ حقیقت نہیں بتائی ہے۔ لہٰذا باپ کو دانش سے نہ کوئی لگاؤ ہے، نہ وہ کسی عامل کے ذریعے اسے تم سے چھین کر لے گیا ہے۔"

"تو پھر کون لے گیا ہے؟"

"ماروی کو اپنے بھائی دانش سے لگاؤ ہے، یہ تم بھی جانتے ہو۔ وہ ہم سب سے چھپ کر اس کے پاس آتی رہتی ہے۔ اس نے دانش کو تمہاری طلسمی گرفت سے نجات دلائی ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ وہ چھوٹی سی... بچی ایسی مہاشکتی مان ہوگئی ہے کہ اس نے میری کالی شکتی کا توڑ کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔"

"گرو دیو! مان لو۔ وہ اپنے بھائی عابد علی کی طرح عجوبہ ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہے۔ کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ کیسی بچکانا اور مضحکہ خیز بات ہے کہ وہ میرے شکنجے سے دانش کے پتلے کو لے گئی ہے لیکن دانش کو تم سے چھین کر باپ کے پاس نہیں لے جارہی ہے۔"

"اس کی کوئی مجبوری ہوگی۔ ہمارا شیطان بہت عظیم ہے۔ وہ ماروی کو حقیقت کا انکشاف کرنے سے اور دانش کو مجھ سے چھین کر لے جانے سے روک رہا ہوگا۔"

وہ بولا۔ "ان کا خدا ان کے لیے عظیم ہے۔ تمہارا شیطان تمہارے لیے عظیم ہے۔ ہماری درگا میا بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ میں کالی ماں کے چرنوں میں عورتوں اور بچوں کی بلی چڑھاؤں گا تو دانش پھر میری جکڑ بندی میں آجائے گا۔"

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "یہ کیا بول رہے ہو؟"

"جو بول رہا ہوں' وہ کرو۔ اپنے بیٹے کے سر کے کچھ بال اور اس کا ایک غلیظ کپڑا میرے پاس بھیج دو۔"

"میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہاری درگا میا کی دہائی دیتی ہوں۔ میرے بچے کو کالے جادو کے عذاب میں مبتلا نہ کرو۔"

"بکواس نہ کرو۔ جو کہتا ہوں' وہ کرو۔ ورنہ پہلے کی طرح پھر تمہیں سزا دوں گا۔ تمہارا پورا بدن ان دیکھی آگ میں جلتا رہے گا۔ میرے ہاتھوں مر کر بیٹے کو مراد اور ماروی کے لیے چھوڑ جاؤ گی۔ بہتر ہے اسے میرے رحم و کرم پر چھوڑ دو اور زندہ رہو۔"

وہ رونے لگی۔ "میرے بچے پر رحم کرو۔ میں نے اسے کلیجے سے لگائے رکھنے کے لیے مراد جیسے خطرناک شخص سے دشمنی مول لی ہے۔ وہاں وہ میرے دانش کو شیطان سے چھین لیتا، یہاں تم اسے ماں سے چھین رہے ہو۔ بیٹے کا جسم میرے پاس رکھ کر جان اپنی مٹھی میں جکڑ رہے ہو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر بولا۔ "میرا دماغ ابھی تک دکھ رہا ہے۔ میرا سر نہ کھاؤ۔ جاؤ یہاں سے۔ جو کہا ہے وہ کرو۔"

اس نے سانس روک کر اسے بھگا دیا۔ وہ دماغی طور پر حاضر ہوکر چیخنے لگی۔ اسے گالیاں دینے لگی۔ پلک جھپک کر بن زیان کے پاس پہنچ کر وہاں کے حالات بتاتے ہوئے بولی۔ "ماروی نے میرے بیٹے کو کالیا کے جادو سے نجات دلائی ہے مگر وہ کتا پھر اسے اپنے جادو میں جکڑنا چاہتا ہے۔ وہ دانش کے سر کے بال اور اس کا کوئی غلیظ کپڑا طلب کررہا ہے۔ میں اس کا مطالبہ پورا نہیں کروں گی تو وہ پہلے کی طرح میرے بدن میں آگ لگائے گا۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ وہ کیسی ناقابلِ برداشت جلن ہوتی ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں کیا کروں؟ مجھے اس کتے جادوگر سے بچاؤ۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا اس خبیث کے کالے جادو سے کیسے پیچھا چھڑائیں۔ اس پر گولیاں برسائی گئیں، وہ پھر بھی زندہ رہا۔ پتا نہیں ماروی نے اسے کس طرح نیم مردہ کیا ہوگا؟ کالے جادو اور روحانی قوت کا ٹکراؤ ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا لارا..........! صرف اور صرف ماروی ہی اس سے نمٹ سکے گی۔ اسے بتاؤ کہ کالیا پھر دانش کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ پھر اپنے بھائی کے لیے ڈھال بن جائے گی۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "ہاں۔ وہی اس سے نمٹ سکے گی۔ مجھے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ دانش کو آئندہ کس طرح بچائے گی؟"

اس وقت دانش کھیل رہا تھا۔ ایک بلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو پکڑ کر اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔ "بلی کو چھوڑو میری بات سنو۔"

وہ تعجب سے بولا۔ "بلی کہاں ہے؟"

"وہ جو ابھی یہاں تھی۔ مجھے یہ بتاؤ، ماروی تمہارے پاس کب آئے گی؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ بلی نہیں تھی، آپی تھیں۔ آپ کو بلی دکھائی دے رہی تھیں؟''

لارا اور بن زیان نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ وہ...... وہ ماروی تھی؟''

وہ فوراً ہی دانش کو بازوؤں میں اٹھا کر اس کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''وہ ابھی یہیں ہوگی۔''

وہ اور بن زیان دوسرے کمرے میں آکر ٹھٹک گئے۔ ماروی ایک جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو لارا اسے بھی برداشت نہ کرتی۔ اس نے مجبوراً اس کی تعریف کی۔ ''تم بہت اچھی بہن ہو۔ تم نے اپنے بھائی کو کالیا کے جادو سے نجات دلائی ہے۔''

دانش ماں کے بازوؤں سے نکل کر دوڑتا ہوا ماروی کے پاس آکر جھولے پر بیٹھ گیا۔ وہ اعتراض نہ کرسکی۔ کالیا جیسے درندے سے وہی تحفظ فراہم کرنے والی تھی۔

بن زیان نے پوچھا۔ ''تم ماروی ہو؟ مراد علی منگی کی بیٹی ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ دانش پر جھک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ وہ آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ بن زیان نے کہا۔ ''ہم نے تمہارے باپ کو دھوکا دیا ہے۔ اس سے دانش کو چھین لیا ہے۔ یہ تم جانتی ہو۔ اس کے پاس آتی رہتی ہو۔ تم نے ہمارے فراڈ کو باپ سے کیوں چھپایا ہے؟''

وہ چپ رہی۔ دانش کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''دشمنوں سے بات نہیں کی جاتی۔ بے شک ہم دشمن ہیں لیکن روبرو آ ہی گئی ہو تو ہم سے بولو۔''

لارا نے کہا۔ ''تم نہیں بول رہی ہو لیکن ہمارا اندازہ ہے بلکہ یقین ہے کہ تم نے دانش کو کالیا کے شکنجے سے نکالا ہے۔ ہمارے کاہن نے کہا ہے کہ تم اپنے بھائی عابد علی منگی کی طرح عجوبہ ہو۔ تم روشن دنیا کی پہلی ہستی ہو جو ہماری کالی دنیا میں آتی جاتی ہو۔ ہم کالیا کو گولیوں سے چھلنی نہ کرسکے۔ تم نے اسے نیم مردہ بنا دیا تھا۔ اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ہم سے کچھ تو بولو؟''

ان کی باتیں ماروی کے لیے جواب طلب نہیں تھیں۔ اس لیے بولنا ضروری نہیں سمجھ رہی تھی۔ لارا نے کہا۔ ''تم نے اسے زندہ چھوڑ کر اپنے بھائی کے حق میں اچھا نہیں کیا ہے۔ وہ پھر دانش کو اپنے شکنجے میں لانے کے لیے مجھے مجبور کررہا ہے۔''

اس بار ماروی نے سر گھما کر لارا کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''وہ کہتا ہے میں دانش کے سر کے کچھ بال اور ناپاک کپڑا اس کے پاس پہنچاؤں۔ وہ پہلے کی طرح پھر میرے بیٹے کو جکڑ لے گا۔''

اتنی دیر بعد ماروی کے منہ سے آواز نکلی۔ اس کی زبان نے سورۃ المائدۃ کی ایک آیت ادا کی۔

بن زیان نے لارا سے کہا۔ ''یہ عربی زبان میں کچھ بول رہی ہے۔''

لارا نے کہا۔ ''یہ اپنی آسمانی کتاب پڑھ رہی ہے۔''

پھر وہ انگریزی زبان میں بولنے لگی۔ ''پاکیزگی صحت ہے۔ عبادت ہے۔ طہارت کے بغیر نہ عبادت ہوتی ہے، نہ خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ناپاکی سے بیماریاں جنم لیتی ہیں اور ناپاک ارادے پھلتے پھولتے ہیں۔ کالیا نے تمہارے ناپاک کپڑے میں تمہیں جکڑ رکھا ہے اور اب دانش کے ایک غلیظ کپڑے کا مطالبہ کررہا ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں اپنے بیٹے کی کوئی چیز اسے نہیں دوں گی۔ وہ مجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالے گا۔ میری موت کے بعد بھی دانش کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اپنے بھائی کو بچالو۔''

''ماں، اپنے بیٹے کو بہت آسانی سے بچاسکتی ہے۔ صرف اسے پاک وصاف رکھ کر۔ اسے ناپاکی سے بچا کر۔''

''وہ دانش کا ناپاک کپڑا لے کر ہی رہے گا۔''

''ناپاکی صرف کپڑے سے نہیں ہے۔ غلاظت صرف جسم کی نہیں ہوتی۔ دانش کے دل و دماغ کو بھی پاک و صاف رکھو گی تو میں اس کے ناپاک لباس کو کالیا تک پہنچنے نہیں دوں گی۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میرے بیٹے کا دل و دماغ صاف ستھرا رہتا ہے۔ یہ ابھی بچہ ہے۔ اس کے اندر کسی سے نفرت، غصہ اور دشمنی نہیں ہے۔ یہ باطن میں منفی خیالات سے پاک ہے۔''

''نہیں ہے۔ شیطان اپنی فطرت میں سرتاپا غلیظ، گھناؤنا اور بدبودار ہے۔ تم بیٹے سے اس کی پوجا کراتی ہو۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''شیطان معظم کو بدبودار نہ بولو۔''

ماروی نے کہا۔ ''خوشبو گلدان سے آتی ہے، گٹر سے نہیں آتی۔ شیطان کا وجود گہرائی تک گٹر ہے۔''

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔''

''پہلے اپنا منہ کالیا سے بچاؤ۔''

''بچالوں گی۔ تم شیطان کا احترام نہیں کروگی، اس کی انسلٹ کروگی تو اپنے بیٹے کی زندگی کے ساتھ اس کے طلسمی شکنجے میں رہا کروں گی۔ اپنی ٹیلی پیتھی سے کالیا کی کالی شکتی

سے تمہارا راستہ روکوں گی۔ تم اپنے بھائی کے پاس یہاں نہیں آسکو گی۔"

وہ ہولے ہولے جھولتے ہوئے بولی۔ "اور میں کیا کروں گی؟"

لارا اور بن زیان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "تم اپنے شیطان کی عظمت اور برتری کے لیے میرے بھائی کو داؤ پر نہیں لگا سکو گی۔ میں اسے کالیا کی گرفت میں بھی جانے نہیں دوں گی۔ وہ ناکام ہو کر یہی سمجھے گا کہ تم اپنے بیٹے کی ناپاک اترن اسے نہیں دے رہی ہو پھر وہ انتقاماً کس طرح تمہیں عذاب میں مبتلا کرے گا، یہ تو تم جانتی ہی ہو۔"

یہ ایسا چیلنج تھا کہ لارا کو چپ لگ گئی۔ اس نے بے بسی سے بن زیان کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ادھر سے کالیا! ادھر سے یہ دشمنی کر رہی ہے۔ دونوں طرف سے میری تباہی اور موت ہے۔"

بن زیان نے کہا۔ "ماروی! یہ ماں ہے۔ اس نے تمہارے بھائی کو جنم دیا ہے۔ اس سے دشمنی نہ کرو۔"

ماروی نے کہا۔ "دشمنی یہ اپنے آپ سے کر رہی ہے۔ اسے کالے جادو کو ناکام بنانے کے لیے دانش کو ناپاکی سے دور رکھنا چاہیے لیکن یہ اپنے شیطان کو نہ ناپاک تسلیم کرتی ہے، نہ دانش کو اس سے دور رکھے گی۔ ٹھیک ہے نہ رکھے۔ شیطان سے بولے کہ اسے بچائے۔ اپنے بھائی پر تو میں آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

وہ بولا۔ "لارا اسے سمجھوتا کرو۔ وہ کالیا اسے زندہ نہیں رہنے دے گا۔"

"اسے زندگی اور سلامتی طہارت سے ملے گی۔ یہ میرے بھائی کو ناپاک شیطان کے معبد میں نہ لے جائے۔ اس سے پوجا نہ کرائے تو میں اس عورت کو بھی کالیا کی عداوت سے بچاتی رہوں گی۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے بیٹے کو ہمارے شیطان دھرم سے نکال کر اپنے دین کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ میں نے مراد کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ جو باپ نہ کر سکا، وہ بالشت بھر کی بچی کرنا چاہتی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اے لڑکی! کوئی دوسری بڑی سے بڑی شرط منوالے۔ میں تیرے قدموں میں جھک جاؤں گی مگر شیطان معظم کے قدموں سے بھی مرتے دم تک لپٹی رہوں گی۔"

ماروی نے کہا۔ "میں تم لوگوں کے فراڈ کے پہلے دن سے اپنے بھائی کو تمہارے سائے میں اس لیے برداشت کر رہی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتی ہوں۔ میرا ایمان ہے اور مجھے یقین تھا کہ یہ دانش کو ہم سے چھین کر آرام و سکون سے نہیں رہ سکے گی۔ یہ بیٹا ماں کے لیے بھی مسائل پیدا کرتا رہے گا اور یہی ہو رہا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آئندہ دانش کی بہتری کے لیے راہ تبدیل کرنے کے لیے اور کیا ہونے والا ہے؟"

بن زیان نے کہا۔ "لارا......! ہم نے مراد سے دھوکا کیا ہے۔ اب کالیا سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ وہ تم ماں بیٹے کو سلامتی اور سکون سے نہیں رہنے دے گا۔ اپنے حالات پر ہر پہلو سے غور کرو صرف ماروی ہی تمہیں اس گرو گھنٹال سے نجات دلا سکے گی۔ شیطان سے تمہاری عقیدت، تمہارا اعتقاد اور تمہاری عبادت اپنی جگہ ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ ایسے وقت شیطان بھی تمہاری مشکل آسان نہیں کر سکے گا۔ جاؤ شیطان کے قدموں میں سر پٹخ کر دیکھ لو۔ کالیا کسی حال میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

وہ بے بسی سے ماروی کو دیکھنے لگی۔ ماروی نے کہا۔ "مجھے نہ دیکھو۔ کالیا کو سوچو اور ہائے ہائے کرو۔ میں ایک ہی شرط پر تمہارے کام آؤں گی۔ تم اب مجھ سے میرے بھائی کو شیطان کی عبادت گاہ میں کبھی نہیں لے جاؤ گی۔ میں دن رات یہ معلوم نہیں کر سکوں گی کہ تم دانش کے دماغ میں کس طرح ہمارے دین کے خلاف بولتی رہو گی اور اپنے شیطان کو کس طرح اس کے دل و دماغ میں نقش کرتی رہو گی۔ فی الحال مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ اپنے بھائی کو شیطان کی عبادت کرنے اور اس کے آگے جھکنے سے روک رہی ہوں۔ یاد رکھو کہ ٹیلی پیتھی اور تنویمی عمل کے ذریعے رازداری سے دانش کو شیطان کا تابعدار نہیں بنا سکو گی۔ اگر ایسی حرکت کرو گی تو میں خیال خوانی کے ذریعے تمہارے شیطانی عمل کا توڑ کرتی رہوں گی۔ اس کے بعد تم پر بھروسا نہیں کروں گی۔ تمہیں میری دشمنی کالیا سے مہنگی پڑے گی۔"

لارا نے بے بسی اور مجبوری سے بن زیان کو دیکھا۔ اس کی نظریں سمجھا رہی تھیں کہ سمجھوتا کر لو۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میرا بیٹا ہماری عبادت گاہ میں نہیں جائے گا اور تم بھی اسے اپنے دین کی طرف مائل نہیں کرو گی۔"

"یہ تو ضرور کروں گی۔ اولاد کو اس کے باپ کے دین

دا یمان کے مطابق پروان چڑھایا جاتا ہے۔ میں جو تعلیم اور ہدایات اسے دوں گی، تم ان پر اعتراض نہیں کروگی۔ میں اعتراض سنتے ہی کالیا کو تم پر حاوی کردوں گی۔ تمہاری دکھتی رگ میری ایک چٹکی میں رہا کرے گی۔''

وہ سر جھکا کر جھولے کے پاس آئی پھر اپنے بیٹے کو بازوؤں میں لے کر کہا۔'' مجھے منظور ہے۔ میں اعتراض نہیں کروں گی۔ اپنی تاریک دنیا میں جارہی ہوں۔''

وہ دوسرے ہی لمحے میں بیٹے کے ساتھ غائب ہوگئی۔ بن زیان نے جھولے کی طرف دیکھا۔ ماروی بھی جاچکی تھی۔

☆☆☆

لندن کی عدالت نے عابی کو تحریری حکم جاری کردیا تھا کہ اسے چوبیس گھنٹے کے اندر وہ شہر چھوڑ دینا ہوگا۔ بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کی رہائش گاہ کے سامنے پولیس کی کئی گاڑیاں دور تک کھڑی تھیں۔ انٹیلی جنس کا چیف اپنے دو گن مینوں کے ساتھ احاطے کے باہر اپنی گاڑی میں تھا۔ اس نے فون پر عابی سے کہا۔'' یور ہائی نس! فلائٹ کا وقت ہورہا ہے۔ آپ باہر آجائیں، ہم آپ کو ائرپورٹ پہنچائیں گے۔''

عابی نے کہا۔'' میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔ مجھے اسی شہر میں مزید کچھ عرصے تک رہنا ہے اور میں رہوں گا۔ آپ حضرات واپس جائیں۔ اپنے عدالتی احکامات کی جبراً تعمیل نہ کرائیں۔''

ٹی وی کے کئی چینلز سے خبریں نشر کی جارہی تھیں۔ کہا جارہا تھا کہ پرنس عابی کی رہائش گاہ کو گھیر لیا گیا ہے۔ وہ باہر نکلے گا تو اسے اپنی مرضی کے مطابق کہیں جانے نہیں دیا جائے گا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے ہانکتے ہوئے ائرپورٹ لے جائیں گے۔

پورے شہر میں ٹینشن پھیل گئی تھی۔ شہریوں کو اور دکانداروں کو حکم دیا گیا تھا کہ عابی کو کہیں جانے کے لیے کوئی اپنی گاڑی میں لفٹ نہ دے۔

یعنی اس کا حقہ پانی بند کردیا گیا تھا۔ شہر کی زمین تنگ کردی گئی تھی۔ صرف ائرپورٹ جانے کا راستہ کشادہ رکھا گیا تھا۔ وہ فون کے ذریعے چیف سے بول رہا تھا اور اسپیشل چینل والوں سے بھی کہہ رہا تھا۔'' میں نے یہاں کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں نے قانون کے خلاف کسی کو جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ایک عرصے سے دنیا دیکھ رہی ہے۔ میں صرف شیطانوں اور مجرموں کے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرتا ہوں پھر کیوں اس شہر سے مجھے جانے کو کہا جارہا ہے؟ قانون کے محافظو! مجرموں کو یہاں سے بھگاؤ اور امن دامان سے رہنے والوں کو رہائشی سہولتیں دو۔ میں اس شہر میں ہر طرح کی سہولتیں حاصل کرنے کا مستحق ہوں اور یہاں رہ کر حاصل کرتا رہوں گا۔''

جب وہ باہر جانے کے لیے دروازے پر آیا تو کئی چینلز کے کیمرے آن ہوگئے۔ متجسس ناظرین لائیو خبریں سننے اور دیکھنے لگے۔ وہ مکان کے احاطے سے باہر آیا تو انٹیلی جنس کے چیف نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے امید ہے، آپ قانون کا احترام کریں گے اور ہمارے ساتھ ائرپورٹ چلیں گے۔''

عابی نے کہا۔'' آپ یہ ثابت کردیں کہ میں نے اس ملک سے نکالے جانے کا کوئی جرم کیا ہے تو ابھی ائرپورٹ جاؤں گا۔''

'' آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے لیکن یہاں آپ کی موجودگی سے امن وامان خطرے میں پڑنے والا ہے۔ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ کسی بھی خطرے کے پیش نظر کسی بھی ناپسندیدہ شخص کو ملک سے باہر کرسکتے ہیں۔''

'' اور مجھے یہ ثابت کرنے کا حق ہے کہ میں ناپسندیدہ نہیں ہوں۔ ایک نیک نام پُرامن شہری ہوں۔ قانون کے محافظ میرا راستہ روک کر مجرمانہ غلطی کریں گے۔ مجھے اس شہر کی کسی دکان سے ضرورت کی کوئی چیز نہیں دی جائے گی۔ کسی ہوٹل سے کھانا نہیں ملے گا تو قانون کے محافظ مجھے بھوکا پیاسا رکھنے کا جرم کریں گے۔ یہ دنیا دیکھ رہی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ کسی جرم کے بغیر مجھے شہر بدر کرنے کی احمقانہ کوشش کی جارہی ہے۔ میں ابھی کسی اوپن ریسٹورنٹ میں جاکر کافی نوش کروں گا۔ آپ نے میری گاڑی کی چابی لے لی ہے۔ کوئی بات نہیں، میں کسی بھی گاڑی سے زیادہ تیز رفتار ہوں۔''

وہ ایک سمت گھوم کر جانے لگا۔ درجنوں سپاہی دوڑتے ہوئے سامنے آکر راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ وہ رکنے والا نہیں تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ان سے ٹکراتے ہوئے گزرنے لگا۔ وہ انہیں ہاتھوں سے نہیں ہٹا رہا تھا۔ وہ خود ہی اسے روکتے ہوئے اس سے ٹکراتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے اور وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ بڑا ہی دلچسپ اور پُرتجسس تماشا تھا کہ آگے کیا ہوگا؟ اس وقت ایک اندازے کے مطابق دنیا کے تمام ٹی وی آن ہوگئے تھے۔ لوگ اپنی مصروفیات چھوڑ کر کھانا پینا بھی بھول گئے تھے۔

سپاہیوں کی فوج اسے روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ اسے ہاتھ مارنے اور دھکے دینے کے بعد تو یہ گزر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی اور بدن کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔

پھر وہ انسانوں کی رکاوٹ ختم ہوگئی۔ دور تک بڑی بڑی گاڑیاں لاکر کھڑی کردی گئیں۔ کوئی انہیں پھلانگ کر دوسری طرف نہیں جاسکتا تھا۔ وہ تو کئی منزلہ عمارتوں کو پھلانگ کر راستہ بنالیتا تھا۔ اس نے فضا میں قلا بازی کھائی۔ ہوا میں جیسے تیرتا ہوا گیا پھر ایک گاڑی کی چھت پر پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ تمام گاڑیوں کو عبور کرکے وہاں سے دوڑتا ہوا ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہاں کی انتظامیہ کو معلوم تھا کہ وہ لندن نہیں چھوڑنا چاہے گا تو قانونی گرفت سے بچنے کے لیے پولیس اور سراغ رسانوں کو پورے شہر میں دوڑاتا رہے گا۔ لہٰذا پولیس والے شہر کے تمام علاقوں میں موجود تھے۔ فون کے ذریعے ایک دوسرے کو بتارہے تھے کہ وہ شاہراہ چھوڑ کر کس گلی میں کس علاقے کی طرف گیا ہے۔

افسران جھنجلا کر کہہ رہے تھے۔ ''وہ فولاد ہے۔ ہم اسے ہاتھوں سے پکڑ نہیں سکیں گے۔ اسے کس طرح قابو میں کیا جائے؟''

اس نے کہا۔ ''اسے گولی ماردو۔''

دوسرے نے کہا۔ ''کس جرم میں گولی ماریں؟ پھر یہ کہ گولیاں اسے لگتی نہیں ہیں اور یہ کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ ایک ریاست کا شہزادہ ہے۔ اسے سزائے موت دینے سے پہلے اس کا کوئی سنگین جرم ثابت کرنا ہوگا۔''

وہ دوسرے علاقے میں پہنچا تو وہاں مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا ہجوم تھا۔ سب ہی پرنس کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں روکنے اور عالی سے دور رکھنے کے لیے سپاہی تعداد میں کم تھے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ سڑکوں پر گاڑیاں رک گئی تھیں۔

اس نے ایک جنرل اسٹور میں آکر پوچھا۔ ''کیا میں اپنی ضرورت کی کوئی چیز یہاں سے خرید سکتا ہوں؟''

دکان کے مالک نے کہا۔ ''یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ سے کسی طرح کا لین دین نہ کیا جائے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں، قانون کے مسلح محافظ آپ کو ہاتھ بھی نہیں لگا پار ہے ہیں تو ہم آپ کو ناراض کرکے نقصان کیوں اٹھائیں۔ آپ کی جو ضرورت ہے، اس دکان سے اٹھا کر لے جائیں۔''

وہ ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آیا تو وہاں بھی دکاندار نے عدالتی حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کے آگے کافی کی ٹرے لاکر رکھ دی۔ کئی لڑکیاں کافی بنا کر پیش کرنے کے لیے اس کے قریب آرہی تھیں۔

وہ ابھی پولیس کے دھکے کھا کر آیا تھا۔ حسیناؤں کے دھکے اس کے ہوش اڑانے والے تھے۔ وہ وہاں سے اچھل کر چھلانگیں لگاتے ہوئے ان کی نظروں سے اوجھل ہوکر اسپیشل چینل کے اسٹوڈیو میں آگیا۔ اس نے کیمرے کے سامنے آکر کہا۔ ''یہ دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس ملک کے عوام مجھے کس قدر چاہتے ہیں۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ عوام چاہتے ہیں اور حکومت نہیں چاہتی کہ میں محبت کرنے والوں کے درمیان محبت سے رہوں۔ میں اس وقت عوام کی عدالت میں ہوں اور پوچھتا ہوں کہ یہاں کے حکام اور قانون کے محافظ مجھ سے نفرت کیوں کررہے ہیں؟ یقیناً ان کی نفرت کے پیچھے کوئی اہم راز ہے۔ ان کی کوئی ایسی کمزوری ہے جسے چھپانے کے لیے وہ مجھے یہاں سے دور بھگا دینا چاہتے ہیں۔ میں بتارہا ہوں کہ شیطان کے پرستاروں سے دوستی اور اتحاد کرنا ان کی کمزور حکمتِ عملی ہے۔ یہ حقیقت وہ دنیا والوں سے چھپا رہے ہیں کہ انہوں نے شیطانی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ہم مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تاریک دنیا کے پانچ خیال خوانی کرنے والوں کو گلے لگایا ہے۔ جن میں دو ٹیلی پیتھی جاننے والے ہارودا اور ابھی بالا کو ہم نے جہنم میں پہنچادیا ہے۔ انہوں نے ہماری دنیا میں آتے ہی مجھ سے دشمنی کی۔ لارا نے میرے بابا جانی کو ٹریپ کرنا چاہا۔ انہوں نے مذاہب کے خلاف دشمنی کی ابتدا ہم باپ بیٹے سے کی ہے اور دوسرے مذاہب کے حکمرانوں اور سیاستدانوں کو دوست بنارہے ہیں۔ یہ کھلی حقیقت آپ کے سامنے ہے لیکن نہیں، یہ حقیقت وہ سامنے نہیں لارہے ہیں۔ مجھے یہاں سے نکال دینے کے بعد پھر ان کے خلاف بولنے والا اور ان شیطانوں کو یہاں سے نکالنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور یہ تو میں کہہ چکا ہوں، یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ دو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے بعد باقی تین کو بھی نابود کرنے کے بعد یہاں سے جانے کے لیے سوچوں گا۔''

بن زیان، یہودی اکابرین، سپر پاور اور اتحادی ممالک کے حکمران اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ''یہ دنیا والوں کو ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ شیطان کی پوجا کرنے والے ہماری دنیا کے مذاہب کو کمزور بنائیں۔''

ایک اعلیٰ حکمران نے کہا۔ ''اور ہم مذاہب کے

خلاف ان سے دوستی کر رہے ہیں۔ ان کی ٹیلی پیتھی کا ہتھیار ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم ان خیال خوانی کرنے والوں سے دیگر سیاسی معاملات میں بھی کام لے رہے ہیں اور بڑی کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔"

بن زیان نے کہا۔ "وہ ٹیلی پیتھی جاننے والے سیاسی شطرنج کی بساط پر جنگ لڑنا نہیں جانتے۔ آبنوس اسی لیے عالی کے مقابلے میں ناکام رہا تھا۔ اب وہ تینوں ہماری ذہانت اور حکمتِ عملی کے مطابق خیال خوانی کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے براہِ راست عالی کے مقابلے پر نہ آ کر سلامتی سے زندگی گزار رہے ہیں۔"

وہ چینل کے ذریعے حقیقت سے انکار کر رہے تھے۔ ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو شیطان کہہ کر نفرت ظاہر کر رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ "عالی کا کیا کیا جائے؟ جب وہ ریاست میں گوشہ نشین تھا تو ہمیں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں وہ باپ بیٹے ہماری لاعلمی میں کیا کر رہے ہیں؟ اب وہ لندن میں آیا ہے اور خود کو ظاہر کر چکا ہے لیکن پہلے سے زیادہ خطرات سر پر منڈلانے لگے ہیں۔ وہ گلے کی ہڈی بن گیا ہے۔ نہ اُسے اگل سکتے ہیں، نہ نگل سکتے۔"

بن زیان نے کہا۔ "اسے چبا جانا ہوگا۔ کسی بھی طرح اسے نابود کرنا ہوگا۔ اس کی موت سے پہلے خود کو موت سے بچانے کی تدبیر کرنی ہوگی۔ ہمارا ایک اعلیٰ اہم عہدیدار کریگ ہوسٹن اس کے ہاتھوں مرنے والا تھا۔ ہم نے بڑی تدبیر سے سودے بازی کر کے اسے بچایا ہے۔ آئندہ وہ کوئی سمجھوتا نہیں کرے گا۔ ہم اس کے ہتھے چڑھتے ہی مارے جائیں گے۔"

وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے سے بولنے لگے۔

"ہے کوئی تدبیر؟ ہے کوئی طاقت اس فولادی روبوٹ سے بچانے والی؟"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اپنی سلامتی کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ اسے ہماری موت بننے سے روک سکتے ہیں۔"

وہ سب ہی بن زیان کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "میں نے اور لارا نے دیکھا ہے۔ کالیا پر بھی گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن وہ اسے نہیں لگیں۔ اس نے اپنے چاروں طرف کالی شکتی کی دیوار اٹھا رکھی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ عالی کو بھی گولیاں نہیں لگتی ہیں۔ ٹیلی پیتھی جاننے والے سوچ کی لہروں کے ذریعے اس کے دماغ تک اس کے جسم تک پہنچ نہیں پاتے ہیں۔ ہماری دنیا میں ایسے عامل کامل ہیں' جو اپنے پراسرار عمل کے ذریعے عارضی طور پر حصار باندھتے ہیں۔"

"کیا آپ ایسے کسی عامل کامل کو جانتے ہیں؟"

"دو زبردست عامل کو جانتا بھی ہوں اور ان کی خدمات بھی حاصل کر چکا ہوں۔ ان میں سے ایک تبت کا لامہ کیشورا کا ہے۔ وہ آدھی رات کے بعد مجھ پر عمل کیا کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ آج سے تین دنوں کے بعد حصار بندی مکمل ہو جائے گی۔ پھر پرنس عالی اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں سے مجھ پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ نہ بندوق کی گولیاں اور نہ ہی اس کے ہتھوڑے جیسے ہاتھ مجھ تک پہنچ سکیں گے۔"

وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے مسٹر زیان! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ روبوٹ مارنے آئے اور تم نہ مرو؟"

وہ بولا۔ "مجھے بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔ آج سے ٹھیک تیسرے دن وہ آخری عمل پڑھے گا اور میں ایک نظر نہ آنے والے محفوظ قلعے میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ حضرات کے سامنے آزمائش ہوگی۔ مجھ پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ وہ مجھ تک نہیں پہنچیں گے۔ میں محفوظ رہوں گا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

"بے شک تم بھی عالی کی طرح ناقابلِ شکست بن جاؤ گے۔ اوہ گاڈ! کیا ایسا ممکن ہوگا؟"

ایک عہدیدار نے کہا۔ "ہم تین دنوں تک بے چین رہیں گے۔ کامیابی ہوگی تو پہلے میں خود پر عمل کراؤں گا۔ اس کمبخت عالی کی دہشت سے نجات پاؤں گا۔"

تمام اعلیٰ عہدیدار اور یہودی اکابرین کہنے لگے کہ پہلے ان پر حصار بندی کا عمل کرایا جائے گا۔ وہاں سب ہی اپنی انا کے خول میں رہنے والے تھے۔

سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "مسٹر زیان! وہ دوسرا عامل کون ہے؟ اسے بھی میرے پاس لایا جائے۔ میں کوئی دوسری بات نہیں سنوں گا۔"

بن زیان نے کہا۔ "وہ دوسرا بہت ہی خطرناک افریقی جادوگر زوبی گانگا ہے۔ میں نے اسے لارا کی خدمت کے لیے مامور کیا ہے۔ وہ بھی آدھی رات کے بعد اس پر حصار بندی کا عمل کرتا رہتا ہے۔"

اعلیٰ حاکم اور دوسرے اکابرین یہ سنتے ہی غصے سے بھڑک گئے۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ لارا کی کیا اہمیت ہے؟ آپ نے کیوں اسے ہم پر ترجیح دی ہے؟"

وہ بولا۔ "لارا میری زندگی میں سب سے زیادہ

اہمیت رکھتی ہے۔ اپنی ٹیلی پیتھی کے ذریعے میرے کئی پیچیدہ معاملات سے مستفی رہتی ہے۔ میں بھی اس کے سنگین معاملات میں اس کے کام آتا رہتا ہوں۔ وہ آج کل ماروی کی روحانی قوتوں اور کالیا کی کالی شکتی کے درمیان بڑی اذیت ناک مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ میں ہر حال میں پہلے اسے مصیبتوں سے نجات دلانے کی کوششیں کررہا ہوں۔ افریقی زومبی گاکنا نے دعویٰ کیا ہے کل آدھی رات تک وہ حصار بندی کے قلعے میں محفوظ ہوجائے گی۔"

کئی اکابرین جھنجلانے لگے۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم اسے اپنی ذات سے بھی زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "میں ہوس پرست نہیں ہوں۔ عورتوں کے معاملات میں پتھر ہوں۔ ہم دونوں ان باپ بیٹے سے اور کالیا سے نجات پانے اور انہیں زیر کرنے کی تدابیر پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ کل آدھی رات کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔"

کئی حکمران اور اکابرین نے کہا۔ "ہم لامہ کیشورا کا اور زومبی گاکنا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے معاملات خود ان سے طے کریں گے۔"

"آپ حضرات سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ دو عامل آپ کی بھیڑ میں پاگل ہوجائیں گے۔ آپ سب ہی انہیں اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ انہیں پہلے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے۔ یوں آپ سب آپس میں ہی دشمن بن جائیں گے۔ پلیز! دشمن کو مارنے سے پہلے خود ہی مرنے کا سامان نہ کریں اور نہ میں ایسا کرنے دوں گا۔ میں نے ان دو عاملوں کو بھاری قیمت پر خرید لیا ہے۔ وہ اگلے چھ ماہ تک نہ کسی سے ملیں گے اور نہ ہی کسی کے کام آئیں گے۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے غصے سے کہا۔ "یعنی ہم تمہارے محتاج بن کر رہیں گے؟"

"محتاج نہیں، دانشمندی ہوگی۔ عالی کو ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

بن زیان انتہائی ذہین اور چالباز تھا۔ اپنے لوگوں کو غلطیوں سے باز رکھنے کی کوششیں کررہا تھا۔ تمام مخالفین ایک طویل مدت سے مراد اور عالی کے مقابلے میں ناکام ہوتے آرہے تھے۔ بن زیان زبردست شطرنجی چالیں چلنا جانتا تھا۔

تمام بڑے اور اہم ممالک سے وہ عالی کے قدم اکھاڑ رہا تھا۔ وہ ممالک اسے اپنے ملک میں ایک دن کے لیے بھی آکر رہنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ بن زیان اس طرح عالی کو قوانین کے خلاف لڑنے پر مجبور کررہا تھا۔ ابھی لندن پہلا شہر تھا، جہاں وہ جبراً قیام کررہا تھا۔ آئندہ بے شمار ممالک اپنی سرحدیں بند کرنے والے تھے۔

بن زیان مراد کو ایک بڑا نقصان یہ پہنچا رہا تھا کہ باپ کو بیٹے سے محروم کرچکا تھا۔ دین کے حوالے سے یہ خسارہ تھا کہ بیٹا شیطانی ماحول میں پرورش پا رہا تھا اور دین و ایمان سے جا رہا تھا۔ ماروی اسے شیطان سے دور رکھنے کی ایک کامیاب کوشش کررہی تھی۔ لارا نے فی الحال اس کی بات مان لی تھی۔ لیکن آگے بازی پلٹنے والی تھی۔ بن زیان کے لائے ہوئے تبت اور افریقا کے پراسرار عامل کامل نئے گل کھلانے والے تھے۔

وہ جادوئی ہتھکنڈوں سے اپنی سلامتی کو یقینی بنا رہے تھے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ عالی کو جادو ٹونے سے نہ مار سکیں گے اور نہ ہی وہ مخالفین اس کا پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ دشمنوں کو مات دینے والے تجربہ کار فوجیوں سے مشورے کررہے تھے۔ سائنسی تجربہ گاہوں میں فولادی روبوٹس تیار کیے جارہے تھے۔ جو شہ زور، جنگجو اور سخت جان تھے۔ انہیں سر سے پاؤں تک زرہ بکتر یعنی لوہے کا لباس پہنا کر جنگ لڑنے کی تربیت دی جارہی تھی۔

اس بار طے کیا گیا کہ لوہے کا لباس پہن کر اسے گھیرا جائے گا اور اس سے دور رہ کر لوہے کی سلاخوں سے، خنجروں اور تلواروں سے اس پر حملے کیے جائیں گے۔

اسے کئی طرح سے چکل ڈالنے کی پلاننگ ہورہی تھی۔ اس کے حلق تک زہر پہنچانے کی تدبیر بھی سوچی جارہی تھی۔ کہتے ہیں نازک اندام عورتوں سے زیادہ کوئی قوی نہیں ہوتا۔ ایسی کوئی عورت عالی کی زندگی میں آجائے تو وہ ضرور چاروں شانے چت ہوجائے گا۔

یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ عورت عالی کی کمزوری بن گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے دو شریکِ حیات کے ساتھ جو جذباتی مسرتیں حاصل ہوئی تھیں۔ انہیں وہ بھلا نہیں پا رہا تھا۔

کتنی ہی حسین لڑکیاں آئے دن اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتی رہتی تھیں۔ کتنی ہی اس پر جان دیتی تھیں۔ نکاح کے دو بول پڑھاتے ہی کوئی بھی اس کی خلوت میں چلی آتی لیکن وہ جلد بازی میں کسی سے دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اپنے بابا جانی کو لارا سے فریب کھاتے دیکھ چکا تھا۔

جب وہ لندن میں روپوش رہتا تھا تب ایک حسینہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے چیلسی پارک کے ایک ایسے گوشے میں دیکھا تھا' جہاں تفریح کرنے والوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ وہ بڑے سکون اور اطمینان سے مغرب کی نماز ادا کر رہی تھی۔

یورپ کے کسی ملک' کسی ماحول میں ایسے نمازی دکھائی نہیں دیتے۔ مسجد میں یا گھروں میں نمازیں پڑھ لی جاتی ہیں۔

پارک میں تفریح کرنے والے مسلم اور غیر مسلم وہاں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔ ایک سمت جانے لگی' کچھ عورتیں کچھ ہٹے کٹے جوان اس کے پیچھے چلتے ہوئے اسے چھیڑنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''گاڈ سے ملاقات کر لی۔ اب ہم سے بھی کرو۔''

عابی نے سامنے آ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہو چکا۔ تمہارا دین تمہارے ساتھ اس کا دین اس کے ساتھ۔ پلیز! اسے جانے دو۔''

وہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر عابی کو دیکھا۔ ان دنوں وہ بہروپ میں رہا کرتا تھا۔ دو تگڑے جوانوں نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ راستے سے ہٹو۔ ہم اس سے ذرا تفریح کر رہے ہیں۔''

ایک نے عابی کے سینے پر ہاتھ مار کر اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹانا چاہا۔ اسے اک ذرا سا ہلا نہ سکا۔ حیرانی سے بولا۔ ''یارو! یہ تو زمین میں گڑا ہوا کھمبا ہے۔ ہلتا ہی نہیں ہے۔''

دوسرے دو ساتھیوں نے بھی اسے پکڑ کر دھکے دیے پھر خود ہی جھٹکے کھا کر پیچھے چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ''بھئی کون ہو تم؟ ہم باڈی بلڈر ہیں۔ آؤ پنجہ لڑاؤ۔ معلوم تو ہو' کیا چیز ہو؟''

عابی نے پانچوں انگلیاں آگے بڑھائیں۔ باڈی بلڈر نے اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنسا دیں پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ پھنس گیا ہے۔ صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ لوہے کے شکنجے میں ہے۔ ان آہنی انگلیوں کو موڑنا تو دور کی بات ہے' وہاں سے اپنی انگلیاں نکال بھی نہیں سکے گا۔

دوسرے باڈی بلڈر نے بھی اپنا پنجہ آگے بڑھایا پھر دونوں ہی پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نے کہا۔ ''واقعی زبردست ہو۔ ہمارا ہاتھ چھوڑ دو۔''

عابی نے کہا۔ ''آئندہ کسی عبادت کرنے والے کا مذاق نہیں اڑاؤ گے اور اس لڑکی کے پیچھے نہیں جاؤ گے۔''

انہوں نے وعدہ کیا۔ عابی نے دونوں کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی انگلیاں سہلانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''ہم نے پرنس عابی کے متعلق سنا ہے۔ وہ ایسا ہی طاقتور ہے۔''

اس لڑکی نے چونک کر عابی کو دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا لیکن وہ پرنس عابی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تمام باڈی بلڈر اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ وہ قریب آ کر بولی۔ ''شکریہ۔ آپ نے طاقت سے منوایا ہے۔ ورنہ یہ آسانی سے پیچھا نہ چھوڑتے۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم اکیلی ہو؟''

''میری تین سہیلیاں ہیں۔''

''وہ نماز نہیں پڑھتیں؟''

''نہیں۔ ان تین میں سے ایک عیسائی ہے، دو یہودی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ ہمارے درمیان مذہبی معاملات پر کبھی بحث یا جھگڑا نہیں ہوتا۔ کیا میرے ساتھ کافی پینا چاہو گے؟ میرا نام لیلیٰ ہے...... اور تمہارا؟''

''میرا نام حمزہ ہے۔ تم سہیلیوں کے ساتھ ہو۔ سوری لو سے...... میں لڑکیوں سے دور رہتا ہوں۔ کافی پھر کبھی۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''تو، ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ تم نے مجھے سیکیورٹی دی ہے۔ میں تمہارے ساتھ کافی پیوں گی۔ سہیلیوں کو فون پر سوری کہہ دیتی ہوں۔''

وہ لیلیٰ سے پہلی ملاقات تھی۔ اس نے ایک طویل مدت کے بعد ایک حسینہ کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ پھر بھی فون پر بھی رو برو ملاقات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہ اپنے طور پر معلومات حاصل کرتا رہا۔ ماسٹر کو بوبو کے جاسوس اس کی معلومات کا ذریعہ تھے۔

یہ معلوم ہوا کہ اس کا باپ سید قاسم درویش واقعی درویش صفت انسان ہے۔ گوشہ نشین رہ کر عبادت کرتا رہتا ہے اور علم فلکیات کے حصول میں غرق رہتا ہے۔ اس کی ستارہ شناسی اور پیش گوئی مستند ہوتی ہے۔

تمام بڑے ممالک کے حکمران اپنے پیچیدہ سیاسی معاملات کے سلسلے میں اس سے رجوع کرتے تھے اور وہ تقریباً صحیح پیش گوئی کرتا تھا۔

دنیا کے امیر ترین تاجروں کی فون لسٹ میں اس کا نام درج رہتا تھا۔ وہ نفع و نقصان کے گراف میں اوپر نیچے جانے سے پہلے ہی انہیں کبھی خوش خبری اور کبھی بری خبریں

سنادیتا تھا۔

وہ بے انتہا دولت مند، کامیاب اور خوش نصیب نجومی تھا۔ لیکن اولاد کے حوالے سے بدنصیب تھا۔ ویسے اولاد تو تھی۔ سات بیٹیاں تھیں، بیٹا ایک بھی نہیں تھا۔

اس نے اپنا جو زائچہ بنایا تھا، اس کے مطابق نرینہ اولاد اسے سات بیٹیوں سے ملنے والی تھی۔ اسے بیٹے نہیں، سات نواسے ملنے والے تھے۔ وہ اپنے نانا کے سائے میں رہنے والے تھے۔ وہ ساتوں علوم وفنون کے حوالے سے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے حوالے سے غیر معمولی اور عجیب وغریب کہلانے والے تھے۔

کچھ عرصے بعد عابی کی غیر معمولی جسمانی شہ زوری اور ذہنی صلاحیتوں کا چرچا ہونے لگا اور وہ عجوبہ کہلانے لگا تو سید قاسم درویش نے اس کا زائچہ بنایا۔ وہ زائچہ کیا تھا' ایک آئینہ تھا۔ اس آئینے میں وہ خود کو اور پرنس عابی کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

جب وقت اور حالات گزر جاتے ہیں تب ان کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں لیکن پیش گوئی وقت اور حالات کے پیش آنے سے پہلے زائچے میں آگئی تھی اور عجیب ناقابلِ قبول کہانی سنا رہی تھی۔

فی الحال جھلک یہ تھی کہ پرنس عابی اس کی بیٹیوں کی زندگی میں آئے گا اور وہ سات عجیب وغریب صلاحیتوں کے حامل نواسے عابد علی منگی سے ہوں گے۔

یہ ماننے والی بات نہیں تھی۔ زائچہ وہ کہہ رہا تھا' جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پہلی بات یہی غلط تھی کہ عابی سات بہنوں کو اپنی شریکِ حیات بنائے گا۔ وہ تو دین کے اور تہذیب کے خلاف کبھی ایسا نہ کرتا۔ درویش کو پہلی بار اپنے زائچے پر شبہ ہوا کہ وہ درست نہیں ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

پرنس عابی سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی اور کیوں نہ بڑھتی۔ یہ بات دماغ میں گردش کر رہی تھی کہ زائچہ درست ہوگا تو اولادِ نرینہ کی کمی حیرت انگیز طریقے سے پوری ہوگی۔ اس کے گھر میں اس کے خاندان میں سات غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل عجوبہ کہلانے والے نواسے آئیں گے۔ اس دنیا کے تمام حکمران' تمام مخالف قوتیں اس کی دھونس میں رہا کریں گی۔

وہ وقتاً فوقتاً ستاروں کی چال سے عابی کے عمل اور ردِعمل کو دیکھنے اور سمجھنے لگا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ مشاہدہ اور مطالعہ کرنے لگا۔ یہ معلوم ہوا کہ اپنی اور عابی کی زندگی میں نمبر سات مشترک ہے۔

اس کی سات بیٹیاں ہیں اور سات نواسے جنم لیں گے اور عابی کے نصیب میں سات بیٹے ہیں اور کوئی بیٹی یا بیٹا نہیں ہوگا۔ سات کا عدد ہمیشہ اس کے لیے خوش نصیبی لائے گا۔

اس رات لیلیٰ گیارہ بجے گھر واپس آئی۔ قاسم درویش معمول کے مطابق اپنے تاریک بیڈروم میں مصلے پر بیٹھا تھا۔ عبادت کے بعد ستاروں کی گردش میں بھٹک رہا تھا۔

لیلیٰ نے زیرو پاور کے بلب کو آن کیا۔ باپ نے کہا۔ ''آؤ، میں نے جیسے ہی ساتویں بار درود شریف پڑھا، تم آگئیں۔ کوئی اچھی بات ہونے کو ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو۔''

وہ پاس آکر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ''آپ نے پرنس عابی کے متعلق پیش گوئی کرکے اسے ہمارے ذہنوں میں نقش کردیا ہے۔ ہم تمام بہنیں اسی کے خواب دیکھتی رہتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے' جو آپ کا زائچہ کہتا ہے؟''

''یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ تم آتے ہی اس کا ذکر کر رہی ہو۔ کیا آتے جاتے اور راستہ چلتے ہوئے بھی اس کا خیال آتا ہے؟''

''آج تو ایک ایسے قدآور باڈی بلڈر سے ملاقات ہوئی ہے جو بالکل پرنس عابی لگ رہا تھا۔''

درویش نے بے اختیار میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''آج سات تاریخ ہے۔''

''پاپا! وہ صورت شکل سے پرنس نہیں تھا لیکن جسمانی طور پر ویسا ہی شہ زور تھا۔ اسے دو باڈی بلڈر نے دھکے دے کر راستے سے ہٹانا چاہا تو خود ہی جھٹکے کھا کر پیچھے چلے گئے۔ وہ دونوں اس سے پنجہ نہ لڑا سکے۔ ہار مان گئے تھے۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ہماری دنیا میں عابی جیسے کئی شہ زور ہوں گے لیکن وہ سات تاریخ کو ملنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ سات ستاروں کی کہکشاں سے گزر رہا ہو اور تمہیں نظر نہ آیا ہو۔ اس سے رابطہ رکھو۔ میں اس سے ملوں گا۔ انشاء اللہ اسے پہچان لوں گا۔ یا خدا......! آج سات تاریخ ہے۔''

ادھر عابد علی منگی بھی اس سے متاثر ہوا تھا۔ اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنے بابا جانی سے اپنی ضرورت بیان کرچکا تھا۔ اس نے دوسرے دن لیلیٰ سے فون پر بات کی۔ ایک نامحرم سے خوب سوچ سمجھ کر ملنا چاہتا تھا۔

ماسٹر کو یوبو نے معلومات حاصل کرنے کے بعد بتایا کہ سید قاسم درویش ایک مشہور و معروف معتبر اور مستند ستارہ شناس ہے۔ عبادت گزار ہے اور گوشہ نشین رہ کر علوم فلکیات میں غرق رہتا ہے۔ آدم بیزار ہے۔ صرف ضرورت مند لوگوں سے ملتا ہے اور ماسٹر نے یہ بھی بتایا کہ اس کا کوئی وارث بیٹا نہیں ہے۔ وہ ستارہ شناس جانتا تھا کہ بیٹے کا باپ کبھی نہیں بن سکے گا۔ پھر بھی اس نے ایک کے بعد کئی شادیاں کیں اور بیٹیوں کا باپ بنتا چلا گیا۔ آج اس کی سات جوان بیٹیاں ہیں۔ لیلیٰ سب سے بڑی بیٹی ہے۔

عالی ان دنوں اٹھارہ برس کا تھا۔ لیلیٰ ستائیس برس کی تھی لیکن اس پہاڑ کے آگے سترہ برس کی لگتی تھی۔ وہ موجودہ معلومات سے مطمئن تھا۔ وہ باپ بیٹی اور بہنیں سب ہی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ مغربی ماحول میں رہنے کے باوجود بے لگام نہیں تھیں۔ حجاب میں رہا کرتی تھیں۔

پھر ایک دن لیلیٰ نے اور اس کے باپ درویش نے اسپیشل چینل کی اسکرین پر پرنس عابد علی منگی کو دیکھا۔ وہ طویل گوشہ نشینی کے یا دشمنوں سے روپوشی کے بعد اصلی چہرے کے ساتھ منظر عام پر آ گیا تھا۔

باپ نے کہا۔ ''بیٹی! یہ اصلی ہمارے سامنے ہے اور وہ تم سے ملنے والا حمزہ ہے۔''

وہ بولی۔ ''پاپا! حمزہ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں اسے چاہنے لگی ہوں۔''

''تم مقدر کے خلاف حمزہ کی سمت نہیں جا سکو گی۔ جو لوح مقدر پر لکھا ہے' وہی ہونے والا ہے۔''

''آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ناکامی ہو گی۔ پرنس کبھی سات بار آپ کا داماد نہیں بنے گا۔''

''ہم کوشش کریں گے۔ تدبیر کریں گے۔ پہلے کوئی پیچیدہ سی بات ناممکن لگتی ہے مگر پھر وہی انسانی عزم اور حوصلے سے ممکن ہو جاتی ہے۔''

عالی نے اسی رات لیلیٰ کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ ''ہیلو! میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔''

لیلیٰ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بولی۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ حمزہ ہیں۔ میں آپ کے لب و لہجے کو اچھی طرح پہچاننے لگی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے پرنس کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔''

''وہ حمزہ میرے لب و لہجے میں بولا کرتا تھا۔ اب میں اس کی آواز میں بول رہا ہوں۔ اس حمزہ نے میرے چہرے کو بدل دیا تھا۔ اب میں نے اسے بدل دیا ہے۔ وہ اب کبھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ سچ بولیں۔ کیا آپ حمزہ بن کر مجھ سے ملتے رہے ہیں؟''

''ہاں۔ اب یہ تماشا نہیں کرنا چاہتا۔ جلد سے جلد تمہیں اپنی شریک حیات بنا لینا چاہتا ہوں۔ ابھی تمہارے گھر آؤں گا۔ تمہارے پاپا راضی ہو جائیں گے تو کل ہی تمہیں اپنی منکوحہ بنا لوں گا۔''

سید قاسم درویش کی زندگی میں اور اس کے گھرانے میں بہت ہی خوشگوار دھماکا ہوا۔ زائچے کے کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ جگمگانے لگے تھے۔ زائچے کی وہ تحریر اب تک خواب جیسی تھی اب تعبیر بننے والی تھی۔

باقی چھ بہنیں بھی مسرتوں سے سرشار ہو رہی تھیں۔ دنیا جہان کی حسینائیں جس کی ہوس میں پاگل ہوتی رہی تھیں' وہ شہزادہ ان کے گھر چل کر آ رہا تھا۔

درویش کو جتنی خوشی حاصل ہوئی' اتنی ہی فکر بھی مسلط ہو گئی۔ یہ بات دماغ کو لگ رہی تھی کہ شہزادہ عابد علی منگی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ سات بار اس کا داماد بن کر اپنی شاہانہ شخصیت کو بھی ٹھیس پہنچانے والا نہیں تھا۔

قاسم درویش کے اندر سات غیر معمولی صلاحیتوں والے عجیب و غریب نواسے چیخ رہے تھے کہ انہیں دنیا میں آنا ہے اور اپنے باپ عالی سے زیادہ دلچسپ تماشے کرتے ہوئے عزت' شہرت' دولت اور طاقت حاصل کرنا ہے اور پوری دنیا کا واحد حکمران بن کر رہنا ہے۔

درویش کے سامنے بہت بڑی اور بہت مشکل بازی تھی جسے جیت لینا تھا۔ اس کا تجربہ اور حوصلہ کہہ رہا تھا کہ جیت لے گا۔ ایک ذرا دیانتداری سے ہٹ کر ذرا سچ ذرا جھوٹ بول کر باتیں بنانی ہوں گی۔ کوئی سی بھی جنگ جیتنے کے لیے چالیں چلنی ہی پڑتی ہیں۔

مراد نے درویش کو فون پر مخاطب کیا۔ ''محترم سید قاسم درویش صاحب! میں ریاست ارض اسلام کا فرماں روا مراد علی منگی عرض کر رہا ہوں۔''

درویش نے کہا۔ ''یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ آج کا دن میرے لیے یادگار رہے گا۔ میں بسر و چشم آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ حکم کریں۔''

''میں نے حکم دینے کے لیے نہیں' آپ سے کچھ مانگنے کے لیے کال کی ہے۔ اصولاً مجھے آپ کے در پر آ کر مانگنا چاہیے لیکن میں ہزاروں میل دور ہوں۔ اس لیے میرا بیٹا آپ کے در پر آئے گا۔ اس سے پہلے یقین کرنا چاہتا

ہوں کہ آپ اس کی مراد پوری کریں گے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ یقین کرلیں۔ آپ کے صاحبزادے میرے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔"

اس طرح فون پر ہی رشتہ طے ہوگیا۔ عابی تصدیق کے لیے ان کے گھر آرہا تھا۔

وہ آیا تو درویش نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اسے گلے لگا کر دعائیں دیں پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے ایک ایک بیٹی کو بلایا۔ پہلے لیلیٰ آئی۔ اس نے شرما کر سر جھکا کر اسے سلام کیا۔ وہ بولا۔ "میری اس بیٹی سے مل چکے ہو اور آج ہماری ملاقات اسی کے لیے ہو رہی ہے۔ بیٹی! تم جاؤ اور شیریں کو بھیج دو۔"

وہ گئی تو لیلیٰ کے بعد شیریں آگئی۔ پھر ہیر، سوہنی، صاحباں، سسی اور جولیٹ یکے بعد دیگرے آنے لگیں۔ وہ سب حسین و جمیل تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ وہ سب اپنی جھلک دکھا کر واپس چلی گئیں۔

پھر کھانے پینے کی ڈشیں آنے لگیں۔ درویش نے کہا۔ "تمہارے بابا جانی نے بات چھیڑی ہے۔ میں کسی تکلف کے بغیر رشتہ قبول کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میرا پیشہ ہے، اس کے مطابق کوئی کام کرنے سے پہلے میں ستارہ شناسی کے علوم سے استفادہ کرتا ہوں۔"

عابی نے کہا۔ "بے شک! آپ نے علوم فلکیات میں حیرت انگیز مہارت حاصل کی ہے۔ یہ عالمی ریکارڈ ہے کہ آپ کی پیش گوئیاں پچانوے فیصد درست ہوتی ہیں۔ باقی پانچ فیصد بھی غلط نہیں ہوتیں، کمزور ہوتی ہیں۔"

"میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہ میری زندگی میں بہت بڑی کمی ہے۔ میں نے اپنا زائچہ بنایا ہے۔ اپنی علمی مہارت سے معلوم کیا ہے۔ مقدر میں لکھا ہے کہ بیٹا کبھی نہیں ہوگا۔ نواسے ہوں گے۔ میری بیٹیاں سات قابلِ فخر نواسے میری گود میں دیں گی۔"

"چلیں۔ اس طرح بیٹے سے محروم رہنے کے تکلیف دہ احساسات کم ہو جائیں گے۔"

"ہاں لیکن میری بیٹیوں کی شادی خانہ آبادی عجیب حالات میں ہوگی اور ایک ہی شخص سے ہوگی۔"

عابی نے چونک کر پوچھا۔ "ایک ہی باپ کی بیٹیوں کی شادی کبھی ایک شخص سے نہیں ہوسکتی۔ یہ سراسر دین کے اور تہذیب کے خلاف ہے۔"

"بے شک! ہم مسلمان ہیں۔ اپنے دینی احکامات کے خلاف کوئی کام کبھی کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن جو ناجائز ہے وہ جائز ہو جائے تو اسے کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ایک ہی شخص کی کئی بہنوں سے شادی جائز نہیں ہوسکتی۔ دنیا کا کوئی قانون ایسی شادیوں کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔ کسی بھی حیلے بہانے سے ایسے رشتے ہو ہی نہیں سکتے۔"

"میرا علم کہتا ہے، یہ میری بیٹیوں کے مقدر میں لکھا ہے کہ وہ سات ماہ سے زیادہ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکیں گی۔ اگر سات ماہ کے آخر تک شوہر نے اسے طلاق نہ دی تو وہ مر جائے گی۔ بیٹے عابی! میری اور تمہاری زندگی میں سات کا عدد بہت اہم ہے۔ تم اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے طلاق دو گے، تب ہی وہ سات ماہ کے بعد زندہ رہ سکے گی۔ ورنہ موت لکھی ہوئی ہے۔"

"اگر میں آپ کی بیٹی سے شادی نہ کروں تو؟"

"اس کی شادی کسی سے بھی ہو۔ ساتویں ماہ کے اختتام تک شوہر اسے طلاق دے گا، تب ہی اسے نئی زندگی ملے گی۔"

"میرا ذہن نہیں مان رہا ہے کہ ایسا ہوگا۔ کسی کو طلاق نہ دینے سے وہ مر نہیں جاتی ہے۔"

"ایسا کسی کے ساتھ نہیں ہوتا ہے لیکن میری بیٹیوں کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ایسا ضرور ہوگا۔ ذرا غور کرو۔ کاتب تقدیر نے ناجائز کو کس طرح جائز کیا ہے۔ پہلی بہن کے لیے طلاق لازمی کردی ہے تاکہ دوسری سے نکاح جائز ہو جائے۔" عابی اس نکتے پر حیرانی سے سوچنے لگا۔ واہ...... خدا کے بندے بھی کیا کمال کرتے ہیں؟ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید بنا دیتے ہیں۔ اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں میں بڑی باریک بینی سے ترمیم اور اضافہ کر کے ناجائز کو جائز قرار دیتے ہیں۔

"آپ اپنی مہارت سے درست پیش گوئی کرتے ہیں پھر بھی پیش گوئی سو فی صد درست نہیں ہوسکتی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شادی کے بعد لیلیٰ کی جان پر بن آئے اور وہ طلاق دینے سے ہی زندہ رہ سکے۔ میرا ذہن نہیں مانتا۔ میں شادی کے سات ماہ بعد اسے طلاق نہیں دوں گا۔ میں آپ کی اس پیش گوئی کو تسلیم نہیں کروں گا۔"

"کوئی بات نہیں، تسلیم نہ کرو۔ میری بیٹی کو شریک حیات بناؤ۔ اللہ کا نام لیتے رہو۔ اس کے ساتھ زندگی گزارتے رہو۔ یہ بھول جاؤ کہ میں نے کوئی بچگانہ سی بات کی ہے۔ یہ یاد رکھو کہ سات ماہ کے بعد اس کی الم ناک

ہلاکت نہیں ہوگی۔ وہ مطلقہ نہیں ہوگی تمہارے ساتھ سہاگن رہ کر زندگی گزارتی رہے گی۔"

"اللہ نے چاہا تو یہی ہوگا۔ وہ طبعی عمر تک میری شریک حیات رہے گی۔"

"انشاء اللہ...... لیکن ایک فی صد میری پیش گوئی کے درست ہونے کا امکان ہے۔ خدانخواستہ شادی کے سات ماہ بعد اس کی جان پر بن آئے گی تو تم اس کی زندگی بچانے کے لیے اسے لمبی عمر تک زندہ رکھنے کے لیے طلاق ضرور دو گے۔ تم ظالم نہیں ہو کہ طلاق نہ دے کر اس کی ہلاکت کا تماشا دیکھو گے۔"

وہ ابھی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ طلاق دینا نامناسب و ناپسندیدہ عمل ہے۔ بلکہ ظلم ہے اور نہ دیتا تو گویا جان لینے کا ظلم کرتا۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ اسے چپ لگ گئی تھی۔

فی الحال شادی اور ازدواجی مسرتوں کو ٹال کر سوچنا سمجھنا تھا کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے؟

اس نے سر گھما کر دیکھا، لیلیٰ دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوئی اس کی ضرورتوں کو پکار رہی تھی۔ اس کے پیچھے دوسری بہنیں بھی جھلک رہی تھیں۔ کچھ نظروں سے اوجھل تھیں۔ بات بن جاتی تو سب ہی اس کی زندگی میں یکے بعد دیگرے چلی آتیں۔

وہ فون کے ذریعے اپنے بابا جانی سے بولنے لگا۔ مراد نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ "فون درویش کو دو۔"

عابی نے فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرے بابا جانی سے بات کریں۔"

اس نے فون کو لے کر کان سے لگایا۔ مراد نے کہا۔ "میرا بیٹا نجومیہ کہلاتا ہے اور اس کے ساتھ عجیب و غریب حالات پیش آتے رہتے ہیں اور اب آپ کی ستارہ شناسی اسے ایک انوکھے انداز میں تماشا بنانے والی بات کہہ رہی ہے۔ یہ تو خدا بہتر جانتا ہے کہ جو کبھی نہیں ہوا وہ آئندہ ہوگا یا آپ کی پیش گوئی غلط ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتا میرا بیٹا سات بہنوں کو یکے بعد دیگرے میری بہو بناتا رہے۔ میں اپنے خاندان میں ایسے کھیل تماشے نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے افسوس ہے۔ ہم اچھے دوست رہ سکیں گے۔ لیکن رشتے دار نہیں بن سکیں گے۔"

درویش نے کہا۔ "ٹھیک ہے، بات آگے نہ بڑھے یعنی ختم ہو جائے لیکن مقدر میں رشتے داری ہے تو وہ ہو کر رہے گی۔ ہم اور آپ ہونی کو انہونی نہیں بنا سکیں گے۔"

وہ دونوں فون پر بول رہے تھے۔ عابی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوئی ضرورت کو دیکھ رہا تھا۔ دل مچل رہا تھا۔ اس نے درویش سے فون لے کر کہا۔ "بابا جانی! ہم ہر کام تقدیر کے آئینے میں دیکھ کر اور نجومیوں سے پوچھ کر نہیں کرتے۔ نہ بہت زیادہ فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوگا؟ ہم اپنے اعمال درست رکھتے ہیں اور اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔ کسی نجومی کی پیش گوئی سنے بغیر جو کرتے رہتے ہیں' اس کا اچھا یا برا صلہ پاتے رہتے ہیں۔ میں انکل درویش کی پیش گوئی کو نظرانداز کر کے ان کی بڑی صاحبزادی کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اب سے پہلے بھی دو شریک حیات مختصر سے عرصے کے لیے آئیں اور گزر گئیں۔ لیلیٰ کے نصیب میں سلامتی ہوگی تو وہ زندہ سلامت رہے گی۔ ورنہ یہ بھی گزر جائے گی اگر پیش گوئی کے مطابق ہوگا تو میں کسی معقول وجہ کسی ٹھوس بنیاد کے بغیر اسے طلاق نہیں دوں گا۔ یہ بھی تسلیم نہیں کروں گا کہ طلاق دینے سے اسے نئی زندگی مل جائے گی' میں اس کی کسی دوسری بہن سے شادی نہیں کروں گا' صرف لیلیٰ ہی میری شریک حیات رہے گی۔"

ایسے دوٹوک فیصلے سے رشتے داری قائم ہوگئی لیکن باقی چھ بہنوں کے خواب ٹوٹ گئے۔ درویش نے دوسری بیٹی شیریں کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا' سات ماہ...... ستارے اپنی چال دکھائیں گے۔

عابی کی باتیں معقول اور قابلِ قبول تھیں۔ مراد نے لیلیٰ کی طرف بیٹے کے رجحان کو سمجھ لیا۔ وہ اس کی محرومیوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹے! واقعی ہم بڑے سے بڑا کام بھی کسی نجومی سے پوچھ کر نہیں کرتے۔ صرف اللہ کے بھروسے پر کرتے ہیں۔ میں تمہیں شادی کی اجازت دے رہا ہوں۔"

فیصلہ ہوگیا۔ یہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا کہ درویش رشتہ منظور کرے گا تو دوسرے ہی دن نکاح پڑھا دیا جائے گا۔

اب دوسرے دن کا انتظار تھا۔

☆☆☆

ماروی نے بظاہر کامیابی حاصل کی تھی۔ لارا کو مجبور کر دیا تھا اور وہ اس لیے مجبور ہوگئی تھی کہ صرف ماروی ہی اس کو اور دانش کو کالیا کی عداوت سے بچا سکتی تھی۔

اس نے سختی سے کہا تھا کہ وہ آئندہ دانش کو شیطان کی عبادت گاہ میں نہیں لے جائے گی اور نہ ہی اس سے پوجا کرائے گی۔ وہ مصلحتاً مان گئی تھی۔ آئندہ حالات سازگار

ہوتے ہی اپنی فطرت کے مطابق بڑی بدلنے والی تھی۔

کالیا نے اس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ دانش کے سر کے کچھ بال اور اس کا کوئی غلیظ کپڑا کوریئر سروس کے ذریعے اسے بھیج دے تاکہ وہ دانش کو دوبارہ اپنے طلسمی شوکیس میں لاسکے۔

ماں نہیں چاہتی تھی کہ بیٹا پھر اس خبیث کے شکنجے میں جائے لیکن اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کالیا نے دھمکی دی تھی کہ انکار کرے گی تو اس کے پتلے میں سوئی چبھوئے گا۔ اس کے اندر آگ لگائے گا۔ وہ پہلے بھی اسے زندہ جلتے رہنے کی سزا دے چکا تھا۔

بن زیان نے لارا کو سمجھایا تھا کہ وہ فی الحال ماروی کی اور کالیا کی باتیں مان لے۔ اسے جلد ہی ان دونوں سے نجات مل جائے گی۔ وہ تبت کے لامہ کی خدمات اپنے لیے اور افریقہ کے زومبی گاگنا کی خدمات لارا کے لیے حاصل کرچکا تھا۔ وہ دونوں پراسرار اور تجربہ کار جادوگر جہاں بھی تھے، وہیں سے ان دونوں کے لیے عمل پڑھتے رہتے تھے۔

بن زیان پر جو عمل پڑھا جارہا تھا، وہ تین راتوں تک جاری رہنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ لامہ کے طلسمی حصار میں محفوظ ہوجاتا پھر نہ تو کالیا کی کالی شکتی اسے چھوسکتی اور نہ روحانی قوتیں اسے زیر کرسکتیں۔ وہ کالیا، ماروی، مراد اور عالی کے حملوں سے محفوظ رہتا۔ وہ اپنے تمام دشمنوں کے مقابلے میں بڑی حکمت عملی سے کام لے کر جوڑ کا توڑ بن رہا تھا۔

لارا پر جو عمل پڑھا جارہا تھا، وہ دوراتوں تک جاری رہنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ کالیا کے طلسمی شوکیس سے نکل آتی پھر کالا جادو اور روحانی قوتیں اس پر اثر نہ کرتیں۔ وہ ماروی کو بھی دانش سے دور کرسکتی تھی۔

فی الحال وہ ماروی کے دباؤ میں تھی۔ کالیا کے حکم کے مطابق اسے اپنے بیٹے کے سر کے بال اور ایک غلیظ کپڑا ارسال کرنا تھا۔ ماروی نے اس سے کہا تھا کہ وہ کالیا کا مطالبہ پورا کرے۔ وہ ان چیزوں کو اس جادوگر کے ہاتھوں تک پہنچنے نہیں دے گی۔ دانش اس کے جادوئی ہتھکنڈوں سے محفوظ رہے گا۔

بن زیان نے لارا سے کہا۔ ”کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم دانش سے تعلق رکھنے والی چیزیں پارسل کرو۔ ماروی نے کہہ دیا ہے کہ وہ کالیا تک نہیں پہنچیں گی۔ تم کسی بھی بچے کے سر کے بال اور اترن بھیج دو۔“

لارا نے یہی کیا۔ اس نے کالیا کے نام ایک پارسل روانہ کیا پھر اس کے دماغ میں پہنچ کر کہا۔ ”میں نے تمہارے حکم کی تعمیل کی ہے لیکن ماروی نے چیلنج کیا ہے کہ اپنے بھائی کی کوئی چیز تمہارے پاس پہنچنے نہیں دے گی۔ اس نے بڑے یقین سے کہا ہے، تم دانش کو دوبارہ اپنے شکنجے میں نہیں لاسکو گے۔“

وہ غصے سے گالیاں دینے لگا۔ ایک ننھی سی بچی اس کے جادو کو ناکارہ بنا کر اپنے بھائی کو اس سے چھین کر لے گئی تھی۔ لارا نے کہا۔ ”وہ گالیاں دینے سے نہیں، منتر پڑھنے سے جائے گی۔ کیا تمہارا جادو اسے کچل نہیں سکتا؟“

”کچل ڈالوں گا۔ بس ایک بار وہ میری مٹھی میں آجائے۔ وہ ریاست سے باہر نہیں نکلتی اور میرے منتر وہاں تک پہنچ نہیں پاتے ہیں۔“

”وہ ریاست سے باہر نکلتی ہے۔ یہاں دانش کے پاس آتی رہتی ہے۔ تم پر حملہ کرنے انڈیا گئی تھی۔ میں نے جو پارسل بھیجا ہے، اسے چھین لینے کے لیے انڈیا جائے گی۔ ہوشیار رہو۔“

وہ پریشان ہوکر خلا میں تکنے لگا پھر بولا۔ ”جاؤ میرے دماغ سے۔ مجھے سوچنے دو۔“

اس نے سانس روک کر لارا کو بھگا دیا۔ پریشان ہوکر سوچنے لگا، کس طرح ماروی تک پہنچ کر اسے اپنی طلسمی گرفت میں لائے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بار سامنے آئے گی تو اسے پکڑ لے گا پھر وہ رہائی نہیں پاسکے گی۔ وہ اب سے پہلے اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں کئی بار منتروں کا جاپ کرچکا تھا۔ وائے ناکامی وہ منتر ایسے خالی گئے تھے جیسے ہوا میں تیر چلاتا رہا ہو۔

وہ کسی بھی جادوئی ہتھکنڈے سے اس کے وجود تک پہنچ نہیں پارہا تھا۔ اندر ہی اندر مایوس ہورہا تھا پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ روحانی قوت کالے جادو پر حاوی ہوجاتی ہے۔

اس نے پھر ایک بار کوشش کی پھر ایک منتر پڑھتے ہی چونک گیا۔ وہ خلاف توقع اچانک ہی سامنے آگئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بڑے ہی جوش و جذبے سے اور عقیدت سے منتر پڑھنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ منتروں کی گرفت میں رہے۔ واپس نہ جاسکے۔

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اپنے منتروں کو لگام دے۔ چپ ہوجا۔ ابھی چلی جاؤں گی۔ یہ بولنے آئی ہوں کہ وہ جہاز رن وے پر اتر رہا ہے جس میں تیرے نام سے پارسل آرہا ہے۔ جب اس پارسل کو جہاز سے باہر لایا جائے

گا تو میں اسے آگ لگا دوں گی۔ تو میرے بھائی کی کسی چیز کو تو کیا' اس کے سائے کو بھی چھو نہیں سکے گا۔''

وہ چیلنج کر کے غائب ہو گئی۔ اس کے اندر تہلکہ مچ گیا۔ اس کا مطلوبہ پارسل آ رہا تھا اور آنے سے پہلے ہی ہاتھوں سے نکلنے والا تھا۔ ماروی بول کر گئی تھی کہ وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔

وہ سیکیورٹی افسر کو آوازیں دیتا ہوا بنگلے سے باہر آیا۔ ''فوراً آؤ۔ ائرپورٹ چلو۔ جہاز کی اَن لوڈنگ سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔ کم آن ہری اپ......''

وہ فون پر ائرپورٹ کے سیکیورٹی افسر سے کہنے لگا۔ ''میرے نام سے ایک پارسل آ رہا ہے۔ میں اسے خود وصول کرنے آ رہا ہوں۔ اس پارسل کی خاص طور پر نگرانی کی جائے۔ کوئی ذمے دار افسر اسے اپنی تحویل میں لے کر میرے پاس لائے گا۔ کسی اور کو اس پارسل کے قریب جانے کی اجازت نہ دی جائے۔''

وہ اس کی حفاظت کے لیے ضروری احکامات صادر کرنے کے بعد ائرپورٹ پہنچنے تک زیرِلب منتر پڑھتا رہا۔ اپنی کالی شکتی کے ذریعے بھی اس کی حفاظت کرتا رہا۔

وہ اندر ہی اندر اس بات پر جھنجلا رہا تھا کہ ایک ننھی سی بچی اسے دوڑا رہی تھی۔ اس کے منتروں کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

لارا نے اس کے دماغ میں آ کر پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا وہ پارسل مل گیا؟''

''میں اسے حاصل کرنے ائرپورٹ جا رہا ہوں۔ اس نے چیلنج کیا ہے کہ اسے میرے ہاتھ لگنے نہیں دے گی۔ کیا وہ تمہارے بیٹے کے پاس ہے؟ اس سے بولو مجھ سے بات کرے۔''

ماروی دانش کے پاس نہیں تھی۔ لارا نے جھوٹ کہا۔ ''یہ یہاں ہے۔ کہہ رہی ہے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ ائرپورٹ جا رہی ہے۔ وہیں تم سے سامنا ہوگا۔''

کالیا کے اندر بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ ائرپورٹ پہنچ گیا تھا۔ اس منسٹر کی سیکیورٹی کے لیے مسلح سپاہی خاصی تعداد میں تھے جبکہ وہ اپنی نہیں' پارسل کی حفاظت کے لیے آیا تھا۔

وہ متعلقہ افسران کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا جہاز کے پاس آیا۔ وہاں سے مسافروں کا اور کوریئر سروسز کا تمام سامان نکالا جا رہا تھا۔ انہیں لگیج ہال کی طرف پہنچایا جا رہا تھا۔

ایک ذمے دار افسر سامان کے ذخیرے سے وہ پارسل اٹھا کر منسٹر رگھو ناتھ کالیا کی طرف لاتے ہوئے بولا۔ ''سر......! اس پر آپ کا نام لکھا ہے۔ اسے دیکھیں۔ یہ آپ ہی کا ہے۔''

کالیا نے ادھر دیکھا۔ اسی لمحے میں ماروی پارسل کے قریب دکھائی دی۔ وہ غصے سے چیخ پڑا۔ ''تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

پارسل اٹھانے والے افسر نے پریشان ہو کر کہا۔ ''سر......! میں نے کیا کیا ہے؟ میں تو آپ کا یہ سامان......''

وہ ماروی کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''میں تم سے نہیں اس سے کہہ رہا ہوں۔''

وہ کسی اور کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جوش اور غصے سے کہا۔ ''تیری تو ایسی کی تیسی۔ ابھی تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔''

وہ منتر پڑھتا ہوا' دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ماروی ذرا پیچھے ہٹی تو اس نے اسے دبوچ لینے کے لیے چھلانگ لگائی۔ سب نے حیرانی سے دیکھا' وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔

دو افسر تیزی سے قریب آ کر اسے زمین سے اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''سر! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ نے کیوں چھلانگ لگائی تھی؟ کیوں یہاں آ کر گر رہے ہیں؟''

اس نے زمین پر سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ پارسل کے قریب کھڑی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''اپنی حالت دیکھ۔ منتر پڑھنا بھول گیا ہے۔ چل شروع ہو جا۔''

ماروی نے اس کی طرف اپنی ایک ہتھیلی پھیلائی۔ اس ہتھیلی پر اچانک چراغ کی لَو روشن ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ ننھی سی لو پارسل کی طرف جائے گی۔ اسے جلا کر راکھ کر دے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے پھونک ماری۔ وہ لو ہتھیلی سے اٹھ کر فضا میں معلق ہو گئی۔ بہت دھیرے دھیرے پارسل کی طرف جانے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر منتر پڑھتا ہوا دوڑتا ہوا اس افسر کے پاس آیا پھر اس کے ہاتھوں سے پارسل کو چھین کر اسے جلتی ہوئی لو سے دور لے جانے لگا۔ پاگل سا ہو کر دوڑنے لگا۔

ماروی کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ وہ ننھی سی لو اس کا پیچھا کرتی ہوئی کسی کو دکھائی دے رہی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہوش مند منسٹر پاگلوں جیسی حرکتیں کیوں کر رہا ہے؟

اس نے منتر پڑھتے ہوئے اپنی ایک ہتھیلی سے اس لو

کو آنے سے روکا۔ وہ رک گئی پھر ایسے گم ہو گئی جیسے بجھ گئی ہو۔

وہ خوش ہو کر اور جوش و خروش سے منتر پڑھنے لگا پھر یک لخت چپ ہو گیا۔ اسے اس ہاتھ کے قریب حرارت محسوس ہوئی جس سے پارسل کو تھام رکھا تھا۔ اس نے سر جھکا کر ہاتھ کو دیکھا تو اچھل پڑا۔ وہ جلتی ہوئی لو پارسل کے اوپر آ گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس پیکٹ میں ڈوب رہی تھی۔

تب یہ منظر سب ہی کو دکھائی دیا۔ اس پیکٹ میں یک لخت آگ لگ گئی تھی۔ وہ کالیا کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ گیا۔ وہ ناکامی اور نامرادی کے باعث چیخنے لگا۔ زمین پر جلتے ہوئے پیکٹ کو اپنے جوتے سے بجھانے کی کوششیں کرنے لگا۔

شعلوں میں لپٹا ہوا پیکٹ راکھ ہو رہا تھا۔ وہ خونخوار درندے کی طرح غراتا ہوا پھر ماروی پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن پلٹ کر دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ تماشا ختم ہو چکا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔

وہ تھک ہار کر گرنے کے انداز میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب ہی حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ''یہ اچانک پیکٹ میں آگ کیسے لگ گئی تھی؟''

ایک نے کہا۔ ''ہمارے منتر تانترک مہا راج ہیں لیکن وہ پارسل تو ان کا اپنا تھا۔ ان کی اپنی چیز کیسے جل کر راکھ ہو گئی؟''

یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا اور نہ کالیا ایک بچی سے شکست کھانے والی حقیقت کسی کے سامنے بیان کر سکتا تھا۔ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی، تب ہی سے کالیا کو مات دیتی آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں چپ چاپ تسلیم کر رہا تھا۔ ''یہ میری کالی شکتی، میرے گیان اور میرے تجربوں سے بہت آگے ہے۔ اسے زبردست روحانی قوتیں حاصل ہیں۔ مجھے فی الحال اس سے دور رہنا چاہیے۔ اپنے اوپر گھمنڈ کروں گا پھر اس سے ٹکراؤں گا تو ایسی ہی شکست اور توہین سے دوچار ہوتا رہوں گا۔ میں ابھی دانش کو نظرانداز کروں گا۔ لارا میرے شکنجے میں ہے۔ میں اس کی ٹیلی پیتھی سے فائدہ اٹھاتا رہوں گا۔''

لارا بڑی دیر سے اس کے اندر تھی اور ماروی کے مقابلے میں اسے مات کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے یہ خیالات سن کر مطمئن ہو گئی کہ وہ آئندہ ماروی سے نہیں ٹکرائے گا۔ اس سے کترانے کے لیے دانش سے دور رہے گا۔ ایسے وقت ایک ماں کو دلی سکون حاصل ہو رہا تھا۔

بن زیان نے کہا۔ ''تم خوش نصیب ہو گئی ہو۔ تمہارے بیٹے کو کالیا کے شر سے نجات مل گئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایک ننھی سی بچی کو ایسی غضب کی روحانی صلاحیتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ یہ عمر کے لحاظ سے آئندہ اور زیادہ ذہین اور زیادہ روحانی قوتوں کی حامل ہوتی رہے گی۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا ماروی یہاں موجود ہے؟ ہم اس سے دو باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

انہیں جواب نہیں ملا۔ ماروی کبھی ان سے بولتی نہیں تھی۔ اپنے بھائی کے پاس آتی تھی۔ اس کے ساتھ وقت گزارتی تھی پھر چلی جاتی تھی۔ انہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

بن زیان نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں، تم موجود ہو۔ ہماری باتیں سن رہی ہو۔ پلیز، دو باتیں کرو۔''

دانش سو رہا تھا۔ لارا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سو رہا ہے۔ ایسے وقت وہ نہیں آتی ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ یہاں نہیں ہے۔''

''اس لڑکی نے تمہاری بہت بڑی مشکل کو آسان کیا ہے۔ تمہارا بیٹا کالے جادو سے محفوظ رہے گا۔ یہ سمجھو کہ کالیا اس کے لیے مر چکا ہے۔''

''لیکن ماروی خود غرض ہے۔ وہ اپنے بھائی کی طرح مجھے بھی اس کے شکنجے سے نکال سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں اب تک اس کمینے کے رحم و کرم پر ہوں۔ وہ ابھی کہہ رہا تھا کہ دانش سے دور رہے گا لیکن میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میری ٹیلی پیتھی سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔''

''فکر نہ کرو۔ زوبی گاٹا بہت زبردست ہے۔ تمہیں اس سے نجات دلائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔ تم آج رات اس کے شکنجے سے ضرور نکل جاؤ گی۔''

''میں شیطان سے التجا کرتی رہتی ہوں کہ زوبی گاٹا کو کامیابی حاصل ہو۔ وہ کالیا پر بھاری پڑے۔ اس کی کالی شکتی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے پھر تو میں آزاد ہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی پھروں گی۔ ماروی کے دباؤ میں بھی نہیں رہوں گی۔ اپنے بیٹے کو شیطان سے دور نہیں کروں گی۔ ہم زوبی گاٹا سے کہیں گے تو وہ ماروی کو یہاں آنے سے روک دے گا۔''

''بے شک اگر آج اس کا عمل تم پر کامیاب رہے گا تو وہ آئندہ ماروی سے بھی تمہیں نجات دلائے گا۔ تمہارے دن پھر رہے ہیں۔ بیٹے کو نجات مل گئی ہے۔ آج تمہیں بھی کالیا سے رہائی ملے گی۔ اس کے بعد ماروی سے نمٹ لیا جائے گا۔''

خیر اور شر کے درمیان ازل سے جنگ جاری ہے۔ یہ تا قیامت جاری رہے گی۔ اس جنگ میں کبھی خیر کو جیت ملتی ہے۔ کبھی شر کا بول بالا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو نابود کر دینے کی کوشش میں ہار جیت کا یہ کھیل تسلسل جاری رہتا ہے۔

زوبی گانا نا ایک سیاہ فام حبشی ساحر تھا۔ اس کے باپ دادا اور پردادا بھی شیطان کو کالی شکتی قوتوں کا سرچشمہ مانتے آئے تھے اور اسی سے کالے جادو کی قوتیں حاصل کرتے رہتے تھے۔

جب بن زیان نے زوبی گانا سے ڈیلنگ کی اور اسے بتایا کہ انڈیا کے ایک تانترک مہاراج' کالے جادو کے مہاشکتی بان رگھوناتھ کالیا سے مقابلہ ہوگا تب اس نے کالیا کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بہت کچھ معلوم کرنے کے بعد کہا۔ ''ہم سمندر کی گہرائیوں سے موتی چن کر لانے والے جادوگر ہیں۔ کالیا ہمارے سامنے کنویں کا مینڈک ہے۔ اپنے دیس کے جادوگروں میں مہاشکتی مان کہلاتا ہے۔ میرے علم نے بتایا ہے کہ وہ ایک ایسی بچی سے مات کھا گیا ہے جو اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھی' ہونے والی تھی۔''

بن زیان نے کہا۔ ''ہاں وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی ہے جہاں پہلے ہی ایک عجوبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا نام عابد علی منگی ہے۔ سنا ہے اس پر جادوئی ہتھکنڈے اثر نہیں کرتے ہیں اور یہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بندوق کی گولیاں اسے نہیں لگتی ہیں۔ اس کے آس پاس سے گزر جاتی ہیں۔''

''مجھے اس خاندان کی ہسٹری بتاؤ۔ میں معلوم کروں گا کہ وہ بچی اور وہ عجوبہ کیسی بلائیں ہیں؟ ہم اس عجوبہ کا چرچا بھی سنتے رہتے ہیں۔''

بن زیان نے ریکارڈ روم سے مراد علی منگی کی پوری ہسٹری کی فوٹو کاپی زوبی گانا کو بھیج دی۔ اس نے دوسرے دن پڑھنے کے بعد کہا۔ ''میں نے مراد علی منگی کا بہت نام سنا تھا۔ یہ ہسٹری کہہ رہی ہے کہ اس کی اولاد بھی حیرت انگیز اور چونکا دینے والی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ میری طلسمی معلومات کے مطابق ان سب کو روحانی قوتیں حاصل ہیں۔ یہ نہ منتر پڑھتے ہیں، نہ کسی طرح کا عمل کر کے کسی مخالف پر پھونکیں مارتے ہیں۔''

بن زیان نے کہا۔ ''یہ اپنی آسمانی کتاب کی آیتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ اب تک یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ آیتیں منتروں سے زیادہ زود اثر ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ کالے جادو کو مات دیتے رہتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''شاید یہی بات ہے۔ فی الحال میرے علوم سے آگہی مل رہی ہے کہ روحانی قوتوں سے نہ ٹکرایا جائے۔ اگر ٹکراؤ لازمی ہو جائے تو براہ راست ان کا سامنا نہ کیا جائے۔ کسی دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلائی جائے۔''

اس نے کہا۔ ''تم ابھی لارا کو کالیا سے نجات دلانے والے ہو۔ اس کے بعد تمہیں ماروی سے نمٹنا ہوگا۔ وہ اپنے بھائی دانش کو شیطان سے دور رکھنے کے لیے لارا کا جینا حرام کر رہی ہے۔''

بن زیان نے اسے بتایا کہ آج ماروی نے کس طرح کالیا کو ائرپورٹ پر اپنے پیچھے دوڑایا اور اسے حاصل ہونے والے پارسل کو آگ لگا کر اپنے بھائی کو اس کے شکنجے میں جانے سے بچایا ہے۔ وہ ماروی سے تیسری بار مات کھا چکا ہے۔

زوبی نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''تعجب ہے.... وہ بہت کم عمر ہوگی۔ جیسا کہ میں نے اس کی خاندانی ہسٹری میں پڑھا ہے۔ اتنی ہی عمر میں اس کی عقل کتنی ہوگی؟ وہ کسی دشمن کی چالوں کو کس طرح سمجھ کر ان کا توڑ کرتی ہوگی؟''

پھر وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''میری عقل نہیں مانتی۔ ماروی کا وہ بھائی جو عجوبہ ہے' وہ اپنی روحانی قوتوں سے اس کی مدد کرتا ہوگا۔ رگھوناتھ کالیا ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہے کہ ایک بچی' بچوں کا کھیل کھیلے اور کالیا جیتتے کھیلتے مات کھا جائے۔''

''ماروی نے اپنے باپ کو' بھائی کو اور خاندان کے کسی بھی فرد کو یہ نہیں بتایا ہے کہ دانش اس کا بھائی ہے۔ مراد کا بیٹا ہے اور وہ دن رات اس کے پاس آتی جاتی رہتی ہے۔ پرنس عالی جو عجوبہ ہے' وہ دانش کی حقیقت سے بے خبر ہے۔ اسے لارا کے اس بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ باپ بیٹے یہ بھی نہیں جانتے کہ ماروی کالیا جیسے جادوگر سے ٹکراتی رہتی ہے۔ تمہیں کالیا سے نمٹنے کے بعد اس بچی سے نمٹنا ہے۔ کچھ ایسا کرنا ہے کہ وہ فتنہ نابود ہو جائے۔ لارا اور دانش کے پاس آنے کا راستہ بھول جائے۔''

زوبی سوچنے لگا۔ بولنے لگا۔ ''اس بچی کو اپنے منتروں کی گرفت میں لا کر سمجھنا ہوگا کہ وہ ناقابلِ شکست کہلانے والے باپ اور عجوبہ کہلانے والے بھائی کی صلاحیتوں اور قوتوں کی محتاج کیوں نہیں ہے؟ کالیا سے اور لارا سے اپنی جنگ تنہا کیسے لڑ رہی ہے؟''

اس نے فون کے ذریعے کالیا کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو! میں زوہبی گاکنا بول رہا ہوں۔ میرا نام سنا ہے نا؟''

''بہت سنا ہے۔ تم نے اچانک مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ میں حیران ہوں۔ میری حیرانی دور کرو۔''

وہ بولا۔ ''میں نے تمہاری بہت تعریفیں سنی ہیں۔''

کالیا خوش ہو گیا۔ زوہبی نے کہا۔ ''سنا ہے ایسے زبردست جادوگر ہو کہ ایک چھوٹی سی بچی سے مات کھاتے آرہے ہو۔''

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ ''یو شٹ اپ نان سنس! اس بچی کی اوقات کیا ہے؟ وہ آج ہی میرے ہاتھوں مرے گی۔''

''کیا وہ تیرے ہاتھ آئے گی؟ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب وہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تب ماں کے پیٹ میں رہ کر اس نے تجھے مات دی تھی۔ دوسری بار تیرے دماغ میں زلزلہ پیدا کر کے تجھے نیم مردہ کر کے گئی تھی۔ اب تیسری بار ائرپورٹ پر ساری دنیا کے سامنے تجھے تماشا بنا کر ذلیل کیا ہے۔ میں تجھے سمجھانے آیا ہوں۔ اس بچی کی طرف رخ نہ کر۔ اس کے بھائی دانش سے دشمنی نہ کر۔ دانش کی ماں لارا کو اپنے طلسمی شکنجے سے رہائی دے دے۔ وہ ابھی تیری گرفت سے نکلنے والی ہے۔''

وہ تن کر بولا۔ ''کس کی مجال ہے کہ لارا کو میرے شکنجے سے نکال کر لے جائے؟''

''میں لے جاؤں گا۔''

''کیا....؟'' وہ گرج کر بولا۔ ''تو مجھ سے دشمنی کرے گا؟ تو پکا عیاش ہے۔ لارا اپنے حسن و شباب سے تجھے الو بنا رہی ہے۔ وہ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے تجھے میرے خلاف استعمال کر رہی ہے۔''

''ایک ماں کے بیٹے سے دشمنی کرے گا تو وہ ضرور تجھ سے نجات حاصل کرنا چاہے گی۔ میں مانتا ہوں کہ پکا عیاش ہوں۔ اتنا کالا ہوں کہ رات کو دکھائی نہیں دیتا۔ گوری چمڑی کو چھوڑتا نہیں ہوں پھر یہ کہ اس کی ٹیلی پیتھی کا علم میرے کالے جادو کو چار چاند لگا دے گا۔ اس کی خیال خوانی کے ذریعے میرے کالے علم کو ایسی تقویت حاصل ہوگی کہ......''

وہ اپنا سینہ ٹھونک کر مزید بولا۔ ''اس زوہبی گاکنا کے آگے کوئی ٹھہر نہیں پائے گا۔''

وہ دونوں فون پر بول رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کالیا اپنے معمول کے مطابق امپورٹڈ مشروب پی رہا تھا۔ لارا کو اس کی یہ روٹین معلوم تھی۔ وہ ایسے وقت اس کے دماغ میں آیا کرتی تھی اور وہ نشے کی ترنگ میں پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایسے وقت لارا خاموشی سے اس کے چور خیالات پڑھتی رہتی تھی۔ اس کی کسی کمزوری تک پہنچنے کی کوششیں کرتی رہتی تھی۔

اس وقت بھی وہ کالیا کے دماغ میں موجود تھی۔ زوہبی گاکنا کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ ابھی نہیں جانتی تھی کہ زوہبی اسے کالیا سے نجات دلا سکے گا یا نہیں؟ لیکن یہ معلوم ہو رہا تھا کہ نجات دلانے کے بعد اسے اپنے قبضے میں رکھے گا۔

ایک تو اس کے حسن کی اور ایک ٹیلی پیتھی کی کشش وہاں جان بن گئی تھی۔ کالیا کے بعد وہ کالا حبشی بھی اس کی دونوں خوبیوں کو لوٹنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

وہ سن رہی تھی۔ اس کے دماغ کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ پھر ایک بار آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی تھی۔

زوہبی گاکنا بڑے اعتماد سے کالیا کو چیلنج کر رہا تھا۔ ماروی سے مات کھانے کے بعد وہ تمام جادوگروں کی نظروں میں دو کوڑی کا ہو گیا تھا۔ اس بات پر جھنجلا رہا تھا کہ لارا اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زوہبی کو اس کے مقابلے پر لے آئی ہے۔

زوہبی نے آدھی رات سے پہلے کہا۔ ''تو نے لارا کے جس پتلے پر عمل کیا ہے میں اس پتلے تک پہنچنے کی کوششیں کئی دنوں سے کر رہا ہوں۔ یہ تیری بدنصیبی ہے کہ آج وہاں تک پہنچ گیا ہوں۔''

وہ چونک گیا۔ تڑپ کر بولا۔ ''تو جھوٹ بول رہا ہے۔ وہاں تک کسی جادوگر کا باپ بھی نہیں پہنچ سکے گا۔''

''ایک بچی پہنچ گئی تھی۔'' اس نے باقی تفصیل بھی بتادی۔

وہ سن رہا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا۔ زوہبی نے کہا۔ ''اب بول کسی کا باپ وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے میں تو پہنچ کر وہاں سے آ گیا ہوں۔ میرے منتر کئی دنوں سے اس پتلے تک پہنچ رہے ہیں۔ جا اور وہاں دیکھ۔ میرے منتروں کی شکتی اپنا کام دکھا رہی ہے۔ جا اور اس شوکیس کو کھول دے۔ ورنہ وہ کسی دم ٹوٹنے اور بکھرنے والا ہے۔''

کالیا کو پھر بدنصیبی نے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ فون کو ایک طرف پھینکتا ہوا دوڑتا ہوا اپنے... بیڈروم کے ایک چور دروازے پر آیا پھر اسے کھول کر تہ خانے میں پہنچا۔ وہ شوکیس محفوظ تھا لیکن دور ہی سے پتا چلا کہ وہاں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔

اس نے تیزی سے قریب آکر دیکھا۔ لارا کا پتلا...

شوکیس کے اندر لیٹا ہوا تھا لیکن وہ پہلے کی طرح نہیں تھا۔ اس کے بدن پر چھالے پڑ گئے تھے اور وہ چھالے پانی کے بلبلے کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ وہ زومبی گانا کے منتروں کی آگ میں پک رہے تھے۔

وہ جواباً منتروں کا جاپ کرنے لگا لیکن زومبی گانا کی کالی شکتی کئی وقتوں سے پہلے کو شکنجے میں لیتی آ رہی تھی۔ کالیا بے خبر تھا کہ اس کے خلاف کیسی عداوت ہو رہی ہے؟

آدمی بے خبری ہی میں مارا جاتا ہے۔ یکبارگی دھماکا ہوا۔ وہ شیشے کا شوکیس ایک چھناکے سے ٹوٹ کر اس کے منہ پر لگتا ہوا دور تک بکھر گیا۔ اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے چہرے میں اور اس کے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ ایک بار ماروی کے حملے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوسری بار پھر بے ہوش ہو کر آرام سے لیٹا رہ گیا۔

اس رات لارا جاگ رہی تھی۔ زومبی گانا نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد اسے کالیا سے نجات ملنے والی ہے۔ وہ بے چین تھی۔ دانش کو لے کر بن زیان کے پاس وقت گزارنے آ گئی تھی۔ رات کے ایک بجے اس کی بے چینی دور ہو گئی۔ زومبی نے فون پر بن زیان سے کہا۔ ''لارا سے بولو کالیا کے دماغ میں جائے۔ میں نے اس کا طلسم توڑ دیا ہے۔''

لارا نے یہ سنتے ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ اس کے دماغ میں پہنچی۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ آہستہ آہستہ ہوش مندی کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''بول کالیا! کس حال میں ہے؟''

وہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ اسے سامنے اسٹینڈ پر رکھا ہوا شوکیس شکستہ دکھائی دیا۔ اس کے شیشے ٹوٹ کر کچھ بکھر گئے تھے، کچھ اس کے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہاں اب لارا کا پتلا نہیں تھا، جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

لارا اس کی سوچ پڑھ رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اسے نجات مل گئی ہے۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گی۔ تجھے نرک میں پہنچاؤں گی۔ چل اس تہ خانے سے باہر نکل۔''

وہ بہت کمزور تھا۔ لارا اس پر حاوی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی خیال خوانی کی قوت سے رینگتا ہوا تہ خانے سے باہر اپنے بیڈروم میں آیا۔ سرہانے تکیے کے پاس ریوالور رکھا ہوا تھا۔ لارا نے اسے حکم دیا۔ ''اسے اٹھا اور گولی چلا۔''

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ ''لارا...... میری جان نہ لو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گا۔ وہ زومبی تمہارا جینا حرام کر دے گا۔''

یوں بولنے کے دوران میں ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر آ گئی۔ وہ اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی انگلی نے بے اختیار ٹریگر کو دبا دیا۔

صرف ایک انگلی کے دباؤ سے تمام کالی قوتوں کا دم نکل گیا۔ وہ بن زیان کے پاس دماغی طور پر حاضر ہو کر خوشی کے مارے اس سے لپٹ کر بولی۔ ''میں آزاد ہو گئی ہوں۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔''

یہ بہت بڑی کامیابی تھی، اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی کالیا کے شکنجے سے نکل سکے گی۔ اچانک ہی آزاد رہنے اور رنگ رلیاں منانے والی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ وہ خوشی سے پاگل ہو کر ناچ رہی تھی۔

لیکن وہ زیادہ دیر تک مسرتیں حاصل نہ کر سکی۔ اچانک ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ ''میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔''

بن زیان نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر فوری طور پر سکون آور دوا کھلائی۔ حیرانی سے بولا۔ ''یہ اچانک تمہیں کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بڑی نقاہت سے بولی۔ ''میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں یکایک کیا ہو رہا ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے محسوس ہوا کہ ذہن میں دھندسی چھا رہی ہے۔ وہ کچھ سوچنا چاہتی ہے لیکن نہیں سوچ رہی ہے۔ سونا چاہتی ہے مگر نیند نہیں آ رہی ہے۔ ایسے وقت زومبی گانا یاد آنے لگا۔

وہ دھند میں لپٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''تو کیسی بے مروت ہے۔ میں نے تجھے شیطانی قوتیں رکھنے والے جادوگر سے نجات دلائی ہے، تو نے ایک فون کال کے ذریعے مجھے شکریہ نہیں کہا۔ میرا خیال ہے رہائی کی خوشی میں پاگل ہو کر ناچ رہی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں، تو میرے پاس آ کر ناچے۔ اب تو تو میری ہو گئی ہے۔ تیری حفاظت کرنا، تجھے دنیا جہان کے دشمنوں سے بچائے رکھنا میرا فرض ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں تمہاری کیسے ہوگئی؟ تم معاوضہ لے کر کام کر رہے ہو۔ آئندہ بھی تمہیں منہ مانگی رقم دی جائے گی۔ اس سے آگے کوئی تعلق رکھنے والی بات نہ کرو۔''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس پر حاوی ہو رہا ہے۔ وہ اب تک جو کہہ رہی تھی، ٹھیک اس کے برعکس کہنے لگی۔ ''زدیبی! میں تمہاری ہوں، میرا حسن، میرا شباب سب تمہارے لیے ہے۔ میں تمہاری کنیز بن کر رہوں گی۔''

وہ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر بول رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی لیکن کھول نہیں پا رہی تھی۔

بند آنکھوں کے پیچھے کوئی خواب نہیں تھا۔ ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اس دھندلکے میں وہ کہیں کہیں سے جھلک رہا تھا۔ جھلکنے سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ قدآور ہے اور جسامت میں گینڈے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔

بن زیان اس سے کئی بار ملاقات کر چکا تھا۔ اس نے لارا کو بتایا تھا کہ وہ آدمی نہیں پہاڑ ہے۔ پہاڑ کی طرح بلند اور پھیلا ہوا ہے۔ اگر دو چار پہلوانوں کو دبوچ لیتا ہے تو وہ اس کے شکنجے سے نکل نہیں پاتے ہیں۔ اس دھند میں اسے دیکھ کر لارا کے ہوش اڑ رہے تھے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے لاکھوں ڈالرز کمانے کے لیے تجھے کالیا سے رہائی نہیں دلائی ہے۔ تیری ٹیلی پیتھی کی کشش نے تجھے ضروری بنا دیا ہے۔ تو میرے لیے خیال خوانی کرتی رہے گی تو میرے کالے جادو کے آگے بڑے بڑے جادوگر شکست کھاتے رہیں گے۔ پھر یہ کہ ایک عورت میں حسن و شباب کی جو کشش ہوتی ہے، وہ تجھ میں بھرپور ہے۔ ہم ہر میدان میں فاتح بن کر عیش و عشرت سے دن گزارتے رہیں گے۔ میں ابھی کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ تجھے حکم دیتا تو پلک جھپکتے ہی وہاں سے یہاں میری آغوش میں آجاتی لیکن اچانک ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ کل تک اس مسئلے سے نمٹ لوں گا۔ کل رات ہم جشن منائیں گے۔''

وہ بڑی ناگواری سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے باتیں سنانا چاہتی تھی لیکن بے اختیار بولنے لگی۔ ''میں آؤں گی۔ جس وقت بلاؤ گے، جہاں بلاؤ گے چلی آؤں گی۔''

''کل آدھی رات کو بتاؤں گا کہ کہاں آنا ہے......؟''

اب آرام کرو، سو جاؤ۔"

اچانک دھند چھٹ گئی۔ وہ گم ہوگیا، اسی لمحے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ خلا میں تکنے لگی، سوچنے لگی۔ یہ سب کیا تھا؟ خواب نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ زومبی گاکنا کی بھاری بھرکم آواز سن رہی تھی اور وہ جو کہہ رہا تھا اسے تسلیم کر رہی تھی۔ اپنے اختیار میں نہیں تھی۔ بہت مجبور اور بے بس ہوگئی تھی۔

وہ بیڈ سے اتر کر دوڑتی ہوئی بن زیان کے بیڈروم میں آئی، وہ سونے جا رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ "میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچاؤ۔ وہ مجھ پر مسلط ہوگیا ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ کالیا مر چکا ہے۔ اب تم پر کون مسلط ہوگا؟"

"زومبی گاکنا۔"

"کیا؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ اسے بتانے لگی کہ کس طرح تھوڑی دیر کے لیے سحر زدہ ہوگئی تھی۔ اس نے گینڈے جیسے کالے شیطان کو دیکھا تھا۔ وہ اسے اپنی ملکیت بنا چکا ہے اور کل رات اس کے حسن و شباب کے چیتھڑے اڑانے والا ہے۔

وہ تمام احوال سننے کے بعد بولا۔ "تم نے خواب دیکھا ہے۔"

"نہیں۔ میں جاگ رہی تھی۔ مجھے خود پر اتنا اختیار نہیں تھا کہ میں آنکھیں کھول سکتی۔ ہائے، میں بری طرح پھنس گئی ہوں۔ زومبی مجھے کالیا کے شکنجے سے نکالنے سے پہلے اپنے شکنجے میں لے آیا ہے۔ وہ مجھے اور میرے ٹیلی پیتھی کے علم کو استعمال کرتا رہے گا۔ جیسے میں کالیا کے آگے بے بس تھی، اسی طرح اس کی بھی تابعدار بن کر رہوں گی لیکن یہاں تو پہلے سے زیادہ عذاب نازل ہوگا۔ وہ میری شخصیت کو میرے بدن کو کھلونا بنا کر رکھے گا۔"

بن زیان سن رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا پھر اس نے فون اٹھا کر زومبی گاکنا سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف بڑی دیر تک بیل جاتی رہی پھر اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ نیند کا وقت ہے۔ کیا مار پڑی ہے کہ میری نیند خراب کر رہے ہو؟"

"سوری! لارا بہت پریشان ہے۔ وہ تمہارے بارے میں کچھ ایسی باتیں کر رہی ہے جس کی میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میرا اور لارا کا معاملہ پرسنل ہے۔ ہمارے ذاتی اور اندرونی معاملات میں تم نہ بولو۔ نہ ہی میں جواب دوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ بن زیان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ لارا نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے، اس کا اور تمہارا معاملہ پرسنل ہے۔ وہ اپنے پرسنل معاملے میں نہ میری سنے گا، نہ کوئی جواب دے گا۔ اس نے فون بند کر دیا ہے۔"

وہ خوف زدہ ہوگئی بن زیان سے ایسے لپٹ رہی تھی جیسے زومبی سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اسے تھپک رہا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا، کہہ رہا تھا۔ "کالیا کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کی جگہ زومبی تم پر حاوی ہوگیا ہے۔"

وہ بولی۔ "کالیا نے کبھی میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ کتا تو مجھے نوچ کھسوٹ کر بیماریوں کا گھر بنا دے گا۔ مجھے بچاؤ۔ تم زبردست چالیں چلتے ہو۔ کسی بھی چالبازی سے مجھے بچالو۔"

"ایک سیدھا سا راستہ یہ ہے کہ وہ جہاں نظر آئے، اسے گولی سے اڑا دیا جائے لیکن وہ گوشہ نشین رہتا ہے۔ اس نے دو بار مجھ سے ملاقات کی۔ ایک بار لندن میں دوسری بار قاہرہ میں۔ اس کے اطراف مضبوط سیکیورٹی تھی۔"

وہ رونے کے انداز میں بولی۔ "پھر وہ کیسے مرے گا؟ کیسے مجھے نجات ملے گی؟ یہ تو کالیا سے زیادہ کمینہ اور بدمعاش ہے۔ کل رات مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گا۔ کچھ کرو زیان! میں سوچ سوچ کر مر جاؤں گی۔"

"فی الحال اسے ٹالنے کی کوشش کرو۔ اس سے بولو کہ جبر نہ کرے۔ پہلے تم سے رومانس کرے۔ تمہیں پیار سے راضی کرے۔"

"میں تو کچھ بول نہیں پائی تھی، اس نے سحر زدہ کر دیا تھا۔ کل بھی اپنے منتروں کی گرفت میں لے کر ظلم کرے گا۔ تم بہت ذہین ہو۔ کوئی چال چلو۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ سوچتا رہا پھر بولا۔

"ذہانت کے آگے جادو کمزور پڑ جاتا ہے۔ کل تمہیں بچاؤں گا۔ اپنی ذہانت سے بچاؤں گا۔ یہ نہ پوچھو کہ کیا کرنے والا ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو اور انتظار کرو۔"

بن زیان اسے امید دلا رہا تھا۔ وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ ایک وہی سہارا تھا۔

☆☆☆

عابی بڑی خاموشی سے لیلیٰ کو اپنی منکوحہ بنانا چاہتا تھا لیکن قاسم درویش خوب پبلسٹی چاہتا تھا۔ دنیا والوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے ریاست کے ایک پرنس کو، دنیا کے سب سے طاقت ور شخص کو اور عجوبہ کہلانے والے کو اپنا داماد بنایا ہے۔

آج رشتہ طے ہوا تھا کل نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے میں درویش نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھوم مچادی۔ ٹیلیفون اور ٹی وی چینلز کے ذریعے شادی خانہ آبادی کا ڈنکا بجادیا۔ جہاں درویش کا بنگلا تھا اور جہاں نکاح پڑھایا جانے والا تھا وہاں جیسے پورا شہر اُمڈ آیا تھا۔

شہر کی انتظامیہ اور دیگر متعلقہ افسران جھنجلا رہے تھے۔ عابی کو لندن کی شہریت نہیں دی گئی تھی۔ وہ جبراً وہاں رہائش پذیر تھا، اوپر سے شادی خانہ آبادی کے ڈھول بجا رہا تھا۔

یہ یقین تھا کہ لندن کی ایک لڑکی لیلیٰ سے شادی کر کے وہ قانونی طور پر ازخود وہاں کا شہری بن جائے گا اور مخالفین یہی نہیں چاہتے تھے۔ ایسی تدابیر پر عمل کرنا چاہتے تھے کہ نکاح سے پہلے رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

پہلی کوشش یہ تھی کہ امن و امان سے شادی رک جائے۔ عدالت سے حکم جاری کیا گیا کہ اسے لندن کی اس لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے۔ درویش اور عابی' سسر اور داماد دونوں ہی عدالتی حکم کے خلاف دھوم مچا رہے تھے۔ دوسری کوشش عابی کے کٹر مخالفین کی تھی۔ وہ مجرمانہ واردات کر کے وہاں امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ تیسری کوشش یہ تھی کہ بن زیان نے تاریک دنیا کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ٹریننگ دی تھی۔ یعنی قانونی حربہ، مجرمانہ واردات اور ٹیلی پیتھی کا ہتھیار سب ہی کو آزمایا جانے والا تھا۔

دوسری طرف مراد پوری طرح محتاط تھا۔ وہ ایک ریاست کے حکمران کی حیثیت سے شاہانہ دستور کے مطابق بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کے لیے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ان حالات میں واردات کرنے والے مخالفین ٹھنڈے پڑ گئے۔ جرائم کی دنیا میں مراد کی دہشت طاری تھی۔ اس کی موجودگی میں بڑے بڑے سورما گن پکڑنا بھول جاتے تھے پھر اس کی آمد نے سمجھادیا کہ ماسٹر کو بوبو اور ریڈ الرٹ کے درجنوں شوٹرز وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ گویا پوری دنیا میں اس کے فوجی تھے۔ بروقت پہنچ جایا کرتے تھے۔ صرف ٹیلی پیتھی جاننے والے ایسے تھے جو مراد اور عابی سے خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے خلاف واردات کرنے کے نتیجے میں انہیں نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا، بن زیان ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔

زوبی گا تا دوسرے دن لارا پر قیامت ڈھانے والا تھا۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ عابی کے خلاف خیال خوانی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے درویش کے دماغ میں آکر کہا۔ "تمہارے خواب پورے نہیں ہوں گے۔ کوئی قاضی نکاح نہیں پڑھا سکے گا۔ میں اس کے دماغ میں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ وہ نکاح پڑھانا بھول جائے گا۔"

درویش نے کہا۔ "تم لوگ پہلے بھی عابی کے خلاف بہت کچھ کرتے رہے ہو اور ناکام ہوتے رہے ہو۔۔۔ کیوں خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالنے آرہے ہو۔ پھر اپنا سا منہ لے کر تاریک دنیا میں جا کر چھپ جاؤ گے۔ اب تک تو یہی کرتے آرہے ہو۔"

انہوں نے کہا۔ "اس بار ناکامی ہوگی تو میں نکاح قبول کرنے والی دلہن کو ہی ختم کر دوں گا۔ تم اپنی بیٹی کا ماتم کرتے رہو گے۔"

درویش نے پریشان ہو کر مراد سے کہا۔ "یہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا دھمکیاں دے رہا ہے۔ وہ کسی قاضی کو نکاح پڑھانے نہیں دے گا۔"

مراد نے بن زیان سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ "تاریک دنیا کے شیطانوں سے تمہاری بڑی دوستی ہے۔ تم میرے خلاف لارا کو تحفظ دینے آئے تھے۔ اب بھی ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے تمہاری دوستی ہے۔ انہیں سمجھاؤ کہ کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔"

اس نے کہا۔ "پلیز! آپ مجھے ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ساتھ نہ ملائیں۔ صرف لارا سے میرا تعلق رہا

ہے۔ وہ آج کل بڑے ہی ذہنی عذاب میں مبتلا ہے۔ آپ سے دشمنی کرنے اور عابی کی شادی روکنے نہیں آئے گی۔ کوئی اور دشمنی کررہا ہوگا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اگر تعلق ظاہر ہوگیا تو میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔''

مراد فی الحال چیلنج کرسکتا تھا۔ ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے نمٹنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ عابی کو معلوم ہوا تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ دشمن خیال خوانی کرنے والوں میں آبنوس اور طاغوتا تھے۔ مراد اور عابی ان کی کوئی کمزوری نہیں جانتے تھے۔ کسی بھی پہلو سے انہیں اپنے دباؤ میں نہیں لاسکتے تھے۔ کوئی ایسی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی جسے ان کے خلاف آزمایا جاسکے۔

چینلز کے ذریعے یہ ساری دنیا کو معلوم ہورہا تھا کہ نکاح مغرب کی نماز کے بعد پڑھایا جائے گا لیکن آبنوس چیلنج کرچکا تھا کہ نکاح خوانی نہیں ہوسکے گی۔ جو قاضی نکاح خوانی کے لیے آئے گا، اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کردیا جائے گا۔

کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوسکے گا، یہ پوری دنیا چینلز کے ذریعے دیکھنے والی تھی۔ اکثریت کہہ رہی تھی کہ وہ باپ بیٹے خیال خوانی کرنے والوں کو نہیں روک سکیں گے، نہ انہیں دیکھ سکیں گے نہ ان سے مقابلہ کرسکیں گے۔

مراد اور عابی کی طرف سے خاموشی تھی جیسے انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو۔ یا پھر وہ مطمئن ہوں کہ شادی خانہ آبادی ہوکر رہے گی۔

ایک قاضی صاحب مقررہ وقت پر دلہن کے پاس نکاح پڑھانے آگئے۔ لوگ چینلز کے ذریعے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ بے تابی سے منتظر تھے کہ اب رکاوٹ پیدا ہونے والی ہے۔ قاضی صاحب کے دماغ میں زلزلہ پیدا ہونے والا ہے اور آبنوس ان کے اندر پہنچ گیا تھا۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا مگر وہ رک گیا تھا۔ اسے بہت ہی سریلی مترنم آواز میں کلام پاک کی آیت سنائی دے رہی تھی۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ آیت قاضی صاحب کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر لیلیٰ سے ایجاب و قبول کرارہے تھے۔ آبنوس کو وہ تلاوت سنائی دے رہی تھی۔

آبنوس نے طاغوتا کو آواز دی۔ ''فوراً آؤ، دیکھو یہاں کیا ہورہا ہے۔''

طاغوتا خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر قاضی صاحب کے دماغ میں آیا۔ اس نے سوچ کی لہروں کے کئی جھٹکے ان کے اندر پہنچائے لیکن وہ متاثر نہیں ہورہے تھے۔ انہیں اس بار انگریزی زبان میں وہی آیتیں سنائی دے رہی تھیں۔

آبنوس اور طاغوتا فوراً ہی لارا کے پاس آئے۔ ''لارا فوراً آؤ۔ دیکھو ہماری خیال خوانی کی لہریں بے اثر ہورہی ہیں۔ وہاں ان کی آسمانی کتاب کی باتیں گونج رہی ہیں۔''

لارا قاضی صاحب کے دماغ میں آئی تو پھر عربی میں تلاوت ہورہی تھی۔ اس نے سریلی اور مترنم آواز کو سنتے ہی کہا۔ ''اوہ! یہ تو ماروی ہے۔''

''ماروی؟'' دونوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ تو ابھی چھوٹی سی بچی ہے۔''

لارا نے کہا۔ ''وہ بڑی نہیں ہے تو اب بچی بھی نہیں رہی ہے۔ اس نے رگھو ناتھ کالیا جیسے جادوگر کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ آج بھی میرے لیے عذاب جان بنی ہوئی ہے۔ میرے بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے۔ اسے شیطان کی پرستش سے روکتی رہی ہے۔ اب وہ اپنے بھائی کی شادی میں شریک ہونے آئی ہوگی۔ ہم میں سے کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا رکاوٹ نہیں بن سکے گا۔ واپس جاؤ۔ وہ تمہیں نقصان پہنچاسکتی ہے۔''

ناظرین منتظر تھے کہ شیطان کے چیلے اب تب میں دھماکا کرنے والے ہیں لیکن قاضی صاحب محفوظ تھے۔ انہیں کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے لیلیٰ اور عابی کا نکاح پڑھا چکے تھے۔

عابی سے محبت کرنے والے خوش ہورہے تھے۔ جشن منارہے تھے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں نے اور دیگر مخالفین نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں پر تکیہ کیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ شادی کا ماحول ماتمی ہوجائے گا اور ایسا نہیں ہورہا تھا۔

یہ انتظامیہ کے عہدیداروں کی اور اعلیٰ حکام کی توہین تھی کہ عابی نے ان کے ملک میں جبراً رہائش اختیار کی تھی اور اب شادی بھی کرچکا تھا۔ وہاں بچے بھی پیدا کرنے والا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ عابی وہاں نئی دلہن کے ساتھ رہے۔ اپنی زمین سے اس کے قدم اکھاڑنے کی ضد تھی، جنون تھا۔ وہ ہر قیمت پر ہر چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اسے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔

شاہانہ دستور کے مطابق دلہن کی رخصتی ہوئی۔ وہاں کے حکام مراد، اس کے بیٹے اور بہو کو شاہانہ سیکیورٹی دینے پر مجبور

تھے اور وہ سیکیورٹی دینے والے ہی جان کے دشمن تھے۔

جب وہ باپ بیٹے دلہن کو لے کر وہاں سے روانہ ہوئے تو لیلیٰ اور عابی ایک کار میں تھے۔ مراد اور ماردی دوسری کار میں تھے۔ ان کے آگے پیچھے جاں نثاروں کی گاڑیاں تھیں۔ ان کے اطراف سرکاری سیکیورٹی فورس کے شوٹرز تھے۔

وہ تمام گاڑیاں ایک مخصوص رفتار سے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ ایک شاہراہ کے اطراف دور تک فلک بوس عمارتیں تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت نے اچانک دو فائر اگل دیے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی آکر عابی کی کار کے پہیوں میں لگیں۔ کار ایک دھماکے سے اچھل کر دوسری طرف گھوم گئی۔

دوسری سمت کی عمارت سے بھی گولیاں چلی تھیں۔ جاں نثاروں نے جواباً ادھر فائرنگ کی تو خاموشی چھا گئی۔ وہ فرار ہو گئے تھے۔ کار ایک عمارت سے ٹکرا کر پچک گئی تھی۔ یہ اندازہ ہو گیا کہ لیلیٰ اور عابی کار کے اندر دب گئے ہیں۔ کار ایسے دھماکے سے ٹکرائی تھی کہ ان کی موت واقع ہو سکتی تھی۔

چند لمحوں کے لیے وہاں موت کی گہری خاموشی چھا گئی۔ سب ہی دم بخود ہو کر پچکی ہوئی کار کو دیکھ رہے تھے۔ تب عابی کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ تلاوت کر رہا تھا۔

ایسی گونجتی گرجتی ہوئی روحانی صدا کے ساتھ وہ کار ایک کھلونے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دور تک بکھرنے لگی۔ عابی اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے لیلیٰ کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لا دلیا تھا۔ وہ محفوظ تھی۔ اسے ایک ذرا سی خراش نہیں آئی تھی۔

عابی اسے کاندھے پر لادے چھلانگیں لگاتا ہوا اس عمارت کے سامنے پہنچا جہاں سے پہلی دو گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایسے وقت تمام جاں نثار ان عمارتوں کی سمت فائر کر رہے تھے، جہاں سے فائرنگ ہوتی رہی تھی۔

عابی ایک چھلانگ لگا کر ایک عمارت کی چھت پر آ گیا۔ فائر کرنے والے لفٹ کے ذریعے فرار ہو رہے تھے۔ وہ ان سے پہلے ہی گراؤنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ اس کے شانے پر لدی ہوئی سہمی ہوئی دلہن نے دیکھا، وہ تین شوٹرز کی پٹائی کر رہا تھا۔ انہیں فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پہلے ہی حملے میں ہتھیار ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے تھے۔ اس کے گھونسے اور اس کی لاتیں کھاتے ہی وہ سب فرش پر گر کر تکلیف سے تڑپ رہے تھے۔

ماردی نے کہا۔ ”بابا جانی! دوسری بلڈنگ کے شوٹرز وہاں کے بظاہر مکین ہیں اور پُرامن شہری ہیں لیکن دشمن ہیں۔ حملہ انہوں نے ہی کیا ہے۔ ابھی اسلحے کو چھپا دیا ہے۔ کوئی ان پر شبہ نہیں کرے گا۔“

مراد اس رہائشی عمارت میں پہنچ گیا۔ وہاں کے مکین نے حیرانی اور پریشانی سے پوچھا۔ ”ہز ہائی نس! آ...... آپ؟“

مراد نے کہا۔ ”وہ ہتھیار نکالو جنہیں ابھی چھپایا ہے۔“

وہ حیرانی ظاہر کر کے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مراد نے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ دوسرا شخص اچھا خاصا تگڑا تھا لیکن دہشت زدہ کرنے کے لیے مراد کا نام ہی کافی ہوتا تھا۔ وہ سہم کر منہ دیکھتا رہ گیا۔ جاں نثار چینلز کے کیمرا مین اور رپورٹرز کو لے آئے تھے۔ اب دنیا انہیں دیکھ رہی تھی۔

یہ ثابت ہو رہا تھا کہ سرکاری طور پر سیکیورٹی دینے والوں نے ہی ان پر جان لیوا حملے کیے ہیں۔ یہ انکشاف ہوتے ہی تمام مخالفین ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ اور الزام اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ عابی کے ہاتھوں مارے جانے والوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ وہ بن زیان کی ڈینجرز تنظیم کے خطرناک شوٹرز تھے۔

مراد نے چینلز کے ذریعے کہا۔ ”کوئی پولیس اور انٹیلی جنس والا سرکاری طور پر ہماری سیکیورٹی کے لیے نہیں آئے گا۔ ہم اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ ابھی ہم باپ بیٹے پانی میں مگرمچھوں کے درمیان ہیں۔ کسی مگرمچھ کو قریب نہیں آنے دیں گے۔ میں دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرا بیٹا یہاں اس وقت تک رہے گا، جب تک اسے اس ملک سے جبراً نکالنے کی دشمنی کی جاتی رہے گی۔ دشمنو! تم تماشا بنو۔ پرنس عابی دنیا کو تماشے دکھاتا رہے گا۔ وہ اس زمین پر ستون کی طرح گڑا ہوا ہے۔ اسے کوئی اکھاڑ نہیں سکے گا۔“

بین الاقوامی عدالت سے کہا گیا۔ ”ہز ہائی نس! آپ قانون کا احترام کریں۔ آپ کے صاحبزادے کو کسی بھی ملک میں وہاں کے قوانین کے مطابق رہنا چاہیے اور مقررہ مدت کے بعد اس ملک کو چھوڑ دینا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”ہمارے دین کے مطابق اس روئے زمین کا اور یہاں کے تمام ممالک کا بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ

ہے۔ بندے اپنی دولت، طاقت اور عسکری قوتوں سے مختلف ملکوں کے ناقابلِ تسخیر حکمران بن گئے ہیں۔ اس دنیا میں حکمرانی ہے تو طاقت سے ہے۔ پرنس عابد علی منگی اپنی طاقت کا لوہا منواتا آرہا ہے۔ وہ جس ملک میں جائے گا، وہاں خود مختار حکمران بن کر رہے گا۔ کوئی دوسرا حکمران اسے اپنا پابند نہیں کرسکے گا اور یہ تماشا دنیا دیکھ رہی ہے اور جب تک اللہ چاہے گا، دیکھتی رہے گی۔"

مراد نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ عابی پوری دنیا کا حکمران بن کر رہے گا۔ کسی بھی ملک کا حکمران اس کی مخالفت کرے گا تو وہ اپنے ملک پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکے گا۔

کسی بھی ملک کا حکمران یہ فیصلہ دل سے تسلیم نہیں کرسکتا تھا اور کھل کر مخالفت کرنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ فی الحال یہ ہوا کہ وہاں عابی سے دشمنی کرنے والے ٹھنڈے پڑ گئے۔ پچاس ہزار سے زیادہ جاں باز اور پچاس ہزار سے زیادہ ماسٹر گولیو کے اور ریڈ الرٹ کے شوٹرز وہاں آگئے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ عابی آئندہ جس ملک میں جائے گا، وہاں اتنی ہی تعداد میں اس کی فوج بھی رہا کرے گی۔

اپنا فیصلہ منوانے کے لیے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جارہی تھی کہ تمام ممالک کے حکمران بے بسی سے تلملا رہے تھے۔ عابی سے اپنے ہی ملک میں جنگ لڑ کر اسے پسپا نہیں کرسکتے تھے۔ وہی تنہا پوری فوج پر بھاری پڑتا تھا۔ آئندہ اس کی فوج کثیر تعداد میں اس کے ساتھ رہنے والی تھی۔

حالات ایسے تھے کہ عارضی طور پر جنگ بندی ہوگئی تھی۔ مخالفین نے مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی۔ عابی اپنی دلہن کے ساتھ آزادی اور خود مختاری سے وہاں رہنے لگا۔ اب لیلیٰ اور عابی کے اہم معاملات تھے۔

بظاہر دونوں خوش تھے اور مسرتوں بھری ازدواجی زندگی گزار رہے تھے لیکن قاسم درویش کی پیش گوئی غلط ہونے والی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ عابی خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تب ہی اس کی شریکِ حیات زندہ رہتی ہے۔ بے لگام تعلق کے نتیجے میں پہلی بیوی بے موت مرگئی تھی۔

اور اب جو زندگی گزار رہی تھی، وہ خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کے باعث ماں نہیں بن سکتی تھی۔ درویش۔ کے لیے عابی کی طرح عجیب وغریب نواسہ پیدا نہیں کرسکتی تھی۔ یوں باقی چھ بیٹیاں بھی منہ تکتی رہنے والی تھیں۔ وہ بے خبر تھا، اپنے علم نجوم کے مطابق سماعت تو اسے پیدا نہیں کرا سکتا تھا۔ آگے جا کر اس ماہر نجومی کی آنکھیں کھلنے والی تھیں۔

☆☆☆

ماروی سے کوئی دشمن چھپ نہیں سکتا تھا۔ بن زیان بڑی رازداری سے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا راہنما بنا ہوا تھا۔ انہیں ہر طرح کے ذرائع اور سہولتیں فراہم کرتا رہتا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب تبت کے جادوگر لامہ کیشورا کا اس پر کامیابی سے عمل کرچکا تھا۔ اس کے وجود کے اطراف حصار باندھ کر اس نے کہا تھا۔ "آئندہ کسی طرح کا بھی جادو منتر اور روحانی عمل اس پر اثر نہیں کرے گا۔ وہ لامہ کے حصار کے اندر محفوظ رہے گا۔"

اور مراد نے کہا تھا کہ وہ درپردہ ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو باپ بیٹے کے خلاف استعمال کرے گا تو بہت پچھتائے گا۔ بن زیان کو یقین تھا کہ اس کی رازداری قائم رہے گی لیکن ماروی اس کے سامنے آگئی۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی کوئی جادوگر اور کوئی روحانی قوت رکھنے والا مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا؟

وہ آئینے میں ماروی کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی طرف گھوم کر بولا۔ "تم......؟"

اس نے کہا۔ "آبنوس اور طاغوتا تمہاری شہ پر میرے بھائی جان کی شادی روکنے کی کوشش کررہے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔"

"میں نے آبنوس اور طاغوتا کو ناکام بنایا ہے اور ان کے پیچھے تمہیں دیکھ چکی ہوں۔ بابا جانی نے وارننگ دی تھی۔ بہت پچھتاؤ گے اور پچھتانے کا وقت آگیا ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"میں براہِ راست کچھ نہیں کرسکوں گی۔ تمہارے اطراف جادوئی حصار دیکھ رہی ہوں۔ فی الحال تمہیں چھو بھی نہیں سکوں گی۔"

وہ یکلخت خوش ہوکر قہقہہ لگانے لگا۔ "جیو لامہ کیشورا کا...! ہزاروں سال جیو۔"

"تم نہیں جیو گے۔ آج سے تمہاری نیندیں اڑ جائیں گی۔ تم جہاں رہو گے جس ملک میں رہو گے، وہاں میں بھائی جان کو تمہارا اتا پتا ٹھکانا بتادوں گی۔ تم نے روحانی قوت کے خلاف عمل کرایا ہے۔ یہ عمل بھائی جان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک نہیں سکے گا۔"

اس کے منہ سے ہنسی اڑ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں ابھی بھائی جان سے کہتی ہوں کہ تم پیرس کے کس علاقے میں کس بنگلے میں ہو۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”جہاں جاؤ گے، وہاں پہنچ جاؤں گی اور بھائی جان کو پہنچادوں گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں اسی جزیرے میں جاؤں گا۔ جہاں میں نے کبھی لارا کو چھپایا تھا۔ وہاں عابی تو کیا اس کا باپ بھی نہیں پہنچ سکے گا۔“

”میں دیکھوں گی کہ تم چھپنے میں کہاں تک کامیاب رہو گے۔“

یہ کہہ کر وہ گم ہو گئی۔ بن زیان کو موت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے لامہ کے ذریعے جادو اور روحانی قوتوں کے خلاف تحفظ حاصل کیا تھا لیکن عابی اور مراد سے سامنا ہوتا تو وہ طلسمی حصار انہیں روک نہیں پاتا۔

اس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اپنے دست راست کو حکم دیا کہ اس کے ذاتی طیارے کو ایک گھنٹے کے اندر پرواز کے لیے تیار کیا جائے۔ وہ جلد سے جلد اس جزیرے میں جا کر رہنا چاہتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسکرین پر عابی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے بے دلی سے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہیلو.....؟“

عابی نے پوچھا۔ ”جزیرے میں چھپنے جا رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”مجبوری ہے۔ تم عداوت کی سزا ضرور دو گے۔ پھر بھی پوچھتا ہوں۔ کیا عداوت ختم کرنے کے لیے کسی طرح سمجھوتا ہو سکتا ہے؟ میری غلطی کو معاف کر سکتے ہو؟“

”صرف ایک شرط پر لیکن تم شرط کے مطابق عمل نہیں کرو گے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ میرے دشمنوں سے دوستی نہ کرو لیکن ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے بڑے فائدے حاصل کر رہے ہو۔ ان کی دوستی سے اور مجھ سے دشمنی سے باز نہیں آؤ گے۔“

”ہاں، وہ ٹیلی پیتھی جاننے والے میرا بہت بڑا اختیار ہیں۔ کوئی دوسری شرط پیش کرو۔“

”کوئی شرط نہیں ہے۔ وہی ایک جزیرہ ہے، جہاں تمہیں میرے ہاتھوں موت نہیں آئے گی۔ جاؤ اور اپنی آخری سانس تک قیدی بن کر رہو لیکن وہاں سکون سے نہیں رہ سکو گے۔ ماروی وہاں آتی رہے گی۔“

”اس کی روحانی قوت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

”کیا یہ نہیں جانتے ہو کہ جادو عارضی ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا اثر زائل ہوتا رہتا ہے۔“

”ایسا ہونے سے پہلے میں پھر عمل کراؤں گا۔“

”تمہارے لامہ کا جادوئی اثر ذرا بھی کمزور ہوگا تو ماروی تمہارے ہوش اڑا دے گی۔ تمہیں اس جزیرے سے باہر میرے سامنے آنے پر مجبور کر دے گی۔ جاؤ اور عارضی تحفظ حاصل کرو۔ جلد ہی ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہوگی۔“

عابی نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ بہت مطمئن تھا۔ عابی اطمینان غارت کر کے چلا گیا۔ اسے یاد آیا کہ کالا جادو دیرپا نہیں ہوتا۔ جلد یا بدیر اس کے اثرات کم ہوتے جاتے ہیں پھر سے وہی عمل کر کے اثرات کو نئے سرے سے قائم رکھا جاتا ہے۔

اس نے فون کے ذریعے لامہ سے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تمہارے جادو کا اثر رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا؟“

”درست ہے۔ اس سے پہلے ہی میں دوبارہ عمل کردوں گا، فکر نہ کرو۔“

”تمہارے عمل کرنے کے دوران وہ توڑ کرنے آجائے گی۔“

”کون آئے گی؟“

وہ اسے ماروی کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ سن کر بولا۔ ”ہے بھگوان! وہ روحانی قوتیں رکھتی ہے۔ اسی نے رگھوناتھ کالیا کو کئی بار مات دی تھی۔ اس سے تو محتاط رہنا ہوگا۔ اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں دوبارہ کب تم پر عمل کرنے والا ہوں۔“

”اس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکے گی۔ وہ نادیدہ ہو کر آتی جاتی رہتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی وہ یہاں موجود ہے یا نہیں؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”کیا مصیبت ہے؟ میں اس کی

موجودگی معلوم کرنے کے لیے منتروں کا جاپ کروں گا پھر وہ تمہارے پاس چھپ کر نہیں آئے گی۔ آتے ہی تمہیں دکھائی دے گی۔''

ایسے وقت لارا آگئی۔ وہ بن زیان سے زیادہ مصیبت زدہ تھی۔ چھ گھنٹے بعد رات ہونے والی تھی اور زدمبی گاننا وہ رات اس کے ساتھ جبراً گزارنے والا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ رات کی تاریکی پھیلتے ہی اس کے پاس چلی آئے۔ یہ جانتا تھا کہ لارا پلک جھپکتے ہی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔

وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ رگھو ناتھ کالیا کی موت کے بعد اس کے شکنجے سے نکل کر زدمبی گاننا کے طلسمی شکنجے میں آگئی تھی۔ اس کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ بن زیان سے بولی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا، اس گینڈے جادوگر سے نجات دلاؤ گے۔ صرف چھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میری حفاظت کے لیے کیا کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میری پلاننگ تھی کہ اس کے پاس جہاں جاؤ گی وہاں میرے شوٹرز پہنچ کر اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ لیکن اس نے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ تم اس کے پاس کس ملک میں کہاں جاؤ گی۔ اب تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ کسی دور دراز کے علاقے میں بلائے گا تو اتنی جلدی میرے شوٹرز وہاں پہنچ نہیں سکیں گے۔ تم نہیں جانتیں، ماروی اور عابی میرے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔''

پھر اس نے فون پر لامہ سے پوچھا۔ ''کیا تم لارا کو زدمبی گاننا کے طلسمی شکنجے سے نکال سکتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں نے آج تک کسی جادوگر کو نہ چیلنج کیا ہے، نہ کسی کو اپنا دشمن بنایا ہے۔ پہلے اپنی فکر کرو۔ میں منتروں کا جاپ کرتے جا رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس کے انکار سے لارا بے یارو مددگار ہو گئی تھی۔ اس کی آبرو، اس کے غرور کی دھجیاں اڑنے والی تھیں۔ وہ رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ''تم نے میرے بچاؤ کے لیے بہت کمزور پلاننگ کی تھی۔ زدمبی کو گولیوں سے چھلنی کرانا چاہتے تھے۔ اب سے پہلے کالیا پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ وہ جادوئی حصار میں محفوظ تھا۔ زدمبی گاننا بھی محفوظ ہوگا۔ وہ نادان نہیں ہے۔ اپنے جادوئی حصار میں رہتا ہوگا۔''

وہ پریشان ہو کر ٹہلنے لگا۔ وہ رو رہی تھی، بول رہی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی تو وہ جینا حرام کر دے گا۔ آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ زیان! مجھے بچا لو۔''

وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''گھوم پھر کر ماروی دماغ میں آرہی ہے۔ ہم نے اس کے کمالات دیکھے ہیں۔ وہ کالیا کی طرح زدمبی گاننا کو بھی مات دے سکتی ہے۔''

''وہ میرے لیے زدمبی گاننا کو چیلنج نہیں کرے گی۔ یہ چاہے گی کہ میں مرجاؤں پھر وہ اپنے بھائی دانش کو کسی رکاوٹ کے بغیر لے جائے گی۔''

اس نے قائل ہو کر کہا۔ ''ہاں، وہ چاہے گی کہ تمہاری موت کے بعد دانش کو اپنے باپ کے پاس اپنے دینی ماحول میں لے جائے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی آرزو پوری ہوگی۔''

ایسے وقت ماروی آگئی۔ وہ نادیدہ نہیں تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر چونک گئے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ تم کالیا سے نجات پانے کے بعد کسی زدمبی گاننا کے طلسمی شکنجے میں آگئی ہو۔''

لارا نے عاجزی سے کہا۔ ''ہاں ماروی! تم ہی اس سے نجات دلا سکو گی۔ میری بچی! میری عزت اور خودداری کی لاج رکھ لو۔''

''ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری موت سے مجھے فائدہ پہنچے گا۔ میں اپنے بھائی کو اپنے دینی ماحول میں لے جاؤں گی۔''

''ہاں تم ایسا کرو گی مگر تمہارا دین تمہارا خدا کیا کہتا ہے؟ کیا یہ کہتا ہے کہ کسی کی عزت آبرو بچا سکتی ہو تو نہ بچاؤ۔ اس کی موت سے فائدہ اٹھاؤ۔ میں تمہارے مجبور کرنے سے دانش کو آج کل شیطان سے دور رکھتی ہوں۔ اس سے اپنے شیطانی دھرم کی کوئی بات نہیں کہتی ہوں۔ تم چوری چھپے آکر دیکھتی رہتی ہو۔''

''ہاں۔ تم اپنے وعدے پر قائم ہو۔''

''مجھ سے ایسی ہی کوئی اور بات منوالو۔ میری عزت بچا لو۔ یہ سوچو کہ یہاں آکر جس بھائی کو دیوانہ وار چاہتی ہو، اسے میں نے جنم دیا ہے۔ کیا اپنے بھائی کو جنم دینے والی ماں کی آبرو نہیں بچاؤ گی؟ کیا بھائی بڑا ہوگا اور سنے گا تو اس کا سر شرم سے نہیں جھکے گا۔''

ماروی چونک کر لارا کو دیکھنے لگی۔ اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ وہ بولی۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ وہاں سے غائب ہوگئی۔ عابی کے پاس پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دے کر بولی۔ ''بھائی جان! میں آئی ہوں۔''

اس نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ''اچانک آئی ہو۔ خیریت تو ہے؟''

وہ کمرے میں آکر لارا کے حالات بتانے لگی۔ وہ توجہ سے سننے کے بعد ناگواری سے بولا۔ ''جو عورتیں اپنے شوہر سے دغابازی کرتی ہیں، ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ کبھی عزت آبرو کی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتیں۔ دوسرے مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہیں۔''

''لارا نے بے شک ہمارے بابا جانی کے اعتماد سے کھیلا ہے۔ انہیں دھوکا دیا ہے لیکن وہ بدچلن نہیں ہے۔ میں اسے اندر سے جانتی ہوں۔ وہ عزت آبرو سے زندگی گزار رہی ہے۔ اب اس کی آبرو پر آنچ نہیں آنا چاہیے۔''

''وہ شیطان کی پرستار ہے۔ اسے اپنے شیطان کے رحم وکرم پر چھوڑ دو۔''

''نہیں بھائی جان! اس عورت نے ہمارے بابا جانی کے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ وہ ہمارے بھائی کو پیدا کرنے والی ماں ہے۔ اس حوالے سے ہمارے لیے محترم ہے۔ ہم اس ماں کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

عابی نے متاثر ہو کر بہن کو دیکھا پھر سر ہلا کر کہا۔ ''درست کہتی ہو۔ اگرچہ وہ ہمارے دین کی دشمن ہے لیکن ہمارے بھائی کی ماں ہے۔ وہ لارا کے پاس کب آئے گا؟ وہ کہاں رہتا ہے؟''

''وہ جہاں بھی رہتا ہے' وہاں لارا کو آنے پر مجبور کرے گا۔ وہ چشم زدن میں وہاں پہنچ جائے گی۔ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گی۔ زومبی کو لارا کے قریب پہنچنے سے روک سکوں گی لیکن اس کا مقابلہ نہیں کرسکوں گی۔''

عابی نے کہا۔ ''پتا نہیں وہ کس ملک میں اور کتنے دور دراز کے علاقے میں ہے۔ میں تمہاری طرح وہاں پہنچ نہیں پاؤں گا۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

وہ دونوں ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ عابی نے کہا۔ ''زومبی کو گھیر کر یہاں لانا ہوگا۔ تب ہی ہم اس سے نمٹ سکیں گے۔''

''وہ کبھی ادھر نہیں آئے گا۔ بہت ہی سرپھرا اور شہ زور ہے۔ گینڈے کی طرح مضبوط اور سخت جان ہے۔ کسی بھی ہیوی ٹرک کو پیچھے سے پکڑ کر روک لیتا ہے۔ وہ ایسا سخت جان ہے کہ زخموں سے چُور ہونے کے باوجود مقابلے پر ڈٹا رہتا ہے۔ اسے تو آپ ہی زیر کرسکیں گے۔''

''لیکن مقابلہ نہیں ہوگا۔ وہ جہاں ہے، وہاں جا نہیں سکوں گا اور وہ یہاں نہیں آئے گا۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ عابی اس کے سامنے ٹہلنے لگا پھر اس نے کہا۔ ''ایک تدبیر ہے۔ لارا اس جادوگر سے بولے کہ کسی دشمن نے اسے زنجیریں پہنادی ہیں۔ زنجیریں نہیں کھلیں گی تو وہ چشم زدن میں اس کے پاس نہیں آسکے گی۔ تب ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی زنجیریں کھولنے کے لیے اس کے پاس آئے۔''

''بھائی جان! یہ اچھی تدبیر ہے۔ زومبی یہی سمجھے گا کہ لارا مجبور ہوگئی ہے۔ اسے وہاں سے رہائی دلائے گا تب ہی اس کے ساتھ کہیں بھی جاسکے گی۔''

''تو پھر جاؤ۔ لارا سے بولو، وہ یہاں آئے۔ میری گرفت میں رہے۔ زومبی اسے رہائی دلانے کے لیے ضرور میرے مقابلے پر آئے گا۔''

ماروی نے لارا اور بن زریان کے پاس آکر کہا۔ ''تم ایک ہی تدبیر سے خود کو محفوظ رکھ سکوگی۔ زومبی سے بولو کہ پرنس عابی تم سے دشمنی کررہے ہیں۔ تمہیں زنجیر پہنادی ہے۔ وہ جب تک نہیں کھلے گی۔ تب تک چشم زدن میں غائب ہوکر زومبی کے پاس نہیں پہنچ سکوگی۔''

وہ بولی۔ ''یہ اچھی تدبیر ہے۔ وہ مجھے مجبور سمجھ کر کالے جادو سے مجھ پر حملہ نہیں کرے گا لیکن وہ دیکھنے آئے گا کہ میں سچ بول رہی ہوں یا نہیں؟''

''یہی تو ہم چاہتے ہیں۔ وہ آئے گا تو تمہیں بندھا ہوا پائے گا۔ بھائی جان اسے زندہ نہیں جانے دیں گے۔''

''کیا پرنس عابی مجھے سچ مچ زنجیر پہنائے گا؟''

''سچ مچ پہنائے گا، تب ہی زومبی دھوکا کھائے گا۔''

لارا نے بن زریان سے کہا۔ ''اس طرح میں زومبی سے نجات حاصل کرکے عابی کے شکنجے میں چلی جاؤں گی۔ یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ ایک کی گرفت سے نکلتی ہوں تو دوسرے تیسرے کے شکنجے میں پہنچ جاتی ہوں۔''

ماروی نے کہا۔ ''تمہیں شکنجے میں رکھنے کا شوق ہمیں

نہیں ہے۔ بھائی جان تمہیں زومبی سے نجات دلا کر رہا کریں گے۔ تم سے پہلے کبھی دشمنی نہیں کی، اب بھی نہیں کریں گے۔"

بن زریان نے کہا۔ "لارا......! تمہارے اور ان کے درمیان دین اور کفر کی جنگ جاری ہے۔ اس جنگ کے دوران ہم مراد اور عابی کی اعلیٰ ظرفی دیکھتے آئے ہیں۔ ماروی نے اپنے باپ اور بھائی کو بچہ تبدیل کرنے کے سلسلے میں ہمارا فراڈ نہیں بتایا ہے۔ یہ اپنی حکمت عملی پر قائم رہے گی اور وہ باپ بیٹے بھی دشمنی نہیں کریں گے۔ ان پر بھروسا کرو۔ عابی کی تدبیر کے مطابق عمل کرو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

واقعی ان کے آگے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لارا راضی ہوگئی۔ ماروی کے ساتھ اسی وقت عابی کے پاس آگئی۔ عابی نے اس کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں پہنا کر فرش پر بٹھا دیا۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے زومبی گاگنا سے کہا۔ "میں مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ پرنس عابی نے مجھے گرفتار کرلیا ہے۔ مجھے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ جب تک یہ نہیں کھلیں گی، میں چشم زدن میں غائب ہو کر تمہارے پاس نہیں آسکوں گی۔"

اس نے پوچھا۔ "پرنس نے تمہیں کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے، میں اس کے بھائی کو جنم دینے والی ماں ہوں۔ وہ کسی بھی عیاش دشمن کو میرے وجود تک پہنچنے نہیں دے گا۔"

"اس کی شامت آگئی ہے۔ میں اس کا یہ غرور خاک میں ملا دوں گا کہ وہ ہماری دنیا کا سب سے طاقت ور آدمی ہے۔ میری اس سے بات کراؤ۔ میں چاہوں گا کہ وہ سمجھانے سے سمجھ لے اور تمہیں میرے حوالے کردے۔"

لارا نے اسے عابی کا فون نمبر بتایا۔ اس نے وہ نمبر پنچ کیے۔ تھوڑی دیر بعد عابی کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "میں زومبی گاگنا بول رہا ہوں۔ کیا تم نے لارا کو قیدی بنا کر رکھا ہے؟"

"ہاں۔ میں قیدی بنا کر اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ میں اسے اپنا کھلونا بنانے والا ہوں۔"

"تم اس کی عزت کو کھیل نہیں بنا سکو گے۔"

"تمہیں اپنی جسمانی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہے۔ میں کیسا فولادی مجسمہ ہوں، یہ تم نہیں جانتے ہو۔"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قوی ہے۔ قادر مطلق ہے اور ناقابل تسخیر ہے۔"

"میں تمہیں اسی اللہ کے پاس پہنچا دوں گا۔"

"تو پھر آؤ اور اپنی حسرتیں پوری کرو۔"

"تم لندن میں ہو، اپنی ذاتی فوج کے ساتھ ہو۔ آئندہ بھی کسی ملک میں اپنی مسلح فوج کے ساتھ رہنے والے ہو اگر واقعی مرد کے بچے ہو تو کسی ویرانے میں تنہائی میں مقابلہ کرو۔ چینلز کے ذریعے اس مقابلے کی پبلسٹی نہ کرو۔ اپنے باپ سے بھی نہ بولو کہ میرے پاس مرنے آرہے ہو۔"

"میں تمہاری تمام حسرتیں پوری کروں گا۔ جہاں بولو گے، تنہا آؤں گا۔"

"میں اپنے منتروں سے معلوم کرلوں گا کہ تم تنہا ہو یا تمہارے پیچھے فوج چھپی ہوئی ہے۔"

"تم پوری طرح مطمئن ہو کر آؤ۔"

"تم لارا کو وہاں لاؤ گے؟"

"لارا کو وہاں ساتھ لے جانا نادانی ہوگی پھر بھی میں اسے لاؤں گا۔"

"یہ ہوئی نہ مردوں والی بات۔ کل دوپہر کو صحرائے گوبی کے ڈیسٹ زون میں آجاؤ۔"

وہ ایسی جگہ بلا رہا تھا جو اس دنیا کی سب سے زیادہ جہنمی زمین کہلاتی ہے۔ وہاں سیکڑوں میل دور تک خشک ریگستان ہے۔ وہاں آدمی تو کیا کیڑے مکوڑوں کا سایہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پینے کے لیے پانی کی ایک بوند نصیب نہیں ہوتی۔ یعنی مقابلے کے دوران جو مارا جاتا، اسے دم توڑتے وقت پانی بھی نصیب نہ ہوتا۔

بہرحال طے ہوگیا۔ دوسرے دن آگ کی طرح تپتے ہوئے ریگستان میں دو پہاڑ ٹکرانے والے تھے۔ لارا نے کہا۔ "عابی! تم دشمن پر اندھا یقین کر رہے ہو۔ وہ تنہا نہیں آئے گا۔ اس کے مسلح چیلے بھی ہوں گے اور جادو کے پٹارے بھی ہوں گے۔"

"ہونے دو۔ میرے ساتھ میرا اللہ رہتا ہے۔"

"تمہارا ایمان تمہیں لے ڈوبے گا تو میں اس کے شکنجے میں چلی جاؤں گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں ابھی تمہاری زنجیریں کھول رہا ہوں۔ تم اس میدان جنگ میں میرے پیچھے آزاد رہو گی۔

جب بھی خطرہ محسوس کروگی، وہاں سے فرار ہو جاؤ گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ اس کی زنجیریں کھولتے ہوئے بولا۔ "چاہو تو ابھی مجھے دھوکا دے کر فرار ہو سکتی ہو لیکن جانتا ہوں، ابھی رہائی حاصل کروگی تو اس کے جادوئی حملوں سے نقصان اٹھاؤ گی۔ کل میدان جنگ میں اس سے بولو گی کہ ہم دونوں میں سے جو فاتح ہوگا، وہی تمہیں لے جائے گا۔ ویسے تمہیں کوئی جبراً نہیں لے جائے گا، تم تو اسی لمحے سے آزاد ہو۔"

وہ عابی کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ مجھ پر اعتماد کر رہے ہو۔ میں کسی بھی لمحے میں جاؤں گی تو مجھے روک نہیں سکو گے لیکن تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تھوڑی دیر کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آ جاؤں گی۔"

وہ پلک جھپکتے ہی گم ہو گئی۔ بیٹے کے پاس پہنچ کر اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہ قبلہ رو بیٹھا ہوا کلام پاک کی ایک آیت کو بار بار سبق کی طرح یاد کر رہا تھا۔ اس کے قریب ماروی مغرب کی نماز ادا کر رہی تھی۔

یہ دیکھتے ہی وہ جل بھن گئی۔ دل میں کہا۔ "اس نے میرے بیٹے کو شیطان کی عبادت سے دور کر دیا ہے اور اپنے خدا کی عبادت سے لگا رہی ہے۔ میں مجبور ہو گئی ہوں۔ زویی گاتا سے نجات حاصل کرنے کے بعد ماروی سے نمٹ سکوں گی۔"

وہ ناگواری سے ماروی کے سامنے آ کر بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم میری عدم موجودگی میں دانش کو اپنے دین کی طرف کھینچتی رہتی ہو۔"

ماروی نے سلام پھیرنے کے بعد کہا۔ "یہ دانش کا پیدائشی حق ہے۔ یہ مسلمان کا بیٹا ہے۔ میں بڑے صبر و تحمل سے دن رات اس کے پاس آتی رہتی ہوں۔ اسے شیطانیت سے دور اور ایمان سے قریب لاتی رہی ہوں۔ تاریک دنیا میں پیدا ہونے والے بچے سات برس کی عمر تک پلک جھپکتے ہی روشن دنیا میں پہنچنے لگتے ہیں۔ دانش بھی اب تمہارے بغیر دنیا کے کسی حصے میں جا سکتا ہے۔ فی الحال یہ میری انگلی پکڑ کر چل رہا ہے۔ مجھے سات برس کی محنتوں کا انعام مل رہا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ یہ تمہاری انگلی پکڑ کر نہیں چلے گا۔ میری اجازت کے بغیر یہ روشن دنیا میں کہیں نہیں جائے گا۔"

ماروی نے کہا۔ "ہماری ریاست ارض اسلام میں جو بہت بڑی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے، وہاں میں تمہاری عدم موجودگی میں دانش کو تین بار لے گئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے یہ شیطان پر لعنت بھیجنے لگا ہے۔"

وہ چیخ پڑی۔ دانش کے پاس آ کر اسے جھنجوڑ کر بولی۔ "کیا تم اس کے ساتھ گئے تھے؟ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے؟"

وہ بولا۔ "آپ میری ماں ہیں اور یہ میری بہن ہے۔ میں دونوں کی باتیں سنتا ہوں اور ان پر عمل کرتا ہوں۔"

"تم ان کے خدا کی عبادت کرتے ہو، یا شیطان کی عبادت کرتے ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "آپی مجھے اتنی اچھی باتیں سمجھاتی رہتی ہیں کہ شیطان میری سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ آپ میرے سامنے اس کا نام نہ لیں۔"

"کیا تم ہمارے شیطان سے نفرت کر رہے ہو، تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

ماروی نے کہا۔ "کیسے توڑو گی؟ اسے مارنا چاہو گی تو یہ بھاگ جائے گا۔"

"بھاگ کر کہاں جائے گا۔ جہاں جائے گا، وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا، وہ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ وہ ماروی کو مارنے کے لیے آگے بڑھی۔ "تم نے بیٹے کو ماں کے خلاف کیا ہے، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے تھپڑ مارنا چاہا۔ اس کا ہاتھ خالی فضا میں گھوم گیا۔ وہ بھی گم ہو گئی تھی۔ وہ غصے سے تلملا گئی۔ پلک جھپکتے ہی وہاں پہنچ گئی جہاں بیٹا گیا تھا۔ پھر وہ جگہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

وہ ریاست ارض اسلام کی اسلامی یونیورسٹی کی میلوں دور تک پھیلی ہوئی عمارت کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ وہاں روحانی رکاوٹیں تھیں۔ اندر نہیں جا سکتی تھی۔ بیٹا ماں کی طرح ٹیلی پیتھی کی صلاحیت کا حامل تھا۔ اس نے کہا۔ "مام! آپ اندر نہیں آ سکیں گی۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم باہر آؤ، میرے ساتھ چلو۔"

"سوری مام! اس شیطان پر اور اس تاریک دنیا پر لعنت بھیج رہا ہوں۔"

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا اپنی ماں پر بھی......؟"

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولا۔ "نہیں مام! کبھی

نہیں، آپ میری جان ہیں۔ اللہ کی رضا سے آپ نے مجھے اس دنیا میں آنے کے لیے رہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں آپ سے دور نہیں رہوں گا۔"

"تو پھر آؤ، فوراً آؤ۔ میں تمہارے ساتھ اسی روشن دنیا میں رہا کروں گی۔ ماں کی جان! میں تڑپ رہی ہوں۔"

"مام! آپ کے ساتھ رہنے کی ایک ہی شرط ہے کہ آپ میری موجودگی میں شیطان کی پوجا نہیں کریں گی، اس کا نام بھی میرے سامنے نہیں لیں گی۔"

وہ پریشان ہوگئی۔ وہ شیطان کی پجارن تھی اور بیٹے کو بھی چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہارے سامنے اس کا نام نہیں لوں گی۔ عبادت کرنا ہوگی تو تاریک دنیا کے معبد میں جایا کروں گی۔ آجاؤ ماں کی جان۔"

وہ پلک جھپکتے ہی حاضر ہوگیا۔ اس کے ساتھ ماروی بھی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم نے باپ سے بیٹے کو چھیننے کا ظلم کیا ہے۔ میں ماں سے بیٹے کو چھین لینے کا ظلم نہیں کروں گی۔ میرے اللہ کی بھی یہی مرضی ہے کہ یہ باپ سے دور اور ماں کے قریب رہے۔ اس معبود کی حکمت عملی کو سمجھنا محال ہے۔ میرے اس بھائی کی پرورش تمہاری چھاؤں میں کررہا ہے۔ وہ علیم ہے، خبیر ہے۔ جانتا ہے کہ کیا کررہا ہے اور کیوں کررہا ہے؟"

ماروی یہ کہہ کر چلی گئی۔ دانش آگے بڑھ کر ماں کے کلیجے سے لگ گیا، پھر وہ دونوں پلک جھپکتے ہی اس جزیرے میں پہنچ گئے جہاں بن زیان نے عابی کے خوف سے پناہ لی تھی۔

حالات ایسے تھے کہ بن زیان نے عابی کے خلاف ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دوستی کررکھی تھی۔ اب عابی اسے عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا اور وہ جزیرے میں آکر چھپ گیا تھا۔

دوسری طرف لارا کو عابی کی مدد سے زومبی گاگنا سے نجات ملنے والی نہیں تھی۔ تیسری جانب اسی مدد کرنے والے عابی کی بہن ماروی نے بیٹے کو ماں سے اور اس کے شیطان سے چھین لیا تھا۔

لارا اور بن زیان دونوں الجھنوں میں تھے۔ ماروی اور عابی ان کے لیے ضروری بھی تھے اور ان کے حساب سے بدترین دشمن بھی تھے۔ اس نیکی اور شرافت کی ان کی نظروں میں اہمیت نہیں تھی کہ عابی دوسرے دن صحرائے گوبی میں لارا کو آبرو کے ایک دشمن سے نجات دلانے والا ہے۔

ماروی کا یہ طرز عمل متاثر نہیں کررہا تھا کہ اس نے بیٹے کو ماں سے نہیں چھینا ہے۔ جن کی عقل پر تالے پڑ جاتے ہیں، انہیں دین و ایمان کی مثبت اور تعمیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

بن زیان نے لارا اور دانش کو دیکھ کر پوچھا۔ "تم کہاں تھیں؟ کہاں سے آرہی ہو اور کیا ہورہا ہے؟"

لارا دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "ماروی نے دانش پر قبضہ جمالیا ہے۔ یہ ہمارے شیطان سے نفرت کرنے لگا ہے۔"

دانش یکلخت اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ماں سے بولا۔ "آپ نے سمجھا یا ہے جہاں شیطان کا ذکر ہو وہاں سے دور ہوجاؤ۔ اگر آپ نے دوسری بار اس کا نام لیا تو میں چلا جاؤں گا۔"

وہ بیٹے کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "بیٹھ جاؤ۔ اس کا نام نہیں لوں گی۔"

بن زیان نے پوچھا۔ "تم مجبور کیوں ہوگئی ہو؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ وہ اپنے دین اور ایمان کے ساتھ اس کے ذہن پر چھاگئی ہے۔ یہ میری طرح چشم زدن میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ میں اسے جانے سے نہیں روک سکوں گی۔"

بن زیان نے بے بسی سے دانش کی طرف دیکھا پھر لارا سے پوچھا۔ "تم زومبی گاگنا سے رہائی پانے کے لیے عابی کے پاس گئی تھیں؟"

"پرنس عابی اپنی زبان پر قائم ہے۔ وہ میری خاطر کل زومبی گاگنا سے مقابلہ کرنے والا ہے۔"

"جو لوگ بیٹے کو تم سے چھین چکے ہیں، وہ کیا زومبی سے تمہیں نجات دلائیں گے؟ میں نہیں مانتا۔"

وہ بولی۔ "میرے اور تمہارے نہ ماننے کے باوجود عابی پر بھروسا کرنا ہوگا۔ اگر کل عابی کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں جاؤں گی تو زومبی کالے جادو کے حملے کرکے مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گا۔ ایک عابی ہی ہے جس پر بھروسا کرنا ہی ہوگا۔"

بن زیان نے سر جھکالیا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ عابی ہی ان کی آخری امید تھا۔

☆☆☆

آگ نظر نہیں آرہی تھی لیکن پورا ریگستان ایسے دہک رہا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آگیا ہو۔ دور حدِ نظر تک ریت کے ذرات چمک رہے تھے۔ سیاہ چشمے کے بغیر

آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی تھیں۔ گرم جلتی ہوئی لو بدن میں چرکے لگا رہی تھی۔

عابی پہلی بار ایسے علاقے میں آیا تھا۔ وہ قدرتی طور پر شدید سردی اور جھلستی گرمی سے گزرنے کا عادی تھا، آندھی طوفان اور زلزلے بھی اسے توڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ صحرا کی ریت پر چلنے والی ایک جیپ میں وہاں تنہا آیا تھا۔ دور تک دیکھ رہا تھا، حدِ نظر تک کسی ذی روح کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس نے فون پر زومبی سے پوچھا۔ ''کہاں ہو؟ میں آ گیا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''میں بھی آ گیا ہوں، بس پہنچنے والا ہوں۔''

لارا عابی کے دماغ میں تھی، اس نے کہا۔ ''جیسے ہی زومبی نظر آئے گا، میں یہاں حاضر ہو جاؤں گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد ہی کئی گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دور افق میں جہاں آسمان جھک کر ریت کے ذروں سے مل رہا تھا، وہاں چند گاڑیاں دھندلی سی دکھائی دیں پھر دوسری طرف سے بھی کئی گاڑیاں آ رہی تھیں۔

لارا نے کہا۔ ''عابی! تم دھوکا کھا گئے۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آ رہا ہے۔''

''آنے دو۔ میرے وجود میں میرے رب کی عطا کی ہوئی لشکری قوتیں ہیں۔''

وہ پچاس گاڑیاں تھیں۔ عابی سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئیں۔ سو سے زیادہ ہٹے کٹے قد آور حبشی جوان ان گاڑیوں سے اتر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں، کلہاڑیاں، نیزے اور تلواریں تھیں۔

انہوں نے سنا تھا کہ عابی کو گولیاں نہیں لگتی ہیں پھر بھی وہ رائفلیں بھی لے کر آئے تھے۔ زومبی کا سنا سب سے آگے والی گاڑی میں سے اتر رہا تھا۔ وہ قد میں عابی سے کچھ اونچا تھا اور ڈیل ڈول میں گینڈے کی طرح سخت چمڑی والا تھا۔

اس نے عابی کے سامنے تن کر کہا۔ ''بہت عرصے سے تیرا چرچا سنتا آ رہا ہوں۔ تو اکیلا پوری فوج کو مار بھگاتا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تو میرے مقابلے میں بہت کمزور دکھائی دے رہا ہے۔ میرا ایک ہاتھ پڑے گا تو زمین سے اٹھ نہیں سکے گا۔

''لہٰذا پہلے میں تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ تماشا دیکھوں گا کہ تو ایک فوج سے کس طرح لڑتا ہے؟ کیوں تجھے گولیاں نہیں لگتی ہیں؟ کیا یہ کلہاڑیاں اور تلواریں بھی تجھے زخمی نہیں کریں گی؟''

عابی نے کہا۔ ''کالا جادو اور کالی نیت رکھنے والے جھوٹے فریبی ہوتے ہیں۔ تو نے کہا تھا کہ تنہا مقابلے کے لیے آئے گا لیکن لشکر کے ساتھ آیا ہے۔''

''اور تو نے کہا تھا، لارا کو یہاں لائے گا۔ تو بھی جھوٹ بول کر اکیلا مرنے آیا ہے۔''

لارا اسی وقت عابی کے پیچھے حاضر ہو گئی۔ عابی نے کہا۔ ''دیکھ لے۔ میں تیری طرح جھوٹا اور مکار نہیں ہوں۔''

زومبی نے لارا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے زنجیریں نہیں پہنائی گئی ہیں۔ میں ابھی اپنے جادو کے ایک جھٹکے سے لے جاؤں گا اور تو منہ تکتا رہ جائے گا۔ تو یہاں آ کر پھنس گیا ہے۔ زندہ واپس نہیں جائے گا۔ اس لیے پہلے لارا کو اپنے شکنجے میں لے رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر پراسرار منتر پڑھنے لگا۔ لارا سہمی ہوئی تھی لیکن اسے ماروی سے حوصلہ مل رہا تھا۔ زومبی منتر پڑھتے پڑھتے گڑبڑا گیا۔ اسے اپنے منتروں کے دوران کلام پاک کی آیتیں سنائی دے رہی تھیں۔

بہت ہی سریلی اور دل میں اتر جانے والی آواز تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے اس آواز میں الجھ رہا تھا۔ کچھ سے کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے عمل کے مطابق آسمان کی طرف دیکھ کر لارا کو اپنی طرف کھینچنے والا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دیکھا تو لارا کے سامنے ماروی کھڑی ہوئی تلاوت کر رہی تھی۔

اس نے گھور کر غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو یہ ماروی ہے۔ بالشت بھر کی چھوکری میرا مقابلہ کرنے آئی ہے۔ ابھی ایک پھونک میں اڑا دوں گا۔''

وہ کوئی پراسرار منتر پڑھنے لگا پھر اس نے ماروی کی طرف زور کی پھونک ماری۔ وہ تلاوت میں مصروف تھی۔ منتروں کی پھونک کا زوردار جھونکا اس کی طرف آیا پھر قریب پہنچ کر رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ جھونکا پلٹ کر واپس آ کر زومبی کے منہ پر لگا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔

وہ حیرانی سے دیدے پھاڑ کر ماروی کو دیکھنے لگا۔ لارا نے کہا۔ ''اور پھونک مار۔ تیرا باپ بھی مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکے گا۔''

عابی نے کہا۔ "روحانی قوتوں کے آگے کالا جادو خاک ہو جاتا ہے۔ یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تیری جسمانی قوت کیا ہوگی؟ تو نے کہا تھا، مجھ سے تنہا مقابلہ کرے گا لیکن ایک پورا لشکر لے کر آیا ہے۔ چل یہ حربہ بھی آزمالے۔"

زومبی نے دور تک پھیلے ہوئے لشکر پر ایک نظر دوڑائی۔ وہ سب ہی مسلح تھے۔ کسی کے ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں تھیں، کسی نے کلہاڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ کوئی ننگی تلوار چلانے والا تھا۔ ہر سمت سے حملے ہوتے تو عابی کہیں سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ حملہ آوروں سے اور کلہاڑیوں سے زخمی ہونا یا کٹ مرنا یقینی تھا۔

زومبی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لشکر کو گرجتے ہوئے حکم دیا۔ "ٹوٹ پڑو ان پر۔ انہیں زندہ نہ جانے دو۔"

یہ حکم سنتے ہی چاروں طرف سے حملے کا شور بلند ہوا۔ وہ تینوں ان کے درمیان تھے۔ ماروی اور لارا پلک جھپکتے ہی غائب ہو کر لشکر سے دور ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئیں۔

ننگی تلواریں، کلہاڑیوں اور لوہے کی سلاخیں عابی کے قریب آ رہی تھیں۔ اس نے اچانک فضا میں اونچی چھلانگ لگائی پھر جیسے ہوا میں اڑتا ہوا زومبی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو منہ پر ایک لات پڑی۔ سر گھوم کر رہ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

عابی نے کہا۔ "تو نے کہا تھا کہ مجھ سے تنہا مقابلہ کرے گا۔ جو کہا تھا، وہ تو اب ہو کر ہی رہے گا۔"

وہ سخت جان تھا، فوراً ہی سنبھل گیا۔ ویسے یہ سمجھ گیا تھا کہ عابی کے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکے گا۔ ایسے وقت تمام فوجی ان کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ زومبی نے چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا تاکہ وہ فضا میں چھلانگیں لگا کر لشکر سے دور بھاگ کر نہ جا سکے۔

دوسرے ہی لمحے میں پتا چلا کہ اس نے عابی کو نہیں، عابی نے اس کو دبوچ لیا ہے۔ اس کے شکنجے میں رہ کر پاؤں زمین سے اکھڑ گئے تھے۔ عابی نے اسے سر سے بلند کرتے ہوئے گاڑی کے بونٹ پر دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ کمر کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ اس کے فوجی ہتھیار اٹھائے دوڑتے چلے آ رہے تھے، وہ پھر فضا میں چھلانگیں لگا کر ان سے دور ہو گیا۔

کچھ فوجی اپنے سردار کو سنبھالنے کے لیے رک گئے۔ باقی پھر عابی کی طرف دوڑتے ہوئے آئے۔ اب وہ پہلے مطمئن تھا۔ بلند آواز سے سورۃ المائدہ کی آیتیں پڑھنے لگا۔ ان کی تشریح بیان کرنے لگا۔

اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے ایک جیپ کار کے پچھلے حصے کو پکڑ کر اٹھایا پھر اسے فضا میں بلند کرتے ہوئے ایک دائرے کی صورت میں گھومنے لگا۔ اب جو قریب آ رہے تھے وہ جیپ کار سے بچنے کے لیے دور بھاگنے لگے۔

وہ کتنی دور جا سکتے تھے؟ عابی نے جیپ کار کو ایک طرف پھینک دیا۔ وہ جہاں آ کر گری وہاں کئی حملہ آور نیچے دب کر پھڑپھڑانے لگے۔

وہ دوسری جیپ کو بھی اسی طرح اٹھا کر دائرے کی صورت میں گھوم رہا تھا پھر اسے بھی ان پر پھینک دیا۔ وہ کئی حملہ آوروں پر آ کر گری۔ زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کی چیخیں ابھر کر گم ہو رہی تھیں۔

پھر تو وہ جتنی گاڑیوں میں بیٹھ کر آئے تھے وہ گاڑیاں ان کی موت کا ذریعہ بن گئیں۔ زومبی گائنا کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اسے ریت پر چاروں شانے چت لٹایا گیا تھا پھر تھوڑی دیر بعد ہی ایک گاڑی اس پر آ کر گری تو وہ ہمیشہ کے لیے لیٹا رہ گیا۔ گاڑی کے نیچے پھڑپھڑا کر مر گیا۔

اس کی موت نے فوجیوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ ہتھیار پھینک کر وہاں سے بھاگنے لگے۔ وہ اپنے سردار کی لاش کے علاوہ تیس لاشیں اور پچاس زخمیوں کو چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔

☆☆☆

وہ صحرا دیکھتے ہی دیکھتے زندہ انسانوں سے خالی ہو گیا۔ صرف عابی وہاں سانسیں لے رہا تھا۔ پھر لارا اور ماروی اس کے سامنے حاضر ہو گئیں۔ وہ اب تک دور ہی دور سے اس کی شجاعت اور غیر معمولی قوت کا تماشا دیکھتی رہی تھیں۔

لارا نے اس کے سامنے سر جھکا کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا۔ "میں تمہاری طاقت اور ذہانت کو سلام کرتی ہوں۔ تم ون مین آرمی ہو۔ اپنی ذات میں ایک لشکر سے زیادہ قوی ہو۔ میں تمہارے باپ سے تمہارے پورے خاندان سے دشمنی کرتی آ رہی ہوں۔ اس کے برعکس تم نے میری آبرو بچائی ہے۔"

عابی نے کہا۔ "صرف اس لیے کہ تم نے ہمارے عابی کو جنم دیا ہے۔ ہم اس کی ماں کی بے عزتی برداشت

نہیں کر سکتے تھے۔یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔تم شیطان کی پرستار ہو اور ہمیشہ رہو گی۔''

وہ بولی۔''اپنا دین دھرم سب کو عزیز ہوتا ہے۔میں مرتے دم تک شیطان کے قدموں میں رہوں گی، تم سے ایک التجا ہے۔ایک احسان اور مجھ پر کرو۔''

''کیا چاہتی ہو؟''

''بن زیان تمہارے خوف سے جزیرے میں چھپا ہوا ہے۔اسے معاف کر دو۔اس سے کوئی ایسا سمجھوتا کرو کہ وہ جزیرے سے باہر آزادی سے رہ سکے۔''

''میں اسے کہہ چکا ہوں۔سمجھوتا کرنے کی ایک ہی شرط ہے کہ وہ شیطانی ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے کوئی رابطہ کوئی معاملہ نہ رکھے۔وہ یہ شرط نہیں مان رہا ہے۔لہٰذا آگے کوئی بات نہ کرو۔''

''تاریک دنیا کی ایک ٹیلی پیتھی جاننے والی میں بھی ہوں۔کیا آج مجھ پر احسان کرنے کے بعد پھر بھی مجھ سے دشمنی کرو گے؟''

''ہماری نظروں میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ماروی رفتہ رفتہ تمہیں مات دیتی آرہی ہے۔یہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔بس اب جاؤ یہاں سے۔''

وہ اسی لمحے میں چلی گئی۔ماروی نے کہا۔''بھائی جان! میں بھی چشم زدن میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔آپ تھکا دینے والا سفر کرتے ہوئے کل لندن پہنچیں گے۔''

''میری فکر نہ کرو۔میں تھکنا اور بیٹھنا نہیں جانتا۔تم جاؤ، آرام کرو۔''

وہ قریب آکر بھائی کے سینے سے لگ گئی۔پھر اللہ حافظ کہہ کر نادیدہ ہوگئی۔

☆☆☆

زومبی کا کہنا تھا کہ عالی سے اس کا مقابلہ تنہائی میں ہوگا اور اس کا علم کسی کو نہیں ہوگا۔اس کے باوجود بات دور تک پھیل گئی تھی۔

لارا نے بن زیان سے کہا تھا۔بن زیان نے یہودی اکابرین کو بتایا کہ صحرائے گوبی کے ویسٹ زون میں دو پہاڑ ٹکرانے والے ہیں۔اس وقت زومبی کو پہاڑ ہی سمجھا جا رہا تھا۔

یہودی اکابرین سے یہ بات کئی ممالک کے حکمرانوں تک پہنچ گئی۔پھر یہ کہ عالی کو بچے، جوان اور بوڑھے سب ہی پہچانتے تھے۔اس نے لندن سے صحرائے گوبی تک سفر کیا تو سب ہی تجسس میں مبتلا ہو گئے۔بے شمار جاسوس اس کے پیچھے آنا چاہتے تھے لیکن جاں نثاروں کی فوج نے انہیں صحرا تک جانے سے روک دیا تھا۔

شام تک وہی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین نتیجہ سب کے سامنے آیا۔زومبی حرام موت مارا گیا تھا۔اس کے سو سے زیادہ مسلح فوجیوں میں سے تیس مارے گئے تھے، پچاس زخمی ہوئے تھے۔باقی جان بچا کر فرار ہو گئے تھے۔

دشمنوں پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔دوست بغلیں بجا رہے تھے۔اسے دل و جان سے چاہنے والے کہہ رہے تھے کہ تمام ممالک کے بادشاہوں کو اس کے آگے سر جھکانا ہی ہوگا۔

وہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر لندن سے افریقا گیا تھا۔ٹکٹ کے بغیر اس نے ہوائی سفر کیا تھا۔لندن کی انتظامیہ اور حکام ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔وہ واپس آیا تو اسے روکنے ٹوکنے کی کسی میں جرأت نہ ہوئی۔

لارا میدانِ جنگ سے سیدھی بن زیان کے پاس آئی تھی۔اسے وہاں کی روداد سنائی تھی پھر دونوں چپ ہو کر سر جھکا کر فکر میں مبتلا ہو گئے تھے۔بن زیان نے بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا۔''عالی جیسی جسمانی قوت رکھنے والا اس زمین پر اور کوئی نہیں ہے۔وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔دنیا کی کوئی حکومت کوئی طاقت کوئی فوج اسے کبھی شکست نہیں دے سکے گی پھر ماروی کی روحانی قوتوں نے عالی کی قوت کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔وہ کم عمر بچی ہے۔ہم اس کے سامنے بھی کمزور اور بے بس ہیں۔''

لارا نے کہا۔''میں نے سنا ہے عالی گیارہ برس کی عمر میں ریاست ارضِ اسلام سے باہر آیا تھا اور اس نے پورے ایک سرحدی لشکر کو مار بھگایا تھا۔مراد سے پیدا ہونے والے بچے اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھانے جا رہے ہیں۔''

''انشاء اللہ......''

وہ دونوں ماروی کی آواز سن کر چونک گئے۔انہوں نے سر گھما کر دیکھا، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ایک خالی ریوالونگ چیئر ذرا متحرک تھی۔آہستہ آہستہ دائیں سے بائیں ہو رہی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



مستقبل کا مصور

نسیم اقبال

تصوراتی طور پر ہر انسان اپنے مستقبل کے بارے میں دلفریب تصویرکشی کرتا ہے مگر یہاں تو مسئلہ دوسروں کے مستقبل کا درپیش تھا۔ ہم دوسروں کے ماضی اور حال کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہہ سکتے ہیں مگر وہ تو مستقبل کی تصویر کھینچ کر اپنے اہداف کو حیرت میں مبتلا کردینے کا ہنر جانتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن اپنے ہی مستقبل کی ہوبہو تصویرکشی بھی کرڈالی کیونکہ ادراک والہام کا ہر سفر اسے اظہار پر اکساتا رہتا تھا۔

اطمینان قلب کا حاصل...... ایک فنکار کی حقیقت پسندی کی انتہا

فوسٹر اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن ابتدا ہی سے بُرے لوگوں کی صحبت میں پڑگیا۔ نوجوانی کی عمر میں ہی اسے جوئے، شراب اور عورت کا چسکا پڑگیا۔ ان تینوں چیزوں کے لیے دولت کی ضرورت تھی لیکن جب والدین کو اس کی بُری عادتوں کا علم ہوا تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور فوسٹر پیسے سے تنگ ہوگیا۔ لہٰذا دولت کی کمی کے بعد فوسٹر نے ان بری عادتوں کی تکمیل کے لیے کچھ اور برائیوں کو اپنالیا۔

سب سے پہلے اس نے ایک جیولرز کے ہاں چوری کی تھی۔ اس کی برائیاں اپنی جگہ لیکن ذہانت میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس لیے اس کی وہ چوری بے حد کامیاب رہی اور اس کے ہاتھ خاصی دولت لگ گئی لیکن بہرحال وہ عادی چور نہیں تھا۔ دولت حاصل تو کرلی لیکن اس کا صحیح استعمال نہ کرسکا اور اس کے شناسا اس کی شاہ خرچی پر حیران رہ گئے۔ کچھ اس کے مخالف بھی تھے، انہوں نے یہ جاننے کی تگ ودو شروع کردی کہ فوسٹر کے ہاتھ یہ دولت کہاں سے لگی......؟ اور ان کی محنت بارآور ثابت ہوئی۔ کسی نہ کسی طرح وہ جیولرز کے ہاں ہونے والی چوری میں فوسٹر کا ہاتھ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اس کی اطلاع پولیس کو مل گئی۔

پولیس نے جس وقت فوسٹر کے مکان پر چھاپا مارا، وہ اس شہر کا ائرپورٹ چھوڑ چکا تھا۔ اسے بروقت علم ہوگیا تھا کہ اس کے کچھ جاننے والوں نے غداری کی ہے۔ بہرحال اس نے گھر بار چھوڑ دیا اور سچی بات یہ ہے کہ اسے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہ گئی تھی جنہوں نے اسے چوری کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

دوسرے شہر میں آنے کے بعد اس نے اپنی ذہانت سے اپنے لیے جلد ہی جگہ بنالی لیکن دولت کی یہاں بھی ضرورت تھی۔ دولت حاصل کرنے کے لیے چوری کو وہ خود بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ برے کاموں میں اس کے نزدیک سب سے گھٹیا کام چوری تھا۔ وہ کوئی اور کام کرنا چاہتا تھا اور انہی دنوں اس کی ملاقات باب سے ہوگئی۔

باب منشیات کی اسمگلنگ کرنے والے ایک گروہ کا ممبر تھا۔ اس نے فوسٹر کو دعوت دی کہ وہ بھی اس گروہ میں شامل ہوکر کام کرے۔ فوسٹر نے اس کام کا جائزہ لیا تو اسے یہ بہت دلچسپ نظر آیا۔ اس میں دنیا کی سیر کے علاوہ خاصی دولت بھی مل جاتی تھی۔ فوسٹر کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے تھا۔ ملک ملک کی عورتیں، ملک ملک کی شراب اور جوئے خانے...... اس سے عمدہ زندگی کون سی ہوسکتی تھی۔

چنانچہ اس نے بہ خوشی اس گروہ میں شمولیت اختیار کرلی۔ یہاں بھی اس کی ذہانت نے اسے بہت جلد گروہ میں ممتاز کردیا تھا۔ گروہ کے منتظمین اس پر بے حد اعتماد کرنے لگے اور بڑے بڑے کام اس کے سپرد کیے جانے لگے لیکن ہمیشہ ایک جیسے دن نہیں رہتے۔ ایک دفعہ وہ منشیات کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر مڈل ایسٹ کے ایک شہر میں اترا اور یہاں وہ کسٹم کے حکام کو ڈاج نہ دے سکا۔ ذخیرہ پکڑا گیا اور اس کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہوگیا۔

فوسٹر بزدل نہیں تھا لیکن وہ حالات سے سمجھوتے کا عادی تھا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ زندگی گزارنے کے لیے کررہا تھا اور اب جب وقتی طور پر یہ زندگی اس سے چھن گئی تھی تو وہ اس سے لپٹا رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے معلومات حاصل کرنے والوں کا ایک تھپڑ کھانا بھی گوارا نہیں کیا اور بڑے اطمینان سے پورے گروہ کی نشاندہی کردی۔ انٹرپول حرکت میں آگئی اور گروہ کے بے شمار افراد گرفتار ہوگئے۔ فوسٹر کو بھی ایک سال کی سزا ہوگئی اور وہ جیل کی نئی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

یہاں اس کی ملاقات بھانت بھانت کے لوگوں سے ہوئی۔ ایک سے ایک اعلیٰ جرائم پیشہ موجود تھا۔ اس نے سب سے ملاقات کرکے حالات زندگی معلوم کیے اور اسے بے شمار تجربات ہوئے لیکن بن حاتم کی شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ سانولے رنگ لیکن خوب صورت نقوش کا حامل یہ نوجوان مڈل ایسٹ کا ہی باشندہ تھا۔ بے حد خاموش طبع اور سنجیدہ طبیعت کا مالک۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور ہمیشہ کسی خیال میں ڈوبا رہتا۔ شروع شروع میں اس نے فوسٹر پر زیادہ توجہ نہ دی لیکن فوسٹر کو اس کی شخصیت پسند آگئی تھی۔ اس لیے اس نے بن حاتم کو نہ چھوڑا اور بالآخر اسے اپنا دوست بنا کر ہی دم لیا۔ بن حاتم اور وہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور فوسٹر نے بن حاتم سے اس کے بارے میں معلومات لینا شروع کردیں۔ ابتدا میں تو بن حاتم نے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا لیکن جب اسے فوسٹر کی شگفتہ اور بے ضرر شخصیت پر اعتماد ہوگیا تو وہ کھل گیا۔

"میں بھی چوری کے الزام میں جیل آیا ہوں دوست۔" اس نے بتایا۔

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن تم نے یہ چوری عادتاً کی تھی یا ضرورتاً؟" فوسٹر نے پوچھا۔

"نہ عادتاً نہ ضرورتاً۔" بن حاتم نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے چوری کی کوشش کیوں کی تھی۔ میں نے اس کوشش میں ایک شخص کو زخمی بھی کردیا تھا۔ یہی شکر ہے کہ وہ مرا نہیں ورنہ میری سزا دو سال کے بجائے یا تو عمر قید ہوتی یا پھر پھانسی۔"

"پہیلیاں نہ بجھاؤ دوست۔" فوسٹر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں نے جو چیز چرانے کی کوشش کی تھی وہ ایک تصویر تھی۔"

"اوہ......کوئی نایاب تصویر ہوگی؟" فوسٹر نے پوچھا۔

"لوگوں کے نزدیک نہ ہو لیکن مجھے وہ تصویر اس قدر پسند آئی تھی کہ میں بے خود ہو گیا تھا۔"

"خوب......کیا کسی حسین لڑکی کی تصویر تھی؟"

"نہیں، دنیا کی کوئی لڑکی زابیلا سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی اور زابیلا صرف میری محبوبہ ہے۔ جیتی جاگتی محبوبہ۔ جو میرے فراق میں دن رات آنسو بہاتی ہے۔ وہ ہر ہفتے مجھ سے ملاقات کرنے آتی ہے۔"

"تب پھر وہ تصویر کیسی تھی؟"

"تصویر......!" بن حاتم نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔ "وہ ایک بھکاری تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، پاس ہی عصا بھی رکھا تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کشکول تھا۔ ہاں...... وہ بھیک مانگ رہا تھا لیکن جس چیز پر بیٹھ کر وہ بھیک مانگ رہا تھا، وہ چمکتے، جگمگاتے ہیروں کا ڈھیر تھا۔ بھکاری کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ اپنے نیچے دبے ہوئے ہیرے نہیں دیکھ سکتا تھا اور بھیک مانگ رہا تھا۔" بن حاتم کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بند آنکھوں سے وہ تصویر دیکھ رہا ہو۔

"ایک بھکاری جو ہیروں کے ڈھیر پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا...... یہ کیا بات ہوئی؟" فوسٹر نے حیرت سے کہا اور بن حاتم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"مجھے بھی نہیں معلوم دوست کہ اس کا مقصد کیا ہے لیکن وہ تصویر مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں ہر قیمت پر اسے خریدنے پر تیار ہو گیا لیکن بوڑھے بدروحوں جیسی شکل والے مصور نے...... صاف کہہ دیا کہ وہ اپنا کوئی شاہکار فروخت نہیں کرتا۔ میں نے اپنی تمام دولت کی پیشکش کی لیکن بوڑھے نے تصویر مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ میں مایوس ہو گیا لیکن تصویر مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ میں ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مصور کے مکان کا پتا لگایا اور پھر ایک رات میں تصویر چرانے کے لیے اس کے مکان میں داخل ہو گیا اور اس کے نگار خانے میں پہنچ گیا۔ رات کا وقت تھا اور مصور نگار خانے میں کام کر رہا تھا۔ وہ ایک تصویر بنا رہا تھا۔ اس نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔"

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"میں یہ تصویر لینا چاہتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم اس کے لیے بے چین ہو لیکن میں یہ تصویر تمہیں نہیں دے سکتا۔ میں نے آج تک اپنا کوئی شاہکار فروخت نہیں کیا چنانچہ تم وہی کرو جو کرنا چاہتے ہو......

اور میں نے وہی کیا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چاقو کے ایک وار سے مصور کو زخمی کر دیا اور وہ ایک چیخ مار کر گر پڑا۔ میں تصویر لے کر نکلنا چاہتا تھا کہ اس کے ملازم اس کی چیخ کی آواز سن کر آ گئے اور مجھے گرفتار کر لیا گیا پھر مجھے دو سال کی سزا ہو گئی۔" بن حاتم خاموش ہو گیا۔

فوسٹر کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ "مجھے حیرت ہے اس تصویر میں ایسی کیا بات تھی جو تم اس کے لیے اس قدر بے چین ہو گئے؟"

"میں خود بھی نہیں جانتا میرے دوست کہ اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ بس میں اسے حاصل کرلینا چاہتا ہوں۔ ہر قیمت پر اور جانتے ہو زابیلا نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"زابیلا...... اوہ، وہ تمہاری محبوبہ۔" فوسٹر نے کہا۔

"ہاں، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ رہا ہونے کے بعد وہ فوراً مجھ سے شادی کرلے گی۔ اس نے کہا تھا جس دن میں رہا ہوں گا وہ مجھے لینے آئے گی اور وہ تمام انتظامات مکمل کرلے گی تاکہ یہاں سے میں سیدھا اس کے گھر چلوں اور پھر سب سے پہلے ہماری شادی ہو جائے۔ اس کے بعد میں اپنے مستقبل پر غور کروں لیکن میں نے اس سے معذرت کرلی۔ میں نے کہا اسے مجھے کچھ وقت دینا پڑے گا۔ میں فوراً شادی نہیں کر سکتا بلکہ اس سے قبل مجھے ایک کام اور کرنا ہے اور وہ کام ہے وہ تصویر حاصل کرنا...... ہاں میرے دوست! رہا ہونے کے بعد سب سے پہلے میں وہ تصویر حاصل کروں گا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا کام۔" بن حاتم کے اس عزم نے فوسٹر کو اور بھی حیران کر دیا اور وہ ایک گہری سانس لے کر گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"تم نے اس انداز میں تصویر کا تذکرہ کیا ہے کہ اب تو میرے دل میں بھی اسے دیکھنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ تصویر مجھے بھی اسی قدر پسند آ جائے اور پھر...... ہم تم رقیب بن جائیں۔"

"اگر تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی میرے دوست تو میں تمہیں بے دریغ قتل کردوں گا۔" بن حاتم نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ "ایسا بھی ممکن ہے کہ تم ہی مجھے قتل

کرو۔"

فوسٹر بھی ہنسنے لگا لیکن وہ بے حد سنجیدگی سے اس تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فوسٹر لاابالی نوجوان تھا۔ اس کی زندگی کا کوئی خاص مقصد تو تھا نہیں اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس پراسرار زمین کے پراسرار نوجوان کے ساتھ مل کر اس تصویر کو ضرور دیکھے گا۔

بن حاتم سے اس کی دوستی اور گہری ہوگئی۔ بن حاتم اکثر اس سے اپنی محبوبہ کے بارے میں گفتگو کرتا رہتا۔ وہ زابیلا کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے فوسٹر سے بھی اس کی محبوبہ کے بارے میں پوچھا۔

"ایک ہو تو بتاؤں..... یہاں تو ہر حسین لڑکی اپنا خواب ہے۔ اب تو مجھے اپنی محبوباؤں کی تعداد بھی یاد نہیں ہے۔" فوسٹر نے سرد آہ بھر کر کہا تو بن حاتم ہنس پڑا۔ فوسٹر کو بھی ہنسی آگئی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ فوسٹر کی ایک سال کی سزا اور بن حاتم کی دو سال کی سزا ایک ہی دن ختم ہوئی۔ دونوں کو ایک ساتھ رہائی کا پروانہ ملا اور بن حاتم فوسٹر سے لپٹ گیا۔

"تمہارے رہا ہونے سے میں بے حد خوش ہوں دوست۔ کیوں نہ ہم ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں؟" بن حاتم نے کہا۔

"میں بھی ایک تنہا کبوتر ہوں جد ھر رخ ہوگیا ادھر پرواز شروع کردی لیکن یہ بری بات ہوگی کہ تم شادی رچا کر بچے پیدا کرنے لگو اور میں سڑکوں پر محبوباؤں کی تلاش میں سرگرداں پھروں۔"

"تم بھی زندگی کو کسی محور پر لانے کی کوشش کرو فوسٹر..... میں تمہاری مدد کروں گا۔" بن حاتم نے خلوص سے کہا۔

"بدقسمتی سے میری زندگی کا کوئی محور نہیں ہے۔ تاہم تمہیں دیکھ کر سنبھلنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے تمہارا کوئی گھر ہے؟"

"تھا..... اب نہیں ہے۔ میری صرف ایک بہن تھی، شادی شدہ جس کے ساتھ میں رہتا تھا لیکن اب وہ یہ ملک چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ مجھے جیل میں ہی معلوم ہوا تھا۔ تاہم اس کی فکر مت کرو۔ زابیلا نے میرے لیے ایک ہوٹل میں انتظام کرلیا ہے۔"

"اور ہاں..... وہ تصویر کا جنون کیا ہوا؟"

"اسی طرح تازہ ہے میرے دوست۔ ورنہ میرا ٹھکانا ہوٹل کے بجائے زابیلا کا مکان ہوتا۔" بن حاتم نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو فوسٹر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

جیل کے دروازے کے باہر زابیلا نے بن حاتم کا استقبال کیا۔ اس نے پھولوں کے ہار اس کے گلے میں ڈالے اور اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"اوہ..... بن حاتم! تمہیں سلاخوں سے باہر دیکھ کر مجھے کس قدر مسرت ہو رہی ہے، میں کیسے بتاؤں؟" وہ خوشی سے دیوانی ہو کر چیخی۔

"مجھے معلوم ہے ہنی۔ ان سے ملو، میرے دوست! یہ بھی میرے ساتھ ہی رہا ہوئے ہیں اور اب میرے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"حاتم کے دوست میرے لیے محترم ہیں۔" اس نے فوسٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے کمرے میں ایک اور بستر ڈلوانا ہوگا لیکن صرف ہوٹل کے کمرے میں۔ جب میرا بستر تمہارے گھر میں ہوگا تب دوسرا بستر صرف تمہارے لیے ہوگا۔" بن حاتم نے ازراہ مذاق کہا تو فوسٹر نے ایک قہقہہ لگایا۔ زابیلا نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

"گویا ہوٹل کے کمرے میں تم ان کی جگہ مجھ سے پر کرو گے؟" فوسٹر نے ہنستے ہوئے کہا تو بن حاتم بھی ہنسنے لگا۔ زابیلا نے ٹیکسی روکی اور وہ اس میں بیٹھ کر ہوٹل الصباح چل پڑے۔ خوبصورت ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں فوسٹر اور حاتم نے غسل وغیرہ کیا۔ زابیلا نے انہیں پارٹی دی اور پھر رات گئے تک وہ ہوٹل کی دلچسپیوں میں گم رہے۔ زابیلا نے ایک راؤنڈ فوسٹر کے ساتھ اور ایک بن حاتم کے ساتھ ڈانس کیا تیسرے راؤنڈ کے لیے فوسٹر نے ایک حسینہ کو منتخب کرلیا تھا۔ رات گئے جب دونوں دوست اپنے بستروں پر لیٹے تو بن حاتم نے تصویر کی بات چھیڑ دی۔

"مصور کا نام طلال نقشی ہے۔ وہ یہاں کے مشہور مصوروں میں شمار ہوتا ہے اور شہر سے دور ایک خوبصورت کوٹھی میں اپنے ملازموں کے ساتھ رہتا ہے۔ سنا ہے دنیا میں اکیلا ہے۔ بے حد کریہہ صورت اور شاید احساس کمتری کا شکار ہے، اب تو بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اس کی سوانح عمری میں عورت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔" بن حاتم نے فوسٹر کو بتایا۔

"خوب، ویسے تصویر کے حصول کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"خیال سے مطلب؟" بن حاتم نے حیرت سے کہا۔

"مقصد یہ کہ تم نے دوسرے کاموں سے پہلے اسے

حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"فیصلہ کیا نہیں تھا دوست...... کیا ہے۔ یہ رات سونے کے لیے تو نہیں ہے۔ میں نے یہ دن بڑی مشکل سے گزارے ہیں۔"

"اوہ...... تو کیا آج ہی رات؟" فوسٹر نے حیرت سے کہا۔

"اب سے صرف چند گھنٹوں کے بعد۔ ماحول پُرسکوت ہوجائے۔ میں نے پروگرام بنالیا ہے۔" بن حاتم نے کہا اور فوسٹر ایک سرور آمیز سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے بھی اس پروگرام میں شریک کیا ہے یا نہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری مرضی پر منحصر ہے میرے دوست۔ ویسے مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

"میں بتاچکا ہوں کہ میں بھی اس تصویر میں دلچسپی لینے لگا ہوں...... صرف دیکھنے کی حد تک اور بہرحال میں کسی نازک مرحلے پر تمہیں تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"شکریہ فوسٹر!" بن حاتم نے ممنونیت سے کہا اور خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگا۔ اس وقت رات کے پونے تین بجے تھے جب بن حاتم اٹھ گیا۔ فوسٹر پر غنودگی طاری ہوگئی تھی لیکن وہ بن حاتم کی ایک آواز پر اٹھ گیا اور پھر دونوں تیار ہوکر چل پڑے۔

"وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں کسی سواری کا انتظام کرنا ہوگا۔ ہوٹل کا گیٹ تو بند ہوچکا ہے، ہم دیوار پھلانگ کر نکلیں گے اور پھر کوئی گاڑی تلاش کریں گے۔" بن حاتم نے کہا تو فوسٹر نے گردن ہلادی۔ وہ ہوٹل کی چہاردیواری پھلانگ کر باہر نکل آئے۔ بن حاتم کی نگاہیں چاروں طرف گردش کررہی تھیں۔ تقریباً نصف فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایک ملک اسٹور کے سامنے پہنچ گئے جہاں دودھ تقسیم کرنے والی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بن حاتم نے ان میں سے چند گاڑیوں کا جائزہ لیا اور پھر اس نے فوسٹر کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں گاڑی کو دھکیلتے ہوئے دور لے گئے اور پھر فوسٹر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کس طرح اس نے گاڑی کا تالا کھول لیا اور اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادیا۔ بن حاتم اسے راستہ بتاتا جارہا تھا۔

شہر پُرسکوت تھا۔ چاروں طرف پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی ہموار سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ بن حاتم بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی پھر شہر سے کافی دور نکل کر وہ ایک عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ اس سنسان علاقے میں بنی یہ عمارت بے حد پُراسرار تھی۔ فوسٹر نے چاروں طرف سے اس کا جائزہ لیا اور پھر بن حاتم کے ساتھ اس کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

"عمارت میں داخل ہونے کے لیے اس سے عمدہ جگہ اور کوئی نہیں ہے۔" بن حاتم نے بتایا۔ "پہلے میں اسی جگہ سے اندر گیا تھا۔" وہ اچھل کر چہاردیواری پر پہنچ گیا اور فوسٹر نے بھی اس کی تقلید کی۔ یہ عمارت کا عقبی لان تھا جسے عبور کرکے وہ عقبی دروازے پر پہنچ گئے۔ عقبی دروازہ دھکیلنے سے کھل گیا اور بن حاتم نے فوسٹر کی طرف دیکھا۔ فوسٹر اس کارروائی میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ بھی بن حاتم کے پیچھے اندر داخل ہوگیا اور وہ کئی راہداریوں اور کمروں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔

"جاگ رہا ہے کمبخت، رات کو کام کرنے کا عادی ہے۔" بن حاتم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "کوئی حرج نہیں ہے، اس سے پچھلا حساب بھی بے باق ہوجائے گا۔" اس نے کمرے کے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلنے سے ہلکی سی آواز ابھری اور دور کمرے کے عین درمیان ایک کینوس بورڈ پر کام کرتے ہوئے طلال نقشی کے ہاتھ رک گئے۔

وہ ایک کریہہ شکل کا بوڑھا تھا۔ پھیلا ہوا چوڑا چہرہ، بدنما حد تک ابھری ہوئی پیشانی اور ان کے نیچے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، چوڑا جسم، پستہ قد۔ وہ کسی گوریلے سے مشابہ تھا۔ اس نے بغور ان دونوں کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے رات کے اس حصے میں ان لوگوں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے لیے ان کی آمد متوقع ہو پھر اس نے کینوس بورڈ پر پردہ ڈال کر وہ تصویر چھپادی جسے وہ بنارہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی سے آتش دان کی طرف بڑھ گیا اور اسی وقت بن حاتم کی کرخت آواز گونجی۔

"خبردار...... زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو ورنہ......" بن حاتم نے ایک مڑا ہوا چمکدار دھات کا خنجر نکال لیا۔ طلال نقشی رک گیا۔ اس نے مڑ کر استہزائیہ انداز میں بن حاتم کو دیکھا اور پھر اس کی پھٹی پھٹی آواز گونجی۔

"فکر مت کرو۔ میں تمہیں ہلاک کرنے کے لیے توپ نہیں نکال رہا بلکہ اپنے حساب کا آخری دانہ ڈبے میں ڈال رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔" اس نے آتش دان کے اندر بنے ہوئے خانے سے ایک موتی نکال کر اسے دکھایا۔ "یہ

آخری موتی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں رہے گا مگر تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟"

"فضول بکواس کر کے ہمیں الجھانے کی کوشش مت کرو طلال۔ وہ تصویر میرے حوالے کر دو۔" بن حاتم نے گرجدار آواز میں کہا۔

"ناممکن ہے میرے دوست۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ ہاں، تھوڑی دیر کے بعد اس نگار خانے کی ہر تصویر تمہارے قبضے میں ہوگی۔ تم جسے پسند کرو، لے جا سکتے ہو۔"

"آج تمہاری کوئی چالاکی کام نہیں آسکے گی طلال نقشی۔ اس دن تم مجھے پھنسوانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن آج یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"تم ضمیر کے اندھے ہو نوجوان۔ میں نے اس دن بھی تمہیں نہیں پھنسوایا تھا۔ تم مجھے زخمی کر کے فرار ہونے لگے اور پکڑے گئے اور اس وقت تقدیر یہی کہتی تھی۔ میں تو تمہیں آج بھی پھنسا سکتا ہوں۔ اس تاریک عمارت کے ہر گوشے میں پولیس کے جوان چھپے ہوتے ہیں لیکن میں تقدیر میں دخل اندازی کا قائل نہیں ہوں۔ میں تمہاری آمد کا مکمل حساب رکھ رہا تھا۔ اگر یقین نہ آئے تو اپنے اس سفید دوست کو آتش دان کے خانے میں پڑے ہوئے موتیوں کو شمار کرنے کا حکم دو۔ موتیوں کی تعداد پورے دو سال کے دنوں پر مشتمل ہوگی اور یہ تمہاری قید کے شمار کا آخری موتی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔ چنانچہ میں تمہارے استقبال کا معقول بندوبست کر سکتا تھا۔"

"فضول گفتگو کرنے کے بجائے اگر تم وہ تصویر میرے حوالے کر دو تو زیادہ بہتر ہے۔" بن حاتم نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں اپنا شاہکار اپنی خوشی سے تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ تمہیں مجھ سے جنگ کر کے اسے حاصل کرنا ہوگا لیکن اس سے قبل میری خواہش ہے کہ تم سے تھوڑی گفتگو کروں۔"

"تم ایک ڈرامائی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو طلال۔ بہر حال، میں تمہاری اس خواہش کو رد نہیں کروں گا۔ بیٹھ جاؤ فوسٹر تاکہ یہ بوڑھا ہمیں خوفزدہ نہ تصور کرے۔" بن حاتم اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ خنجر اس کے ہاتھ ہی میں تھا اور وہ کسی چیتے کی طرح چوکنا بیٹھا تھا تاکہ ذرا سی حرکت پر اپنا کام کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔ فوسٹر نے بھی ایک کرسی سنبھال لی۔ اسے یہ سچویشن انتہائی دلچسپ اور پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔

"شکریہ...... تو میرے دوست سب سے پہلے تو تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تم اس تصویر کے حصول کے لیے اس قدر بضد کیوں ہو، تم کیوں اسے حاصل کرنے کے خواہشمند ہو؟ کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا؟"

"وہ مجھے پسند ہے۔" بن حاتم نے جواب دیا۔

"غلط...... یوں تو دنیا کی بہت سی چیزیں تمہیں پسند آئی ہوں گی، کیا تم ان چیزوں کے حصول کے لیے اسی قدر بے چین ہو جاؤ گے؟ کیا تم ان میں سے ہر چیز کو حاصل کرنے کے لیے اسی طرح جرائم پر آمادہ ہو جاؤ گے؟"

"تصویر مجھے حد سے زیادہ پسند ہے، جیل کے اندر بھی میں اس کے لیے تڑپتا رہا۔" بن حاتم نے کہا۔

"اس کی وجہ بتاؤ دوست...... اگر تم نہیں بتا سکتے تو مجھ سے پوچھو۔"

"تم بتا سکتے ہو؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں اس تصویر کا خالق ہوں۔ میں نے اس تصویر کو جنم دیا ہے۔ میرے علاوہ اس کے بارے میں اور کون بتا سکتا ہے۔" بوڑھے نے پراسرار انداز میں کہا۔ اس کی دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چنگاریوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ بھدے چہرے پر جوش کے دبے دبے آثار تھے اور اس کی کریہہ شکل کچھ اور مکروہ ہو گئی تھی۔

"تب پھر بتاؤ...... یہ تصویر مجھے کیوں پسند ہے؟"

"کیونکہ...... یہ تمہاری تصویر ہے۔" بوڑھے نے معنی خیز انداز میں کہا اور بن حاتم نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" آخر اس نے کہا۔

"میں مستقبل کا مصور ہوں میرے دوست...... میں اپنی تصویروں میں پیشین گوئیاں کرتا ہوں اور اس تصویر میں، میں نے تمہارے مستقبل کی پیشین گوئی کی ہے۔ وہ تمہارا مستقبل ہے بن حاتم اور میری پیشین گوئی آج تک غلط نہیں نکل سکی۔"

"بکواس کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میرا خیال ہے تم اپنے ملازموں کا انتظار کر رہے ہو۔ شاید کسی ذریعے سے تم انہیں اطلاع دینا چاہتے ہو لیکن اس بار تم اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔" بن حاتم غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"ہاں اس بار میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں

ہوسکوں گا لیکن میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اپنے خوابوں میں بسنے والی اس سیاہ حویلی کو فراموش نہ کرنا، وہ طلال نقشی ہوگا جو اپنی پیشین گوئی کے انجام کا منتظر ہوگا۔"

"بکواس مت کرو، تصویر کہاں ہے؟ اسے میرے حوالے کردو۔" بن حاتم نے لپک کر بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا اور بوڑھے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ فوسٹر دروازے پر جم گیا تھا۔ اسے اس نازک صورتِ حال کا احساس ہوگیا تھا۔ بن حاتم اس کے گریبان کو جھٹکے دے کر اس سے تصویر کا مطالبہ کررہا تھا اور بوڑھے کے قہقہے بلند ہورہے تھے پھر اس کے قہقہے کراہوں میں بدل گئے۔ بن حاتم کے خنجر نے اس کی آنتیں باہر نکال دی تھیں۔

بوڑھے نے دونوں ہاتھوں میں گرتی ہوئی آنتیں سنبھال لیں اور اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ "ایک وار ...... میرے دل کے مقام پر اور کردو...... وار کاری ہونا چاہیے۔ میں موت کی اذیت برداشت نہیں کرسکتا۔" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی جبکہ بن حاتم سخت غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی کیفیت جنونیوں کی سی ہورہی تھی۔ چند لمحات وہ دم توڑتے ہوئے بوڑھے کو دیکھتا رہا اور جب اس کا پھڑکتا ہوا جسم ساکت ہوگیا تو بن حاتم نے جھک کر اپنے خنجر کا خون بوڑھے کے لباس سے صاف کیا اور فوسٹر کی طرف مڑا۔ فوسٹر کو اس کی آنکھوں میں دیوانگی جھلکتی محسوس ہورہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ فوسٹر کو گھورتا رہا اور پھر بولا۔

"اس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے ذہنی خلجان میں مبتلا کردیا تھا۔"

"تصویر تلاش کرو اور یہاں سے نکل چلو۔ مجھے یہ بوڑھا شیطانی قوتوں کا مالک معلوم ہوتا ہے۔" فوسٹر نے کہا تو بن حاتم نے گردن ہلادی پھر وہ رول کیے ہوئے کینوس کے بنڈلوں کی طرف چل پڑا جو ایک الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ فوسٹر بھی اس کے نزدیک ہی کھڑا ہوکر ان بنڈلوں کو دیکھنے لگا۔

بن حاتم نے ایک بنڈل کھولا، یہ کوئی اور تصویر تھی۔ اس نے بنڈل زمین پر ڈال کر دوسرا بنڈل اٹھالیا اور پھر تیسرا۔ بنڈلوں کے ڈھیر زمین پر لگتے رہے پھر اس نے ایک بنڈل کھولا اور اسے سرسری نگاہ سے دیکھ کر زمین پر ڈال ہی رہا تھا کہ چونک پڑا۔ اس نے بنڈل دوبارہ کھولا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

ہاں، یہ اسی کی تصویر تھی۔ اس تصویر میں وہ بوڑھے طلال پر چاقو سے وار کررہا تھا۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب وہ بوڑھے پر حملہ کرنے کے بعد جیل چلا گیا تھا۔ اس نے وہ تصویر فوسٹر کی طرف بڑھادی۔ "دیکھو، بوڑھے نے اس وقت کے منظر کو کس طرح نقش کیا ہے۔" اس نے کہا تو فوسٹر تصویر دیکھنے لگا۔

"اسے آتش دان میں ڈال دو۔" بن حاتم نے کہا اور دوسرے بنڈل تلاش کرنے لگا اور پھر اسے اس کی مطلوبہ تصویر مل گئی۔ بن حاتم کے منہ سے ایک سرور انگیز آواز نکلی اور اس نے فوسٹر کی طرف دیکھا جو آتش دان میں جلتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

"مل گئی فوسٹر! مجھے میری مطلوبہ تصویر مل گئی۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا تو فوسٹر جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بھی تصویر کو دیکھا اور بلاشبہ اسے یہ تصویر آرٹ کا نادر نمونہ معلوم ہوئی۔ اس تصویر میں ایک اندھے اور لنگڑے فقیر کو دکھایا گیا تھا جو ہیروں کے ڈھیر پر بیٹھا پیالہ پھیلائے بھیک مانگ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی فوسٹر کو ایک اور احساس ہوا۔ ایک عجیب سا احساس۔ اسے محسوس ہوا کہ ہیروں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا فقیر بن حاتم سے مشابہ ہے۔ گو یہ بوڑھا فقیر تھا، اس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں، آنکھوں کے حلقے سیاہ اور ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی لیکن ان خدوخال سے بن حاتم کا تصور ابھرتا تھا اور اس نے بن حاتم سے یہ بات کہہ ڈالی۔

"اس فقیر کی تصویر غور سے دیکھو بن حاتم۔ کیا اس کے خدوخال تم سے نہیں ملتے؟" بن حاتم نے بغور اس تصویر کو دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔ چند سیکنڈ کے لیے اس کا چہرہ بالکل ست گیا لیکن پھر اس نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا جیسے اپنے دل سے انجانے خوف کو دور کررہا ہو۔

"بوڑھا یقیناً شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے ہمارے دلوں میں ایک خوف سمونے کی کوشش کی تھی اور ہم اسی خوف کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ذہن سے خوف جھٹک دو فوسٹر۔ یہ سب بکواس ہے۔ وہ شیطان صفت بوڑھا مرتے مرتے بھی ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرگیا ہے۔"

فوسٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پُرخیال انداز میں دیوار کو گھور رہا تھا پھر وہ فوسٹر کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ "آؤ دوست! اب یہاں رکنا بے کار ہے...... یہاں سے نکل چلیں۔"

"چلو۔" فوسٹر نے کہا اور ایک گہری سانس لے کر

پلٹنے لگا لیکن اسی وقت اس کی نگاہ کینوس بورڈ پر پڑی جس کا پردہ گر چکا تھا اور اس کے ذہن میں بے شمار دھماکے ایک ساتھ ہونے لگے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں زیر تکمیل تصویر پر جم گئیں۔ یہ حال کی تصویر تھی۔ اس تصویر میں دو کردار نمایاں تھے۔ ایک طلال نقشی جو اپنے پیٹ سے گرتی ہوئی آنتوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے تھا اور دوسرا چہرہ بن حاتم کا تھا جس کے ہاتھ میں دبے، مڑے ہوئے خنجر سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک لمحے میں فوسٹر کے ذہن پر قیامت گزر گئی۔ اس کے ذہن میں طلال نقشی کی آواز گونجنے لگی۔

''میں مستقبل کا مصور ہوں...... میں اپنی تصویروں کے ذریعے پیشین گوئی کرتا ہوں۔'' طلال نقشی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔ اس نے کہا تھا۔ ''ہاں، اس بار میں کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکوں گا۔''

''کیا دیکھ رہے ہو فوسٹر...... آؤ۔'' بن حاتم نے کہا۔

''اس تصویر کو دیکھو بن حاتم۔ یہ...... یہ کیا ہے؟'' فوسٹر نے کہا اور بن حاتم کی نظریں تصویر پر پڑیں۔ بغل میں دبا ہوا بنڈل نیچے گر پڑا اور وہ مضطربانہ انداز میں آگے بڑھ آیا۔

''یہ...... یہ...... ناممکن ہے۔ یہ ناممکن ہے، بالکل ناممکن۔ وہ اتنی جلدی یہ تصویر نہیں بنا سکتا۔ اور میرا لباس...... اور یہ خنجر جو میں نے آج ہی خریدا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے فوسٹر؟''

''ہاں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم اس کی باتوں پر بھروسا کرلیں۔ اسے اپنی موت کا یقین تھا اور اس نے اس تصویر میں اپنی موت کی پیشین گوئی کی تھی۔ تمہیں یاد نہیں رہا بن حاتم، اس نے کہا تھا کہ آج اس کے انتظار کا آخری موتی مجسم ہو رہا ہے اور وہ تمہاری آمد کا منتظر تھا۔''

''نکل چلو فوسٹر۔ اس شیطانی نگار خانے سے نکل چلو۔ ورنہ...... ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''صرف ایک منٹ بن حاتم۔ ہم اس تصویر کو قتل کے ثبوت کے طور پر یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ اس تصویر سے پولیس بہ آسانی تمہارا سراغ لگالے گی۔ ٹھہرو اسے بھی آتش دان کی نذر کردیا جائے۔'' فوسٹر نے کہا اور تصویر فریم سے اتار کر آتش دان میں ڈال دی پھر وہ اس وقت تک وہاں رکے جب تک تصویر راکھ نہ بن گئی۔ فوسٹر نے اس دوران بن حاتم کے لرزتے ہوئے جسم کو صاف دیکھا تھا۔ بن حاتم خوف سے لرز رہا تھا اور پھر وہ بن حاتم کی پسندیدہ تصویر اٹھا کر وہاں سے نکل آیا...... بن حاتم کا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح بن حاتم شدید بخار میں جلا تھا۔ اس پر سرسامی کیفیت طاری تھی۔ اس کی محبوبہ زابیلا جب اس سے ملنے آئی تو اس کی کیفیت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''بخار کب چڑھا؟''

''رات کے کسی حصے میں مجھے احساس بھی نہیں ہوسکا۔''

''کسی ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے...... ٹھہرو میں بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک ڈاکٹر کو لے آئی۔ اس دوران فوسٹر نے تصویر ایک محفوظ جگہ پر چھپا دی تھی۔ ڈاکٹر نے موسی اثر بتایا اور انجکشن وغیرہ لگا کر چلا گیا۔ زابیلا بن حاتم کے پاس بیٹھی تشویش ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فوسٹر کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے فوسٹر کہ بن حاتم مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔''

''ہاں...... بن حاتم نے اسی انداز میں تمہارا ذکر کیا تھا۔''

''اس کا ہر راز میرا ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ ایک تصویر حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی کے لیے وہ جبل چلا گیا تھا۔'' وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''ان تمام باتوں کو جاننے کے بعد آپ مجھے بتایئے کہ کیا آپ لوگوں نے رات اسی کمرے میں گزاری؟''

''کیا مطلب......؟'' فوسٹر چونک پڑا۔

''بن حاتم اس تصویر کے لیے بے چین تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ رہا ہونے کے بعد ایک رات بھی وہ اس کا انتظار کرسکتا ہے۔''

فوسٹر گردن جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ زابیلا تصویر کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اس لیے اسے یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ بن حاتم تصویر حاصل کرچکا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''رات ہم نے کمرے میں نہیں گزاری۔''

''تصویر مل گئی؟''

''ہاں۔'' فوسٹر نے جواب دیا۔

''بہت اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا پھر کچھ سوچتے

ہوئے بولی۔ ''کیا خیال ہے فوسٹر کیوں نہ اب آپ لوگ میرے گھر میں منتقل ہوجائیں؟''

''کیا آپ کا گھر ہماری رہائش کے لیے موزوں رہے گا؟''

''کیوں نہیں، شاید بن حاتم نے میرے بارے میں آپ کو تفصیل سے نہیں بتایا۔ میں اپنے چچا کے ساتھ مقیم ہوں۔ پوری دنیا میں میرا اس بوڑھے لالچی چچا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میرا چچا شرابی اور جواری ہے۔ وہ کچھ نہیں کرتا اور میرے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے، شدید نفرت لیکن بہر حال مجھے عورت ہونے کا احساس بھی ہے اور عورت مرد کے سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، چاہے وہ ایک بوڑھے اور شرابی چچا ہی کا سہارا کیوں نہ ہو۔ مجھے بن حاتم کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔''

''شاید یہاں تمہاری جائداد ہوگی ورنہ تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''کوئی جائداد نہیں ہے۔ میں ایک کلب میں رقص کرتی ہوں۔ وہیں سے جو کچھ ملتا ہے اس سے اپنا پیٹ پالتی ہوں اور اس لالچی بوڑھے کی ناپاک خواہشات پوری کرتی ہوں۔''

''بہر حال محترمہ زابیلا۔ میری رائے ہے کہ بن حاتم کے ہوش میں آنے سے قبل ہمیں آپ کے گھر نہیں منتقل ہونا چاہیے۔ اس سے مشورہ ضروری ہے۔'' فوسٹر نے کہا تو زابیلا خاموشی سے اس کی شکل دیکھنے لگی پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔

''اچھی بات ہے۔ میں بن حاتم کے لیے بہت فکر مند ہوں لیکن مجھے چند ضروری کام بھی کرنے ہیں۔ اس لیے اس وقت اجازت چاہتی ہوں۔ دوپہر کے بعد پھر آؤں گی۔'' اور وہ رخصت ہوکر چلی گئی۔

بارہ بجے کے بعد بن حاتم کا بخار اتر گیا۔ فوسٹر نے اسے تھوڑا سا سوپ پلایا اور پھر زابیلا کی آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے زابیلا کی خواہش بھی بتائی تھی۔

''ابھی مناسب نہیں ہے۔ طلال نقشی کی لاش برآمد ہوجانے کے بعد حالات دیکھ لو۔ اس کے بعد ہم دوسرا قدم اٹھائیں گے۔'' بن حاتم نے جواب دیا تو فوسٹر نے اس سے اتفاق کیا۔

دوپہر کے بعد حسب وعدہ زابیلا آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بن حاتم کی حالت قدرے بہتر دیکھ کر اسے سکون ہوا لیکن اس کے چہرے

کی زردی اب بھی برقرار تھی۔ اس نے تصویر کے حصول پر بن حاتم کو مبارک باد دی اور اس سے دلجوئی کی باتیں کرتی رہی لیکن کبھی کبھی اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور نگاہوں میں خوف ابھرتا۔ یہ بات صرف فوسٹر محسوس کرسکا پھر اس نے بن حاتم سے شام کو آنے کا وعدہ کیا اور چلتے چلتے بولی۔

"مجھے یہ ہوٹل تمہارے لیے بہتر نہیں معلوم ہوتا بن حاتم۔ شام کو ہم ایک دوسری جگہ منتقل ہوجائیں گے، تم تیار رہنا۔"

"لیکن میرا خیال ہے میں یہاں آرام سے ہوں۔ وقتی طور پر طبیعت خراب ہوگئی تھی اب ٹھیک ہوں۔" بن حاتم بولا۔

"تم عورت کے دل کو نہیں جانتے ڈیئر۔ میں تمہارے بارے میں لاکھوں وسوسوں کا شکار ہوگئی ہوں۔ میں ضرور تمہیں یہاں سے منتقل کردوں گی۔ تیار رہنا، میں کسی بھی وقت تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔"

بن حاتم مسکرانے لگا تب وہ فوسٹر سے مخاطب ہوکر بولی۔ "ڈاکٹر نے بن حاتم کے لیے ایک طاقت کی دوا تجویز کی ہے مسٹر فوسٹر...... براہِ کرم آپ میرے ساتھ کیمسٹ کی دکان تک چلیں تاکہ میں آپ کو وہ دوا دلادوں۔ تکلیف کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔ دراصل بن حاتم سے ملنے کے لیے میں اس قدر بے چین تھی کہ دوا بھی نہیں خرید سکی۔ بس ذرا نیچے تک چلنا ہوگا۔ کیمسٹ کی دکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ضرور...... ضرور۔" فوسٹر جلدی سے تیار ہوگیا۔

بن حاتم محبت آمیز انداز میں مسکرانے لگا اور فوسٹر دروازے سے باہر نکل گیا تاکہ ان لوگوں کو تنہائی کے چند لمحات دے دے۔ کچھ دیر بعد ترابیلا بھی باہر آگئی اور اس نے فوسٹر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہوٹل کے گیٹ سے باہر نکل جانے کے بجائے وہ اس کے عقبی لان کی طرف بڑھ گئی جو سنسان پڑا تھا پھر ایک جگہ رک کر اس نے اپنے پرس سے ایک شیشی نکال لی اور اسے فوسٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"طاقت کی دوا میں خرید لائی تھی لیکن تم سے تنہائی میں چند باتیں کرنی تھیں اس لیے بہانے سے تمہیں باہر لے آئی۔"

"کیا بات ہے؟" فوسٹر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تصویر حاصل کرنے کے لیے طلال نقشی کو قتل کرنا پڑا تھا؟"

"ہاں۔" فوسٹر نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔

"اس کی لاش مل گئی ہے چونکہ وہ ایک بڑا اور نامور مصور تھا اس لیے اس کے قاتلوں کے بارے میں تفتیش بھی اعلیٰ پیمانے پر ہورہی ہے۔ خفیہ محکمے کا ایک رکن الیاس شیطان کی طرح چالاک ہے۔ آج تک وہ کسی کیس میں ناکام نہیں رہا ہے اور وہی اس کیس کی تفتیش کررہا ہے۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بارے میں ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہے گا۔" فوسٹر نے کہا۔

"اس دھوکے میں نہ رہیں مسٹر فوسٹر۔ میں بتا چکی ہوں کہ وہ شیطان کی طرح چالاک ہے۔ وہ بن حاتم کے بارے میں شبہ کرچکا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"طلال نقشی کے سیکریٹری نے اسے دو تصویروں کی کمی کی اطلاع دی ہے اور ان تصویروں کی راکھ آتش دان میں ملی ہے۔ کینوس بورڈ پر لگی تصویر بھی غائب ہے اور دوسری تصویروں کے بنڈل کھلے ملے ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ چوروں نے دو تصویریں جلادیں اور ایک چرالی۔ بن حاتم کا قصہ بھی الیاس کو معلوم تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ بن حاتم جیل سے رہا ہوگیا ہے اور پھر ایک اور ثبوت بھی ملا ہے۔ یہ آتش دان میں پڑے ہوئے سوئی تھے جن کی تعداد سات سو تیس ہے اور بن حاتم کو پورے دو سال کی سزا ہوئی تھی جس کے دن ہیں سات سو تیس...... اور کوئی ہوتا تو شاید ان باریکیوں پر توجہ نہ دیتا لیکن الیاس کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"اوہ...... یہ تو بڑی خطرناک بات ہے...... مگر تمہیں تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں۔ یوں سمجھ لو میں ایک کلب کی رقاصہ ہوں اور ہر قسم کے لوگ مجھ سے ملتے ہیں۔ میرے چند عاشق میرے دوستوں کے بھی عاشق ہیں اور مجھے خوش رکھنے کے لیے ان کا خیال رکھتے ہیں۔ محکمے کے رکن الیاس کے اسسٹنٹ نے مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے کہ الیاس کن لائنوں پر سوچ رہا ہے۔ کاغذی کارروائی کے بعد وہ بن حاتم کی تلاش شروع کرے گا۔"

فوسٹر کے جسم سے پسینا چھوٹ گیا۔ وہ خود بھی بن حاتم کے ساتھ شریک تھا۔ منشیات کی اسمگلنگ کے جرم میں ایک سال سزا کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن کسی کے قتل میں شرکت کی

سزا آسان نہیں ہوگی اور پھر بن حاتم سے اسے بھی دلچسپی ہوگئی تھی۔
''پھر اب کیا پروگرام ہے زابیلا؟'' اس نے پوچھا۔
''ابھی کسی کو ہم لوگوں کے اس ہوٹل میں قیام کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ ان لوگوں کو اس حد تک معلوم کرنے میں کچھ وقت بھی لگے گا۔ میں فوری طور پر ایک مکان تلاش کر کے شام تک تمہیں اس میں منتقل کردوں گی اور اس کے بعد کوئی دوسرا بندوبست کردوں گی۔ تفصیلات بن حاتم کو بھی بتانا ضروری تھیں لیکن وہ بیمار ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ ان تفصیلات سے اس کے ذہن پر برا اثر پڑے۔ اس لیے مجھے تمہیں الگ لانا پڑا۔ ہاں میری ہدایت ہے کہ اس دوران اپنے کمرے سے باہر مت نکلنا، اچھا اب میں چلتی ہوں۔ یہ شیشی لے جاؤ اور اسے اس کی ایک خوراک استعمال کرادو۔ میں شام تک آؤں گی۔''

☆☆☆

بن حاتم بیمار ضرور تھا لیکن صرف ان پراسرار باتوں کے خوف سے جو بوڑھے نے اسے بتائی تھیں۔ جرم کے معاملے میں وہ اس قدر بزدل نہیں تھا اگر بزدل ہوتا تو طلال کو اس طرح قتل نہ کر دیتا چنانچہ فوسٹر نے اس سے یہ تفصیل چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اس کا اندازہ درست نکلا۔ بن حاتم نے کہا۔
''میں نے اسے قتل کرنے سے قبل پولیس کو بھی ذہن میں رکھا تھا۔ بہر حال پولیس آسانی سے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔ زابیلا کا انتظار کریں ورنہ میں خود کوئی بندوبست کرلوں گا۔''
شام کو چھ بجے زابیلا آگئی۔ اس کے ساتھ ایک بند گاڑی بھی تھی۔ ہوٹل کا بل وغیرہ وہ پہلے ہی ادا کر آئی تھی۔ چنانچہ وہ انہیں لے کر چل پڑی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے خوبصورت ایک منزلہ مکان میں منتقل ہوگئے۔
''میں تمہارا شکر گزار ہوں زابیلا۔ بے شک تم میرے لیے سخت مشکلات سے گزر رہی ہو لیکن زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ الماس آسانی سے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔'' بن حاتم نے محبت سے زابیلا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مسلتے ہوئے کہا۔
''اوہ..... تو فوسٹر نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا لیکن تم الماس کو ٹھیک سے جانتے نہیں ہو بن حاتم۔ یہ شہر اب ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ وہ ہمیں تنگ کرتا رہے گا اس لیے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بندوبست کررہی ہوں اور شاید آج ہی رات میں تمہیں بتادوں کہ کب ہم یہ شہر چھوڑ رہے ہیں۔ ہم اس جگہ سے نکل کر ہی پُرسکون زندگی بسر کرسکیں گے بن حاتم۔ میں اب تم سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رہ سکتی۔'' آخری الفاظ اس نے شرماتے ہوئے ادا کیے اور جھینپی ہوئی نظروں سے فوسٹر کو دیکھنے لگی۔
''اوہ سوری۔'' فوسٹر نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد بن حاتم نے ہی اسے آواز دی اور زابیلا اپنا لباس درست کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔
''تم بلاوجہ ہی باہر نکل گئے۔'' بن حاتم نے جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔
''کوئی حرج نہیں ہے دوست۔'' فوسٹر نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے کہا اور پھر وہ رومال بن حاتم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے ہونٹوں پر شاید غلطی سے لپ اسٹک لگ گئی ہے۔'' بن حاتم جھینپے ہوئے انداز میں ہنس پڑا اور زور زور سے ہونٹوں کو رگڑنے لگا۔

☆☆☆

آدھی رات کے قریب انہیں ایک اور سفر کرنا پڑا۔ وہی بند گاڑی آئی تھی، دو آدمی ساتھ تھے۔ انہوں نے انہیں زابیلا کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ دیا جس میں تحریر تھا کہ وہ ان دونوں کے ساتھ چلے آئیں اور ان پر مکمل اعتماد کریں۔
''چلو بھئی آج کل وہ مرد ہے اور ہم عورت۔'' بن حاتم نے مسکراتے ہوئے کہا اور بند گاڑی انہیں لے کر چل پڑی۔
راستے کا کوئی پتا نہیں چل سکا لیکن پھر جہاز کے سائرن نے اطلاع دی کہ وہ بندرگاہ کے علاقے میں ہیں اور پھر ایک ساحل پر انہیں اتارا گیا جہاں چند لوگ ان کے منتظر تھے۔ کنارے پر کھڑی ہوئی ایک لانچ انہیں لے کر چل پڑی۔ بن حاتم حیران تھا کہ زابیلا نے کیا چکر چلایا ہے ورنہ اتنی جلدی ملک سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ لانچ نے انہیں ڈیک سے دور کھڑے ہوئے ایک جہاز پر پہنچا دیا اور جہاز کے قوی ہیکل کپتان نے ان کا استقبال کیا۔
''آپ لوگوں میں سے بن حاتم کون ہے؟ غالباً تم کیونکہ تمہارا ساتھی سفید فام ہے۔'' کپتان نے بن حاتم کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔
''آپ کا خیال درست ہے۔'' بن حاتم نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہ رات تکلیف سے گزارنا ہوگی۔ رات ہی کے کسی حصے میں جہاز کی چیکنگ ہوگی اور پھر صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔" کپتان نے کہا اور درحقیقت یہ تکلیف دہ رات ان کی زندگی میں سب سے عجیب تھی۔ انہیں جہاز کے سب سے نچلے حصے میں مویشیوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ بدبو کے مارے ان کے دماغ پھٹے جارہے تھے۔ وہ مویشیوں کے چارے دان میں چھپے ہوئے تھے اور ان کے اوپر گھاس پھوس کے ڈھیر تھے لیکن مجبوری تھی جب تک یہ مصیبت لکھی تھی، گزارنی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور پھر انہوں نے جہاز میں حرکت محسوس کی۔ شاید جہاز بندرگاہ چھوڑ رہا تھا۔ گویا جہاز چیکنگ کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ وہ اسی طرح چھپے رہے اور پھر انہوں نے مویشیوں کی کریہہ اور کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے درمیان کچھ انسانی آوازیں سنیں اور اس کے بعد کپتان کی آواز سنائی دی۔

"باہر نکل آؤ شریف آدمیوں..... خطرہ ٹل چکا ہے۔"

اور وہ دونوں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے باہر نکل آئے کپتان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ کپتان نے انہیں اشارہ کیا تو وہ انہیں لے کر چل پڑے پھر کیبنوں کی قطار کے ساتھ انہوں نے دو کیبنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں کیبن آپ کے ہیں، آپ آرام کریں۔"

"شکریہ۔" انہوں نے گردنیں ہلائیں اور پھر فوسٹر نے بن حاتم سے کہا۔ "اوکے بن حاتم! تھوڑی دیر بعد ملاقات کریں گے۔"

بن حاتم نے گردن ہلادی اور پھر دونوں کیبنوں کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ بن حاتم کے کیبن میں زابیلا موجود تھی اور اس کے ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بن حاتم اسے دیکھ کر چونک پڑا اور پھر اس نے دوڑ کر زابیلا کو اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

"جس وقت جہاز نے بندرگاہ چھوڑی تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کتنے عرصے تم سے جدا رہنا پڑے۔ قید کے دو سال ہی میرے لیے صبر آزما تھے اور پھر......"

"میں نے بھی یہ دن کانٹوں پر گزارے تھے بن حاتم۔ میں اب تمہیں کیسے چھوڑ سکتی تھی۔" زابیلا نے اس کے جسم میں پیوست ہوتے ہوئے کہا اور بن حاتم نے اپنے پیاسے ہونٹ اس کے یاقوتی ہونٹوں میں پیوست کردیے۔

نہ جانے کب تک وہ ایک دوسرے میں پیوست رہے پھر جب فوسٹر نے دروازے پر دستک دی تب وہ چونکے اور بن حاتم نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"اوہ ..... ونڈرفل۔ میں سوچ رہا تھا بن حاتم تمہارے بغیر اداس ہوگا لیکن شکر ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔" زابیلا بھی مسکرانے لگی۔ "میری طرف سے ایسی محبت کرنے والی محبوبہ کی مبارکباد قبول کرو بن حاتم۔ تمہاری دونوں خواہشات پوری ہوگئیں یعنی تمہیں تمہاری پسندیدہ تصویر بھی مل گئی اور پسندیدہ محبوبہ بھی۔"

"ہاں میرے دوست! اس ..... سلسلے میں، میں تمہارے کردار کو کبھی نظرانداز نہیں کروں گا۔" بن حاتم نے شکرگزار انداز میں کہا۔

"لیکن آپ نے ہمارے یہاں آنے کا بندوبست کیسے کیا مس زابیلا...... معاف کریں ابھی تو میں آپ کو مس ہی کہوں گا جب تک آپ میرے دوست کی بیوی نہ بن جائیں۔"

"میں بن حاتم کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مسٹر فوسٹر۔ میں آپ کو بتاچکی ہوں کہ میں ایک کلب میں رقاصہ ہوں۔ اس طرح میری واقفیت ہر قسم کے لوگوں سے ہے اور معاف کریں بوالہوس قسم کے مردوں سے خود کو محفوظ رکھ کر الو بنانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے۔ یہ جہاز پچھلے ایک ماہ سے ہمارے شہر کی بندرگاہ پر تھا اور اس کا کپتان صرف میرا رقص دیکھنے روزانہ وہاں آتا تھا۔ بصورت دیگر وہ میرا عاشق ہے۔ پرسوں رات وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے مجھ سے رخصت ہونے آیا کیونکہ اس کا جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ یہ بات مجھے اچانک ہی یاد آگئی اور میں بندرگاہ جاکر اس کپتان سے ملی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے جہاز میں چھپا کر لے چلے کیونکہ میرے دشمن مجھے قتل کردینا چاہتے ہیں۔ میں نے اسے ایک فرضی کہانی بھی سنادی جس میں میرے شوہر......" یہ کہتے ہوئے زابیلا کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ "اور میرے شوہر کے دوست کا بھی تذکرہ تھا جو میری وجہ سے موت کے شکنجے میں جارہے تھے۔ بہرحال کپتان کو موم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوا اور اس طرح......!"

"خوب......!" فوسٹر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ بعض معاملات میں عورت مرد سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔" زابیلا مسکرانے لگی۔

☆☆☆

دن انتہائی خوشگوار گزرا۔ کپتان نے ان کے لیے ہر سہولت مہیا کر دی تھی۔ پورا دن وہ جہاز کی سیر کرتے رہے۔ زابیلا اپنے ساتھ کافی رقم لے آئی تھی اس لیے وہ مطمئن تھی پھر شام کو انہوں نے ریلنگ سے لگ کر ڈوبتے سورج کا منظر دیکھا اور پھر رات ہو گئی۔ رات دن سے زیادہ خوشگوار ثابت ہوئی۔ کم از کم بن حاتم کے لیے تو یہ رات بہت حسین اور دلکش تھی۔ زابیلا اس کے سینے میں منہ چھپائے لیٹی تھی۔ اس رات کا تصور نہ جانے کب سے اس کے ذہن میں تھا۔ کب سے وہ اس رات کے لیے تڑپ رہی تھی۔ بن حاتم کی سانسیں بھی جذبات میں الجھی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

چیخ کی آواز فوسٹر کے کیبن تک گئی تھی۔ وہ جاگ گیا۔ بن حاتم کا کیبن اس کے کیبن سے ملا ہوا تھا۔ اسے زابیلا کی آواز سنائی دی جو بدحواسی کے عالم میں بن حاتم کو پکار رہی تھی۔

''نہ جانے کیا ہو گیا؟'' فوسٹر نے سوچا اور جلدی سے اپنا بستر چھوڑ دیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اس وقت اس کے کیبن پر دستک دینا بہت بری بات تھی لیکن فوسٹر خود کو نہ روک سکا اور چند لمحوں کے بعد وہ بن حاتم کے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے زابیلا کی آواز سنائی دی۔

''فوسٹر...... کیا بات ہے زابیلا؟''

''ایک منٹ۔'' اندر سے زابیلا کی آواز سنائی دی۔ فوسٹر نے کیبن کے کی ہول سے آنکھ لگا دی لیکن پھر اسے آنکھ ہٹا لینی پڑی کیونکہ زابیلا کا چمکدار مرمریں جسم اس کے سامنے تھا۔ وہ لباس پہن رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا اور فوسٹر اندر داخل ہو گیا۔

''کیا بات ہے۔ میں نے کوئی چیخ سنی تھی۔'' اس نے پہلے زابیلا اور پھر بن حاتم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بن حاتم گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی خوف سے دھواں دھواں تھا۔

''کیا بات ہے بن حاتم؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''میں نے ایک خواب دیکھا تھا بڑا دہشت ناک خواب تھا۔ میں اپنی بے ساختہ چیخ کو نہ روک سکا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا دیکھا؟'' فوسٹر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''عجیب خواب تھا۔ میں نے دیکھا میں سمندر کی سطح پر سرپٹ دوڑ رہا ہوں۔ میرے پیروں کے نیچے پانی ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے قدم رکے تو میں پانی میں ڈوب جاؤں گا اور...... میرے دوڑنے کی وجہ وہ سیاہ رنگ کی خوف ناک شارک تھی جو سمندر میں میرا تعاقب کر رہی تھی۔ بہت بڑی مچھلی جو بار بار منہ کھولتی اور اس کے خوفناک دانت نمایاں ہو جاتے۔ کئی بار مچھلی میرے قریب پہنچی۔ قریب تھا کہ وہ مجھے دبوچ لے لیکن میں پھر اس سے آگے نکل جاتا پھر اچانک میرے پاؤں ڈوبنے لگے۔ میں دوڑنے کے قابل نہ رہا اور مچھلی میرے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس کا پہاڑ جیسا جسم مجھ پر چھانے لگا اور اس کی خوفناک آنکھیں میرے قریب ہونے لگیں اور میں چیخ پڑا۔ اگر زابیلا مجھے جگا نہ دیتی تو مچھلی مجھے ضرور چبا ڈالتی۔''

''خوب۔'' فوسٹر ہنس پڑا لیکن بن حاتم کے چہرے سے دہشت کم نہیں ہوئی۔ کافی دیر تک فوسٹر اس سے باتیں کرتا رہا پھر انہیں آرام کرنے کی تلقین کر کے ان کے کیبن سے نکل آیا۔

لیکن دوسرے دن بھی اس کی حالت درست نہیں تھی۔ ایک عجیب سا خوف اس پر چھایا ہوا تھا۔ سمندر کی لہروں کو کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے فوسٹر سے کہا۔ ''میرا مذاق نہ اڑاؤ تو ایک بات کہوں فوسٹر۔''

''ضرور۔'' فوسٹر نے دلچسپی سے کہا۔

''تمہیں بوڑھے طلال کے الفاظ یاد ہیں کہ میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اپنے خوابوں میں بسنے والی اس سیاہ مچھلی کو فراموش نہیں کرنا۔ وہ طلال النفشی ہوگا جو اپنی پیشین گوئی کے انجام کا منتظر ہوگا۔''

''ایں...... ہاں۔'' فوسٹر بھی چونک پڑا۔ چند لمحوں تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔ ''اوہ تمہارے رات کے خواب کا معما حل ہو گیا۔ تمہارے ذہن کے تاریک گوشوں میں طلال کے الفاظ محفوظ تھے جو سوتے میں تمہارے لاشعور میں اتر آئے۔''

''یہ بات نہیں ہے فوسٹر۔ کیا تم یقین کرو گے کہ اسے قتل کرنے کے دوسرے دن بھی میں نے خواب میں اس مچھلی کو دیکھا تھا۔ ایک دھندلا سا خاکہ لیکن اس روز میں خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ اس دن میں نے دیکھا کہ وہ مچھلی مجھے گھور رہی ہے۔ وہ دم کے بل کھڑی ہوئی تھی۔''

''اس نے تمہیں فلمی گانے نہیں سنائے؟'' فوسٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مذاق نہ اڑاؤ دوست! نہ جانے کیوں میرا دل ایک

انجانے خوف سے بوجھل ہو گیا ہے۔ میں خود بھی حیران ہوں۔" بن حاتم نے سنجیدگی سے کہا۔

"انسانی قتل کو برداشت کرنا آسان کام نہیں ہے دوست...... میں نے اب تک کی زندگی کے جرائم میں گزاری ہے لیکن یقین کرو میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ ہمت ہی نہیں پڑسکی۔ تمہارے ذہن پر کافی دن تک ایسا ہی خوف مسلط رہے گا اور آہستہ آہستہ ہی تم اسے بھول سکو گے۔" فوسٹر نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو بن حاتم فکرمند انداز میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

سمندری سفر جاری رہا لیکن زابیلا بن حاتم کی طرف سے بہت فکرمند تھی۔ بن حاتم کی صحت گرتی جارہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد رہنے لگا تھا۔ ہر وقت اس کے چہرے پر خوف کے آثار چھائے رہتے۔ اس دوران ان کا تعارف چند دوسرے مسافروں سے بھی ہو گیا تھا اور اکثر ان کے ساتھ نشست رہتی لیکن بن حاتم اس وقت بھی کھویا کھویا سا رہتا۔

اس وقت وہ تینوں جہاز کے ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کافی کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بن حاتم پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی لکیر کو دیکھ رہا تھا کہ فوسٹر نے اسے آواز دی تو وہ چونک پڑا۔

"ہیں......!" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"تمہاری یہ کیفیت ہم دونوں کے لیے پریشان کن ہے بن حاتم۔ تم نے ایک بے مقصد خوف کو اپنے اوپر مسلط کرلیا ہے۔ مجھے بتاؤ تمہارے اس وہم کا کوئی علاج ہے؟"

"میں خود پریشان ہوں فوسٹر۔ یقین کرو مجھے احساس ہے کہ میری وجہ سے تم دونوں کس قدر پریشان ہو لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن پر ہر وقت اس سیاہ مچھلی کا خوف مسلط رہتا ہے۔ اب تو میں دن میں بھی اسے دیکھنے لگا ہوں۔ چلتے چلتے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں چونک کر پلٹتا ہوں تو مجھے ایک ہیولا سا دکھائی دیتا ہے۔ مچھلی کا سا ہیولا۔ جس کی خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی ہوتی ہیں اور اس کے جبڑے کھلے ہوتے ہیں۔ رات کو خواب میں مچھلی مجھے جہاز کا تعاقب کرتی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ جہاز کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو۔ میں اس صورتحال سے بہت پریشان ہوں فوسٹر۔"

"اپنے ذہن سے یہ وہم نکالنے کی کوشش کرو بن حاتم۔ ورنہ تمہاری صحت تباہ ہو جائے گی۔ ہم خطرے کی جگہ سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ اس خیال کو جھٹک دو اور کسی مناسب جگہ پہنچ کر اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو۔" فوسٹر نے کہا اور پھر وہ خاموش ہو گئے کیونکہ مس مارتن آرہی تھی۔ یہ ایک کم عمر لڑکی تھی جس سے جہاز پر ہی ان کا تعارف ہوا تھا۔ لڑکی بے پناہ حسین تھی اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی دیکھا جاتا تھا جس نے اپنا نام مارتن بتایا تھا۔ اسی نسبت سے اسے مس مارتن کہا جاتا تھا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ وہ لڑکی کا باپ ہے۔ ویسے فوسٹر اس لڑکی سے بہت متاثر تھا اور پہلی ملاقات میں اس کی نظروں میں لڑکی کے لیے پسندیدگی کے جذبات نظر آئے تھے۔

"ہیلو مس مارتن۔" فوسٹر نے لہک کر اس کا استقبال کیا تو لڑکی پھیکے انداز میں مسکراتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔

"میں بہت دیر سے آپ لوگوں کو تلاش کررہی تھی۔"

"مسٹر مارتن کہاں ہیں؟" فوسٹر نے پوچھا۔

"اوپر دھوپ لے رہے ہیں۔" لڑکی کے ہونٹ تنفر آمیز انداز میں کھنچ گئے اور فوسٹر نے اس انداز کو حیرت سے دیکھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ "کیا آپ مجھے کچھ وقت دیں گے مسٹر فوسٹر۔ آیئے ریلنگ تک چلیں۔" لڑکی نے کہا۔

"اوہ...... ضرور۔" فوسٹر خوشی سے بولا اور زابیلا کی آنکھوں میں معنی خیز چمک لہرانے لگی۔ بن حاتم بھی مسکرایا تھا۔ فوسٹر اس کے ساتھ ریلنگ تک آگیا۔ لڑکی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"میرا آپ سے تعارف چند روزہ ہے مسٹر فوسٹر لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن نے کہا ہے کہ میں آپ پر اعتماد کرلوں۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے مس مارتن۔" فوسٹر نے کہا۔

"مجھے مس مارتن نہ کہیں۔ میں اس خبیث کے ساتھ اپنا نام پسند نہیں کرتی۔" لڑکی نے کہا اور پھر چاروں طرف دیکھ کر بولی۔ "ممکن ہے مجھے زیادہ وقت نہ ملے اس لیے میں کم سے کم وقت میں آپ سے اپنا مدعا کہہ دینا چاہتی ہوں۔ یوں بھی میرے پاس صرف ایک رات ہے۔" فوسٹر کی آنکھوں میں حیرانی کے تاثرات ابھر آئے۔

"بوڑھا میرا باپ نہیں ہے بلکہ ایک جرائم پیشہ انسان ہے۔ کافی عرصے تک بحری قزاقوں کے گروہ میں رہ چکا ہے۔ وہ مجھے اغوا کرکے لایا ہے۔"

"اوہ......!" فوسٹر کے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔

"مجھے معاف کرنا فوسٹر...... شاید آپ نے بحری قزاق پیٹرس کے بارے میں کچھ سنا ہو۔ وہ میرے والد تھے۔ انہوں نے پوری زندگی قزاقی میں گزاری اور آخر

ایک دن ایک ملک کی بحری پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے۔ میں ان دنوں ساکسیا جزیرے میں تھی۔ ساکسیا سے بیس میل دور ایک غیر آباد جزیرے میں میرے والد کا ہیڈ کوارٹر تھا اور مارٹن میرے والد کا دستِ راست تھا۔ مارٹن بچ گیا، کچھ دوسرے قزاق بھی کام آ گئے باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ مارٹن بے حد بدطینت انسان ہے۔ میرے والد چونکہ ان کے سرغنہ تھے اس لیے دوسرے لوگ میری عزت کرتے تھے لیکن ان کی موت کے بعد میری کوئی حیثیت نہ رہی۔ میں باپ کی موت کے بعد دوسرے ملک چلی گئی۔ میرے باپ نے میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ اس لیے آرام سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ مجھے گروہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک رات میں سو رہی تھی کہ مارٹن اور اس کے ساتھی میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے زبردستی اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ مارٹن نے مجھ سے کہا کہ میں ان خزانے کے بارے میں بتاؤں جو میرے والد نے ان لوگوں کی مدد سے اکٹھا کیا تھا۔ وہ خود بھی خزانے کے حق دار تھے۔ یہ خزانہ اس غیر آباد جزیرے میں موجود تھا جہاں میرے والد کا ہیڈ کوارٹر تھا اور بلاشبہ مجھے اس کا ٹھکانا معلوم تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ خزانہ ان کی ملکیت نہ تھا۔ لوٹے ہوئے مال میں سے ان کا حصہ انہیں پہلے ہی مل جاتا تھا۔ وہ صرف میری ملکیت تھا۔ میں کمزور لڑکی تھی۔ اس جزیرے تک سفر کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے میں نے سوچا تھا کہ میں شادی کے بعد اپنے شوہر کو اس کا پتا بتاؤں گی اور پھر اس سے ہم عشرت کی زندگی بسر کریں گے۔ میں نے مارٹن کو منع کیا تو اس نے میرے اوپر تشدد کیا اور مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ تب مجبوراً میں تیار ہو گئی اور اب ہم اس جزیرے کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ پہلے ہم ساکسیا جاتے اور اس کے بعد وہاں میں خزانہ ان کے حوالے کر کے جان بچا لیتی لیکن پچھلی رات میں نے ان لوگوں کی گفتگو سنی ہے۔ وہ پروگرام بنا چکے ہیں کہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد مجھے قتل کر دیں گے۔ میں مرنا نہیں چاہتی فوسٹر۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ سسکیاں لینے لگی، فوسٹر یہ کہانی سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ بہ مشکل اس نے لڑکی کو چپ کروایا اور بولا۔

''لیکن مارٹن تو تنہا سفر کر رہا تھا...... میرا مطلب ہے صرف آپ ان کے ساتھ ہیں۔''

''نہیں۔ آٹھ آدمی اور اس کے ساتھ ہیں لیکن وہ خود کو اس سے علیحدہ رکھتے ہیں اور ان کے درمیان اجنبیت رہتی ہے۔''

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں خاتون؟'' فوسٹر نے ہمدردی سے کہا۔

''میں تمہارا سہارا چاہتی ہوں۔ کل صبح ہم ایک جزیرے کے قریب سے گزریں گے۔ یہ علاقے میرے جانے پہچانے ہیں۔ یہ جزیرہ اسکائی کہلاتا ہے یہاں سے وہ جزیرہ چالیس میل دور ہے جہاں خزانہ موجود ہے۔ ہم وہاں سے موٹر کشتی حاصل کر لیں گے اور پھر ہیڈ کوارٹر پہنچ کر وہ خزانہ نکال لائیں گے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔''

''کیا جہاز اس جزیرے پر رکے گا؟'' فوسٹر نے پوچھا۔

''نہیں اس کے لیے ہمیں سمندر کا تھوڑا سا حصہ عبور کرنا ہوگا۔ ہم خاموشی سے ایک کشتی لے کر اتر جائیں گے اور صبح تک اس جزیرے پر پہنچ جائیں گے پھر اسی دن وہاں سے چل دیں گے۔ جزیرے پر پہنچ کر انتظامات میں کر لوں گی کیونکہ وہاں میرے شناسا موجود ہیں۔''

''ہوں!'' فوسٹر کچھ سوچنے لگا۔ بن حاتم اور زابیلا کے ساتھ لگے رہنا اس کے لیے سود مند نہیں تھا۔ اسے خود اپنے لیے بھی کچھ کرنا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ یہ لڑکی اسے پسند تھی۔ بہرحال چند منٹ کے بعد اس نے کہا۔ ''لیکن تمہیں علم ہے کہ میرے ساتھ دو ساتھی اور ہیں۔ میں ان کے مشورے کے بغیر قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

''ہم انہیں ان کا حصہ دے دیں گے۔ آپ انہیں تیار کر لیں۔''

''ٹھیک ہے میں ان سے بات کر کے دو گھنٹے بعد تمہیں بتاؤں گا۔ تم کسی طرح اسی ریلنگ تک پہنچ جانا۔'' فوسٹر نے کہا تو لڑکی نے گردن ہلا دی۔

☆☆☆

''ممکن ہے کوئی اور چکر ہو۔ لڑکی فراڈ کر رہی ہو۔'' بن حاتم نے تشویش ظاہر کی۔

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ میں نے بحری قزاق پیٹرس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔''

''اگر تمہیں اس پر اعتماد ہے تو ٹھیک ہے۔ یوں بھی میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس طرح میرا ذہن بٹ جائے۔'' بن حاتم نے کہا۔ زابیلا تو خزانے کے بارے میں سن کر پہلے ہی تیار ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی آمادگی کے بعد فوسٹر نے لڑکی سے کہہ دیا کہ وہ اور اس کے ساتھی اس کی مدد پر آمادہ ہیں۔ لڑکی نے بہت ممنونیت کا اظہار کیا۔ اس نے کہا اسے خزانے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ مرنا نہیں چاہتی اور فوسٹر نے اسے کافی تسلی دی۔

اور پھر فوسٹر اور بن حاتم تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔انہوں نے کشتی حاصل کرنے کا پروگرام مکمل کرلیا۔
وہ رات کا آخری پہر تھا۔ پورے جہاز میں سناٹا طاری تھا۔تمام کیبن تاریک تھے،صرف کپتان کے کیبن میں روشنی تھی۔رسیوں سے بندھی ہوئی کشتی سمندر میں اتر گئی اور پھر ایک ایک کرکے وہ چاروں کشتی پر پہنچ گئے۔ نیچے پہنچ کرانہوں نے رسے کشتی سے علیحدہ کردیے اور چاروں اسے جہاز سے دور کرنے کے لیے پتوار چلانے لگے۔آن کی آن میں کشتی بہت دور نکل گئی۔سب خاموش تھے اور اپنے کام میں مشغول تھے پھر اندھیرا چھٹنے لگا اور دور سے جزیرہ اسکائی نظر آنے لگا۔ جزیرے کو دیکھ کران کے ہاتھوں میں اور تیزی آگئی اور ڈیڑھ گھنٹے کی سخت جدوجہد کے بعد وہ اسکائی پہنچ گئے۔یہ سیدھے سادے لوگوں کا چھوٹا سا جزیرہ تھا۔یہاں کے لوگوں کی آمدنی بانس کی ٹوکریاں اور دوسری چیزوں سے تھیں۔ جزیرے کے آدھے حصے پر بانس اُگے ہوئے تھے۔لوگ ٹوکریاں، کرسیاں اور دوسری چیزیں بنا کر کشتیوں پر شہر لے جاتے اور انہیں فروخت کرکے ضروریات کی چیزیں لے آتے۔ یہاں انہیں ایک کشتی حاصل کرنے میں وقت نہیں ہوئی۔اس کے لیے کسی سرمائے کی ضرورت نہ پڑی صرف لوسی کے رسوخ کام آئے۔ یہاں اس کے کافی شناسا تھے اور اس سے خوفزدہ تھے،البتہ کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری ضروریات کی کچھ چیزیں اس سرمائے سے خریدی گئیں جو زابیلا کے پاس محفوظ تھا اور وقت ضائع کیے بغیر اسی شام کو انہوں نے اس غیر آباد جزیرے کے لیے سفر شروع کردیا۔کشتی کافی مضبوط تھی لیکن وہ موٹر کشتی نہیں تھی بلکہ بادبان سے چلتی تھی۔تاہم اس کے بادبان بے حد مضبوط تھے۔ انہوں نے ایک دلچسپ سفر شروع کردیا۔لوسی بڑی زندہ دل لڑکی تھی۔مصیبتوں میں پھنس کراس کی شوخیاں کم ہوگئی تھیں لیکن اب جبکہ وہ حالات کے بھنور سے نکل آئی تھی اس کی جولانی پھر واپس آگئی تھی۔ وہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے کی قائل تھی۔اس کے علاوہ وہ فوسٹر میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی اور فوسٹر......وہ تو باقاعدہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔
کشتی لہروں پر رواں دواں تھی اور اب بن حاتم بھی خوش نظر آنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنا خوف بھول گیا ہو۔سمندری سفر اور بادبانی کشتی چلانے کا تجربہ نہ تو فوسٹر کو تھا اور نہ بن حاتم کو لیکن لوسی اس کی ماہر تھی۔اس نے بتایا کہ اس نے باپ کے ساتھ بہت سی سمندری مہمات میں حصہ لیا ہے۔اس سلسلے میں اس نے بہت سے قصے بھی سنائے۔
دوسرے دن بارہ بجے کے بعد سے لوسی کچھ فکرمند ہوگئی۔اس نے کہا کہ اب تک غیر آباد جزیرہ نظر آجانا چاہیے تھا۔شاید وہ راستہ بھٹک گئے ہیں۔لوسی کی اس بات نے سب کو فکرمند کردیا لیکن لوسی نے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، وہ اس سمندر سے بہ خوبی واقف ہے کوئی نہ کوئی نشان ضرور نظر آجائے گا اور وہ جزیرہ تلاش کرلے گی۔ بہرحال ماحول میں پہلے جیسی بات نہ رہی گو سب ہی خود کو سنبھال رہے تھے لیکن بہرحال ایک الجھن ضرور تھی۔
لوسی ایک ماہر ملاح کی طرح کبھی کبھی مستول پر چڑھ کر سمندر کا جائزہ لینے لگتی۔ پتلون اور قمیص پہنے ہوئے وہ کوئی ملاح ہی معلوم ہوتی تھی۔اس وقت وہ مستول پر ہی چڑھی ہوئی تھی جب اس نے چیخ کر ایک علامت نظر آنے کی اطلاع دی اور پھر جلدی سے نیچے اتر آئی۔
”ایک علامت نظر آئی ہے لیکن بڑی خوف ناک علامت ہے۔“اس نے کہا۔
”کیا مطلب؟“فوسٹر نے پوچھا۔
”کاش ہمارے پاس دوربین ہوتی۔تاہم تم میری انگلی کی سمت میں دیکھو۔وہ سمندر میں ایک تکون سا ابھرا ہوا ہے۔یہ سیاہ رنگ کی بہت بڑی شارک ہے۔بڑی خطرناک مچھلی ہے، اس کی وجہ سے کئی حادثے ہوچکے ہیں۔ اکثر چھوٹی کشتیوں کا تعاقب کرتی ہے اور موقع ملتے ہی حملہ آور ہوجاتی ہے۔“
سیاہ مچھلی کا نام سنتے ہی بن حاتم کا چہرہ زرد پڑگیا۔اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا اور وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔”وہ......وہ اب بھی ہمارا تعاقب کررہی ہے؟“
”ہاں......لیکن دن کی روشنی میں وہ حملہ نہیں کرے گی،بہت پرانی مچھلی ہے۔میں کئی بار اسے دیکھ چکی ہوں۔اسے شکار کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن سب ناکام رہے بلکہ بحری قزاق تو اسے کوئی بدروح سمجھتے ہیں۔“لوسی بن حاتم کے خوف سے بے خبر رہ کر بتاتی رہی اور بن حاتم کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔زابیلا اور فوسٹر کو اس کی کیفیت معلوم تھی لیکن وہ لوسی کو اس بارے میں نہیں بتاسکتے تھے۔اس لیے خاموش رہے۔ شام جھکتی رہی اور وہ آنکھیں پھاڑتے رہے۔بن حاتم خوفزدہ نظروں سے اس تکون کو دیکھتا رہا جو برابر ان کے تعاقب میں تھا۔لوسی کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ وہ کبھی پُرامید نظر آنے لگتی اور کبھی اس کی آنکھوں سے پریشانی جھانکنے لگتی پھر ایک اور مصیبت آگئی۔ آسمان پر

ابر شام ہی سے چھا گیا تھا لیکن بادل زیادہ گہرے نہیں تھے پھر رات ہوتے ہی ہوا چلنے لگی۔ ان ہواؤں کا تجربہ کسی کو نہ تھا، لوسی کو بھی نہیں۔ انہیں تو اس وقت احساس ہوا جب طوفان نے انہیں آن گھیرا۔ ہوا کے زوردار جھکڑ چلنے لگے اور سمندر کی پُرشور لہریں ان کی کشتی کو ہچکولے دینے لگیں۔ مضبوط بادبان اتارے بھی نہیں تھے جس کی وجہ سے ہوا کا قہر نازل ہونے لگا اور کشتی الٹ پلٹ ہوگئی۔ بڑی خوفناک صورتِ حال ہوگئی تھی۔ زابیلا خوف سے چیخ رہی تھی، لوسی دہشت سے خاموش تھی پھر چرچر کی خوفناک آواز کے ساتھ بادبان پھٹ گئے اور ان کے چیتھڑے فضا میں جھولنے لگے۔

ان کے پھٹ جانے سے کشتی تو ہلکی ہوگئی لیکن لہروں نے اسے باقاعدہ فٹبال بنالیا تھا۔ ان خوفناک اور تیز و تند لہروں کے سامنے کچھ پیش نہ چل رہی تھی۔ ایک بار زابیلا اچھل کر سمندر میں گرتے گرتے بچی۔ اگر فوسٹر اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ گر جاتی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح سمندر میں گرنے سے محفوظ ہوگئی۔ طوفان کا زور بڑھتا ہی جارہا تھا اور اب تمام تدبیریں ناکام ہوگئی تھیں، وہ صرف حالات کے رحم و کرم پر تھے۔

بن حاتم کشتی کا ایک سرا مضبوطی سے پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید دہشت تھی اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ایک طرف گھور رہا تھا۔

"مضبوطی سے بیٹھے رہو بن حاتم۔ طوفان بہت جلد ختم ہوجائے گا۔" فوسٹر نے اسے تسلی دی۔

"وہ...... وہ آرہی ہے۔ دیکھو...... وہ آرہی ہے۔" بن حاتم نے فوسٹر سے پھٹے پھٹے لہجے میں کہا۔

"کون آرہی ہے...... کہاں ہے؟"

"وہ...... سیاہ مچھلی۔ وہ کشتی کے بالکل قریب ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" فوسٹر کو پہلی بار اس پر غصہ آگیا۔ "جب ہمت نہیں تھی تو کسی کو قتل کیوں کیا۔ گدھا کہیں کا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ہوش میں آؤ بن حاتم۔ اس وقت کوئی......" لیکن جملہ پورا ہونے سے پہلے ایک زبردست لہر نے کشتی کو اچھال دیا۔ فوسٹر ایک طرف جا پڑا لیکن بن حاتم کی چیخ بے حد بھیانک تھی۔ اس کے ہاتھوں سے سہارا چھوٹ گیا اور وہ اچھل کر سیدھا پانی کی طرف گیا۔ فوسٹر نے بے انتہا پھرتی سے کام لے کر اسے پکڑنے کی کوشش کی اور بن حاتم کی کلائی اس کے ہاتھ میں آگئی لیکن بن حاتم کا باقی جسم پانی میں جا پڑا تھا۔ فوسٹر نے انتہائی قوت صرف کر کے اسے کھینچنا چاہا لیکن نہ جانے کیوں بن حاتم کا وزن کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی دہشت ناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ تب...... پہلی بار فوسٹر نے سیاہ رنگ کی اس دیوقامت مچھلی کو دیکھا جس نے بن حاتم کی ایک پنڈلی منہ میں دبالی تھی۔

فوسٹر کا خون جمنے لگا۔ پہلی بار اسے بن حاتم کے خوف کا احساس ہوا لیکن وہ ہمت نہیں ہارا۔ وہ اپنے جسم کی انتہائی قوت صرف کر کے اسے کھینچنے لگا۔ لڑکیوں نے بھی مچھلی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی دہشت سے چیخ رہی تھیں لیکن ...... فوسٹر کی طاقت مچھلی کے سامنے کچھ نہ تھی۔ کشتی جھولنے لگی۔ فوسٹر بھی جان کی بازی لگانے کا تہیہ کر چکا تھا اور پھر وہ کامیاب ہو ہی گیا۔ ایک اور لہر آئی اور مچھلی کو سنبھلنے کے لیے بن حاتم کی ٹانگ چھوڑنا پڑی۔ فوسٹر نے پوری قوت سے اسے کھینچ لیا لیکن بن حاتم کا پورا پنجہ پنڈلی کی ہڈی سے ٹوٹ کر مچھلی کے منہ میں رہ گیا تھا اور بن حاتم کشتی میں بری طرح تڑپ رہا تھا۔

فوسٹر نے اسے کھینچ کر کشتی کے درمیان کرلیا۔ وہ بدحواس ہوگیا تھا۔ بن حاتم کے زخم کا اسے پورا پورا احساس تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ اپنے علاوہ بن حاتم کے تڑپتے ہوئے جسم کو بھی سنبھال رہا تھا۔ دوسری طرف زابیلا چیختے چیختے بے ہوش کر مستول سے جھول گئی تھی۔

☆☆☆

یہ بھیانک طوفان نہ جانے کب تک جاری رہا اور پھر سمندر پُرسکون ہوگیا۔ کشتی لہروں پر آگے بڑھنے لگی اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ انہوں نے خود کو ساحل کے قریب پایا۔ طوفان نے جہاں انہیں ایک زبردست صدمے سے دوچار کیا تھا، وہاں انہیں ان کی منزل پر بھی پہنچا دیا تھا۔ یہ وہی جزیرہ تھا جہاں لوسی انہیں لانا چاہتی تھی۔ پورے جزیرے پر ایک ہی عمارت تھی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی پراسرار اور بدنما عمارت جس کے ایک کمرے میں بن حاتم زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ وہ خزانہ بھول گئے تھے۔ سب کو بن حاتم کی زندگی کی فکر تھی۔ زابیلا کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی تھی لیکن سب بے بس تھے۔ بن حاتم کے زخم کو مندمل کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ فوسٹر نے درختوں کے پتے توڑ کر اس کے زخم پر رکھے اور اسے کس کر باندھ دیا تھا۔

تین دن تک بن حاتم زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہا اور پھر اس نے موت کو شکست دے دی۔

درختوں کے پتوں نے اس کے لیے مرہم کا کام دیا تھا اور وہ ٹھیک ہونے لگا۔ پندرھویں دن اس کا زخم مندمل ہوگیا۔ فوسٹر نے اس کے لیے درخت کی لکڑی کاٹ کر بیساکھی بنادی۔ بن حاتم سنجیدہ رہنے لگا تھا اور زابیلا ہر وقت اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔

بیسویں دن بن حاتم نے کہا کہ اب وہ ہر قیمت پر یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ ادھر لوسی کو یہ بھی خوف تھا کہ مارٹن اور اس کے ساتھی انہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ فوسٹر نے بھی آمادگی ظاہر کردی۔ تب لوسی نے اس عمارت کے ایک خفیہ تہ خانے سے وہ صندوق نکال لیا جس میں قیمتی ہیرے، زیورات اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ یہ خزانہ بہت قیمتی تھا لیکن بن حاتم جو کچھ گنوا بیٹھا تھا اس کا کوئی بدل نہ تھا۔ فوسٹر نے لوسی اور زابیلا کی مدد سے کشتی درست کی اور بائیسویں دن وہ وہاں سے چل پڑے۔ واپسی کا سفر بھی بے حد تکلیف دہ اور دراز تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ایک شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ زابیلا لنگڑے بن حاتم کو بھی سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ یہاں پہنچ کر لوسی نے بہ خوشی آدھا خزانہ بن حاتم کے حوالے کردیا۔ اس نے کہا وہ اپنے وطن جانا چاہتی ہے جبکہ زابیلا نے دوسری جگہ جانے کی خواہش کی تھی۔

پھر ایک دن فوسٹر اور لوسی ان دونوں سے رخصت ہوگئے۔ فوسٹر نے بن حاتم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا کہ اس دولت کے سہارے وہ تمام زندگی عیش سے گزار سکتا ہے۔ اسے تردد نہیں کرنا چاہیے۔

اس واقعے کے پورے تین سال بعد ایک دن پیرس کے ایک پرانے بازار میں فوسٹر، لوسی کے ساتھ اپنی قیمتی کار میں جارہا تھا کہ فوسٹر کی نگاہ ایک بھکاری پر پڑی۔ گدڑی میں لپٹا ہوا اندھا بھکاری بجلی کے کھمبے کے نزدیک بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ فوسٹر اس بھکاری کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کون سے نقوش ابھر گئے تھے۔ وہ جلدی سے کار روک کر نیچے اترا اور اس فقیر کے پاس پہنچ گیا۔

''بن حاتم۔'' اس کی لرزتی ہوئی آواز گونجی اور فقیر چونک کر آنکھیں پٹپٹانے لگا۔

''کون ہے؟'' اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''فوسٹر، تمہارا دوست۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بن حاتم؟'' فوسٹر نے دردناک آواز میں کہا۔

''فوسٹر......!'' فقیر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور پھر اس کے ہاتھ بیساکھی ٹٹولنے لگے۔ وہ بیساکھی کے سہارے مضطربانہ انداز میں کھڑا ہوگیا۔ ''فوسٹر......آہ میرے دوست! یہ تم ہو۔ آہ...... کاش میں تمہیں دیکھ سکتا۔'' وہ فوسٹر کے شانے کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔

''آؤ، میرے ساتھ آؤ۔'' فوسٹر اسے سہارا دیتے ہوئے بولا اور راہ چلتے لوگ حیرت سے اس امیر آدمی کو دیکھنے لگے جو ایک گندے فقیر کے ساتھ اس مہربانی سے پیش آرہا تھا۔ لوسی بھی بن حاتم کو پہچان کر ششدر رہ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بن حاتم فوسٹر کے ہوٹل کے عالیشان کمرے میں بیٹھا بھرائی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

''ہمیں خزانہ مل گیا فوسٹر لیکن میں اس پراسرار روح سے فرار کیسے حاصل کرتا جو مجھ پر مسلط تھی۔ ہم...... میں اور زابیلا ایک شہر میں فروکش ہوگئے لیکن کالی چھپکلی میرے تعاقب میں تھی۔ ہماری زندگی اس منحوس مصور کے شکنجے میں تھی۔ ایک رات، میں ایک ہوٹل میں زابیلا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ہوٹل میں آگ لگ گئی۔ خدا کی پناہ، وہ بہت شدید آگ تھی۔ سیکڑوں لوگ جل کر راکھ ہوگئے۔ میں لنگڑا تھا، بھاگ نہ سکا اور وفادار زابیلا نے جو میری بیوی بن چکی تھی، میری جان بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی۔ میری آنکھیں جل گئیں، زابیلا مرگئی اور میں بچ گیا لیکن اب میں لنگڑا ہونے کے ساتھ اندھا بھی تھا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہوکر میں اپنے گھر آیا اور میں نے تمام خزانہ اپنے لباس میں چھپالیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کوئی اسے نہ لے اڑے۔ میں اس خزانے کو استعمال بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ میرے اندھے پن سے فائدہ اٹھاتے اور اب وہ خزانہ میری گدڑی میں محفوظ ہے لیکن پیٹ بھرنا بھی ضروری تھا۔ ایک لنگڑا اور اندھا آدمی بھیک ہی مانگ سکتا ہے اور پھر اس طرح خزانہ بھی محفوظ رہتا ہے۔ کسے خبر ہوگی کہ اس اندھے فقیر کے پاس اتنا بڑا خزانہ ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے۔ اوہ شاید تم بھول گئے مگر میں نہیں بھولا۔ دیکھو...... دیکھو میں نے یہ تصویر آج تک سنبھال کر رکھی ہے۔ اس خزانے کی طرح...... جس میں مستقبل کے مصور نے ایک اندھے فقیر کو ہیروں کے ڈھیر پر بیٹھ کر بھیک مانگتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کی یہ تصویر بھی دوسری تصویروں کی طرح درست ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' بن حاتم نے کینوس کی تصویر کھول کر ان کے سامنے کردی......!

شاہ دولہ

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان چاہے خاندان میں رہنے کا عادی ہو یا خاندان سے ہٹ کر تنہا... اس کی انفرادی شخصیت، عمل، کردار اور منفرد سوچ ہی اس کی زندگی کا حاصل اور قیمتی سرمایہ ہے۔ جیسے کہ شاہ دولہ... جنہیں اپنا خاندان تو نصیب نہیں ہوا مگر جس حلقے میں بھی رہے اپنی جداگانہ شان کا مظہر ضرور رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کاتبِ تقدیر اپنے خاص بندوں کے مقدر کو ایک الگ ہی انداز میں تحریر کرتا ہے پھر ویسے ہی حالات کے دائرے میں قید کرکے اسی کے مطابق رستے بھی پیروں تلے بچھا دیتا ہے... اس طرح اس کے مقرب بندے اس کی رضا میں راضی رہ کر تمام آزمائشوں میں سرخ رو ہو جاتے ہیں۔

حالات کی سختیوں سے نبرد آزما پاک رب العزت کی خوشنودی پانے والے ولی کی روداد



جب انقلابِ زمانہ نے لودھیوں کو مغل فاتح بابر کے ہاتھوں تباہ و برباد کر دیا تو یہ پورے ملک میں منتشر ہو گئے اور ادھر ادھر آوارہ و سرگرداں پھرنے لگے۔ انہوں نے مختلف پیشے اختیار کیے۔ مغل دربار میں ان لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ لودھیوں کے آخری فرماں روا ابراہیم لودھی کی ماں نے بابر کو کھانے میں زہر دے کر ہمیشہ کے لیے لودھیوں کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔

لودھیوں کے چند خاندان پنجاب میں بھی بس گئے تھے۔ یہ لوگ سالوں گمنامی میں زندگیاں بسر کرتے رہے۔ اسی خاندان کے کچھ لوگوں نے عبادت وریاضت میں منہمک ہو کر اپنے زخمی دلوں پر اندمال کا مرہم رکھ لیا تھا۔ شاہ دولہ بھی ایک ایسے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ عزیزوں رشتے داروں نے نظریں پھیر لیں۔ گزر بسر کا کوئی سہارا نہ رہا۔ پاس پڑوس والوں نے کچھ دن تو ان کا ساتھ دیا اس کے بعد وہ بھی خاموش ہو گئے اور اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

کئی وقتوں کا فاقہ، سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسے میں ایک ادھیڑ عمر شخص نے شاہ دولہ سے بڑی محبت ظاہر کی۔ ان کے پاس آیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صاحبزادے! مجھے تمہارے حالِ زار پر بڑا رحم آتا ہے۔ تم نے کھانا کب سے نہیں کھایا؟"

شاہ دولہ نے معصومیت سے جواب دیا۔ "دو دن سے۔"

اس شخص نے اور زیادہ افسوس کیا۔ "صاحبزادے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں گا۔"

ننھے معصوم شاہ دولہ نے اپنے مہربان کی انگلی پکڑ لی اور اس کے گھر چلے گئے۔ اس نے نوکر کو حکم دیا۔ "دیکھو! بچہ بہت بھوکا ہے اس کے لیے گرما گرم مزے دار کھانا لاؤ۔"

حکم کی دیر تھی کہ گرما گرم مزے دار کھانا بچے کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس شخص نے نوالے بنا بنا کر شاہ دولہ کو کھلانا شروع کر دیے۔ کھانا کھلانے کے دوران اس شخص نے شاہ دولہ سے پوچھا۔ "بیٹے! ایک بات تو بتاؤ۔"

شاہ دولہ نے کہا۔ "پوچھیے۔"

اس شخص نے کہا۔ "تم کہتے ہو، میں دو دن کا بھوکا ہوں حالانکہ تمہارے چہرے سے دو دن کے فاقوں کی نقاہت ذرا بھی مترشح نہیں، آخر یہ کیا بات ہے؟"

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے فاقوں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا لیکن یہ بات درست ہے کہ میں نے دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

وہ شخص میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا اور اپنے ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاتا رہا۔ کھانا کھلانے کے بعد اس نے انہیں نرم وملائم بستر پر لٹا دیا اور کہا۔ "بیٹے سو جاؤ اور کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ اللہ جو کچھ کرے گا، اچھا ہی کرے گا۔"

شاہ دولہ اس بستر پر لیٹتے تو پلک جھپکتے ہی سو گئے۔ وہ شخص انہیں سلا کر کہیں غائب ہو گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو اس نے شاہ دولہ کو ایک خوش خبری سنائی، بولا۔ "صاحبزادے! میں نے تمہارا انتظام کر دیا۔ اب تم کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد دسترخوان پر کھانا لگوایا اور شاہ دولہ کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کھانے کے دوران کہا۔ "صاحبزادے! میں چاہوں تو تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھ سکتا ہوں لیکن میرے ساتھ رہنے میں ایک دشواری ہے، میری بیوی بچوں کے ساتھ ان دنوں میکے گئی ہوئی ہے، ہفتے عشرے میں واپس آجائے گی۔ میں اپنی بیوی کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ تمہیں اس گھر میں دیکھ کر چراغ پا ہو جائے گی اور میں اس کی یہ بات نہیں برداشت کر سکتا۔ اس لیے اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے تمہارا انتظام ایک دوسری جگہ کر دیا ہے۔ اس گھر میں صرف دو میاں بیوی رہتے ہیں۔ ان کی اولاد کوئی نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنے بیٹے کی طرح پالیں گے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تم بڑے مقدر والے ہو۔ ورنہ ایسا گھرانا کسے ملتا ہے؟"

شاہ دولہ کم گو تھے۔ اس شخص کی باتیں سنتے رہے اور اس کی شکل دیکھتے رہے۔ دونوں نے رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر چلے گئے۔

علی الصباح اس شخص نے شاہ دولہ کو بیدار کیا اور کہا۔ "صاحبزادے! تم منہ ہاتھ دھو لو، ناشتا تیار ہے۔"

شاہ دولہ نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کیا اور اس شخص کے ساتھ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ باہر گھوڑا گاڑی تیار کھڑی تھی جسے کوچوان چلا رہا تھا۔ دونوں اس پر سوار ہو گئے اور گھوڑا گاڑی چل پڑی۔

راستے میں اس شخص نے شاہ دولہ کو سمجھانا شروع کیا۔ "صاحبزادے! میری ایک بات تم ہمیشہ یاد رکھنا۔"

شاہ دولہ معصومیت سے اس شخص کی شکل دیکھنے لگے۔

وہ شخص کہہ رہا تھا۔ ”صاحبزادے! اگر تمہارے والدین زندہ ہوتے اور تم سے یہ کہتے کہ میرا جسم داب دو، تو تم کیا کرتے؟“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔“
اس شخص کے چہرے پر شگفتگی سی دوڑ گئی، بولا۔ ”شاباش! مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔“
کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”یہ گرمیوں کا موسم ہے اگر تمہارے والدین اس گرم موسم میں تم سے یہ کہتے کہ ذرا پنکھا تو جھل دو تو تم کیا کرتے؟“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک پنکھا جھلتا رہتا جب تک کہ وہ مجھے منع نہ کر دیتے۔“
اس شخص نے فرط خوشی میں کہا۔ ”بے شک، نیک اور صائب اولاد یہی کرتی ہے۔“
وہ شخص اسی قسم کی باتیں کرتا ہوا جب ایک حویلی کے سامنے پہنچا تو شاہ دولہ سے کہا۔ ”صاحبزادے! سفر تمام ہوا۔ اس حویلی میں ہمیں چلنا ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”اس حویلی میں رہنے والے میاں بیوی حد درجہ شریف ہیں۔ یہ تمہیں اپنی اولاد کی طرح اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں پھر جب تم ان کے ساتھ رہنے لگو تو ہمیشہ ان کا اپنے والدین کی طرح احترام کرنا اور ان کا ہر حکم بے چون و چرا مان لینا۔“
شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میری تو یہی کوشش رہے گی کہ میں ان کا ہر حکم مانوں، آگے کا حال اللہ جانے۔“
گاڑی پر سے اتر کر اس شخص نے حویلی کے دربان سے کہا۔ ”جاؤ، اندر کہہ دو کہ علی تقی آیا ہوا ہے۔“
دربان اندر گیا اور ذرا دیر بعد واپس آکر جواب دیا۔ ”لالہ جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
اس شخص کا چہرہ فرط خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے شاہ دولہ کی انگلی پکڑی اور حویلی میں داخل ہو گیا۔ دربان آگے آگے تھا اور یہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے۔ دربان انہیں ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں لالہ جی دھوتی باندھے اور جنیو کان میں پھنسائے ایک مورتی کے سامنے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہ دونوں مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔
کچھ دیر بعد لالہ ادھر سے فارغ ہو کر ان دونوں کے پاس آ گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے شاہ دولہ کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ”کہو علی تقی! کیا حال چال ہے؟ کام دھندا کیسا چل رہا ہے؟“
علی تقی نے جواب دیا۔ ”کام دھندا مندا ہے آج کل۔ باہر نہیں جانا نہیں ہوتا۔ تم جانو شہر کے اندر تو یہ دھندا صحیح طور پر چل نہیں سکتا۔ اتفاق سے کوئی کام ہو جائے تو ہو جائے۔ بس گھر میں پڑا مکھیاں مارتا رہتا ہوں۔“
لالہ جی نے شاہ دولہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو یہ ہے وہ لڑکا؟“
علی تقی نے جواب دیا۔ ”ہاں یہی ہے وہ لڑکا۔ بے چارہ یتیم بھی ہے اور یسیر بھی۔ بہت شریف ہے۔“
لالہ جی برابر آنکھے جا رہے تھے۔ پوچھا۔ ”پر ایک بات تو بتاؤ علی تقی! اس کے ماں باپ کیا واقعی مر گئے؟“
علی تقی نے جواب دیا۔ ”میں اس کے ماں باپ کی موت کا یقین دلانے کے لیے بڑی سے بڑی قسم بھی کھا سکتا ہوں۔“
لالہ جی نے پوچھا۔ ”اور اس کا کوئی اور رشتے دار؟“
علی تقی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اوپر اللہ اور نیچے آپ ہیں۔ بس ان دو کے سوا اس کی کسی سے بھی کوئی رشتے داری نہیں ہے۔“
لالہ جی نے دربان سے کہا۔ ”اس لڑکے کو للائن کے پاس لے جا، میں وہیں آ رہا ہوں۔“
شاہ دولہ نے علی تقی کی طرف دیکھا۔ اس نے شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے! اندر چلا جا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
شاہ دولہ نے بغیر کسی حیل وحجت کے دربان کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔
شاہ دولہ کے جاتے ہی لالہ جی نے علی تقی سے پوچھا۔ ”اس کا کیا نذر کر دوں؟“
علی تقی نے جواب دیا۔ ”صرف پانچ سو اشرفیاں۔“
لالہ جی نے کچھ اس طرح منہ بنایا گویا انہیں یہ جواب پسند نہیں آیا ہوا۔
علی تقی نے کہا۔ ”پھر لالہ جی! جلدی کیجیے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔“
علی تقی نے اپنا جملہ ختم کیا ہی تھا کہ لالہ جی بول پڑے۔ ”میں کہتا ہوں اگر تم یوں ہی امن وسکون سے رہنا چاہتے ہو تو......“
لیکن پوری بات نہیں ہو سکی۔ علی تقی نے کہا۔ ”لالہ جی! اب دیر نہ کیجیے۔ مجھے دے دلا کر رخصت کیجیے۔“
شاہ دولہ اندر سے واپس آ چکے تھے۔ لالہ جی نے دربان کو گھور اور نرمی سے کہا۔ ”میں نے کیا کہا تھا تم سے؟“

دربان نے جواب دیا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ اس کو للائن کے پاس لے جاؤں۔ یہ للائن کو دیکھتے ہی یہاں بھاگ آیا۔ اس سلسلے میں، میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں تو اسے جھڑک بھی سکتا ہوں مگر...... مگر......''

علی نقی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور حکم دیا۔ ''بیٹے! جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اندر للائن کے پاس جاؤ اور اس وقت تک وہیں رہو جب تک تمہیں بلایا نہ جائے۔''

شاہ دولہ پھر اندر چلے گئے تو علی نقی نے لالہ جی سے کہا۔ ''لالہ جی! اب دیر نہ کیجیے۔ پانچ سو اشرفیاں مرحمت فرمایئے۔''

لالہ جی نے منہ بنا کر کہا۔ ''اس ذرا سے بچے کی پانچ سو اشرفیاں۔ آخر اس بات کا جواز کیا ہے؟''

علی نقی نے جواب دیا۔ ''اس کا جواز یہ ہے کہ شاہ دولہ کا تعلق بہلول لودھی کے خاندان سے ہے۔ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، آئندہ تاریخوں میں شاہ دولہ کے ساتھ آپ کا نام بھی آجائے گا۔''

لالہ جی نے علی نقی کے آگے دو سو اشرفیاں رکھ دیں اور کہا۔ ''میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اگر لینا ہو تو لے لو۔ ورنہ لڑکے کا ہاتھ پکڑو اور اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

علی نقی نے دو سو اشرفیاں اٹھالیں اور پژمردگی سے کہا۔ ''لالہ جی! آج کل کاروبار مندا ہے اس لیے دو سو اشرفیاں لے رہا ہوں ورنہ میں انہیں ہاتھ بھی نہ لگاتا۔'' یہ کہتے ہوئے علی نقی کھڑا ہوگیا۔

لالہ جی نے کہا۔ ''اب اپنا وقت نہ برباد کرو۔ جاؤ، ورنہ وہ لڑکا دوبارہ آجائے گا۔''

علی نقی فوراً ہی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہ دولہ پھر آگئے اور پوچھا۔ ''وہ میرا مہربان دوست کہاں چلا گیا؟''

لالہ جی نے معنی خیز نظروں سے شاہ دولہ کو دیکھ کر پوچھا۔ ''میں کون ہوں؟ کچھ جانتے ہو؟''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، جانتا ہوں...... آپ ایک مہربان شخص ہیں۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے، آپ مجھ کو پالنا چاہتے ہیں۔''

لالہ جی نے کہا۔ ''نہیں صاحبزادے! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہیں علی نقی سے خریدا ہے وہ بردہ فروش ہے اور اس کا یہی کاروبار ہے۔ وہ اکثر سفر میں رہتا ہے اور جن بچوں کو ادھر ادھر سے اٹھا کر لاتا ہے، یہاں کے متمول لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔''

شاہ دولہ کی نظریں مورتی پر لگی ہوئی تھیں۔ بچپنے کے باوجود انہیں یہ احساس تھا کہ بت پرستی بہت بری چیز ہے، پوچھا۔ ''آپ لوگ ہندو ہیں نا؟''

لالہ جی نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہم ہندو ہیں۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''مجھ سے بت پرستی نہ کرانا۔ میں بتوں کی کوئی خدمت نہیں کروں گا۔''

لالہ جی نے ہنس کر کہا۔ ''تو مسلمان ہے نا۔ میں جانتا ہوں، میں تجھ سے اپنے مندر کا کوئی کام بھی نہیں لوں گا۔''

للائن نے بھی لالہ جی سے شاہ دولہ کی بڑی تعریف کی۔

شاہ دولہ کو اس حویلی میں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ بات محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ ہندو دوانہ چھوت چھات کے پیشِ نظر انہیں کھانا اچھوتوں کی طرح پیش کیا گیا تھا۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد لالہ جی نے شاہ دولہ کو آواز دی۔ ''شاہ دولہ! ذرا میرے پاس تو آنا۔''

شاہ دولہ جب اس کے پاس پہنچے تو وہ ٹانگیں پسار چکا تھا، بولا۔ ''ذرا میرے پاؤں تو دابنا۔''

شاہ دولہ نے لالہ جی کے پاؤں دابنا شروع کردیے۔ وہ بڑی دیر تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ لالہ جی کو نیند آگئی اور وہ خراٹے لینے لگے۔

☆☆☆

لالہ اور للائن دونوں ہی شاہ دولہ سے بڑی خدمتیں لیتے۔ دوپہر کو کمرا بند کرکے سوجاتے اور شاہ دولہ ان کے لیے چھت کا پنکھا کھینچتے رہتے اور یہ کام کئی کئی گھنٹے جاری رہتا۔ شام سے ذرا پہلے پورے گھر کی صفائی کرنا پڑتی۔ مغرب کے بعد انہیں کھانا دیا جاتا۔ ابھی یہ کھانے سے فارغ بھی نہ ہوتے کہ لالہ جی کے پاؤں میں درد شروع ہوجاتا اور یہ اسے دابنا شروع کردیتے۔

رات کو جب یہ سو رہے ہوتے، لالہ جی کو ان کی ضرورت پیش آجاتی تو بے دریغ جگا دیتے۔

لالائن اپنی ساڑیاں شاہ دولہ کے حوالے کر دیتیں کہ انہیں دھولا۔ یہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ساڑیاں دھونے لگتے اور کوشش کر کے صاف ستھری دھوتے۔ دونوں میاں بیوی شاہ دولہ کے بے عذر کام سے بہت خوش تھے۔ وہ اکثر آپس میں باتیں کرتے تو موضوعِ گفتگو شاہ دولہ ہی ہوتے۔

شب و روز گزرتے رہے، یہاں تک کہ سالوں بعد جب شاہ دولہ سنِ شعور کو پہنچے تو ان میں ایک تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ وہ لالہ اور لالائن کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنی کوٹھری میں چلے جاتے اور اللہ اللہ کیا کرتے۔ سالوں ساتھ رہنے کے دوران دونوں میاں بیوی نے شاہ دولہ میں یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ ان کی اکثر باتیں سچ ہو جایا کرتی تھیں۔ مثلاً کسی دن لالائن سے کہہ دیا کہ...... ''مالکن! آج آپ کی بہن آرہی ہیں ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر لیجیے۔''

لالائن پوچھتیں۔ ''تجھے یہ خبر کس نے دی؟''

شاہ دولہ جواب دیتے۔ ''میرے دل نے۔ اندر معلوم نہیں کون بیٹھا مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ لالائن سے کہہ دو تمہاری بہن آرہی ہے، اس کے کھانے پینے کا انتظام کر لو۔ بس اندر کی یہ بات میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔''

اور سہ پہر تک یہ بات حیرت انگیز طور پر صحیح ہو جاتی۔ لالائن کی بہن آجاتیں اور لالائن کو سکتہ ہو جاتا۔

جب اس قسم کے کئی واقعات رونما ہوئے تو شاہ دولہ کا احترام کیا جانے لگا۔ لالہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ شاہ دولہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ جب لالہ نے شاہ دولہ کی دیانت محنت اور صبر و استقلال پر غور کیا تو انہیں بالکل یقین ہو گیا کہ شاہ دولہ کے جسم میں کسی رشی منی کی روح ہے۔ لالہ نے ایک دن شاہ دولہ کا امتحان لیا۔ لالہ کا ایک بھائی اپنی نوعمری سے مفقود الخبر تھا۔ سوچا کہ اپنے اس بھائی کی بابت شاہ دولہ سے معلوم کیا جائے۔ لالہ جی نے شاہ دولہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور کہا۔ ''شاہ دولہ! یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کو کافی عرصے تک نہیں پہچان سکا۔ میں نے آپ کو بہت پریشان کیا اور بہت زیادہ محنت کرائی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ علی تقی کا کیا انجام ہوا؟ وہی علی تقی جس نے آپ کو میرے ہاتھ بیچ دیا تھا۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''میں ہمیشہ اپنی قسمت پر شاکر رہا ہوں۔ خدا کے معاملات میں دخل دینا میرا کام نہیں۔ اس نے میرے ذمے یہ کام سونپ دیا تھا کہ آپ کی خدمت کروں، چنانچہ میں نے یہ کام پوری دیانت داری اور محنت سے انجام دیا اور میں یہ بھی نہیں جاننا چاہتا کہ علی تقی کا کیا انجام ہوا؟ ہاں، کوئی میرے دل میں بیٹھا یہ کہہ رہا ہے کہ علی تقی کے سینے میں برچھا اتار دیا گیا۔''

لالہ جی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار شاہ دولہ کے پاؤں چھو لیے۔ شاہ دولہ نے اپنے دونوں پاؤں کھینچ لیے، لالہ نے کہا۔ ''میاں جی! یہ برچھے والی بات میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا مگر یہ بھی آپ کو معلوم ہو گئی۔ علی تقی نے کسی طرح جوڑ توڑ کر کے ایک مغل شہزادے کی ملازمت کر لی تھی۔ ابھی کل ہی ایک شخص نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ شہزادہ کسی بات پر علی تقی سے ناراض ہو گیا اور اس کے سینے میں برچھا اتار دیا گیا۔''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''اللہ کا نظام بڑا پیچیدہ ہے اور اسے انسان نہیں سمجھ سکتا۔''

لالہ جی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کیا۔ ''میاں جی! میرا ایک بھائی بچپن سے غائب ہے، ہم نے اسے بہت زیادہ تلاش کیا مگر اس کا آج تک کوئی پتا نہیں چل سکا۔ کیا آپ اس کی بابت مجھے کچھ بتائیں گے؟''

شاہ دولہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سکوت اختیار کیا پھر بولے۔

''لالہ جی! کل دوپہر تک آپ کے بھائی آجائیں گے۔''

لالہ جی نے فرطِ خوشی میں کہا۔ ''کیا سچ؟ مگر اس کا تو کہیں پتا تک نہیں۔ پھر وہ کیسے آجائے گا؟''

لالہ جی شک و شبہے میں پڑ گئے۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کا ذکر گھر میں لالائن سے کیا۔ انہوں نے شاہ دولہ کی تائید کر دی، بولیں۔ ''اگر میاں جی نے یہ بات کہہ دی ہے تو ضرور درست نکلے گی۔''

شاہ دولہ رات رات بھر عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ دوسرے دن سہ پہر کو وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے کہ لالہ جی پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے آئے اور کہا۔ ''میاں جی! میرا بھائی آگیا...... میاں جی! میرا بھائی آگیا۔''

شاہ دولہ نے ہنکاری بھری جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ تلاوتِ کلام پاک میں مشغول ہیں اس لیے بات نہیں کریں گے۔ کچھ دیر بعد جب وہ تلاوت کر چکے تو لالہ کے پاس گئے اور پوچھا۔ ''لالہ جی! آپ کے بھائی کہاں ہیں؟''

لالہ جی نے انہیں اپنے بھائی سے ملایا اور ان کی بابت اپنے بھائی کو بتایا۔ ''میاں جی نے تیری بابت کل ہی مجھے یہ

بتا دیا تھا کہ آج تو سہ پہر تک آ جائے گا، چنانچہ تو آ گیا۔"

رات کو عشا کی نماز کے بعد شاہ دولہ اسمائے ربانی کا ورد کرنے لگے۔ یہ سلسلہ نصف رات تک جاری رہا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد انہیں کچھ سہو ہوا اور وضو کرنے کے لیے اٹھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے چند سائے محسوس کیے۔ جب ان سایوں پر نظر پڑی تو انہیں فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ لالہ جی، للائن اور لالہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ آپ نے پوچھا۔ "آپ لوگ کب آئے؟ خیر تو ہے؟"

لالہ جی نے عرض کیا۔ "ہم تینوں بڑی دیر سے یہاں کھڑے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ آواز دے کر آپ کے انہماک کا سلسلہ توڑ دیں۔ اب جب آپ خود ہی اٹھے ہیں تو آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

آپ مصلے پر دوبارہ بیٹھ گئے اور ان تینوں کو چارپائی پر بٹھانا چاہا مگر ان تینوں نے آپ کے سامنے اونچی جگہ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ "میاں جی! جب تک ہمیں آپ کے مقام اور مرتبے کا علم نہیں تھا، بڑی گستاخیاں کرتے رہے مگر اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم آپ کے پاس زمین پر تو بیٹھ جائیں گے مگر پلنگ پر یا اونچی جگہ پر ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "جیسی آپ صاحبان کی مرضی۔ جہاں مناسب سمجھیں بیٹھ جائیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ تینوں فرش پر آپ کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

لالہ جی نے نظریں جھکا لیں اور کہنا شروع کر دیا۔ "میاں جی! اب ہم آپ کو اس طرح اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے جس طرح آپ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ ہماری طرف سے آپ آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اگر آپ اس حویلی میں رہیں گے تو یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی اور ہم آپ کے لیے ایک اچھی سی جگہ بنا دیں گے اور اگر آپ کو اس حویلی میں رہنا پسند نہ ہو تو جہاں چاہیں چلے جائیں۔"

للائن نے رقت سے عرض کیا۔ "آپ جہاں بھی جائیں، آپ جہاں بھی رہیں، مجھے نہیں بھولیں گے۔ یا تو آپ خود تشریف لایا کریں گے یا پھر میں درشن کے لیے حاضری دیا کروں گی کیونکہ اب آپ کا ساتھ مرنے جینے کا ساتھ ہے، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

لالہ کے چھوٹے بھائی نے کہا۔ "اور میاں جی! میں نے تو ابھی آپ سے کوئی فیض ہی نہیں پایا۔ درشن کے لیے بھی حاضری دیا کروں گا۔"

آپ نے لالہ سے کہا۔ "لالہ جی! اگر آپ واقعی مجھ کو آزاد کر رہے ہیں تو میں اس حویلی میں نہیں رہوں گا کیونکہ میں کسی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا پھروں گا۔ میں کسی ایک جگہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

لالہ جی نے جواب دیا۔ "میں آپ کے جانے سے خوش تو نہیں ہوں گا لیکن جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ اب آپ آزاد ہیں، آپ فی الواقع آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں اور جہاں رہنا چاہیں رہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "تب پھر میں یہ رات تو اسی حویلی میں گزاروں گا، صبح چلا جاؤں گا۔"

تینوں بہت اداس اور سوگوار تھے۔ وہ آپ کی اجازت سے دیر تک آپ کی صحبت میں رہے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح آپ نے لالہ سے رخصت چاہی تو تینوں نے رونا شروع کر دیا۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

آپ نے حویلی سے کوئی سامان بھی نہیں لیا۔ حالانکہ تینوں نے اس پر بڑا زور دیا اور خوشامدیں کرتے رہے کہ بستر، لوٹا اور اسی قسم کا دوسرا ضروری سامان ضرور لیتے جائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا، کہا۔ "میں اس حویلی میں خالی ہاتھ آیا تھا اس لیے خالی ہاتھ ہی یہاں سے جاؤں گا۔"

آپ اس حویلی سے نکل کر سیالکوٹ کے مشہور بزرگ شاہ سیدا کی خدمت میں پہنچے، انہیں سرمست سیالکوٹی بھی کہا جاتا تھا۔

شاہ سیدا نے شاہ دولہ کو دیکھا اور سوال کیا۔ "کس لیے آئے ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پیاسا کنویں کے پاس کیوں جاتا ہے؟"

پوچھا۔ "کیا نام ہے؟"

جواب دیا۔ "دولہ۔"

شاہ سیدا نے فرمایا۔ "یہاں تو ایک دولہ پہلے ہی سے موجود ہے۔" پھر آواز دی۔ "دولہ! ادھر تو آنا۔"

آپ کی آواز سن کر ایک شخص آپ کے پاس آن کھڑا ہوا، بولا۔ "جی پیر و مرشد! ارشاد؟"

شاہ سیدا نے شاہ دولہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ نوجوان بھی کچھ حاصل کرنے آیا ہے۔ تیرا ہم نام بھی ہے۔“

شاہ سیدا کے خدمت گار دولہ نے عرض کیا۔ ”پیرومرشد! میں تو ایک عرصے سے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے قدموں میں پڑا ہوں، ویسے سمندر زمانے کی پیاس بجھا سکتا ہے۔“

شاہ سیدا نے شاہ دولہ سے کہا۔ ”تو بھی اپنے ہم نام دولہ کے ساتھ رہ میرے قریب ہی۔ اللہ بھلا کرے گا۔“

شاہ دولہ بھی اپنے پیرومرشد سے بیعت ہو کر ان کے قدموں میں رہنے لگے۔

وہاں مریدوں اور ارادت مندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہزاروں کا ہجوم رہتا تھا۔ شاہ سیدا کی محویت میں رہتے تھے۔ شاہ دولہ نے محسوس کیا کہ ان کے پیرومرشد کی خود ان پر کوئی خاص نظر نہیں ہے۔ ہاں اپنے ہم نام دولہ پر خاص توجہ دیتے تھے لیکن اس احساس سے وہ دل برداشتہ بھی نہ ہوئے۔ وہ کوشش یہی کرتے کہ پیرومرشد کی خدمت کریں اور جب بھی وہ آواز دیں، خود جائیں اور ان کا حکم بجالائیں۔

شاہ سیدا اپنی عمر کے آخری دور میں تھے۔ ان کی باتوں میں جدائی کی بو محسوس ہوتی تھی۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ ایک دن تخلیہ میں شاہ دولہ نے اپنے پیرومرشد سے عرض کیا۔ ”پیرومرشد! میں ہنوز پیاسا کا پیاسا ہوں۔“

شاہ سیدا نے جواب دیا۔ ”صبر کر صبر! جو جس کے حصے کا ہے مل جائے گا۔“

شاہ دولہ نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ”حضرت! یہ کچھ خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے۔“

شاہ سیدا نے جواب دیا۔ ”وہ خالی اسی لیے ہے کہ بھر اجائے۔ اس کی فکر نہ کر۔“

کئی دن بعد شاہ سیدا کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ آپ کے مرید اور ارادت مند ہر وقت آپ کے آس پاس موجود رہتے لیکن ایک رات شاہ دولہ کے علاوہ شاہ سیدا کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

نصف شب کو آپ نے آواز دی۔ ”دولہ! ذرا آنا تو۔“

شاہ دولہ آواز سن کر اندر چلے گئے۔ وہاں السی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ شاہ سیدا نے چراغ کی روشنی میں شاہ دولہ کو دیکھا تو کہا۔ ”وہ اپنا دولہ کہاں چلا گیا؟ میں نے اسے آواز دی تھی، تجھے نہیں۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ دولہ تو یہاں موجود نہیں ہے، کچھ توقف فرمائیں شاید آجائے۔“

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”تب پھر تم جاؤ، جب وہ آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دو۔“

شاہ دولہ باہر چلے آئے۔

کافی دیر بعد شاہ سیدا نے پھر آواز دی۔ ”دولہ! ذرا آنا تو۔“

اس بار پھر شاہ دولہ اندر داخل ہوئے اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! میں حاضر ہوں، کوئی خدمت ہو تو بے دریغ فرمادیں۔“

شاہ سیدا نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”کیا میں نے تجھ سے تھوڑی دیر پہلے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنا دولہ درکار ہے۔ پھر یہ تو بار بار کیوں آجاتا ہے؟“

شاہ دولہ نے کہا۔ ”پیرومرشد! یہاں میرے سوا کوئی بھی نہیں، میں باہر موجود ہوں، آپ جب بھی آواز دیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔“

رات کے پچھلے پہر شاہ سیدا نے پھر آواز دی۔ ”دولہ! کہاں ہو؟“

شاہ دولہ ایک بار پھر اندر داخل ہوئے اور عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کا دولہ تو موجود نہیں، میں حاضر ہوں۔“

شاہ سیدا مسکرائے، فرمایا۔ ”اچھا دولہ! تو ہی آجا۔“

شاہ دولہ اپنے پیرومرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہوگئے۔

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”دولہ! یہ میرا آخری وقت ہے۔ اب میں جارہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے، کسی کو بخش دوں۔“

شاہ دولہ نے نظریں جھکالیں۔

شاہ سیدا نے فرمایا۔ ”مجھ سے نظریں ملا، میری طرف دیکھ۔“

شاہ دولہ نے اپنے پیرومرشد سے آنکھیں جو ملائیں تو کایا ہی پلٹ گئی۔ پورے وجود میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور دل پگھلنے لگا۔ شاہ دولہ جذب و کیف کا شکار ہوگئے۔

پیرومرشد وفات پا گئے۔ شاہ دولہ ان کی تجہیز وتکفین کے بعد وہاں نہیں رکے اور جنگل کی راہ لی۔ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن جنگل میں گزار دیتے۔ جو کہتے ہو جاتا۔ لوگوں میں ہر طرف آپ ہی کا چرچا ہونے لگا۔

ایک عرصے بعد جب طبیعت ٹھہری تو سیالکوٹ کے بجائے گجرات کو اپنا مستقر بنا لیا۔ مستی کم ہوئی تو خانقاہ کی تعمیر بھی ہوگئی۔ پھر بھی کبھی کبھی مستی میں معلوم نہیں کیا کچھ کر گزرتے۔

خانقاہ میں عورتوں کا ہجوم بھی ہونے لگا۔ ان کی خواہشیں بھی عجیب وغریب ہوتی تھیں، کوئی محبوب کی تلاش میں آتی تو کوئی پردیس گئے ہوئے شوہر کی خیریت اور واپسی کی طالب ہوتی۔ کسی کو شوہر کی بے روزگاری کا مداوا درکار ہوتا تھا لیکن ان میں اکثریت ان عورتوں کی ہوتی جنہیں اولاد درکار ہوتی۔ شاہ دولہ کی زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ جو فرماتے ہو جاتا۔

ایک خاتون آئیں۔ ان کا تعلق کسی ریاست سے تھا۔ جب شاہ دولہ کے آستانے پر حاضری دی تو اس وقت بھی ریاست کے حشم خدم ان کے ساتھ تھے۔ آپ کو اندر اطلاع دی گئی کہ ایک ریاست کی بہو شرفِ باریابی چاہتی ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ ”انہیں اندر میرے پاس بھیج دیا جائے۔“

ریاست کی بہو کو شاہ دولہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ آپ نے ان خاتون کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”بڑی بہو! خیریت تو ہے؟ کیسے زحمت فرمائی؟“

بہو نے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! کیا عرض کروں؟ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے مگر وہ دولت جسے آنکھ کا نور کہا جاتا ہے، اس سے میں ابھی تک محروم ہوں۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”میں تیرا علاج کر تو سکتا ہوں مگر اس میں ایک ایسی قباحت ہے کہ تو راضی نہ ہو اور میں اس کے بغیر تیرے لیے دعا بھی نہیں کروں گا۔“

عورت نے کہا۔ ”آپ کسی قباحت کی بات نہ کیجیے۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔“

شاہ دولہ نے کہا۔ ”میں تیرے لیے اولاد کی دعا کروں گا مگر تجھے اپنی پہلی اولاد خانقاہ کی نذر کرنا ہوگی۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔ مجھے آپ کی بات منظور ہے۔ آپ کی بات سے تو ایسا لگتا ہے کہ خدا مجھے شاید کئی اولادیں دے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا تجھے کئی اولادیں دے گا لیکن تیری پہلی اولاد میری خانقاہ کی ہوگی۔“

عورت نے کہا۔ ”مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ میرے حق میں دعا کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب تو جا سکتی ہے مگر اپنی بات یاد رکھنا۔“

عورت چلی گئی۔ جب وہ اپنے قصر میں داخل ہوئی تو اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ اس نے سوچا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ پہلی اولاد خانقاہ کی نذر کر دی جائے۔ اگر اولاد ہی ایک ہوئی، بعد میں نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ سوچتے سوچتے پریشان ہوگئی۔ پھر اپنے آپ پر ہنسنے لگی کہ ابھی اولاد کا تو کہیں پتا نشان نہیں اور وسوسے اتنے زیادہ آنے لگے۔ آخر اس نے اس مسئلے کو اس وقت پر اٹھا رکھا جب تک کوئی بیٹا یا بیٹی پیدا ہو جائے۔

خدا نے شاہ دولہ کی زبان میں برکت دی تھی۔ خاتون کو حمل ہو گیا اور دس ماہ بعد بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ بچہ خاصا صحت مند تھا۔ مگر اس کا سر نسبتاً چھوٹا تھا۔ عورت کو اپنا بچہ بہت پیارا لگا۔ اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے خانقاہ کی نذر نہ بھی کیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے اپنے ملازمین کو ہدایت دی کہ اس بچے کی پیدائش کا کہیں ذکر نہ کیا جائے۔ کیونکہ عورت کو معلوم تھا کہ اس کے چاکروں میں کئی ایسے تھے جو شاہ دولہ کی خانقاہ میں حاضریاں دیا کرتے تھے۔ عورت نے انہیں دھمکی دی کہ اگر اس بچے کا خانقاہ میں ذکر کیا گیا تو وہ ذکر کرنے والے کو تباہ و برباد کر دے گی۔

اس بچے کی پیدائش کے کئی دن بعد عورت نے خواب میں دیکھا کہ شاہ دولہ اس سے کہہ رہے ہیں۔ ”عورت! بدعہدی بڑا گناہ ہے، اپنا وعدہ پورا کر۔“

عورت نے کہا۔ ”حضرت! مجھ پر رحم کیجیے۔ اس بچے کو مجھ سے نہ لیجیے۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”بات لینے دینے کی نہیں ہے، وعدے کی ہے۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا پہلا بچہ میری خانقاہ کی نذر کر دے گی۔ اب اگر تو اس سے منحرف ہو رہی ہے تو ہو جا۔ تیری اطلاع کے لیے میں یہ بتائے دے رہا ہوں کہ تیرا یہ لڑکا اپنے چھوٹے سر کی وجہ سے مسلوب العقل ہے اور یہ تیرے کسی کام کا نہیں۔“

عورت بیدار ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے سر کو بہت غور سے دیکھا، یہ بہت چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے خاص اطبا، کو بلوا کر بچہ ان کے سامنے کر دیا اور پوچھا۔ ''آپ لوگ بتائیں کہ یہ بچہ اپنے چھوٹے سر کی وجہ سے کیسا ہوگا؟''

اطباء نے خوب اچھی طرح مشاہدہ کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''یہ بچہ مسلوب العقل ہوگا، بالکل جانوروں کی طرح۔''

عورت کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔ وہ کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتی رہی۔ آخر ایک دن یہ فیصلہ کرلیا کہ اس بچے کو خانقاہ کی نذر کر دیا جائے۔ یہ اسی تزک واحتشام سے خانقاہ گئی اور شاہ دولہ کو مطلع کیا۔ ''میں حاضر ہوں اور باریابی کی خواستگار ہوں۔''

شاہ دولہ نے اسے بلالیا۔ بچہ عورت کی گود میں تھا۔ وہ شاہ دولہ کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

شاہ دولہ نے کہا۔ ''تو تم آگئیں؟ حالانکہ شیطان نے تمہیں وسوسے میں ڈال دیا تھا۔''

عورت نے وہ بچہ آپ کی طرف بڑھا دیا۔ ''بچہ حاضر ہے مگر ایسا بچہ کیوں پیدا ہوا؟''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''عورت! جب میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا تمہیں اور بچے بھی دے گا تو تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی! بچے کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔''

شاہ دولہ نے تسلی دی۔ ''عورت! میں کہہ جو رہا ہوں، خدا تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔''

عورت نے پوچھا۔ ''بچے کو میں پال پوس کر خانقاہ کے حوالے کردوں یا اسی وقت؟''

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ''ہمارے لیے دونوں ہی صورتیں قابلِ قبول ہیں۔''

عورت اس بچے کو اپنے ساتھ واپس لے گئی۔ اسے خدا نے تین سال میں تین اولادِ نرینہ عطا کیں۔ وہ خوشی خوشی اپنا پہلا بچہ خانقاہ کی نذر کر گئی۔

اس کے بعد یہ خبر مشہور ہوگئی اور شاہ دولہ کی خدمت میں ایسی عورتوں کی بھیڑ رہنے لگی جو اولاد کی خواہش مند ہوتی تھیں۔ آپ اولاد کی خواہش مند ہر عورت سے یہی کہتے اور جہاں بھی آپ کی دعا سے بچہ پیدا ہوا، اس کی ہیئت یہی ہوتی۔ سر چھوٹا، زبان گنگ، مسلوب الحواس، مجذوب۔ یہ بچے موش شاہ دولہ یعنی شاہ دولہ کے چوہے کہے جانے لگے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

☆☆☆

شاہ دولہ کے عقیدت مندوں میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی تھے، عوام بھی اور خواص بھی۔ ان میں راجا چرسیہ ملک راجوڑ بھی شامل تھا۔ یہ شاہ دولہ کی خدمت میں حاضری دیتا تو احتراماً آپ کے قدموں میں بیٹھا رہتا۔ آپ بھی راجا کا بڑا خیال رکھتے۔

راجا حسبِ دستور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

شاہ دولہ خلافِ عادت راجا کو دیکھتے رہے۔ راجا پریشان ہوگیا، پوچھا۔ ''حضرت! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے جو آپ مجھ کو اس طرح دیکھ رہے ہیں؟''

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ''راجا! تو میرے پاس کتنے عرصے سے آرہا ہے؟''

راجا نے جواب دیا۔ ''کافی عرصے سے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے تجھ سے ایک بار بھی تیرے خاندان اور آبائی رسم ورواج کے بارے میں کوئی سوال کیا کبھی؟''

راجا نے جواب دیا۔ ''ایک بار بھی نہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تیرے خاندان میں نومولود بچیوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے؟''

راجا اس سوال کا جواب دینے میں متذبذب ہوا۔ آپ نے اسے تسلی دی، فرمایا۔ ''گھبرا نہیں، میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دے دے۔ بقیہ بات میں خود بتاؤں گا۔''

راجا نے جواب دیا۔ ''میاں جی! میرے ہاں صدیوں سے یہ طریقہ رائج چلا آرہا ہے کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اسے اسی وقت ہلاک کر دیا جاتا ہے۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''کیا تو بھی اس رسم پر عمل کرتا ہے؟''

راجا نے جواب دیا۔ ”میاں جی! میں باپ دادا کی رائج کردہ رسم کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟ کس طرح ترک کر سکتا ہوں؟ اگر میں اس پر نہیں چلوں گا تو خاندان کے لوگ مجھے خارج کر دیں گے۔“

آپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے، گویا اپنے حال میں گم ہیں اور کسی کی کچھ سن ہی نہیں رہے، پھر پوچھا۔ ”اچھا راجا! خدا تیرا بھلا کرے، ایک بات اور بتا۔“

راجا نے کہا۔ ”ارشاد، پوچھیے۔“

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ”تیرے گھر میں کچھ ہونے والا ہے کیا؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، عنقریب بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اگر بچی پیدا ہوئی تو کیا کرے گا؟“

راجا نے جواب دیا۔ ”وہی جواب تک ہوتا رہا ہے۔ میں نے عرض جو کیا کہ میں اپنے باپ دادا کی رسم کو کس طرح بدل سکتا ہوں؟“

آپ نے ذرا سختی سے فرمایا۔ ”راجا! میری پیش گوئی سن لے۔ اس بار تیرے گھر میں لڑکی ہی پیدا ہوگی اور خبردار جو تم نے اسے ہلاک کیا۔ اس کو مارنا مت۔ اس کی پرورش کرنا۔“

راجا چپ ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے اس کی ذہنی الجھن ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے عرض کیا۔ ”لیکن میں نے آپ کو بتایا نہیں کیا کہ اگر میں لڑکی کو ہلاک نہیں کروں گا تو خاندان کے لوگ مجھے پریوار سے نکال باہر کریں گے۔“

شاہ دولہ نے بڑے تحمل سے فرمایا۔ ”لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ تو اس لڑکی کو نہیں ہلاک کرے گا کیونکہ یہ ایک راز ہے، قدرت کا راز۔“

راجا نے پریشانی سے کہا۔ ”لیکن حضرت! میں آپ کی بات ماننے کے بعد بھی بے بس ہی رہوں گا کیونکہ مجھ پر میرے پریوار کا دباؤ جو رہے گا۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”راجا! تیری سمجھ میں میری باتیں نہیں آئیں گی۔ میں سر دست یہی کہوں گا کہ تو پیدا ہونے والی بچی کو ہلاک نہیں کرے گا۔“

راجا نے کہا۔ ”میاں جی! آپ نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ لڑکی نہ ماری جائے۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”راجا! لڑکی پیدا ہو جائے تو اسے سب سے پہلے میرے پاس لانا۔ اس وقت میں تجھے بتاؤں گا کہ میں اس لڑکی کی سفارش کیوں کر رہا ہوں۔“

راجا چلا گیا لیکن اس کا ذہن بہت پراگندہ تھا۔ اس نے اس بات کا ذکر اپنی دھرم پتنی سے کیا، بولا۔ ”شاہ دولہ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس بار جو لڑکی گھر میں پیدا ہو، اس کو ہلاک نہ کرنا کیونکہ اس میں بھی ایک راز ہے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”شاہ دولہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کو اپنے حال میں مگن رہنے دو اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو، ورنہ رشیوں کی بددعائیں ہمیں پریشان کر دیں گی۔“

جب دن پورے ہو گئے تو راجا پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگا۔ بیوی بہت خوش تھی اور شاہ دولہ کو دعائیں دے رہی تھی جنہوں نے راجا کو بچی کے قتل سے منع کر دیا تھا۔

گھر میں بچی پیدا ہوئی تو کہرام برپا ہو گیا۔ گھر کے سارے ہی افراد بچی کو ہلاک کرنے پر زور دیتے تھے لیکن راجا نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں اس لڑکی کو شاہ دولہ کی خدمت میں لیے جاتا ہوں۔ وہ جیسا حکم دیں گے، میں اس پر عمل کروں گا۔“

راجا کی ماں نے کہا۔ ”لیکن ایسا تو آج تک نہیں ہوا کہ بچی پیدا ہوا ور اسے ہلاک نہ کیا جائے۔“

راجا نے جواب دیا۔ ”لیکن میں بھی کیا کروں؟ میں شاہ دولہ کی ہدایت پر بہرحال عمل کروں گا۔“

راجا نے اس بچی کو لیا اور سیدھا شاہ دولہ کی خدمت میں پہنچ گیا، بولا۔ ”میاں جی! یہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ آپ سے وعدہ تھا اس لیے اسے نہیں مارا گیا۔ اب آپ فرمائیں کہ اس کا کیا کیا جائے؟“

یہ کہتے ہوئے راجا نے اس بچی کو شاہ دولہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ انہوں نے اسے فوراً گود میں اٹھالیا، بولے۔ ''راجا! یہ تو کیا کرتا ہے۔ یہ بچی ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہے۔ اس سے تیرا مرتبہ بھی بلند ہوگا اور ہم فقیروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔''

راجا، شاہ دولہ کی باتیں حیرت سے سنتا رہا، پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''بالکل سچ۔ اس کا نام کیا رکھا ہے؟''

راجا نے جواب دیا۔ ''شاہ جی! نام تو اس کا رکھا جاتا ہے جس کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس کا کوئی نام نہیں۔''

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ''یہ بائی ہے، عزت دار خاتون، میں نے اس کا نام بائی رکھ دیا۔''

راجا بہت خوش تھا، پوچھا۔ ''حضرت! اس بچی کی بابت مزید کیا حکم ہے؟''

آپ نے حکم دیا۔ ''اس کی شاندار طریقے سے پرورش کی جائے اور اسے کسی قسم کا بھی گزند نہ پہنچایا جائے۔''

راجا بچی کو واپس لے گیا اور اس کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کی۔ لڑکی بالغ ہوگئی۔

یہ شاہجہاں کا عہدِ حکومت تھا۔ اس وقت شاہجہاں کی عمر انچاس سال تھی۔ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے لاہور پہنچ چکا تھا۔ یہاں شہزادہ اورنگ زیب بھی موجود تھا اور یہیں آصف خان فالج کے مرض میں مبتلا پڑا ہوا تھا۔ آصف خان بادشاہ کی چہیتی مرحومہ بیوی ممتاز محل کا باپ اور ملکہ نور جہاں کا بھائی تھا۔ فالج نے اس کا دایاں حصہ بے کار کر دیا تھا۔ یہ بادشاہ کی حکومت کا چوبیسواں سال تھا۔

قرب و جوار کے والیانِ ریاست اور امراء نے بادشاہ کی خدمت میں حاضریاں دیں اور نذرانے گزارے۔ انہی میں راجا ملک راجوڑ بھی شامل تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بیٹی بائی کو بھی لایا تھا۔ اس نے بائی کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کرتے ہوئے کہا۔ ''حضور! میرا یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمائیں۔''

بادشاہ نے یہ نذرانہ قبول تو کرلیا مگر ساتھ ہی فرمایا۔ ''اس وقت میری عمر انچاس برس ہے اس لیے یہ لڑکی میرے لیے مناسب نہیں ہے۔'' پھر شہزادہ اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شہزادہ اس سے نکاح کرسکتا ہے۔''

بادشاہ نے نہایت سادگی سے بائی کا نکاح اورنگ زیب سے پڑھوا دیا۔ اورنگ زیب ملتان سے لاہور پہنچا تھا۔ بیوی کو لے کر ملتان واپس چلا گیا۔

☆☆☆

آگرے میں شاہجہاں بیمار ہوا تو شہزادوں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ شہزادہ دارا شکوہ ولی عہد تھا لیکن امیدواروں میں اورنگ زیب بھی تھا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ بن گیا تو ملک میں ہندومت کو ترقی ہوگی اور اسلام روبہ زوال ہوجائے گا۔ اس نے اپنا یہ ارادہ کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ بائی سے یہ سن چکا تھا کہ شاہ دولہ نے سالوں پہلے یہ فرمایا تھا کہ بائی ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہوگی چنانچہ اس کو کچھ کچھ یقین ہوگیا تھا کہ حکومت اسی کو ملے گی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک بار شاہ دولہ سے ملے گا اور ان سے صاف صاف معلوم کرے گا کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ بنے گا یا نہیں؟

اورنگ زیب نے ایک زرد مرغ، دو ولایتی بلیاں اور ایک لکڑی کی چھڑی لے کر گجرات کا رخ کیا۔ وہ یہ چیزیں شاہ دولہ کی نذر کرنا چاہتا تھا اور یہ سوچا تھا کہ اگر شاہ دولہ نے چھڑی اورنگ زیب کو واپس کردی تو وہ یہ سمجھے گا کہ عصائے حکومت اس کے ہاتھ آگیا۔ بیوی بائی اس کے ساتھ تھی۔

اورنگ زیب آپ کی خانقاہ میں پہنچا۔ تو آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ''باہر جاؤ اور بادشاہ سلامت کو میرے پاس لے آؤ۔''

جب مریدوں نے باہر نکل کر یہ کہا کہ ''بادشاہ سلامت کو پیر و مرشد شاہ دولہ یاد فرما رہے ہیں۔'' تو اورنگ زیب بہت خوش ہوا۔ اس نے تینوں چیزیں شاہ دولہ کی نذر کردیں۔ اسی وقت کسی نے شاہ صاحب کی خدمت میں ایک نان پیش کیا۔ شاہ دولہ نے اورنگ زیب کی چھڑی اور نان اس کی طرف بڑھا دیے اور کہا۔ ''بادشاہ سلامت! یہ نان خدا کے حکم سے آپ ہی کے لیے بھیجی گئی ہے اور یہ چھڑی..... اس کو اپنے لیے عصائے حکمرانی سمجھیں اور اپنے پاس رکھیں۔''

اورنگ زیب وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ واپسی میں اپنی بیوی بائی سے کہا۔ ''میں شاہ دولہ کو اتنا بڑا ولی نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے ان سے کچھ بھی نہیں پوچھا لیکن انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں ان سے جاننا یا سننا چاہتا تھا۔''

بائی نے جواب دیا۔ ”شہزادے! میں جس خاندان میں پیدا ہوئی تھی، وہاں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جاتا تھا مگر میری بابت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ اسے نہ مارا جائے کیونکہ یہ ایک بادشاہ کی بیوی اور کئی بادشاہوں کی ماں ہے پھر جب میری آپ سے شادی ہوگئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ آپ اس ملک کے بادشاہ ہوں گے اور میرے بیٹے بھی حکومت کریں گے۔“

اورنگ زیب کا بیٹا بہادر شاہ اول اسی بائی کا بیٹا تھا۔ اورنگ زیب مطمئن ہو کر اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے لگا۔

☆☆☆

شاہجہاں بول و براز کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس خطرناک اور اذیت رساں بیماری نے بادشاہ کو بستر پر گرا دیا۔ شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ دارا شکوہ خود کو شاہجہاں کا ولی عہد اور قائم مقام سمجھتا تھا مگر اورنگ زیب نے اسے دعوتِ مقابلہ دی اور اسے ولی عہد ماننے سے انکار کر دیا۔

دارا شکوہ نے یہ سن رکھا تھا کہ شاہ دولہ نے اورنگ زیب کو دعائیں دے رکھی ہیں۔ اس نے اپنے ایک معتمد ہندو بلہو رائے کو ہدایت کی کہ وہ گجرات کے شاہ دولہ کے پاس جائے اور دارا شکوہ کے حق میں دعائیں حاصل کرے۔ بلہو رائے خود بھی شاہ دولہ کا بڑا معتقد تھا۔ اسے شاہ صاحب نے سدا بسنت کا خطاب دے رکھا تھا۔

بلہو رائے اپنے ولی نعمت کی ہدایت پر گجرات پہنچا اور شاہ دولہ کی خدمت میں حاضری دی۔

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ”سدا بسنت! کہو کیسے آنا ہوا؟“

بلہو رائے نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں شہزادہ دارا شکوہ کا نمک خوار ہوں اور خدا کے فضل سے شہزادہ ہی ہندوستان کا حقیقی ولی عہد اور مستقبل کا حکمراں ہے۔“

شاہ دولہ نے پوچھا۔ ”اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

بلہو رائے نے جواب دیا۔ ”شہزادہ دارا شکوہ کے حق میں دعائے فرماں روائی و حکمرانی۔“

شاہ دولہ نے فرمایا۔ ”لیکن یہ کام میرا تو نہیں ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر کا ہے، میں کیا کر سکتا ہوں؟“

بلہو رائے نے اصرار کیا۔ ”حضرت! آپ ایک بار اپنی زبان سے فرما دیں کہ دارا شکوہ بادشاہ ہندوستان۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں یہ کس طرح کہہ دوں، ایک غلط بات کس طرح اپنی زبان سے ادا کردوں۔ بھائی سدا بسنت! یہ حق اور مال ایک کلہ دار شخص کا ہے، یہاں دستار بندی و ولی عہدی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

بلہو رائے نے پھر اصرار کیا۔ ”حضرت! شہزادہ دارا شکوہ آپ کا حقیقی ارادت مند اور پرستار ہے۔ آپ ولی عہد کے حق میں ارشاد تو فرمائیں پھر دیکھیں اس کی عاجزی اور انکساری۔“

شاہ دولہ نے جواب دیا۔ ”بلہو رائے! پختہ کار آدمی کو طمع خام کا آرزومند ہونا فائدہ نہیں دیتا۔“

بلہو رائے نے شہزادہ دارا شکوہ کو مطلع کر دیا کہ شاہ دولہ دعائیہ کلمات ادا کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور انہیں اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

شہزادوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی اور اورنگ زیب نے سبھوں کو شکست دے کر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے مسندِ شاہی پر قدم رکھا۔

شاہ دولہ نے سیالکوٹ اور گجرات میں کئی مدرسے، مساجد، پُل اور عمارتیں بنوائیں، لنگر خانہ جاری کیا جہاں ہزاروں بھوکے دونوں وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ حاجت مندوں کا تانتا لگا رہتا اور آپ ہر کسی کی حاجت روائی فرماتے۔

آپ ایک عرصے تک انسانوں کی خدمات انجام دینے کے بعد میں وفات پا گئے۔

پنجاب کے شہر گجرات میں شاہ دولی دروازے کے باہر آپ کا مزار ہے۔ یہاں عام دنوں کے علاوہ جمعرات کو زائرین کی کثرت نظر آتی ہے اور اولاد کی خواہش مند عورتیں کاغذ کے پھول چڑھاتی ہیں۔

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیا الدین برنی۔ افضل الفوائد، امیر خسرو۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، حیات امیر خسرو، تقی محمد خورجوی۔ خسرو شیریں بیان، اقبال صلاح الدین۔
بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

شکستِ فاتحانہ

زرین قمر

زمین کو فتح کرنے اور دلوں پر حکومت کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے جبکہ دشمن عناصر اسی فرق کو جبر وظلم سے مٹانے کی کوشش میں نہ صرف دلوں کو توڑتے رہے ہیں بلکہ اقوام عالم کی نظروں میں بھی گرنے کا سبب رہے ہیں۔ جیسے کشمیر پر جبراً تسلط قائم کرکے اس کے حسن کو گہنایا جا رہا ہے۔

جنت نظیر وادی کی روداد جہاں آج بھی اندھیروں کا راج ہے



کشمیر کی وادی میں حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سرسبز وشاداب کھیتوں پر غروب ہوتے سورج کی زرد کرنیں عجب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ کھیتوں کے درمیان بنا مٹیالے رنگ کا ایک چھوٹا سا گھر دور سے ویران سا محسوس ہو رہا تھا

لیکن اس کے باورچی خانے میں ایک بوڑھا شخص منہ کے بل فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا جبکہ بوڑھا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی بوڑھی بیوی دیوار کے سہارے نڈھال بیٹھی تھی جیسے کسی نے

اس کی ساری دولت لوٹ لی ہو۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی اور وہ خوف زدہ نظروں سے باورچی خانے کے درمیان میں رکھی میز کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں فوجی وردی میں ایک انڈین فوجی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر شراب کی خالی بوتل رکھی تھی اور اس کی گن میز پر رکھی ہوئی تھی۔

اچانک باورچی خانے کے دروازے سے ایک اور انڈین فوجی داخل ہوا اور بوڑھی عورت اسے دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگی۔

''تم بے غیرت ...... ذلیل ...... کتے ...... تمہیں خدا غارت کرے...... خدا کا عذاب تم پر نازل ہو......'' وہ چیخ رہی تھی لیکن اندر آنے والے فوجی پر اس کا جیسے کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا میز کے قریب پہنچا تھا اس نے میز پر رکھی بوتل کھول کر گلاس میں انڈیلی اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

''لگتا ہے تم کافی پریشان ہو نریندر۔'' میز کے گرد بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے کہا۔ نریندر کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر جا بجا ناخنوں کے کھرونچوں کے نشانات تھے اور گالوں پر انگلیوں کے نشانات نمایاں تھے۔ اس نے اپنے دائیں گال کو ایک ہاتھ سے سہلایا۔

''یار ستیارام! اگر میں پھرتی نہ دکھاتا تو اس لڑکی نے میری آنکھ پھوڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی...... کم بخت نے کس زور سے گلاس مارا ہے...... میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ لگا لینا چاہیے۔'' نریندر نے کہا اور بوڑھی عورت کی طرف مڑا۔

''تمہارے پاس کوئی دوا ہوگی...... کوئی ٹیوب جو میں آنکھ پر لگا سکوں...... تمہاری بیٹی بہت ظالم ہے۔'' نریندر نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم پر لعنت ہو...... تم کتے ہو۔'' بوڑھی عورت نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

نریندر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ستیارام کی طرف مڑا۔

''ستیا! تم چاہو تو تم بھی زندگی کے مزے لوٹ لو۔'' نریندر کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

''میں؟...... نن...... نہیں۔'' ستیا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کافی دیر ہوگئی ہے اب چلنا چاہیے۔''

''احمق مت بنو...... تم بھی مرد ہو اگر دیر بھی ہوگئی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم کہہ دیں گے کہ ہم راستہ بھول گئے تھے۔'' نریندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

ستیارام چند لمحے کو جھجکا اس کا قد پستہ اور رنگ سانولا تھا۔ وہ انڈین آرمی میں شامل ہونے سے پہلے ملبوسات کا ڈیزائنر رہ چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نریندر اسے بزدل سمجھے چنانچہ وہ اٹھا اور باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکل گیا اس کا رخ گھر کے اس کمرے کی طرف تھا جس میں سے ابھی نریندر باہر آیا تھا۔ بوڑھی عورت اس کے ارادے کو بھانپ کر تیزی سے اٹھی اور آگے جا کر اس کے راستے میں کھڑی ہوگئی۔

''نہیں...... نہیں...... ! میں تمہیں نہیں جانے دوں گی...... اس کا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ زور سے چیخی لیکن ستیا نے اسے زور سے دوسری طرف دھکا دیا اور وہ فرش پر گر گئی۔

اس کے ساتھ ہی نریندر نے ستیا کا ریوالور اٹھا لیا جو وہ میز پر رکھ کر جا رہا تھا اور ریوالور بوڑھی عورت کی طرف تان لیا۔

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' اس نے بوڑھی عورت سے کہا اور ستیا کی طرف مڑا۔

''تم جاؤ...... ان دونوں کو میں دیکھ لوں گا۔'' اس کا اشارہ بوڑھی عورت اور فرش پر بے ہوش پڑے بوڑھے کی طرف تھا۔ ستیا لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہو گیا لیکن چند لمحوں بعد ہی واپس آ گیا۔

''کیا بات ہے؟...... کیوں آ گئے؟...... کیا ہوا؟'' نریندر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا...... مجھے یہ ٹھیک نہیں لگتا۔'' ستیا نے کہا۔

''احمق...... تم ڈرپوک ہو...... وہ ایک معمولی لڑکی ہے...... کمزور لڑکی...... اور تم...... اوہ، تم بالکل احمق ہو۔'' نریندر نے اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''ہمیں کافی دیر ہوگئی ہے...... اندھیرا پھیل رہا ہے...... اب واپس چلنا چاہیے۔'' ستیا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے واپسی کا کہا جس پر نریندر نے بے پروائی سے شانوں کو جھٹکا۔

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں یہ بوتل ختم کرنے کے بعد چلوں گا۔'' نریندر نے ادھوری بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں صبح سے ڈیوٹی پر تھے۔ ان کے پاس جدوجہد آزادی کشمیر میں حصہ لینے والے کئی رضا کاروں کی فہرست تھی جنہیں گرفتار کرنا ان کی ذمے داری تھی۔ دو نوجوانوں کو گرفتار کر کے وہ پیچھے فوجی چوکی تک بھیج چکے تھے۔ سارا دن کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ تھک گئے تھے۔

اس وقت شراب زیندر کو سکون بخش رہی تھی۔ وہ اس علاقے میں اپنا کام ختم کر کے یہاں سے پلٹ رہے تھے کہ انہیں کھیتوں کے درمیان یہ چھوٹا سا گھر نظر آ گیا اور وہ یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے رک گئے۔ اس وقت پیش آنے والا ناخوشگوار واقعہ ناگہانی طور پر ہی وقوع پذیر ہوا تھا۔ انہیں بوڑھے شخص کی بیٹی نے غصہ دلا دیا تھا۔ شروع میں ان کا رویہ بہت نرم تھا۔ انہوں نے بوڑھے سے ایک کشمیری مجاہد کے گھر کا پتا پوچھا تھا اور اس کی منہ زور جوان بیٹی نے انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ بغیر اجازت گھر میں داخل ہوئے تھے۔ بوڑھی عورت نے اس وقت اپنی بیٹی کو خاموش کر دیا تھا اور فوجیوں کے مانگنے پر انہیں پانی پیش کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پانی پی کر وہاں سے چلے جائیں گے لیکن وہ باورچی خانے میں رکھی میز کے گرد موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے اور آپس میں دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔

”تم یہاں راستہ پوچھنے آئے تھے، تمہیں میری ماں نے راستہ بھی بتا دیا ہے۔ اب یہاں کیوں بیٹھے ہو؟...... جاؤ۔“ بوڑھے کی بیٹی نے غصے سے کہا۔ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ لڑکی کے بولنے پر زیندر کی توجہ اس کی طرف ہوئی ورنہ اب تک اس نے لڑکی کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات بھی نہ تھی کہ کسی کی نگاہ کا مرکز بن جاتی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی سوائے اس کی سیاہ ہرنی جیسی آنکھوں کے جن میں شرارت چھپی نظر آتی تھی۔ چہرہ بالکل زرد تھا اور لباس بہت سادہ لیکن اس کے انداز میں غرور اور طنطنہ تھا۔

زیندر نے بچپن سے کشمیری لڑکیوں کے بڑے قصے سنے تھے پھر فوج میں شمولیت پر اس کے ساتھی فوجیوں نے اسے بڑی داستانیں سنائی تھیں۔ وہ اکثر وادیٔ کشمیر میں آپریشنز کے دوران کشمیری لڑکیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیری لڑکیوں میں ضرور کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو ہندو لڑکیوں میں نہیں ہوتی اور جب بھی زیندر نے اپنے ساتھیوں سے اس خاص بات کے بارے میں پوچھا تھا تو اس سے یہی کہا گیا تھا کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا، بس دیکھ کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے اور اب جب اس کی ڈیوٹی کشمیر میں لگی تھی تو اسے کشمیری لڑکیوں کی بہادری اور سخت گیری کی بہت سی مثالیں ملی تھیں۔

”اپنی باتیں ختم کرو اور یہاں سے نکلو۔“ اس نے پھر غصے سے کہا تو زیندر ہنسنے لگا۔

”تم تو خاصی بہادر ہو...... اس بوڑھے کی بیٹی تو نہیں لگتیں۔“ زیندر نے قریب کھڑے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لڑکی نے تنک کر جواب دیا۔

”یہ ایک استانی ہے...... اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے۔“ اس کی ماں جلدی سے درمیان میں بول پڑی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اپنی تیزی کی وجہ سے کوئی غلط بات کہہ بیٹھے اور ان بھارتیوں کو طیش آ جائے۔

”تب تو تمہاری تعلیم بھی اچھی خاصی ہو گی۔“ زیندر نے پھر لڑکی کو چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے...... میں کتنی بھی پڑھی لکھی ہوں، تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لڑکی پھر غصے سے بولی۔

”تم یہ تو سمجھ ہی سکتی ہو کہ ہم لوگ کتنے اچھے ہیں۔ ہم تم کشمیریوں کو نظم و ضبط سے رہنا سکھائیں گے...... تم سب فسادی ہو...... تمہیں امن سے رہنا نہیں آتا...... تم حکومت کے خلاف لڑتے ہو۔“ زیندر کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بک رہا تھا۔ لڑکی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

”زیندر! بس کرو۔“ اس کے ساتھی ستیا نے مداخلت کی اور اسے سمجھانا چاہا۔

”تم مت بولو ستیا...... میں اس لڑکی کو سکھاؤں گا کہ

پیارا پیغام

انسان گھر بدلتا ہے، لباس بدلتا ہے، رشتے بدلتا ہے، دوست بدلتا ہے پھر بھی پریشان کیوں رہتا ہے کیونکہ وہ خود کو نہیں بدلتا۔ اسی لیے تو مرزا غالب نے کہا تھا۔

عمر بھر غالب یہی بھول کرتا رہا
دھول چہرے پہ تھی اور آئینہ صاف کرتا رہا

مرسلہ۔ ڈاکٹر ظفر اسلام جام، علی پور

اچھی بات

یاد رکھیے کہ خوشیاں، رزق اور رنگ گھر بیٹھے نہیں ملا کرتے اور اگر مل بھی جائیں تو صحیح معنوں میں ان کی قدر نہیں کی جا سکتی۔ جو باہر نکلنے اور اپنی قوت کو آزمانے کا حوصلہ رکھتا ہے، وہی ان تک پہنچتا ہے اور قدر بھی کرتا ہے اور اسی کی زندگی کے رنگ اور خوشیاں دیرپا بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

ایک بھارتی فوجی سے بدتمیزی کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' نریندر نے غصے سے کہا پھر وہ لڑکی کی طرف لپکا۔

''تم کیا کرلو گے؟'' لڑکی نے غصے سے کہا اور پیچھے کی طرف ہٹی لیکن نریندر نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

''ابو!'' لڑکی زور سے چیخی اور اس کے ساتھ ہی بوڑھا کشمیری اس پر جھپٹا جس پر نریندر نے لڑکی کو چھوڑ کر بوڑھے کے منہ پر زور دار تھپڑ مارا بوڑھا لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا... اور فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا اور بوڑھی عورت اور لڑکی یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ وہ بے تحاشا چیخ رہی تھیں۔ نریندر نے آگے بڑھ کر پھر لڑکی کو دبوچ لیا جس کے ساتھ ہی لڑکی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھپڑ کھا کے وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

''کیا کسی بھارتی فوجی کو تم اسی طرح خوش کرتی ہو؟'' نریندر نے حقارت سے کہا۔ ''تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے نریندر اسے گھسیٹتا ہوا باورچی خانے سے باہر لے جانے لگا۔ تب بوڑھی عورت راستے میں آ کھڑی ہوئی اور اس کا انجام بھی بوڑھے سے مختلف نہیں ہوا۔

''نریندر..... نریندر!'' ستیارام اسے برابر آوازیں دے رہا تھا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''بے وقوف تم چپ رہو۔'' نریندر نے اسے ڈانٹا اور لڑکی کو باورچی خانے کے برابر بنے کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کرلیا۔ کمرے سے کچھ دیر تک لڑکی کی چیخوں کی آواز آتی رہی جو آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔ اس عرصے میں ستیارام پر وحشت سی سوار ہو گئی تھی اور نریندر باہر آیا تو ستیا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ نریندر نے بوڑھی عورت کو دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے روتے دیکھ کر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور اس کے سامنے ڈال دیے۔

''لو! یہ رقم رکھ لو، اس سے تم اپنی لڑکی کے لیے نیا لباس خرید لینا۔'' اس نے ہنستے ہوئے ڈھٹائی سے کہا تو بوڑھی نے اس کی طرف دیکھ کر تھوک دیا اور اب وہ ستیا کے ساتھ بیٹھا پینے میں مشغول تھا اس نے ستیا کو بھی لڑکی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی مگر فطرتاً ڈرپوک ستیا ایسا نہ کرسکا پھر کچھ دیر بعد وہ اٹھا اس نے میز پر پڑی اپنی ٹوپی اٹھائی اور ستیا کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔

دونوں فوجیوں کے باہر جانے کے بعد ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور کچھ دیر بعد گاڑی کے انجن کی آواز دور ہوتی چلی گئی تب بوڑھی عورت دوڑتی ہوئی صحن میں گئی اور بند کمرے کے دروازے کو دھکا دے کر کمرے میں داخل ہوئی جہاں اس کی بیٹی فرش پر بے سدھ پڑی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

بوڑھی ماں نے اس کے آنسو پونچھے اور سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ وہ خود بھی روتی جارہی تھی اسے اٹھا کر پھر وہ اپنے بوڑھے شوہر کی طرف بڑھی اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش دلایا۔

''فریحہ! میری بچی، میری مدد کرو..... دیکھو تمہارے ابو کا سر پھٹ گیا ہے..... انہیں سر پر پٹی باندھنی ہے۔'' بوڑھی عورت نے بیٹی سے کہا جو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت بڑے حادثے سے گزری تھی۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا پھر اس نے اپنی ماں کی مدد کی اور بوڑھے باپ کے سر پر پٹی باندھی لیکن اسے دکھ تھا کہ وہ اس ہندو فوجی کو کوئی سزا نہیں دے سکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھلی جارہی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے ماں باپ سے آنکھیں ملا سکے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خود ہی قصوروار ہو اب اس کی زندگی میں کوئی خوشی، کوئی امنگ نہیں رہی تھی۔

ٹھیک بیس دن بعد نریندر پھر اس چھوٹے سے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہوا۔ اس بار وہ تنہا آیا تھا۔ اپنی بائیک اس نے گھر کے باہر کھڑی کی تھی۔ اس بار وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور اپنے ساتھ سلک کے خوب صورت موزے لایا تھا۔ وہ اس لڑکی کے لیے تھے جسے اس نے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا تھا اور اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے ناگوار اثرات کو ختم کرنے کے لیے یہ تحفہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو فریحہ میز کے قریب بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تم..... کیوں آئے ہو۔ اب کیا چاہتے ہو؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

''خوفزدہ مت ہو..... میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا..... دیکھو میں تمہارے لیے کتنے اچھے سلک کے موزے لایا ہوں۔'' اس نے موزوں کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''جاؤ! چلے جاؤ..... اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' فریحہ نے حقارت سے کہا۔

''احمق مت بنو! یہ چاقو رکھ دو..... اور یاد رکھو اس دن جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے غصے ہی کی وجہ سے ہوا۔ میرا وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اب پھر تم مجھے غصہ مت دلاؤ۔" نریندر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" فریحہ نے کہا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گیا تھا۔ نریندر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور زمین پر گرا ہوا چاقو اٹھا لیا تھا۔

"کیا میں آلو چھیلنے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا پھر وہ ایک آلو اٹھا کر چھیلنے بھی لگا تھا۔ فریحہ حقارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم اتنی خفا کیوں ہو؟ میں نے تمہیں اتنا نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا..... میں اس وقت غصے میں تھا اور تم نے میرے ساتھ برا سلوک کیا تھا چنانچہ میں نے......"

"چپ ہو جاؤ!" فریحہ زور سے چیخی۔ "تم کتنی آسانی سے سب کچھ دہرا رہے ہو جبکہ میں کچھ بھی یاد رکھنا نہیں چاہتی..... جاؤ..... چلے جاؤ۔"

"میں اپنی مرضی سے آیا ہوں اور اپنی مرضی سے ہی جاؤں گا۔" نریندر نے ضدی لہجے میں کہا۔

"اگر تم نہیں جاؤ گے تو میرے ابو خود..... چوکی جا کر تمہارے جنرل سے تمہاری شکایت کریں گے۔" اس نے دھمکی دی۔

"میرا جنرل اس سے مل کر خوش ہوگا کیونکہ ہمیں بھی یہاں کے لوگوں سے دوستی کرنے کے احکامات ملے ہیں..... ویسے اب تک میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا مطلب؟" فریحہ نے غصے سے کہا۔ فریحہ کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس بار وہ اسے پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی پھر اسے یاد آیا کہ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ ٹیچر ہے۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ کھیتوں پر کام کر رہے ہیں۔"

"میں بھوکا ہوں۔ مجھے کچھ روٹی، پنیر اور ایک گلاس شربت دے دو..... میں قیمت ادا کر دوں گا۔" اس نے کہا تو فریحہ نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ہم نے تو خود تین ماہ سے پنیر کی شکل نہیں دیکھی اور ہمیں خود پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ تمہارے فوجی ساتھی ایک سال پہلے ہمارے گھوڑے لے گئے تھے اور اس بار ہماری گائیں بھی لے گئے ہیں۔ اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"انہوں نے ان چیزوں کی تمہیں قیمتیں ادا کی ہوں گی۔" نریندر نے یقین سے کہا۔

"کیا ان کے دیے ہوئے بے قیمت نوٹ ہم کھا سکتے ہیں؟"

"کیا تم بھوکی ہو؟" نریندر نے پوچھا۔

"نہیں! میں یہ آلو پکاؤں گی۔ آج ہم آلو اور روٹی کھائیں گے اور پھر میرے ابو آگے گاؤں جا کر وہاں سے بکرے کا گوشت لائیں گے پھر ہم وہ پکائیں گے۔" فریحہ نے جواب دیا۔

"سنو..... میں کوئی خراب آدمی نہیں ہوں..... میں تمہیں پنیر اور شہد لا کر دوں گا۔"

"مجھے تمہارے تحفوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ چیزیں کھانے سے پہلے مر جانا پسند کروں گی جو تم نے ہم جیسے لوگوں ہی سے چھینی ہیں۔" فریحہ نے حقارت سے کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔" نریندر نے ہنستے ہوئے کہا اور اٹھ کر گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فریحہ نے سکھ کا سانس لیا تھا لیکن وہ حیران تھی کہ وہ دوبارہ وہاں کیوں آیا تھا۔

دس دن بعد نریندر پھر ان کے گھر آ گیا۔ اس بار فریحہ کے ماں باپ بھی گھر پر تھے اور فریحہ کھانا پکا رہی تھی۔ نریندر سے کسی نے کوئی بات نہیں کی جس کا مطلب تھا کہ فریحہ نے اس کی پچھلی بار آمد کے بارے میں انہیں بتا دیا تھا۔

"میں تم لوگوں کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔" نریندر نے خوشگوار موڈ میں کہا اور اپنے ساتھ لایا ہوا ایک شاپر میز پر رکھ دیا پھر اس میں سے وہ چیزیں نکال نکال کر میز پر رکھنے لگا جن میں پنیر، ڈبل روٹیاں، شہد اور دودھ کے ڈبے تھے۔ بوڑھی عورت کی آنکھوں میں اس نے خوشی کے آثار دیکھ لیے تھے چنانچہ اس کے لبوں پر بھی کامیابی کی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہماری پچھلی ملاقات میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا اور اس میں کچھ غلطی تم لوگوں کی بھی تھی۔" نریندر نے کہا اور اس کی بات مکمل ہوتے ہی فریحہ کچن سے باہر آ گئی۔

"تم بار بار یہاں کیوں آتے ہو؟" اس نے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی چیزوں پر پڑیں تو وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ان چیزوں کو اٹھا اٹھا کر نیچے پھینکنے لگی۔

"انہیں یہاں سے لے جاؤ..... جاؤ۔" اس نے غصے سے کہا تبھی اس کی ماں آگے بڑھی۔

"فریحہ! تم پاگل ہو..... خاموش ہو جاؤ۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں فریحہ سے کہا۔

"میں اس کا کوئی تحفہ نہیں لوں گی۔" فریحہ پھر غصے

سے بولی۔

"یہ ہماری غذا ہے...... ہماری اپنی...... جو انہوں نے ہم سے ہی چھینی تھی...... دیکھو سامان کو دیکھو......" اس کی ماں نے کہا تو فریحہ نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ بوڑھی عورت نے سب چیزیں اٹھا کر میز پر رکھ لیں۔

"ہمیں شرم آنا چاہیے۔ ہمیں یہ چیزیں نہیں لینا چاہئیں۔" فریحہ نے پھر احتجاج کیا۔ اس کا باپ ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ وہ ضعیفی کے باعث اس منہ زور بھارتی فوجی کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔

"نہیں اس میں شرم کی کیا بات ہے...... انہوں نے ہم سے جو چھینا ہے وہی واپس لوٹا رہے ہیں۔" بوڑھی نے کہا تو فریحہ اسے گھورنے لگی۔ نریندر اس کے والد کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر بوڑھے کی طرف بڑھا دیا۔

"اسے رکھو، میں تمہیں اور بھی لا دوں گا...... میں تم لوگوں کے لیے خوراک کا سامان بھی لاؤں گا...... کیا ہم لوگ دوست نہیں بن سکتے؟ جو کچھ بھی ہوا اسے ختم نہیں کیا جاسکتا؟" وہ پھر فریحہ کی طرف مڑا۔

"تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو تمہیں میرے بارے میں خیالات بدل لینے چاہئیں کیونکہ جو واقعہ پیش آیا وہ سب اچانک ہوا تھا اور میں اس وقت غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ اب تم لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔"

"ہماری ناراضگی سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تم کشمیر میں آئے دن یہاں کے لوگوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم کرتے ہو۔ تم عادی ہو۔ تم شرمندہ ہونے والی قوم نہیں ہو، جاؤ ہمیں تنہا چھوڑ دو۔"

اس کی اس بات کا جواب نریندر کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں آجاتا تھا شاید وہ اپنی تنہائی دور کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنی فوجی زندگی کی یکسانیت سے تنگ آگیا تھا۔ اس نے مایوسی سے فریحہ کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار ان کے گھر آیا اور ہر بار وہ اپنے ساتھ کافی سامان لاتا تھا۔ پنیر، ڈبل روٹی، شکر، کافی، جیلی اور مختلف چیزیں لیکن ہر بار اس کی ملاقات فریحہ سے نہیں ہوتی تھی۔ وہ یا تو اسکول میں ہوتی یا پھر اپنے والد کے ساتھ کھیتوں میں کام میں مصروف ہوتی تھی۔ زیادہ تر اس کی ماں ہی نریندر سے ملتی تھی۔

ایک روز جب نریندر آیا تو فریحہ کی ماں اسے باہر کھیتوں ہی میں مل گئی۔ اس نے نریندر کے ہاتھ میں بڑا سا پیکٹ دیکھا تو خوش ہوگئی اور اپنے ساتھ گھر میں لے آئی پھر اس کے ہاتھ سے پیکٹ کھول کر اس میں سے چیزیں نکالنے لگی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"تم بہت اچھے ہو۔" اس نے کہا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" نریندر نے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں بالکل۔" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دیکھ رہی ہو کہ فریحہ کھیتوں سے واپس تو نہیں آرہی ہے۔

"کیا تم کچھ پیو گے؟" اس نے نریندر سے پوچھا۔

"ہاں ضرور۔" نریندر نے کہا۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس بوڑھی عورت کے دل میں اس کے تحائف نے کچھ جگہ بنا دی ہے۔

"کیا تمہیں میرا لایا ہوا گوشت پسند آیا؟" نریندر نے پوچھا۔

"ہاں بہت اچھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں اگلی بار جب آؤں گا تو اور گوشت لاؤں گا...... کیا فریحہ کو بھی وہ گوشت پسند آیا تھا؟" اس نے پوچھا تاکہ جان سکے کہ فریحہ کا غصہ کم ہوا یا نہیں۔

"وہ تمہاری لائی ہوئی کسی چیز کو چھوتی بھی نہیں ہے۔"

"وہ احمق ہے۔" نریندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں بھی اس سے یہی کہتی ہوں لیکن وہ کچھ سنتی ہی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ۔" نریندر نے کہا پھر وہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپس چلا گیا۔

وہ گھر سے نکل کر کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے فریحہ نظر آگئی جو گھر کی جانب آرہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی اور نریندر نے اپنی بائیک اس کے قریب روک لی۔

"ٹھہرو فریحہ! رک جاؤ...... میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" نریندر نے کہا۔

"بولو! میں ایک کمزور عورت ہوں، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اسی لیے تو میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہو۔" اس نے غصے سے کہا۔

"میں کافی عرصے سے کشمیر میں ڈیوٹی پر ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کشمیری عورتیں بہت سخت مزاج ہوتی ہیں۔" اس نے فریحہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ ہمارے درمیان

دوستانہ فضا قائم ہوجائے۔ کیا تم اپنے ماں باپ کی طرح نرم رویہ اختیار نہیں کرسکتیں؟'' زریندر نے پوچھا۔
''اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اب پہلے والی فریحہ نہیں رہی ہوں اور تمہاری مہربانی کی بدولت اب ماں بننے والی ہوں۔''
فریحہ کی بات سن کر زریندر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
''کیا؟'' زریندر نے حیرت سے کہا۔
''ہاں!'' فریحہ نے کہا اور رونے لگی۔
''فریحہ! یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے بے یقینی سے کہا اور اس کی طرف لپکا۔
''نہیں...... مجھے مت چھونا۔'' وہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹی۔ ''جاؤ...... دفع ہوجاؤ۔ تم مجھے پہلے ہی بہت دکھ دے چکے ہو۔'' فریحہ نے کہا اور دوڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ زریندر کافی دیر تک کھڑا اس کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔
اس رات جب زریندر سونے کے لیے لیٹا تو اس کے ذہن میں صرف فریحہ کا خیال تھا۔ اسے اس کی روتی ہوئی آنکھیں نہیں بھولتی تھیں۔ اب وہ اس کے بچے کی امانت دار بھی تھی پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ فریحہ سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس احساس سے اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ فریحہ کو دوسری عورتوں سے مختلف نہیں سمجھتا تھا لیکن اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فریحہ کا دکھ بانٹ لے، اسے دلاسا دے، اسے مسکراتا ہوا دیکھے۔ تین دن اور تین راتیں وہ فریحہ کے بارے ہی میں سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے بچے کے بارے میں وہ فریحہ کی ماں سے بات کرے گا اور اسی خیال کے تحت وہ ایک بار پھر فریحہ کے گھر پہنچ گیا۔ فریحہ کی ماں اسے کھیتوں کے راستے میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں اکٹھی کرتے ہوئے مل گئی تھی۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل وہیں روک دی۔
''مجھے فریحہ کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔'' زریندر نے فریحہ کی ماں سے کہا۔
''تمہیں کیسے پتا چلا؟''
''مجھے فریحہ نے خود بتایا ہے۔'' زریندر نے کہا۔
''لیکن اس نے تو ہمیں بھی منع کیا تھا کہ تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔'' فریحہ کی ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''جس شام وہ ناخوشگوار واقعہ ہوا تھا، فریحہ کو تیز بخار ہوگیا تھا۔ وہ کئی دن تک بخار میں پھنکتی رہی...... وہ گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ ہم لوگوں کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہوجائے گی۔ یہاں ڈاکٹر بھی آسانی سے نہیں ملتے پھر جب اس کا بخار اترا تو وہ بہت کمزور ہوچکی تھی۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ وہ تمہاری امانت اٹھائے پھر رہی ہے تو پاگل سی ہوگئی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرلیں لیکن کسی نے ہماری مدد نہیں کی۔''
''دیکھو، اسے مصیبت مت سمجھو۔ اس کی ذمے داری میں اٹھاؤں گا۔'' زریندر نے کہا۔
''لیکن فریحہ یہ بات نہیں سمجھے گی۔'' فریحہ کی ماں نے کہا۔
پھر زریندر باتیں کرتے کرتے گھر تک آگیا تھا اور فریحہ جو اس وقت کام میں مصروف تھی، اسے دیکھ کر چراغ پا ہوگئی۔
''فریحہ! کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں؟'' اس نے فریحہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔
''نہیں! میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی...... تم میرے راستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتے؟ کیا یہی کافی نہیں ہے کہ تم نے میری زندگی تباہ کردی ہے۔''
''نہیں، میں ایسا نہیں سوچتا۔ مجھے تو اس خبر سے خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔''
''خوشی؟'' فریحہ نے غصے سے دہرایا۔
''ہاں! میں چاہتا ہوں تم میری اس امانت کو سنبھالو۔''
''تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔'' فریحہ نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔
''میری بات تو سنو۔ مجھے جب سے یہ بات پتا چلی ہے میں نے کسی اور بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔ جب کشمیر میں حالات ٹھیک ہوجائیں گے تو ہم بھی واپس چلے جائیں گے۔ میں تم سے شادی کرکے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' زریندر نے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی اتنی نفرت کے باوجود وہ اسے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی دعوت دے رہا تھا۔
''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے۔ پہلے میرے ساتھ زیادتی کی اور اب بغیر میری مرضی کے تم نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ آئندہ زندگی مجھے کیسے گزارنی ہے؟ تم ہوتے کون ہو؟''
''تمہیں اندازہ نہیں...... تمہارے ہر بار جھڑکنے کے باوجود میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔'' زریندر نے کہا تو فریحہ کی ہنسی نکل گئی۔ وہ زور زور سے ہنس رہی تھی اور اس

کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔ جیسے اسے دورہ پڑ گیا ہو۔ آخر اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑا اور اس کے گالوں پر تھپڑ مارے تب وہ خاموش ہوئی۔

"تم فکر مت کرنا اسے ہسٹیریا کے دورے پڑتے ہیں۔" فریحہ کی ماں نے کہا۔

"تمہارے ماں باپ کون ہیں؟" فریحہ کی ماں نے نریندر سے پوچھا۔

"بھارت میں ہماری کچھ زمینیں ہیں جن سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ ہمیں سب کچھ میسر ہے۔ فریحہ ہمارے ساتھ خوش رہے گی۔ میں کبھی اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔" نریندر نے وعدہ کیا۔

"اس کے پاس دنیا بھر کی آسائشیں ہیں۔" فریحہ کی ماں نے اس کے والد کی طرف مڑتے ہوئے کہا جس کی توجہ نریندر کی طرف تھی۔

"یہ میرے لیے بہت اچھی آفر ہے کہ ایک غاصب ملک کا غیر مہذب فوجی میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ مجھے خوشگوار زندگی کی پیشکش کر رہا ہے۔ یہ بہت اچھا موقع ہے...... ہے نا۔" فریحہ نے دکھ سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ تمہاری پیشکش بہت اچھی ہے۔" فریحہ کے باپ نے پہلی بار زبان کھولی۔

"میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ بچپن میں فوت ہو گیا اور اب فریحہ ہی ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔" فریحہ کے والد نے کہا۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر فریحہ کو خود سے جدا کرنا آپ کے بس میں نہیں تو میں یہاں رہ کر ہی باقی زندگی گزار دوں گا۔" نریندر نے کہا۔

"تاکہ یہاں اریب قریب کے لوگوں کو اب تک جو کچھ پتا نہیں ہے ان سب میں ہماری عزت کا ڈھنڈورا پٹ جائے۔" فریحہ نے غصے سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بھائی کے مرنے کے بعد اس کے والدین کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ انہیں کوئی گھر داماد مل جائے تاکہ ان کی بیٹی بھی ان سے جدا نہ ہو اور وہ بھی تنہائی کا شکار نہ ہوں۔

"اس صورت میں غور کیا جا سکتا ہے۔" فریحہ کی ماں نے کہا تو فریحہ غصے سے اس کی طرف مڑی۔

"ماں! کم از کم تم تو ایسا نہ کہو...... تم جانتی ہو میں اس شخص کو پسند نہیں کرتی...... ایک تو اس نے میرے ساتھ زیادتی کی...... دوسرے یہ مسلمان بھی نہیں...... تیسرے تم جانتی ہو...... کہ میں...... میں حماد کی منگیتر ہوں...... وہ بھی میری طرح اسکول ٹیچر ہے...... یہ منگنی بھی تو تم لوگوں کی مرضی ہی سے ہوئی تھی۔" فریحہ نے روتے ہوئے کہا۔

"وہ...... حماد...... کہاں ہے؟" نریندر نے اداسی سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہو سکتا ہے...... تم جیسے سفاک لوگوں کی قید میں ہے...... اسے دہشت گرد قرار دے کر قید کر دیا گیا ہے جبکہ وہ بے قصور ہے اور تم...... تم ہمارا غلہ کھانے کے لیے یہاں پڑے ہو۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور تم نے دیکھ لیا کہ تمہارے ہزار بار معافی مانگنے پر بھی میں نے تمہیں معاف نہیں کیا...... کیا میرا جو نقصان ہو گیا اسے تم پورا کر سکتے ہو؟" فریحہ کی بات کا نریندر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

"سنو! تمہیں بتاؤں کہ حماد مجھ سے بہت محبت کرتا ہے...... وہ تمہاری طرح امیر اور طاقتور تو نہیں ہے لیکن اس میں شرافت ہے جو اس کے چہرے سے جھلکتی ہے۔ اس کی واحد طاقت اس کی روح کی پاکیزگی ہے۔ میں اس کی ہوں اور اپنی تمام محبتوں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی ہوں۔" فریحہ کی بات پر نریندر کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ فریحہ کسی اور کو بھی چاہ سکتی ہے۔

"اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اب تم میری اور صرف میری امانت کی رکھوالی کرو گی۔" نریندر نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو! تم نے میرے ساتھ زبردستی ضرور کر لی ہے لیکن مجھے یقین ہے جب حماد کو حقیقت کا علم ہو گا تو وہ مجھے معاف کر دے گا...... تم جو سامان یہاں لاتے ہو، میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتی۔ میری نظروں میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور مجھے تمہارے بچے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف تمہارا ہے...... جو ہندو ہو گا...... اور تمہاری طرح ہو گا کیونکہ وہ تمہارے خون سے ہو گا...... اس کی آنکھیں...... اس کے بال تمہاری طرح ہوں گے...... اوہ خدایا...... میں اس اذیت میں کیوں گرفتار ہوئی......" فریحہ نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

"کیا تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" فریحہ کی ماں نے نریندر سے پوچھا۔

''ہاں، میں اسے چاہتا ہوں۔''

''اور تم اسے یہاں سے لے کر بھی نہیں جاؤ گے...... تم یہیں رہو گے...... اور کھیتوں میں ہمارے ساتھ کام بھی کرو گے؟'' فریحہ کی ماں نے پوچھا۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔''

''ویسے بھی میرے بوڑھے شوہر میں اتنا دم نہیں کہ مزید محنت برداشت کر سکے لیکن اپنے گھر اپنے ملک میں تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کام کرتے جبکہ یہاں تمہیں غیروں کے ساتھ......''

''ایسا مت کہیں۔'' نریندر نے کہا۔ ''میں بہت بدل گیا ہوں اور فریحہ کے ساتھ جو زیادتی ہوگئی ہے اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہمیں کبھی بھی وہ ٹیچر حماد پسند نہیں تھا۔ وہ فریحہ کی پسند ہے پر جب فریحہ کی منگنی ہوئی تب ہمارا بیٹا زندہ تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے...... حالات مختلف ہیں۔'' فریحہ کی ماں نے کہا۔

''میں یہ زمین بیچنا بھی نہیں چاہتا...... یہ ہمارے لیے ماں کی حیثیت رکھتی ہے۔'' اس بار فریحہ کا بوڑھا باپ بھی بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' نریندر نے کہا پھر وہ واپس چلا گیا۔ وہ کئی ہفتے فریحہ کے گھر نہیں آیا۔ اس عرصے میں اس نے بھارت میں اپنے ماں باپ کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ یہاں ایک مقامی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے حصے کی زمینیں بھی اس کے بھائی کو دے دی جائیں پھر جب وہ فریحہ کے گھر جانے کے لیے ایک روز کھیتوں سے گزر رہا تھا تو راستے ہی میں فریحہ کی ماں اسے مل گئی۔

''تم آج گھر مت جاؤ......'' اس نے کہا۔

''کیوں؟...... ایسی بھی کیا بات ہے؟'' نریندر نے پوچھا۔

''آج فریحہ غصے سے پاگل ہو رہی ہے...... آج بھارت سے خط آیا ہے حماد کا انتقال ہو گیا ہے...... وہ بہت دیوانی ہو رہی ہے۔'' فریحہ کی ماں نے اسے بتایا۔

''لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''اسے بھارتیوں نے کیمپ میں گولی مار دی ہے۔'' اس نے بتایا۔ نریندر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

''جب وہ پُرسکون ہو جائے گی تو میں تمہیں خط لکھ دوں گی تم آ جانا۔''

''ٹھیک ہے لیکن یہ خیال رکھنا کہ تمہیں فریحہ کا خاص

پانچ نصیحتیں

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں، ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''کوئی ہے جو مجھ سے یہ چند کلمات حاصل کر کے ان پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔''

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ یا رسول اللہ! میں سیکھوں گا تو آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ارشاد فرمایا۔

(1) تم اللہ کی حرام کردہ باتوں سے بچو، تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

(2) جو اللہ نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے اس پہ راضی ہو جاؤ، تم لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔

(3) اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرو تو حقیقی مومن بن جاؤ گے۔

(4) لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو، تم اچھے مسلمان بن جاؤ گے۔

(5) زیادہ ہنسا نہ کرو اس لیے کہ زیادہ ہنسی دل کو مُردہ کر دیتی ہے

(مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور)

خلیل جبران

☆ لنگڑے کے لیے یہی دانش مندی ہے کہ وہ اپنی لاٹھی دشمن کے سر پر نہ مارے۔

☆ ہمارے دلوں کے بھید وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے اپنے دل بھیدوں سے بھرے ہوں۔

☆ صحیح معنوں میں عظیم آدمی وہ ہے جو نہ خود سردار بنے اور نہ اسے کوئی بنائے لیکن لوگ اسے سردار تسلیم کریں۔

☆ جب تک تمہارا منہ کھانے سے بھرا ہو تو ایک اچھا ترانہ کیسے گا سکتے ہو اور جب تک تمہارے ہاتھ سونے سے لدے ہوں تو ان کو دعائے خیر کے لیے کیسے اٹھا سکتے ہو۔

☆ تم اس شخص کو تو بھول سکتے ہو جس کے ساتھ تم ہنسے تھے لیکن اس شخص کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے جس کے ساتھ روئے تھے۔

☆ برتری اچھے اخلاق سے ہوتی ہے نہ کہ رنگ سے۔

☆ جن کے سروں پر چھت نہیں ہوتی، وہ زلزلوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

خیال رکھتا ہے اور مجھے اس کی حالت سے باخبر رکھتا ہے۔'' زریندر نے کہا۔

''ہاں! میں اور میرا شوہر تمہارے ساتھ ہیں۔'' فریحہ کی ماں نے وعدہ کیا اور زریندر راستے ہی سے رخصت ہو گیا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد فریحہ کی ماں اس کے پاس آبیٹھی۔ جب سے فریحہ کو علم ہوا تھا کہ اس کی ماں بھی چاہتی ہے کہ وہ زریندر سے شادی کرلے تب سے وہ ایک کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ اپنی ماں سے بھی بہت کم بات کرتی تھی۔

''میں نے زریندر کو یہاں بلانے کے لیے خط لکھ دیا ہے۔ وہ شاید کل یہاں آئے گا۔'' اس کی ماں نے کہا تو فریحہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

''بتانے کا شکریہ! میں اپنے کمرے میں رہوں گی اور کوئی مجھے تنگ نہ کرے۔'' اس نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

''عقل کی بات کرو فریحہ! اب وقت گزر چکا ہے...... زریندر تم سے محبت کرتا ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حماد مر چکا ہے...... وہ خوب صورت ہے...... جوان ہے...... کوئی بھی لڑکی اس سے شادی کرنے پر فخر کرسکتی ہے اور وہ کھیتوں میں ہماری مدد بھی کرے گا اور ممکن ہے کہ وہ ایک نیا ٹریکٹر بھی خرید کر ہمیں دے دے۔'' فریحہ کی ماں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''آپ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں...... میں زریندر سے نفرت کرتی ہوں۔ مجھے اس کی مدد نہیں چاہیے۔ میں اس سے اتنی نفرت کرتی ہوں کہ اگر میں اسے مار بھی ڈالوں تب بھی مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' فریحہ نے غصے سے کہا۔

''تم بہت احمق ہو فریحہ...... تمہارے ساتھ جو... کچھ ہوا وہ تو ہو چکا...... اب آگے کی سوچو۔''

''کیا سوچوں؟ ایک ہندو سے شادی کرلوں؟''

''تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے فریحہ۔'' اس کا باپ بھی گفتگو میں شریک ہو گیا جو فریحہ کے تیز تیز بولنے کی آواز سن کر وہاں آ گیا تھا۔ ''وہ کہتا ہے کہ وہ نام کا ہندو ہے...... وہ ہمارے طرز زندگی کو پسند کرتا ہے اور ہمارے ساتھ ہماری طرح ہی رہے گا۔'' اس کے باپ نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ ''تم جانتی ہو...... ہم ان کے محکوم ہیں، ان سے لڑ کے نفرت کر کے ہم ان سے نہیں جیت سکتے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' فریحہ نے بیزاری سے کہا۔

''عقل کی بات کرو فریحہ اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال کرو۔ اسے باپ کے سائے سے محروم مت کرو۔''

اس کی ماں نے سمجھایا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسرے روز زریندر آیا تو وہ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ''مجھ سے نہ چھپنے کے لیے تمہارا شکریہ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میرے والدین نے بلایا ہے، زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق مجھے ہی ہے...... تم بہت چالاک ہو۔ تم نے میرے ماں باپ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے رام کرلیا ہے لیکن تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''میں کوشش نہیں چھوڑوں گا پھر اگر حماد زندہ ہوتا تب بھی تمہاری ضد سمجھ میں آتی تھی لیکن اب جبکہ وہ مر چکا ہے......''

''مر نہیں چکا۔'' فریحہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم بھارتیوں نے اسے مار دیا ہے۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ تم لوگ مسلمانوں کو برداشت ہی نہیں کرسکتے۔'' فریحہ نے کہا۔

''ہوسکتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم اسے بھول جاؤ۔ تم جانتی ہو جب کوئی چاہنے والا ہم سے بچھڑ جاتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کے بغیر ہم بھی مر جائیں گے۔ مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے۔ کیا تم مجھے بھی اس تکلیف سے گزارنا چاہتی ہو؟ کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ تم بھی زندہ رہو اور اس بچے کو اس کے باپ سے محروم مت کرو۔'' زریندر نے سمجھایا۔

''چاہے کچھ بھی ہو تم سمجھتے ہو کہ میں کبھی یہ بھول پاؤں گی کہ تم ہندو ہو اور میں مسلمان...... کیا میرے ملنے والے، دوست احباب وہ اس بچے کے بارے میں سوال نہیں کریں گے؟ میں انہیں کیا جواب دوں گی؟ میں تم سے صرف ایک بات چاہتی ہوں۔ تم مجھے تنہا چھوڑ دو اور خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ اور کبھی واپس مت آنا۔''

''لیکن میرا بچہ؟ میں اسے چاہتا ہوں۔''

''تم... بھلا غیر شعوری طور پر کسی چیز کے مل جانے پر تم اس کی کیا قدر کرسکتے ہو؟ یہ بچہ محض ایک حادثہ ہے۔''

''تم سمجھ نہیں سکتیں، میں بہت خوش ہوں۔ میں اس بچے کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔'' زریندر نے کہا تو فریحہ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم بھارتیوں کے ظلم کو سراہوں یا تمہاری حساسیت کی تعریف کروں۔'' فریحہ نے طنزیہ انداز میں کہا لیکن زریندر اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

''میں ہر وقت اس کے متعلق ہی سوچتا رہتا ہوں۔ وہ یقیناً لڑکا ہوگا میری طرح خوب صورت۔'' اس نے کہا۔

''میں اسے بازوؤں میں لے کر پیار کروں گا...... اسے چلنا سکھاؤں گا۔ اسے بولنا سکھاؤں گا۔ میں اسے شوٹنگ سکھاؤں گا...... مچھلیاں پکڑنا سکھاؤں گا۔'' وہ بولے جا رہا تھا اور فریحہ اسے عجیب انداز میں دیکھ رہی تھی اور اس کے دماغ میں عجیب و غریب خیال پرورش پا رہا تھا۔ وہ پراسرار ہنسی ہنس رہی تھی۔

''تم میرے دشمن ہو اور ہمیشہ دشمن ہی رہو گے۔ میں صرف اپنے کشمیر سے محبت کرتی ہوں۔ اے کاش میں اس کو آزاد دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ ایک سال بعد، تین سال بعد لیکن ہوگا ضرور...... دوسرے لوگ چاہیں تو تمہارے سامنے سر جھکا دیں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور تمہارے بچے سے بھی نفرت کروں گی۔'' فریحہ نے کہا۔

''کیا ڈاکٹر کا انتظام کرلیا ہے؟ میں تمام اخراجات برداشت کروں گا۔'' نریندر نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس کام کی شہرت سارے شہر میں کروں گی؟''

''تو پھر؟'' نریندر نے پوچھا۔

''تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' فریحہ نے کہا تو نریندر سرد آہ بھر کر کھڑا ہوگیا پھر وہ اسے دروازے سے نکل کر باہر جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ کافی دن نہیں آیا پھر اسے فریحہ کی ماں کا خط موصول ہوا جس میں خوشخبری تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ وہ دیوانہ وار فریحہ کے گھر پہنچا۔ فریحہ کا باپ باہر ہی اسے مل گیا تھا۔

''فریحہ کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے۔ تمہیں مبارک ہو تمہارا بیٹا بھی بہت خوب صورت ہے۔'' فریحہ کے باپ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ بالکل تمہاری طرح ہے۔'' ماں نے کہا۔

''اوہ بھگوان! میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ یہ دنیا میرے لیے اور بھی خوب صورت ہوگئی ہے۔ میں فریحہ کو...دیکھنا چاہتا ہوں۔'' نریندر نے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ وہ تم سے ملے گی اور اب میں اسے تنگ کرنا نہیں چاہتی۔'' فریحہ کی ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے اسے تنگ مت کرو لیکن مجھے ایک نظر بچے کو دکھا دو۔'' نریندر نے التجا کرنے والے انداز میں کہا۔

''میں دیکھتی ہوں کہ کیا کر سکتی ہوں۔'' فریحہ کی ماں نے کہا اور فریحہ کے کمرے کی طرف چلی گئی لیکن کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو بوکھلائی ہوئی تھی۔

''وہ وہاں نہیں ہے......'' اس نے کہا۔

''پھر کہاں ہے؟'' نریندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''پتا نہیں...... آؤ دیکھیں۔'' اس نے کہا پھر انہوں نے سارا گھر چھان مارا لیکن فریحہ نہیں ملی تھی۔

''خدا خیر کرے...... وہ باہر کیسے چلی گئی...... اوہ میرے خدایا...... رحم کر...... اللہ کرے وہ خیریت سے ہو...... بچہ بھی اس کے پاس ہی ہوگا...... مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' فریحہ کی ماں بری طرح رو رہی تھی۔ وہ سب باہر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ فریحہ گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے جسم پر نائٹ گاؤن کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ پانی سے تر ہو رہا تھا۔ اس کے بالوں سے بھی پانی ٹپک رہا تھا اور اس کا رنگ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ اس کی ماں نے لپک کر اسے تھام لیا۔

''تم کہاں تھیں...... اوہ میری بچی تم تو بالکل بھیگی ہوئی ہو...... یہ کیا حماقت ہے...... تم کہاں گئی تھیں؟'' فریحہ کی ماں نے کئی سوال کیے لیکن فریحہ نے اسے جواب دینے کے بجائے آہستہ سے پیچھے ہٹا دیا اور نریندر کی طرف بڑھی۔

''تم بالکل صحیح وقت پر یہاں پہنچے ہو۔'' اس نے کہا۔

''بچہ کہاں ہے؟'' نریندر نے پوچھا۔

''مجھے بہت جلدی میں یہ کرنا پڑا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر میں دیر کروں گی تو شاید یہ کام کبھی نہ کر سکوں۔'' فریحہ نے روتے ہوئے کہا۔

''فریحہ! تم نے کیا کیا ہے؟''

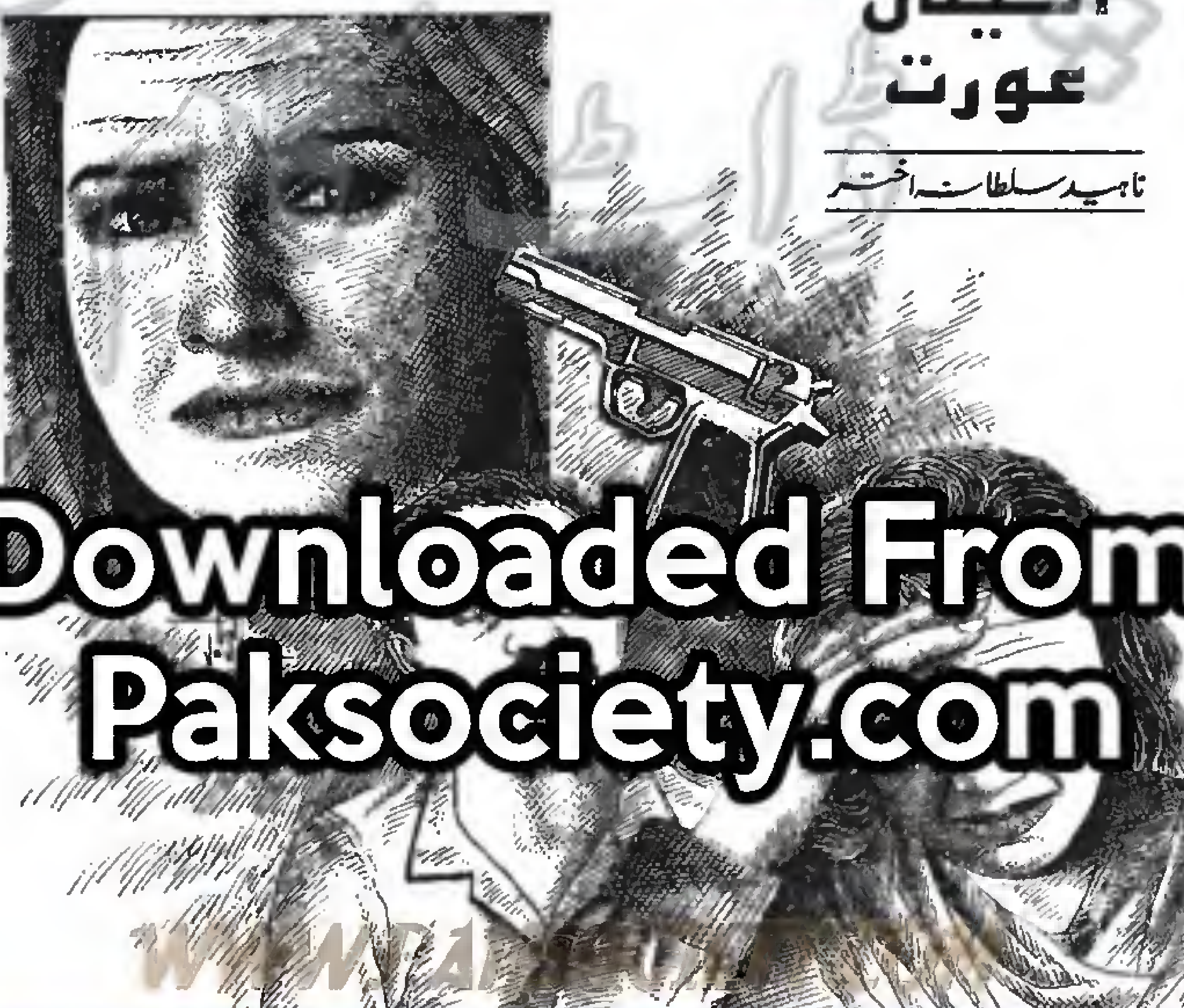
''میں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں اسے تالاب میں لے گئی اور اسے اس وقت تک پانی میں رکھا جب تک وہ مر نہیں گیا......'' فریحہ نے چیخ کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی نریندر کی بھی چیخ نکل گئی۔ ایسی چیخ جیسے کسی جانور کو بہت گہرا زخم لگا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر وہ ڈگمگاتے قدموں سے دروازے سے باہر نکل گیا...... اور تالاب کی طرف چل دیا۔ فریحہ کرسی پر ڈھیر ہوگئی تھی۔ اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے اپنا بدلہ لے لیا تھا لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اس طرح کر کے وہ جیتی ہے یا ہاری ہے؟

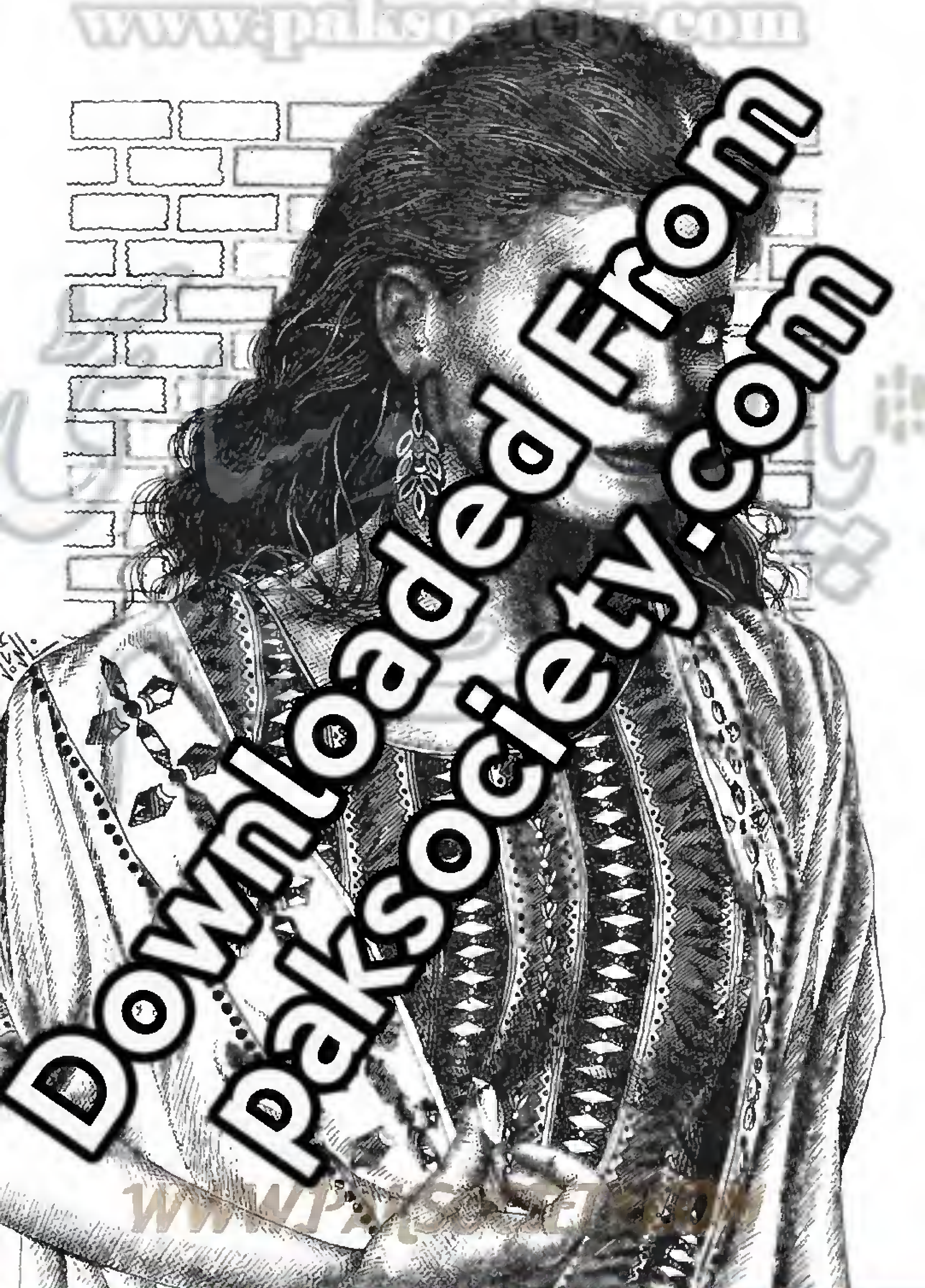
یہ کیسا عجیب احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات ایک انسان کے اندر اس طرح سمادی کہ اس میں گم ہوکر اکثر باہر کی دنیا بے کار محسوس ہوتی ہے مگر۔۔۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہی انسان اندر سے اتنا خالی ہوجاتا ہے کہ بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ جذبات واحساسات کا یہی الٹ پھیر اسے بھی ایک اندیکھی اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔وہ جو بھرپور زندگی جینا چاہتی تھی جب اپنے زندہ رہنے کے جواز پر غور کرنے بیٹھی تو گویا قدرت کی مصلحتیں۔۔۔ موسم کے بدلنے کا ہنر۔۔۔ کونپل کے پھوٹنے کا رنگ اور دن کا رات میں ڈھل جانے کا فلسفہ اسے ایک نئی دنیا سے روشناس کرا گیا۔اس کے باوجود وہ اپنے دل کے اندھیرے دور نہ کرسکی کہ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش تو شاید اس خالق نے اپنی مخلوق کے خمیر میں شامل کردی ہے۔ بہرحال قدرت نے اس کی ناک پر جو عینک دھری تھی اس سے اسے کائنات کے سارے رنگ بہت واضح اور الگ الگ نظر آنے لگے تھے مگر۔۔۔زیادہ جان لینا بھی بعض اوقات جان کا دشمن بن جاتا ہے،اس نے بھی شاید وقت سے یہی دشمنی مول لے لی تھی۔اگرچہ جانتی تھی کہ وقت کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔

زندگی کے تمام محاذوں پر جنگ لڑنے والی ایک حسینہ کی شکستگی اور حوصلے کی دلگداز داستان

اکیلی عورت

ناہید سلطانہ اختر





اکیلی عورت کے مسائل کوئی نگینہ بندہ علی سے پوچھتا۔ صبح سے شام تک بلکہ رات تک کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زندگی جہدِ مسلسل بنی رہتی...... اک کوہِ گراں جسے صبح سے رات تک سر کرنا لازم ہوتا۔ ہر صبح آنکھ کھلنے پر اسے یوں لگتا جیسے سیٹی بج گئی تھی اور اب اسے دوڑنا تھا اور پھر...... دوڑتے ہی جانا تھا...... نقطۂ آغاز سے نقطۂ اختتام تک...... مگر اختتام بھی ہوتا ہی نہ تھا...... علی الصباح بستر چھوڑنے کے بعد وہ رات ہی کو کمر سیدھی کر پاتی تھی...... اگلی صبح پھر سیٹی کی آواز...... پھر وہی دوڑ...... پھر وہی تشنہ کامی...... کہنے والوں کا کیا تھا وہ تو بڑے مزے سے کہہ دیتے واہ! کیا خودمختار اور آزادانہ زندگی تھی نگینہ بندہ علی کی! نہ کوئی ذمے داری نہ پابندی...... ویلی یعنی اکیلی ہے نا...... مزے میں ہے...... نہ میاں نہ بچے...... بس ایک اپنی ذات...... کہنے والوں کو تو بس زبان ہلانی پڑتی مگر...... اکیلی عورت کے دکھ سے تو نگینہ بندہ علی ہی واقف تھی...... کوئی اس سے پوچھتا زندگی اسے کس بھاؤ پڑی تھی۔

وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ نگینہ سے بڑی ثمینہ بندہ علی جو شادی کے بعد ثمینہ صفدر کہلاتی تھی اور چھوٹی نگینہ بندہ علی...... ویسے بہنیں تو وہ تین تھیں۔ سب سے چھوٹی مرینہ جو اپنی ٹین ایج میں ہی اچانک چل بسی تھی۔ اس کا جانا بھی اک عجیب سانحہ تھا۔ انتہائی ناگہانی نہایت دلخراش موت خصوصاً ماں کے لیے جو خود ڈاکٹر تھی مگر بے حد پیاری اور لاڈلی بیٹی کو یکا یک موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر بھی کچھ نہ کر سکی تھی۔ بس دم بخود رہ گئی تھی...... ہکا بکا...... صدمے اور بے یقینی سے مانندِ دیوار چپ!...... اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے...... قطعاً ناقابلِ یقین!...... اس کے لیے تو شوہر کی موت کا صدمہ ہی بہت تھا...... مرینہ کی ناگہانی موت اک اور کوہِ گراں!

نگینہ کی ماں کی طرح اس کا باپ بندہ علی بھی ڈاکٹر تھا۔ دونوں کی محبت کی شادی تھی اور قابلِ رشک ازدواجی زندگی...... بندہ علی نہایت نفیس انسان تھا۔ اچھے انسان اللہ کو بھی پیارے ہوتے ہیں...... کار ایکسیڈنٹ میں بندہ علی جائے حادثہ پر ہی فوت ہو گیا...... مرینہ دنیا میں آنے والی تھی۔ نگینہ کی ماں کو یوں تو تینوں بیٹیوں ہی سے بہت پیار تھا مگر مرینہ کو وہ اپنے دل کے بہت قریب رکھتی تھی۔

مرینہ پندرہ سال کی تھی اور کانونٹ میں زیرِ تعلیم۔ نگینہ اور ثمینہ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ ماں سرکاری اسپتال میں شعبۂ امراضِ نسواں کی سربراہ تھی۔ صبح کو وہ ان تینوں کو ان کے اسکول، کالج ڈراپ کرتی اپنی ڈیوٹی پر چلی جاتی، دوپہر کو انہیں لیتی ہوئی گھر واپس آتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ چاروں نے اکٹھے کھانا کھایا پھر ماں حسبِ عادت کھانے کے بعد چائے پینے لگی اور مرینہ اس کے نزدیک ہی راکنگ چیئر میں جھکولے لیتے ہوئے ایک میگزین کے تازہ شمارے کی ورق گردانی کرنے لگی جو اخبار والا صبح ہی ڈال کر گیا تھا۔ میگزین کی ورق گردانی کے درمیان اس نے لطائف والا صفحہ کھولا اور ماں سے کہا۔ ''ممی! لطیفے سنیں گی۔''

''سناؤ۔'' ماں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اسے پیار سے دیکھ کر کہا۔

وہ ماں کو اونچی آواز میں لطیفے پڑھ کر سنانے لگی۔ تیسرا یا چوتھا لطیفہ تھا جسے ماں کو سنا کر وہ زور سے ہنسی اور اچانک ہی اس کی ہنسی رک گئی۔ راکنگ چیئر ایک دو جھٹکے لے کر ساکت ہو گئی اور مرینہ اپنے دائیں پہلو پر لڑھک سی گئی۔

''کیا ہوا؟'' ماں نے سوچا، اسے اپنے سنائے لطیفے پر بس اتنی ہی ہنسی آئی تھی۔

مرینہ بے حس و حرکت رہی۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔

''مرینہ!'' ماں نے سمجھا وہ مذاق کر رہی تھی۔

مرینہ سر مو نہ ہلی۔

''مرینہ!'' ماں کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

''مری......'' ماں چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کچھ خوفزدہ سی ہو کر اٹھی۔ ''مرینہ!'' اس نے مرینہ کو ہلایا۔ مرینہ کچھ نہیں بولی۔ ماں نے بے تابانہ اس کا جسم ٹٹولا، کلائی اپنے ہاتھ میں لی۔ نبض کی رفتار دیکھنی چاہی۔ نبض ساکت ملی۔ ماں کی فلک شگاف چیخوں نے نگینہ اور ثمینہ کو حواس باختہ ہو کر کمرے سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔

جس نے سنا دم بخود رہ گیا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ موت ہنستی کھلکھلاتی زندگی کو اس سرعت سے بھی نگل سکتی ہے۔ مرینہ کی ناگہانی موت نے ماں کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں کچھ سے کچھ ہو گئی۔ دکھ اسے اندر ہی اندر چاٹ گیا۔ مرینہ کی موت کے بعد وہ تقریباً تین سال زندہ رہی۔ مرنے سے چند ماہ پہلے اس نے ثمینہ کی شادی اپنی ایک دوست کے بیٹے صفدر سے کر دی تھی۔ نگینہ بندہ علی ان دنوں ایم اے کی طالبہ تھی۔ اچھا ہوا جو ماں نے مرنے سے پہلے ثمینہ کی شادی کر دی ورنہ دو نوجوان کنواری لڑکیوں کے لیے اکیلے رہنا مشکل ہو جاتا۔

مشکل تو پھر بھی ہوا۔ ثمینہ کا شوہر صفدر حیات اچھا آدمی ثابت نہیں ہوا حالانکہ شادی سے پہلے صفدر کی والدہ نے جو نگینہ کی ماں کے اسپتال ہی میں نرسنگ سپرنٹنڈنٹ تھیں، ماں سے اپنے بیٹے کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ بہت لائق ہے، بہت جینئس ہے۔ آپ کا بیٹا بن کر رہے گا۔ ثمینہ کو بہت خوش رکھے گا وغیرہ وغیرہ۔ ماں کو اپنی روز بروز کمزور ہوتی صحت اور ٹوٹتے حوصلے کے باعث ثمینہ کی شادی کی جلدی تھی۔ جلدی تو ماں کو نگینہ کی شادی کی بھی تھی۔ اگر موت مہلت دیتی اور زندگی وفا کرتی تو وہ نگینہ کی بھی شادی کر کے اس دنیا سے گئی ہوتی۔

ماں کی موت سے پہلے بھی صفدر آئے دن سسرال میں ہی پڑا رہتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد تو اسے مستقل سسرال میں رہنے کے لیے نگینہ کے اکیلے پن کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ اس کے گھر والے بھی شاید تنگ ہی تھے اس سے۔ انہوں نے مستقل بنیادوں پر اس کے سسرال مستقل ہوجانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ صفدر نکما نوجوان تھا۔ ثمینہ سے اپنی شادی کی بات چیت چلنے پر وہ اپنی ماں کے کہنے پر ثمینہ کی والدہ کے اطمینان کے لیے اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے باپ کے کاروں کے شوروم میں بیٹھنے لگا تھا اور ثمینہ کی والدہ کو یہ بتایا تھا کہ اس شوروم میں وہ ساجھے دار تھا لیکن شادی کے بعد چند ہی ہفتوں میں اس کی اصلیت ظاہر ہوگئی تھی۔ وہ چمکیلی کار جس میں وہ شادی کی بات چیت کے دوران اپنی ماں اور گھر والوں کو لاتا لے جاتا رہا تھا اور شادی کے بعد چند دن اس نے اسی کار میں ثمینہ کو بھی گھمایا پھرایا تھا...... اسی شوروم سے مستعار لی ہوئی کار تھی جو ثمینہ سے اس کی شادی کے چند دن بعد اسی شوروم میں کھڑی کرنا پڑی تھی۔ ماں کو اس کی موت سے پہلے اس دھوکا دہی کا علم ہوگیا تھا۔ اس نے ثمینہ سے کہا تھا۔ ”تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔“

ثمینہ کانوینٹ میں پڑھی تھی۔ تعلیمی پس منظر اچھا تھا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم والے کالج سے گریجویشن کی تھی۔ ماں کی موت کے بعد جب صفدر مستقل طور پر سسرال میں آپڑا تو ثمینہ نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد شہر کے ایک معروف انگریزی اسکول میں ملازمت حاصل کر لی مگر انتظامیہ کی شرط تھی کہ اسے جلد از جلد ٹیچرز ٹریننگ کرنا ہوگی۔ نگینہ ایم اے فائنل کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی تھی۔ دونوں بہنوں نے فیصلہ کیا کہ نگینہ کے امتحانات کے بعد ٹیچرز ٹریننگ کے آئندہ تعلیمی سال میں دونوں مل کر ہی ایڈ کریں گی۔ ثمینہ کی شادی کے بعد اس کے شوہر کے حالات دیکھ کر نگینہ سوچتی، اچھا ہوا جو ماں نے اس کی شادی نہیں کی۔ اگر اس کی شادی ہوجاتی تو خدا جانے وہ کن حالات کا شکار ہوئی ہوتی۔

صفدر نکما ہی ہوتا تو ثمینہ اپنی بدقسمتی پر صبر کر لیتی، کون سا عیب تھا جو اس میں نہیں تھا۔ نشہ، عورت، خیانت، بدکلامی، بدگمانی، دھونس، مار پٹائی۔ وہ جو شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ابتدائی عرصے میں ماں کی حیات کے دوران ایک مہذب اور نرم گو شخص کے طور پر ماں کے سامنے آتا رہا تھا، اب ثمینہ کے ساتھ ایسی بدکلامی کرتا کہ توبہ ہی بھلی۔ اس بے چاری پر ایسی ایسی تہمت طرازی کرتا کہ اس کے آنسو نہ تھمتے۔ چرس پینا اس شخص کا محبوب مشغلہ تھا اور شراب کی بوتل نہ ملتی تو وہ پاگل ہونے لگتا۔ نشہ پورا کرنے کے لیے کبھی اپنی ماں سے پیسے ہتھیا کر لاتا، کبھی کسی بہن بھائی یا دوست سے ادھار مانگتا۔ کبھی قرض کی پیتا تو کبھی بے حیائی سے ثمینہ کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا۔ اس بے چاری کے پاس بھی کیا تھا، ماں کی چھوڑی ہوئی جمع پونجی جس میں نگینہ کا حصہ بھی تھا اور ثمینہ کی تنخواہ کے ساتھ اسی جمع پونجی سے دونوں بہنوں کو گزارہ بھی کرنا تھا۔ عورت کے معاملے میں وہ ایسا بے شرم تھا کہ راہ چلتی لڑکیوں کو ٹہوکے دیتا اور عورتوں کو چھیڑ کر گالیاں کھاتا۔ جن بے حیا عورتوں سے اس کے مراسم تھے ان کا بے حجابانہ ثمینہ سے تذکرہ کرتا۔ خیانت ایسی کہ ثمینہ تو ثمینہ، نگینہ کے بیگ پر بھی ہاتھ صاف کرنے میں عار نہ سمجھتا۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بنا اچھا کھانے پینے کو مانگتا۔ اپنی ہر ضرورت کے لیے بے شرمی سے ثمینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا۔ نشہ کرتا اور نشے میں یا تو ہوش و خرد سے بیگانہ لمبا پڑا سوتا رہتا یا ثمینہ کو گندی گندی گالیاں بکتا اور جوشِ دشنام میں نگینہ کو بھی اول فول بکنے لگتا۔ ثمینہ اس کی حرکتوں پر اعتراض کرتی تو مار پیٹ کرنے لگتا۔ نگینہ بہن کی حمایت میں اسے بچانے آتی تو اس بے چاری کو بھی ہاتھ پڑ جاتے۔ دونوں بہنوں کو اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے دیکھتا تو بدگمان ہوجاتا کہ اسی کے بارے میں کوئی سازش کر رہی تھیں۔ اپنی حرکتوں کے باعث اسے یہ خدشہ بھی رہتا کہ ثمینہ زیادہ عرصہ اسے برداشت نہیں کرے گی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جو عیاشی وہ اس گھر میں کر رہا تھا کہیں اور نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا بات بات پر وہ ثمینہ کو دھمکی بھی دیے جاتا۔ ”تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے اور اگر بھی تم نے مجھے چھوڑنے کی کوشش کی تو میں تمہاری سات نسلوں

کو نہیں بخشوں گا۔''

وہ سات نسلوں کو نہ بخشنے کی دھمکی دیتا تھا۔ ثمینہ اور اسی کی وجہ سے نگینہ کو بھی اپنی موجودہ نسل کی جاں بخشی بھی مشکل نظر آتی تھی جو پیارے وطن کے اس شہر نگاراں میں قریبی رشتوں میں انہی دونوں بہنوں تک محدود تھی۔ ایک سگی خالہ اور ماموں اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ کینیڈا میں رہتے تھے۔ دور پار کے جو رشتے دار وطن میں رہتے تھے انہیں ثمینہ اور نگینہ کی خیر خبر لینے کی نہ فرصت تھی نہ حاجت۔

وقت، حالات اور قربت نے دونوں بہنوں کو یک جان دو قالب بنا دیا تھا۔ ایک مسکراتی تو اس کی مسکراہٹ دوسری کے چہرے پر بھی منعکس ہوتی۔ دکھ میں دونوں ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھ کر روتیں۔ صفدر کی حرکتیں صرف ثمینہ کو آزار پہنچانے کا سبب نہ بنتیں بلکہ نگینہ بھی اس سے یکساں آزردہ ہوتی۔

☆☆☆

فائنل امتحان سے نگینہ کے فارغ ہوتے ہی ثمینہ اور نگینہ نے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ دونوں کو داخلہ مل گیا مگر ثمینہ کو ملازمت جاری رکھنا بھی ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے ٹریننگ کالج میں ایوننگ شفٹ بھی تھی مگر نگینہ کا صبح سے دوپہر تک صفدر کے ساتھ اکیلے گھر میں رہنا بھی نامناسب تھا۔ اس نے بھی ثمینہ کے اسکول میں اعزازی ٹیچر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کر دیا۔ دونوں بہنیں صبح ایک ساتھ اسکول جاتیں۔ اسکول سے چھٹی کے بعد ٹریننگ کالج اور وہاں سے شام کو گھر واپسی...... پھر گھر کے کام اور رات گئے تک پڑھائی۔ اگلی صبح پھر وہی شیڈول۔ معلمی کی عملی تربیت کی خاطر طلبہ کو پڑھانے کے لیے اسباق کی تیاری کا سلسلہ شروع ہوا تو سبق کی منصوبہ بندی اور سمعی و بصری اعانات کی تلاش اور تیاری کے لیے دونوں کو خاصی تگ و دو کرنا پڑتی۔ کبھی کبھی رات رات بھر کام کرنا پڑتا۔

صفدر کو ان دونوں بہنوں کی شبانہ روز مشقت پر ترس آتا نہ ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس کے نکھٹو پن اور آرام پسندی کا وہی عالم تھا۔ اسے بس اپنی ذات سے غرض تھی اور اپنی ضروریات پوری ہونے سے دلچسپی...... کس طرح؟ ...... یہ اس کا مسئلہ نہ تھا...... کسی بھی طرح اسے اچھا کھانا پینا اور اچھا لباس ملنا چاہیے تھا اور منہ کو لگے نشے کی تسکین کے لیے پیسا بھی۔ ثمینہ احتجاج کرتی تو وہ زبردستی اور مار پیٹ پر اتر آتا۔ علیحدہ ہونے کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا۔

ٹریننگ کے آخری دنوں میں ثمینہ امید سے ہوگئی۔ نگینہ خوش ہوئی کہ بہن کے ہاں اولاد ہونے سے زندگی میں کچھ تو تبدیلی آئے گی۔ ثمینہ کو بھی امید بندھی کہ باپ بن کر صفدر کو یقیناً اپنی ذمے داریوں کا کچھ تو احساس ہوگا...... اور شاید اس کے ساتھ ہی صفدر کے رویے میں بھی تبدیلی آجائے گی مگر صفدر نے نہایت بے اعتنائی سے کہا۔ ''تم دونوں بہنیں تو نوکری پر چلی جایا کرو گی اسے پالے گا کون؟''

''تم اور کون۔'' ثمینہ نے کہا۔

''کیا؟'' وہ چونکا۔ ''میں! میں بچہ پالوں گا۔''

''ہاں...... دن بھر فارغ بھی تو پڑے رہتے ہو گھر میں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' صفدر نے نظریں بگاڑ کر اسے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ یا تو میں نوکری کروں اور تم بچہ پالو...... یا پھر میں نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھتی ہوں، تم نوکری کرو۔''

''مجھ سے نوکری وو کری نہیں ہوتی۔''

''نوکری نہیں ہوتی تو شادی کیوں کی تھی؟''

''کیونکہ تمہاری ماں کو اپنی بیٹی کو باندھنے کے لیے ایک کھونٹا چاہیے تھا ورنہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جاتی۔'' صفدر نے کہا۔ وہ عموماً اسی طرح خرافات بکنے کا عادی تھا۔

نگینہ نے جو یہ سب کچھ سن رہی تھی، بعد میں ثمینہ کو سمجھایا۔ ''مت لگا کرو تم اس بدتمیز انسان کے منہ۔''

''وہ انسان حرام کی کمائی کھانے والا ہے۔''

''ہاں......''

''میرا خیال تھا اب کچھ سدھر جائے گا...... اپنی ذمے داری کا احساس ہوگا اسے۔''

''ایسے لوگ خود غرض ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا کسی سے دلچسپی نہیں ہوتی۔'' نگینہ نے ثمینہ سے چھوٹی ہونے کے باوجود اسے بڑوں کی طرح سمجھایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا میرا کیا بنے گا...... کیا پتا کتنی لمبی زندگی ہو۔ کیسے گزاروں گی میں اس شخص کے ساتھ پوری زندگی...... کمبخت، منحوس علیحدگی کے بارے میں بھی تو نہیں سوچنے دیتا...... دھمکیاں دیتا ہے کہ یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا...... میرے خدا! میں کیا کروں۔'' ثمینہ روہانسی ہوگئی۔

''اللہ سے دعا مانگو...... اسی پر بھروسا رکھو ثمینہ۔''

''سارا وقت دعا مانگتی رہتی ہوں نگینہ...... گھر کا کام کرتے ہوئے، بس میں سفر کرتے ہوئے، اسکول میں اپنے فارغ وقت میں...... بس یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ میرے حالات اچھے کردے۔'' ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''انشاء اللہ وہ ضرور سنے گا۔'' نگینہ نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

ٹیچرز ٹریننگ کالج میں دونوں بہنوں کی ٹریننگ مکمل ہوگئی۔ عملی تربیت میں دونوں نے شاندار نتائج حاصل کیے۔ تھیوری کے پرچے بھی ہوگئے۔ ثمینہ کے ہاں بچے کی ولادت بھی اب بس چند ہفتوں ہی کی بات تھی۔ آنے والے مہمان کے لیے دونوں بہنوں نے مل جل کر تیاری کی تھی۔ بیٹا ہوتا یا بیٹی، کپڑوں کے علاوہ باقی تمام ضروریات تو دونوں ہی کی یکساں تھیں۔ گدیلے، تہابلے، تکیے، دودھ کی بوتل، پالنا وغیرہ وغیرہ۔ ثمینہ جب آنے والے بچے کے لیے اپنی لائی ہوئی کوئی چیز صفدر کو دکھاتی تو وہ کوئی خاص دلچسپی نہ لیتا اور ثمینہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی کہ خدا نے اس کی قسمت میں اتنا خودغرض مرد کیوں لکھ دیا تھا۔

بچے کی ولادت کے لیے ثمینہ کو اسپتال بھی نگینہ کو لے جانا پڑا کیونکہ جب ثمینہ کو اسپتال جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو صفدر شراب کے نشے میں مست پڑا تھا۔

ثمینہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ صفدر نے کچھ خاص خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ ثمینہ اور نگینہ کو چڑانے کو بولا۔ ''گھر میں تم دو عورتیں کچھ کم تھیں کیا جو تیسری بھی آگئی۔''

ثمینہ نے جو ماں بن کر نہایت مسرور تھی صفدر کی بات پر کہا۔ ''ہم دو عورتیں کسی اور کی بیٹیاں ہیں، یہ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔''

''مجبوری!'' صفدر نے شانے اچکائے۔

بچی کا نام آئینہ رکھا گیا۔ آئینہ کی پیدائش نے ثمینہ کو ہی نہیں، نگینہ کو بھی اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی تسکین میں مصروف کردیا۔ نگینہ بچی کی دیکھ بھال میں بہن کا پورا ہاتھ بٹاتی۔ صفدر کو اپنے آپ سے فرصت ملتی تو وہ بھی بچی کو دیکھ لیتا۔ زچگی کی چھٹی ختم ہونے کے بعد ثمینہ نے اسکول جانا شروع کیا تو اس کی اور نگینہ کی عدم موجودگی میں آئینہ باپ کے رحم و کرم پر ہوتی۔

ماں بن جانے کے بعد ثمینہ کو یوں لگتا جیسے اس کی زندگی کو ایک واضح مقصد مل گیا تھا۔ صفدر سے تو نہ اسے پہلے کوئی خوشی اور امید تھی، نہ اب مگر آئینہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور امید محسوس ہوتی۔ نگینہ بھی آئینہ سے بہت پیار کرتی۔ اسکول سے ملنے والے اعزازیہ کا بڑا حصہ وہ آئینہ کے لیے ننھی منی چیزیں خریدنے پر خرچ کردیتی۔

بی ایڈ کے امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد نگینہ نے سرکاری شعبے میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ ثمینہ اپنے موجودہ ادارے میں ہی خوش اور مطمئن تھی۔ اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔ اسکول معیاری تھا۔ آئینہ کی تعلیم کا وقت آنے پر وہ اسے بھی اسی اسکول میں داخل کراسکتی تھی۔ انتظامیہ نے اپنے ادارے کے ہر ملازم کو ایک بچہ مفت پڑھوانے کی مراعات دے رکھی تھی جو ادارے کے معیار کے اعتبار سے خاصی پرکشش مراعات تھی۔

نگینہ کو کچھ تگ و دو کے بعد ایک سرکاری تعلیمی ادارے میں سیکنڈری اسکول ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ ثمینہ اگر ایک معیاری انگریزی تعلیمی ادارے میں تدریس کا فخر رکھتی تھی تو نگینہ سرکاری ملازمت حاصل کرکے تحفظِ ملازمت کے ساتھ ایک سرکاری ملازم کو ملنے والی مراعات کا استحقاق رکھتی تھی۔ چودھویں گریڈ میں اس کی تنخواہ بھی معقول تھی۔

صفدر کے روز و شب وہی تھے۔ کھانا، پینا اور ڈکرانا۔ نکھے پن کی اسے ایسی عادت پڑی ہوئی تھی کہ بیٹی کا باپ بن کر بھی وہ اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنے کے بجائے طفیلیہ بن کر گھر میں پڑا رہنا چاہتا۔ ثمینہ جھنجلاتی تو وہ دھونس جماتا۔ ''تم دونوں بہنیں تو بن ٹھن کر اپنے کندھوں پر بیگ لٹکا کر صبح ہی نکل جاتی ہو گھر سے...... تمہاری بچی کو میں پالتا ہوں۔''

''بچی صرف میری نہیں آپ کی بھی ہے۔''

''اچھا!'' وہ حیرانی کا تاثر دیتا پھر ثمینہ کو جلانے اور تڑپانے کو کہتا۔

''چلو...... تم کہتی ہو تو مانے لیتا ہوں۔''

وقت کے ساتھ ساتھ آئینہ سے ثمینہ کی محبت بڑھتی چلی گئی اور صفدر نے اس محبت کو ثمینہ کے خلاف اپنا ہتھیار بنالیا۔ ثمینہ جب اس سے نوکری کرنے اور بری عادات ترک کرنے کو کہتی تو وہ دھمکی دیتا۔ ''آئینہ کو لے کر ایسا گم ہوں گا کہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملوں گا تم لوگوں کو۔'' تم لوگوں سے اس کی مراد ثمینہ اور نگینہ دونوں بہنیں ہوتیں۔ وہ جانتا تھا کہ نگینہ بھی آئینہ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ وہ بچی کو لے کر گم ہوجانے کی دھمکی سے ثمینہ ہی نہیں، نگینہ کو بھی بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا۔

☆☆☆

کالج میں لیکچرر شپ نگینہ کی دیرینہ خواہش تھی جس

کے لیے وہ کوشش بھی کرتی رہتی تھی۔ اپنی صلاحیت اور لگن کے باعث اس نے جلد ہی ایک سرکاری کالج میں ملازمت حاصل کرلی۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے ثمینہ کو نگینہ کی شادی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس نے مناسب رشتے کے لیے اپنے اسکول کے ساتھیوں اور ملنے جلنے والوں سے کہہ رکھا تھا۔ اپنی اس فکر کا اظہار جب وہ نگینہ پر کرتی تو وہ ٹال جاتی اور دل گرفتگی سے کہتی۔ ''تمہیں شادی کر کے کیا ملا جو مجھے مل جائے گا۔''

''تحفظ!''

''کیسا تحفظ؟''

''ایک مرد کے نام کا تحفظ۔''

''فقط نام کا...... اور کچھ دیا اس شخص نے تمہیں سوائے بے عزتی، ذلت، گالم گلوچ اور مار پیٹ کے۔''

''پھر بھی لوگ مجھے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ میں ایک شادی شدہ عورت اور ایک بچی کی ماں ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے غیر شادی شدہ عورتوں کو بے عزتی کی نظر سے دیکھتے ہیں لوگ۔''

''نہیں نہیں...... خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں۔''

''تو پھر؟''

''شادی سے عورت کو اعتماد ملتا ہے۔''

''میں تمہیں بے اعتماد لگتی ہوں؟''

''نہیں نہیں۔''

''یار! کیا حماقت ہے...... شادی سے عورت کو تحفظ ملتا ہے، اعتماد ملتا ہے...... ایک نکھٹو آدمی سے شادی کرنے سے بہتر ہے عورت کنویں میں چھلانگ لگا دے...... اور کچھ نہیں تو چین سکون تو مل جائے گا۔''

''ضروری تو نہیں کہ ہر عورت کا نصیب میرے جیسا ہو...... اچھے مردوں کی بھی کمی نہیں دنیا میں۔''

''ثمینہ! کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ اچھا ہے یا برا...... شروع میں تو تمہارا نکھٹو میاں بھی بڑا اچھا ہی دکھتا تھا۔''

''رسک تو لینا پڑتا ہے...... میں شادی نہ کرتی تو تمہارا اور میرا دل بہلانے کے لیے آئینہ جیسی گڑیا کہاں سے ملتی ہمیں۔''

''ہاں...... بس یہی ایک فائدہ ہوا ہے تمہاری شادی کا۔''

''تو کچھ فائدہ تم بھی حاصل کرلونا۔''

''اگر کوئی اچھا آدمی ملا تو شادی کروں گی ورنہ......''

''ورنہ؟''

''ورنہ...... ہرگز نہیں۔''

''کیا مطلب! شادی نہیں کرو گی۔''

''ہاں۔''

''یہ بے وقوفی مت کرنا...... مس احمدی کو تو دیکھا ہے نا تم نے۔''

''تمہارے جونیئر سیکشن کی ہیڈ؟''

''ہاں وہی...... خود شادی نہیں کی مگر اب ایک ایک کو نصیحت کرتی ہیں کہ شادی ضرور کرنا۔''

''پاگل ہیں۔''

''نہیں خیر عقلمند تو بہت ہیں اور...... پر فیکشنی آئیڈیل۔''

''دیکھ لو...... شادی کرلیتیں تو ان کے دماغ میں بھی تمہارے دماغ کی طرح بھس بھرا ہوتا۔''

''نگینہ!''

''سوری، سوری...... مذاق کر رہی ہوں...... ویسے شادی میں اس وقت تک نہیں کروں گی جب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملے گا۔''

''بائی دی وے، ڈھنگ کے آدمی کا حدود اربعہ کیا ہونا چاہیے؟''

''کماتا ہو، کوئی نشہ نہ کرتا ہو، گالم گلوچ نہ کرتا ہو، مار پیٹ نہ کرے۔''

''یعنی صفدر کا اپوزٹ ہو۔''

''بالکل...... برا مت ماننا...... مجھے تمہارے میاں سے نفرت ہے۔''

''مجھے معلوم ہے...... لیکن میں کیا کرسکتی ہوں نگینہ۔''

''اتنا تو کرسکتی ہو کہ مجھے بار بار شادی کے لیے نہ کہا کرو۔''

''میری مجبوری ہے...... اور اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ امی بھی ہم دونوں کے لیے کتنی فکرمند رہتی ہوں گی...... میں چاہتی ہوں تم جلد سے جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔''

''ہاں تاکہ اس گھر میں تمہیں تمہارے میاں کی مار پیٹ سے بچانے والا کوئی نہ رہے۔''

''میری قسمت میں اگر یہی ہے نگینہ تو تم میری قسمت سے کب تک بچا سکتی ہو مجھے۔'' ثمینہ نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''اور ہاں، ایک ضروری بات اور......''

''تمہارے لیے میری شادی کی فکر کے علاوہ بھی کوئی اور ضروری بات ہوسکتی ہے۔'' نگینہ نے اپنی مسکراہٹ سے ثمینہ کی دل گرفتگی دور کرنی چاہی۔

''مجھے اس گھر کے بارے میں بھی صفدر کی نیت سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟" نگینہ چونکی۔ "کچھ کہا؟"

"امی کی زندگی سے انہیں معلوم ہے کہ یہ گھر امی کے نام ہے پھر بھی بار بار انجان بن کر پوچھتے ہیں کس کے نام ہے؟"

"ہاں، یہ تو تم نے مجھے بتایا تھا مگر اس میں پریشانی کی کیا بات؟"

"ایسے سوال بلا سبب اور بلا مقصد نہیں کیے جاتے جبکہ اس کا ہر مرتبہ انہیں ایک ہی جواب بھی مل رہا ہے کہ امی کی زندگی میں ان کے نام تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بہنوں کی وارثت۔"

"صفدر بھائی کو اس سے کیا لینا دینا۔"

"دینے کو تو ان کے پاس ہے ہی کیا، ہمیشہ لینے کے چکر میں ہی رہتے ہیں...... کل پھر یہی بات پوچھ رہے تھے...... جب وہ گھر کی بات کرتے ہیں تو میں سخت پریشان ہو جاتی ہوں۔"

"کیوں...... کیوں پریشان ہو جاتی ہو؟"

"کیونکہ یہی ایک ٹھکانا ہے ہمارے پاس جہاں ہم عزت سے سر چھپائے بیٹھے ہیں اور یہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ تمہارا گھر بھی ہے۔"

"مت پریشان ہو...... کچھ نہیں ہوتا۔"

"تم نہیں جانتیں نگینہ وہ کیسا بدفطرت آدمی ہے۔"

"تمہارے لیے پہلے ہی فکریں اور پریشانیاں کچھ کم ہیں جو تم اندیشوں سے پریشان ہو رہی ہو...... جب کوئی بات ہو گی تو دیکھا جائے گا۔" نگینہ نے بہن کو تسلی دی۔

☆☆☆

ثمینہ کا اندیشہ جلد ہی حقیقت بن گیا۔ صفدر نے ثمینہ پر مکان فروخت کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ صفدر کے لیے ثمینہ کے ساتھ جھگڑا فساد کرنے کو پہلے ہی کچھ کم بہانے تھے جو ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

"امی کے انتقال کے بعد یہ گھر صرف میرا نہیں، ہم دونوں بہنوں کا ہے۔ جب تک نگینہ کی مرضی بھی نہ ہو اسے بیچنے کی یا اسے اس کا حصہ نہ دے دیا جائے، میں اکیلے یہ گھر کیسے بیچ سکتی ہوں؟" ثمینہ نے گھر بیچنے کے لیے صفدر کے اصرار پر کہا۔

"گھر بیچ کر اس کا حصہ اسے دو وہ اپنا حصہ خود لو۔" وہ بولا۔

"اور رہیں گے کہاں؟"

"جب نگینہ کی شادی ہو جائے گی اور اسے اس کا حصہ دینا پڑے گا تب بھی تو کہیں رہو گی...... وقت سے پہلے کام ہو جائے تو اچھا ہے۔"

آئے دن کی تھکا دینے والی اور مار پیٹ سے تنگ آ کر نگینہ نے ثمینہ سے کہا۔ "بیچ دو گھر تاکہ یہ جھگڑا فساد تو ختم ہو۔ اب تو گھر سے باہر نکلتے بھی شرم آنے لگی ہے...... کیا سوچتے ہوں گے محلے والے اس گھر میں روزانہ ہی کسی نہ کسی بات پر دنگا فساد رہتا ہے۔"

"یہی میں بھی سوچتی ہوں نگینہ...... اور مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی بھی اجیرن کر رکھی ہے اس شخص نے۔"

"گھر فروخت کروانے کا مقصد اور کچھ بھی نہیں سوائے تمہارے حصے کی رقم ہتھیانے کے۔" نگینہ نے کہا۔

"جانتی ہوں...... اس شخص کے ساتھ رہتے رہتے مجھے اس کی فطرت کا اچھی طرح پتا چل گیا ہے۔"

"تم ان سے پوچھو تو گھر فروخت کرنے کے بعد رہیں گے کہاں؟"

"میں ابھی سے تمہیں بتا دوں، اس کے پاس سو جواب ہوں گے میرے اس سوال کے...... پہلے تو وہ مجھے یہ چکر دے گا کہ اپنا گھر خرید لیں گے...... پھر یہ کہے گا کرائے پر لے لیں گے...... پھر کچھ اور...... پھر کچھ اور۔"

"تم ذرا پوچھ کر تو دیکھو کیا کہتے ہیں۔"

"پوچھ لوں گی۔"

اگلی بار جب صفدر کی طرف سے پھر گھر فروخت کرنے کا تقاضا آیا تو ثمینہ نے کہا۔ "گھر بیچ کر ہم رہیں گے کہاں؟"

"اپنا گھر خرید لیں گے۔"

"جتنی رقم میرے حصے میں آ سکتی ہے اس سے ڈھنگ کا کوئی گھر خرید سکیں گے ہم؟"

"چھوٹا لے لیں گے۔"

"اور اگر چھوٹا بھی نہ ملا تو؟"

"کرائے پر لے لیں گے کوئی گھر۔"

"ہر مہینے کرائے کی علت رہے گی۔"

"تو کیا ہوا...... لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے نہیں ہیں کیا...... آدھا کرایہ نگینہ دے دیا کرے گی۔"

"کیوں؟ وہ کیوں دے گی؟"

"اگر وہ ہمارے ساتھ رہے گی تو اسے دینا پڑے گا ورنہ......"

"ورنہ؟"

"وہ اپنا کوئی بندوبست کرے۔"

"جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی اسے رہنا تو ہمارے ہی ساتھ ہے۔"

"ساتھ رہنا ہے تو کرایہ بھی دے۔"

"اسی لیے کہتی ہوں کہ جب تک نگینہ کی شادی نہیں ہو جاتی یہ گھر نہ بیچا جائے تو اچھا ہے۔"

"پھر وہی بات!" صفدر جو گھر فروخت کرنے پر ثمینہ کی آمادگی دیکھ کر کچھ تمیز سے بات کر رہا تھا، یکایک بگڑ گیا۔ "کتنی دفعہ کہا ہے مجھے غصہ دلانے کی بات نہ کیا کرو۔"

"اس میں غصے کی کیا بات۔"

"غصے کی نہیں تو پھر اور کیا...... تم چاہتی ہو نگینہ کی شادی کے بعد اس کا شوہر آکر ہم سے کہے نکلو اس گھر سے...... اس گھر میں میری بیوی کا بھی حصہ ہے۔ یا پھر نکالو میری بیوی کا حصہ...... یا بیوی کے ساتھ وہ بھی یہیں آکر دھرنا دے کر بیٹھ جائے۔"

"کوئی بات نہیں...... آخر آپ بھی تو رہ ہی رہے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ ثمینہ پر آنکھیں نکالتا سامنے آکھڑا ہوا اور اس کے بال پوری شدت سے مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا۔ "طعنہ دیتی ہے مجھے اس گھر میں رہنے کا۔"

بال کھینچے جانے کی تکلیف سے ثمینہ کے منہ سے سسکاری نکلی۔ بہن کو تکلیف میں دیکھ کر نگینہ اس کی مدد کو آئی۔ "کیا کرتے ہیں صفدر بھائی۔"

"تم درمیان میں نہ آیا کرو...... ہٹ جاؤ۔" صفدر نے اسے پرے دھکیلا۔ وہ لڑکھڑائی اور دیوار سے جا ٹکرائی۔ ثمینہ اسے سنبھالنے کو آگے بڑھی۔ صفدر دونوں کو گھورتا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

ناچار دونوں بہنوں کو گھر فروخت کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔ دونوں بہنوں کے حصے میں یکساں رقم آئی۔ اپنی رہائش کے لیے بقول صفدر "عارضی طور پر" ایک گھر کرائے پر لے لیا گیا۔ نگینہ کو پیشگی اور رواں ماہ کے کرائے میں نصف رقم ادا کرنی پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو صفدر اسے اور ثمینہ کو طعنے دے دے کر کھا جائے گا۔ ویسے بھی وہ اپنے کانوں سے صفدر کی یہ بات سن چکی تھی کہ اس کے اور ثمینہ کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہنے کی صورت میں اسے کرایہ دینا پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ پھیلا کر تقاضا کرتا، نگینہ نے اپنے حصے کا کرایہ ادا کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

مکان کی فروختگی کے بعد کچھ عرصہ صفدر کا موڈ غیر معمولی طور پر خوشگوار رہا۔ ثمینہ سے وہ بڑی نرمی سے بات کرتا۔ نگینہ کے ساتھ بھی اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ دونوں جانتی تھیں کہ یہ تبدیلی عارضی تھی۔ ثمینہ کے حصے میں آنے والی رقم اس تبدیلی کا باعث تھی۔ کرائے کے مکان میں کچھ دن گزارنے کے بعد ثمینہ نے اس سے کہا۔ "اب کوئی مکان دیکھیں خریدنے کو۔ بینک میں رکھی رقم اتنی تیزی سے نہیں بڑھتی جتنی تیزی سے مکانوں کی قیمتیں چڑھتی ہیں۔"

"یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں؟" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"تکلیف تو کوئی نہیں مگر ہر ماہ کرایہ کہاں سے دیں گے؟"

"تمہاری تنخواہ سے اور کہاں سے...... آدھا کرایہ تم دینا آدھا تمہاری بہن دے گی۔"

"اس کی شادی ہو گئی تو پھر تو پورا ہم ہی کو دینا پڑے گا...... بہتر ہے اپنا گھر خرید لیا جائے۔"

"جب اس کی شادی ہو گی دیکھا جائے گا...... فی الحال یہی گھر ٹھیک ہے۔" وہ ترش روئی سے بولا۔

ثمینہ اور نگینہ دونوں ہی کو صفدر کی نیت کے کھوٹ کا اندازہ تھا۔ وہ انہیں کرائے کے مکان میں ڈال کر مکان کی فروخت سے ثمینہ کے حصے میں آنے والی رقم پر گھات لگائے بیٹھا تھا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ یہ شخص یہی کرے گا۔" ثمینہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

"تم پریشان مت ہو۔" نگینہ نے اسے تسلی دی۔

"کیسے نہ ہوں پریشان نگینہ...... بچی کا ساتھ ہے..... کل اس کی تعلیم بھی شروع ہونی ہے اور اخراجات بھی ہوں گے۔ اس آدمی کو تو اپنی عیاشیوں سے ہی فرصت نہیں...... یہ میرے پیسوں پہ دانت گاڑے بیٹھا ہے...... نہیں دوں گی تو یہ اپنی عادت کے مطابق جھگڑا فساد شروع کر دے گا...... اس کی ہنگامہ بازیوں سے تنگ آکر ہم ابی کا گھر فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے کہ نہیں...... اب وہی حربہ یہ مجھ سے پیسے اینٹھنے کے لیے بھی آزمائے گا۔"

"ایک پیسا مت دینا اسے۔"

"اب تک دے ہی رہی ہوں کہ نہیں۔"

"تم کہنا یہ پیسے مکان خریدنے کے لیے ہیں۔"

"مکان خریدنے کے لیے! وہ تو کفن کے پیسے بھی نہ چھوڑے۔" ثمینہ نے تلخی سے کہا پھر روہانسی ہو کر بولی۔ "میری جان بھی تو نہیں چھوڑتا۔ کیا بتاؤں کیسی کیسی دھمکیاں دیتا ہے...... جانتا ہے کہ اکیلی عورتیں ہیں کیا بگاڑ لیں گی میرا۔ خدا کرے تمہاری شادی کسی اچھے آدمی سے

"ہو جائے تا کہ تم تو اس جہنم سے نکلو۔"

"تم کب تک رہو گی اس جہنم میں...... ایک بار ہمت کر کے اس سے علیحدگی کا مقدمہ دائر کر دو۔"

"میں ڈرتی پہلے بھی تھی نگینہ...... آئینہ کے بعد اور زیادہ ڈرنے لگی ہوں۔ یہ آدمی میرے ساتھ کچھ الٹا سیدھا کر دے یا بچی کو لے کر کہیں غائب ہو جائے تو میں اپنی بچی کو کہاں ڈھونڈتی پھروں گی۔"

"وہ اسی لیے شیر بنتا ہے...... جانتا ہے کہ تم ڈرتی ہو۔"

"کیا کروں...... ڈرنا میرا مقدر بن گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے میں اپنے حصے کی رقم سے کوئی گھر خرید لوں، تم وہاں رہ سکتی ہو۔"

"ہرگز نہیں، ایسی غلطی بھی نہ کرنا...... ایک مرتبہ یہ اگر تمہارے گھر میں گھس گیا تو نکلنے کا نام نہیں لے گا...... یہ تو امی کے گھر سے بھی نہ نکلتا اگر اسے میرے حصے کی رقم کی لالچ نہ ستا رہی ہوتی۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم۔"

"میں تو بس ہر وقت خدا سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔"

"ایک ہی سے نمٹنا مشکل ہے ہم دونوں کے لیے...... دو سے کون نمٹے گا بابا۔"

"خدا کرے تمہیں کوئی بہت اچھا آدمی ملے اور پیارا سا گھر جہاں محبت ہو، سکون ہو۔" ثمینہ کی تشنہ تمنائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں تیرنے لگیں۔

☆☆☆

ثمینہ اور نگینہ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ صفدر نے بہانے بہانے ثمینہ سے پیسے مانگنے شروع کر دیے۔ ہاتھ تو وہ پہلے بھی پھیلائے رکھتا تھا مگر اب ڈیمانڈ بڑھ گئی تھی۔ سو، پچاس کے بجائے ہزار، دو ہزار کا مطالبہ ہونے لگا۔ ثمینہ انکار یا احتجاج کرتی تو وہ اوچھے ہتھیار استعمال کرتا۔ کبھی دھونس، دھمکی، کبھی گالم گلوچ اور مار پٹائی۔ آئینہ جو بڑی ہو رہی تھی، باپ کی یہ حرکتیں دیکھ کر سہم جاتی اور رونے لگتی۔

"آپ کو اس معصوم پر بھی رحم نہیں آتا۔" ثمینہ اپنی اذیت بھول کر آئینہ کو بازوؤں میں چھپا لیتی۔

"مجھے تو آتا ہے تجھے نہیں آتا۔" صفدر حسب عادت تو تڑاق پر اتر آتا اور ثمینہ کے سینے سے لگی آئینہ کو دیکھتے ہوئے ثمینہ کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا۔ "لا جلدی نکال پیسے ورنہ...... اسے۔" وہ آئینہ کی طرف انگلی اٹھاتا۔ "لے کر چلا جاؤں گا کہیں۔"

"کہاں ہیں میرے پاس پیسے۔"

"مجھے سبق پڑھاتی ہے...... بینک میں تیرے باپ کے پیسے رکھے ہیں۔"

"وہ خرچ کر دیں گے تو آگے کیا ہوگا...... اپنے گھر سے کرائے کے مکان میں تو لا کر ڈال دیا...... کیا اب سڑک پر بٹھانے کا ارادہ ہے؟"

"چل چل زیادہ فلسفہ مت بول...... پیسے دے پیسے۔"

"پیسے بینک میں ہیں۔"

"بینک سے نکالے نہیں جا سکتے کیا...... چیک لکھ دے چیک...... کیش کرا لوں گا...... جلدی کر...... ورنہ چیخیں مار مار کر رو دے گی تیری بیٹی۔"

"آپ کی بھی ہے۔"

"چل تو کہتی ہے تو مان لیتا ہوں کہ میری بھی ہے...... تبھی تو اسے رلانا نہیں چاہتا ہوں...... لیکن تو مجھے مجبور کر رہی ہے۔"

ثمینہ کو اسے چیک لکھ کر دینا پڑتا اور وہ بڑی بے شرمی سے دانت نکالنے لگتا۔ "یہ ہوئی نا بات...... کیوں خواہ مخواہ پٹتی ہے، پہلے ہی دے دیا کر۔"

ثمینہ کو صفدر سے کراہیت محسوس ہونے لگتی۔ کیا بدفطرت آدمی تھا وہ۔ ثمینہ اسے کبھی قابل رحم لگتی، کبھی اس کی بزدلی پر غصہ آنے لگتا۔ ایسے آدمی کی دھمکیوں سے ڈرنے کے بجائے اس کے منہ پر تھوک کر اس سے اپنا پیچھا چھڑا لینا چاہیے تھا ثمینہ کو۔ صفدر کے ہاتھ اب اس کی ایک ایسی کمزوری آ گئی تھی جس پر وہ اسے بہ آسانی تمام زندگی بلیک میل کر سکتا تھا اور وہ کمزوری تھی آئینہ!

"میرے ساتھ زیادہ ٹرٹر کرے گی تو آئینہ کو لے کر ایسا گم ہوؤں گا کہ تو ساری زندگی اس کی صورت دیکھنے کو ترستی رہے گی۔" اب وہ اپنی مطلب برآری کے لیے اسے اکثر یہ دھمکی دینے لگا تھا۔ اس کی اس دھمکی پر تو ثمینہ بینک میں رکھی رقم کیا اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔

ثمینہ اور ثمینہ کے ساتھ نگینہ کو بھی نفسیاتی دباؤ میں رکھنے کے لیے صفدر کے دھمکی، دھونس، گالم گلوچ اور مار پیٹ کے علاوہ اور بھی طریقے تھے۔ کچن میں برتنوں کو زور زور سے پٹخنا بلکہ اکثر چینی اور کانچ کے برتنوں کو توڑ بھی دینا۔ فرنیچر کو ٹھوکریں مارتے ہوئے چلنا یا فرش پر زور زور سے گھسیٹ کر تیز آواز سے دوسروں کے اعصاب شل کر دینا۔ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے بند کر کے سننے والوں کی سماعت کو اذیت سے دوچار کرنا۔ ریڈیو اور ٹی وی اتنی اونچی آواز میں چلانا کہ قبروں میں سوئے مردے

بھی جاگ اٹھیں۔

ثمینہ اور نگینہ کے لیے بس وہی وقت اچھا ہوتا جو وہ گھر سے باہر گزار آتیں۔ گھر تو ان کے لیے جلتی دوزخ کے مانند بن گیا تھا۔ ثمینہ اکثر نگینہ سے کہتی۔ ''میری وجہ سے تمہیں بھی اس جہنم میں جلنا پڑتا ہے۔''

نگینہ دیکھ رہی تھی کہ گھر فروخت ہونے اور کرائے کے مکان میں شفٹ ہونے کے بعد سے صفدر کا رویّہ بد سے بدتر ہوتا چلا جارہا تھا۔ ثمینہ کے ساتھ اب وہ اس سے بھی نہایت اہانت سے پیش آتا۔ ذرا ذرا سی بات پر روک ٹوک کرتا۔ بدتمیزی کرنے کو اسے بس چھوٹا سا بہانہ درکار ہوتا۔ ایسے ایسے حیلے بہانوں سے بدتمیزی اور فساد کرتا کہ نگینہ کو اس پر غصہ آنے کے ساتھ اپنے اوپر شرم بھی آنے لگتی۔ مثلاً یہ بھی کوئی بات ہوتی کہ وہ باہر سے گھر آئی تو صفدر اس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ ''جوتے باہر جھاڑ کر گھر میں آیا کرو۔ اتنی مٹی اپنے جوتوں کے ساتھ لاتی ہو جیسے کوئی دو سال کی بچی ہو۔''

وہ شرمندہ ہوکر اپنے پاؤں یکے بعد دیگرے جوتے سمیت اٹھا کر جوتے کا تلا دیکھنے پر مجبور ہوجاتی۔ کبھی اسے نگینہ کے زور سے بولنے پر اعتراض ہوتا کبھی الگنی پر سوکھتے دھلے کپڑوں کو کھینچ کھینچ کر نیچے گراتے ہوئے بڑبڑاتا۔

''آتے جاتے سر پر لگ رہے ہیں۔ اس بدتمیز عورت کو اتنا خیال نہیں کہ کپڑے سوکھ گئے ہیں تو انہیں اتار لیا جائے۔'' کبھی وہ اس کے کھانے پینے پر روک ٹوک کرتا کبھی زیادہ دیر باتھ روم میں رہنے پر!

ایک روز اس نے عاجز آکر کہہ ہی دیا۔ ''صفدر بھائی! آپ کو میری ہر بات پر اعتراض کیوں ہونے لگا ہے؟''

''کیونکہ یہ میرا گھر ہے۔''

''کرایہ میں بھی دیتی ہوں۔''

''نہیں چاہیے تمہارا کرایہ..... کرلو اپنا بندوبست کہیں اور۔''

نگینہ شاکڈ رہ گئی۔ صفدر کے بارے میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سفلی فطرت کا آدمی تھا، نگینہ کا دل دکھنے لگا۔ ایک تو کوئی رشتہ بھی نہیں آرہا تھا اس کے لیے۔ رشتہ آتا بھی کیسے..... رشتہ آتا ہے لوگوں سے میل جول اور تعلقات رکھنے سے۔ ان دونوں بہنوں کا تو یہ عالم تھا کہ صفدر کی وجہ سے کسی کو گھر بلاتے بھی ڈرتی تھیں۔ اس کا کچھ بھروسا تھوڑی ہوتا کب اس کے دماغ کی چابی گھوم جائے اور وہ اول فول بکنے کھڑا ہوجائے۔ اسے نہ اپنی عزت پیاری تھی نہ دوسروں کی بلکہ دوسروں کی عزت تو وہ مٹی میں رولنے کی تلاش میں رہتا تھا۔ ثمینہ کو اس کی ساتھی نگینہ کے لیے رشتے بتاتی رہتی تھیں۔ اس نے ایک دو کو گھر بلایا بھی تھا۔ گھر کے مرد کو بھی ان سے ملوانا پڑا۔ صفدر نے جان بوجھ کر ان کے سامنے ایسی باتیں کیں کہ آنے والے ایسے گئے کہ پلٹ کر نہیں آئے۔ ثمینہ نے ایک دو کو بلانے کے بعد پھر کسی کو بلانے کی ہمت ہی نہیں کی۔ اب وہ اکثر نگینہ سے کہتی۔ ''دعا کرتی ہوں تمہارے لیے کوئی فرشتہ آجائے۔'' نگینہ کو بہن کی بے بسی پر ترس آنے لگتا۔ شادی رشتے آنے سے ہوتی ہے اور رشتے گھر میں ملتے ہوتے ہیں گھر سے باہر نہیں...... اور گھر میں صفدر جیسا بدخواہ بیٹھا تھا۔ ایسا بدفطرت تھا وہ کہ جب ثمینہ کی ایک کولیگ کے رشتے داروں میں سے نگینہ کے لیے ایک رشتہ آیا تو نگینہ کے ان کے سامنے چائے لے کر آنے پر اس نے ان لوگوں کے سامنے ہی کہا۔

''پیالیاں اچھی طرح دھو بھی لی تھیں یا برسوں پرانی رکھی پیالیاں یونہی نکال کر لے آئی ہو؟'' نگینہ مہمانوں کے سامنے شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی اور جب دوسرا رشتہ آیا تو اس دن وہ شراب کے نشے میں ان کے سامنے آن بیٹھا تھا۔ حالانکہ ثمینہ نے اسے پیشگی باخبر کر رکھا تھا کہ مہمان آنے والے ہیں وہ ان سے ملنے اور ان کے جانے کے بعد اپنا شوق پورا کرے مگر اسے کسی کی عزت کا کب پاس تھا۔ پی کر ان کے سامنے آیا اور وہ اول فول بکیں کہ آنے والے بے چارے اپنی بغلیں جھانکنے لگے۔ اب ثمینہ کسی کو گھر بلانے کی ہمت ہی نہیں کرپاتی تھی۔ نگینہ کی شادی کے لیے بس دعائیں ہی کرتی رہتی تھی۔ رشتے آسمان پر طے ضرور ہوتے ہیں مگر برستے نہیں۔ بندھن زمین پر ہی بندھتا ہے۔ دو گھرانوں کے افراد کے مل بیٹھنے سے...... ہاں...... کبھی کبھی فقط دو افراد کی باہمی رضامندی سے بھی...... مگر نگینہ اس قسم کے دو افراد میں سے نہ تھی۔

صفدر کی حرکتوں سے تنگ آکر نگینہ کبھی کبھی کسی ہاسٹل میں شفٹ ہوجانے کا ارادہ کرنے لگتی۔ ہاسٹلوں کی کمی نہیں تھی مگر ثمینہ کے اکیلے ہوجانے کے خیال سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا پاتی مگر کرائے کے مکان میں شفٹ ہونے کے بعد صفدر کی آئے دن کی دل آزار باتوں نے نگینہ کو یہ دعا مانگنے پر مجبور کردیا کہ خدا اس کے لیے غیب سے کوئی ایسی سبیل نکالے کہ وہ صفدر جیسے کم ظرف اور نیچ فطرت انسان کے رحم و کرم پر نہ رہے۔

☆☆☆

خدا کبھی کبھی اپنے بندوں کی دعائیں سننے کے لیے

بہت نزدیک ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی وقت تھا جب نگینہ کی دعا فوراً سنی گئی۔ کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ انگلستان کی ایک یونیورسٹی میں پاکستان کے لیے اسکالر شپس کا اعلان ہوا۔ نگینہ نے بھی نہ چاہتے ہوئے درخواست دے دی۔ اس کا نہ چاہنا محض ثمینہ کے خیال سے تھا۔ اس بے چاری کا نگینہ اور آئینہ کے سوا اور تھا کون۔ شوہر تھا تو وہ بھی جان کا وبال۔ آئینہ ابھی ماں کا دکھ درد بانٹنے کے لائق نہ تھی، ایک نگینہ ہی تھی جس سے وہ اپنا دکھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتی تھی مگر جب مشیتِ ایزدی ہوجائے تو انسان کی ساری سوچ بچار دھری رہ جاتی ہے۔ ڈوریاں ہل جاتی ہیں اور انسان کٹھ پتلیوں کے مانند ان ڈوریوں کی حرکت پر ناچنے لگتا ہے۔ مشیتِ ایزدی بھی تھی کہ نگینہ اسکالر شپ کے لیے امیدوار بن جائے۔ اس نے اسکالر شپ کے لیے درخواست دے دی مگر اسے یقین نہ تھا کہ اسکالر شپ مل جائے گی۔ وطنِ عزیز میں ایک سے بڑھ کر ایک گوہرِ نایاب پڑا تھا۔ گو اس کا اپنا تعلیمی ریکارڈ بھی شاندار تھا مگر وہ اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی کا شکار نہ تھی۔ جانتی تھی کہ اسکالر شپ کے لیے اسے سخت مقابلے کا سامنا ہوگا۔

نگینہ کو اسکالر شپ مل گئی مگر وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ ثمینہ کو مکمل طور پر صفدر جیسے خود غرض اور بے رحم آدمی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا نگینہ کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ہزاروں اندیشے اور خدشات تھے۔ خدا جانے وہ بے رحم شخص ثمینہ کے اکیلے رہ جانے پر اس کے ساتھ کیا کرے۔ ابھی تو وہ تھی بہن کے ساتھ اس کی مدافعت کے لیے۔ اس کے جانے کے بعد اسے صفدر کی مار پیٹ اور تشدد سے کون بچائے گا...... کون اس کا دکھ درد بانٹے گا...... کون اس کی سنے گا...... کون اس کے آنسو پونچھے گا...... کون اس کی ہمت بندھائے گا...... کون اسے یہ امید دلائے گا کہ آئینہ اس کا سہارا بنے گی۔ نگینہ کے دل کو واہموں نے ڈرانا شروع کردیا...... ایسا نہ ہو کہ وہ بیرونِ ملک جاکر ایسے حالات میں پھنس جائے کہ واپس ہی نہ آسکے...... اور اگر آجائے تو ثمینہ اس بے رحم آدمی کے ظلم و جفا کی تاب نہ لاکر دنیا ہی سے جاچکی ہو...... وہ دوبارہ کیونکر دیکھ پائے گی اپنی مظلوم اور قابلِ رحم بہن کو...... بھری دنیا میں ایک وہ ہی تو تھی اس کی اپنی۔

خاصی سوچ بچار کے بعد نگینہ نے اسکالر شپ نہ لینے کا فیصلہ کیا مگر سب سے پہلے تو ثمینہ ہی نے اس کے اس ارادے کی پُرزور مخالفت کی پھر گھر سے باہر اس کے دوستوں اور بہی خواہوں نے اسے اپنا ارادہ بدلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔

''پاگل ہوئی ہو کیا جو ایسا سنہری موقع گنوانا چاہتی ہو۔'' کالج میں اس کی بہترین دوست نورالعین نے کہا۔

''نگینہ! ہم سب کو تو تمہاری قسمت پر رشک آرہا ہے اور تم اسکالر شپ لوٹا کر کفرانِ نعمت کرنا چاہتی ہو۔'' اس کی ایک کولیگ مس ثمرہ نے جو خود بھی اسکالر شپ کی امیدوار رہی تھیں، حیرت سے کہا۔

''مس نگینہ! یہ بے وقوفی مت کیجیے گا...... زندگی میں ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے۔'' پرنسپل نے سمجھایا۔

''میڈم! کچھ ڈومیسٹک پرابلمز ہیں۔'' نگینہ نے ان سے کہا۔

''ارے! آپ پر تو کوئی ذمے داری بھی نہیں...... پوچھ سکتی ہوں کیا ڈومیسٹک پرابلمز ہیں۔''

''میری بہن اکیلی رہ جائیں گی۔''

پرنسپل بے ساختہ ہنسیں۔ ''تم جیسی سمجھدار اور لائق استاد سے مجھے ایسے جواب کی امید نہیں تھی...... ارے بھئی بہن تمہاری کوئی بچی تو نہیں ہیں...... تم سے بڑی ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہے۔ تمہاری اپنی...... تمہیں انگلینڈ کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ محکمہ تمہیں مبارکباد کا پیغام بھجوا چکا ہے۔ چھٹی دینے کو تیار ہے اور کیا چاہیے! کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو اس موقع کو گنوائے گا۔''

لوگوں کی باتوں نے اسے کشمکش میں مبتلا کردیا۔

ثمینہ نے اسے سمجھایا۔ ''قسمت سے ملتے ہیں ایسے سنہری موقعے۔ نگینہ! میں جانتی ہوں تم میری وجہ سے نہیں جانا چاہتیں لیکن...... تمہاری اس قربانی سے بھی تو میرا مقدر نہیں بدل جائے گا...... باہر جانے سے شاید تمہیں کوئی ایسا اچھا آدمی مل جائے جس سے شادی کرکے تم وہیں سیٹل ہوسکو۔ اگر ایسا ہوگیا تو کم از کم مجھے تمہاری طرف سے تو اطمینان اور خوشی نصیب ہوگی۔''

''محکمہ مجھے اس یقین دہانی پر باہر جانے کی اجازت اور چھٹی دے گا کہ میں واپس آکر سرکار کی خدمت کروں گی۔''

''ہوسکتا ہے کوئی ایسا شخص مل جائے تمہیں جسے اس کے محکمے نے بھی پاکستان آکر سروس کرنے کا پابند کر رکھا ہو۔''

''سوری! میں خواب نہیں دیکھتی۔''

''میں تو دیکھتی ہوں نگینہ...... تمہارے اس جہنم سے

نکلنے کا خواب..... میرے خوابوں پر ہی تو صفدر کا بس نہیں ورنہ تو اس نے مجھے ہر معاملے میں بے بس کر رکھا ہے.......

پلیز نگینہ! تم اس موقع کو مت گنواؤ...... اگر کوئی اور راستہ خدانخواستہ نہ بھی نکلا تمہارے لیے باہر جا کر تو کم از کم اس جہنم سے تو کچھ عرصے کے لیے نکل سکو گی جہاں برتنوں اور دروازے کھڑکیاں پٹخنے کی آوازیں ہی انسان کے اعصاب شل کر کے رکھ دیتی ہیں...... تمہیں میری قسم نگینہ!''

''مجھے آئینہ بہت یاد آئے گی۔'' نگینہ نے عذر تراشا۔

''ہو سکتا ہے تمہارے ذریعے آئینہ کے مستقبل کے لیے بھی کوئی راستہ بن جائے۔'' ثمینہ کی نگاہوں میں التجا تھی۔

بالآخر نگینہ مجبور ہو گئی۔

☆☆☆

بیرونِ ملک گزرا ہوا وہ وقت نگینہ کی آئندہ زندگی میں حسین و دلکش یادگار وقت رہا۔ یونیورسٹی میں اسے مختلف بر ظانوی ہی نہیں بھانت بھانت کی قومیتوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ثمینہ اور آئینہ اسے بہت یاد آئیں۔ ثمینہ کی طرف سے اسے فکر بھی رہتی۔ خدا جانے صفدر اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہوگا۔ لاشعور میں چھپا خوف اور فکر ڈراؤنے خواب بن کر اکثر اس کی نیند اڑانے کا موجب بنتے۔ ایک بار آنکھ کھلتی تو دوبارہ لگنا محال ہو جاتی۔ ثمینہ سے ہفتے میں ایک دو مرتبہ فون پر بات چیت ہو جاتی۔ اس کے حالات بدستور وہی تھے۔

یونیورسٹی میں اس کی گہری دوستی پامیلا واکر سے ہوئی۔ مقامی طالبہ تھی۔ ماں اس کے بچپن ہی میں اسے باپ کے پاس چھوڑ کر دوسرے آدمی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ بعد میں اس کے باپ نے ماں کو طلاق بھی دے دی تھی۔ پامیلا باپ کے پاس ہی رہی۔ باپ نے بھی ایک عورت رکھ لی۔ پامیلا نے علیحدہ رہنا شروع کر دیا۔ ایک نوجوان سے دوستی ہوئی۔ دونوں نے منگنی بھی کر لی۔ شادی سے چند ماہ قبل اس کا منگیتر روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا۔ اس سانحے کو دو سال ہو گئے تھے۔ پامیلا اپنے منگیتر کو بھول نہیں پائی تھی۔ فارغ وقت میں جب وہ اور نگینہ اکٹھی بیٹھتیں تو پامیلا زیادہ تر اپنے آنجہانی منگیتر ہی کی باتیں کرتی رہتی۔ نگینہ بھی اس سے اپنے دل کی باتیں کر لیتی۔

''اپنی بہن اور بھانجی کو بھی یہاں بلا لو...... اس شخص کو وہاں اکیلے سڑنے دو۔'' پامیلا مشورتاً نگینہ سے کہتی۔

''میرا بس چلے تو ایک منٹ نہ لگاؤں انہیں یہاں بلانے میں مگر مشکل یہ ہے کہ میری بہن شوہر پرست عورت ہے...... وہ کہتی ہے شوہر جیسا بھی ہے، میرے سر کا سائبان اور میری بیٹی کا باپ ہے۔''

''نہایت روایتی سی سوچ ہے...... اٹھارھویں صدی کی عورت کی سوچ!'' پامیلا کہتی۔

''ہمارے معاشرے میں عورتوں کی اکثریت اسی قسم کی سوچ رکھتی ہے۔ مرد سے گالیاں کھاتی ہیں۔ مار کھاتی ہیں۔ اس کی دی ہوئی ذلت برداشت کرتی ہیں پھر بھی شوہر کو اپنے سر کا تاج سمجھتی ہیں۔''

''بہت مضحکہ خیز۔''

''بہرحال پھر بھی ہو سکتا ہے کہ میرے یہاں سے واپس اپنے وطن جانے کے بعد کسی وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

''میں اگر تمہارے کسی کام آ سکی تو مجھے خوشی ہوگی۔''

☆☆☆

ثمینہ کی خواہش کے مطابق نگینہ کو دیارِ غیر میں کوئی ایسا آدمی نہ ملا جس سے زندگی بھر کا رشتہ استوار کر کے بقول ثمینہ وہ اس جہنم سے نکل سکتی جو صفدر کی وجہ سے گھر میں دہک رہا تھا۔

مسئلہ یہ نہیں تھا کہ دنیا سے اچھے مرد ختم یا کمیاب ہو گئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ثمینہ کے حوالے سے اس کا سابقہ جس مرد سے پڑا تھا اس نے ثمینہ کی ہی نہیں اس کی زندگی کو بھی الجھنوں سے دوچار کر کے ماں کے زیرِ سایہ اس کی ہنستی مسکراتی زندگی کو الم گزیدہ کر دیا تھا۔ وہ نہ اپنی ہم عمر جوان خواتین کی طرح ہنستی مسکراتی تھی نہ اسے بننے سنورنے کا شوق رہا تھا۔ عمر رسیدہ عورتوں کی سی گہری سنجیدگی اس کی شخصیت پر طاری رہتی۔ وہ اپنی عمر سے اتنی آگے جا کھڑی ہوئی تھی کہ اپنے جوڑ کے جوان مردوں سے اسے ذہنی ہم آہنگی ہی نہ محسوس ہوتی اور وہ بھی اسے ''آپا'' قسم کی مخلوق سمجھنے لگتے۔

چنانچہ دیارِ غیر میں وظیفے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی واپسی اکیلے ہی ہوئی۔ ثمینہ کو اس کے آنے کی خوشی ہوئی مگر اس بات کا دکھ بھی تھا کہ اسے پھر اسی جہنم میں جلنا ہوگا۔

☆☆☆

وطن واپسی پر نگینہ اسی کالج میں دوبارہ اپنے فرائضِ منصبی سنبھالنے کی پابند ہوئی جہاں سے وہ تعلیمی رخصت لے کر بیرونِ ملک گئی تھی۔ کسی برتر عہدے یا دوسرے ادارے میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے وہ مقررہ قواعد و ضوابط

سے گزرنے کی پابند تھی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ ترقی کی اسے دھن تھی نہ امنگ، کالج میں طالبات کو پڑھا کر بھی وہ مطمئن تھی۔ دل میں کوئی خواہش تھی تو اپنی اور ثمینہ کی زندگی میں تبدیلی کی۔ تبدیلی کی اسی تمنا نے اسے بیرونِ وطن جانے پر بھی مجبور کیا تھا۔ ورنہ کیا ضرورت تھی اسے پردیس کاٹنے کی۔

روز و شب پھر وہی ہو گئے اور زندگی قید مسلسل! صفدر کا ناروا طرزِ عمل اور بات بے بات طعن و تشنیع۔ اس کے مسلسل جبر و تشدد نے ثمینہ کی جسمانی صحت کے ساتھ نفسیاتی کیفیت کو بھی بری طرح متاثر کر رکھا تھا۔ گھر کی فروخت سے ثمینہ کے حصے میں آنے والی رقم صفدر اپنی عیاشیوں پر لٹا چکا تھا اور اب بھی اس کا دستِ سوال ثمینہ کے سامنے پھیلا ہی رہتا۔ ثمینہ منع کرتی تو وہ حسب عادت دھونس، دھمکی، گالم گلوچ اور مار پیٹ پر اتر آتا۔ ثمینہ اور نگینہ کے ساتھ آئینہ بھی بیٹی ہونے کے باوجود اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی۔

''اللہ کرے پاپا مر جائیں۔'' وہ باپ کو کوستی۔

''بری بات آئینہ۔'' ثمینہ اسے تنبیہ کرتی۔

''آئی ہیٹ ہم۔'' آئینہ کہتی۔

''باپ ہے تمہارا۔''

''نہیں چاہیے مجھے ایسا باپ۔''

''تو پھر کیسا چاہیے۔'' ثمینہ اسے محبت سے دیکھتی۔

''جیسے میری فرینڈز کے ہیں...... لوونگ اور کیئرنگ۔''

''سب کی قسمت ایک جیسی تھوڑی ہوتی ہے۔''

''میری ایسی کیوں ہے...... آپ کی ایسی کیوں ہے؟''

''اللہ کی مرضی۔''

''اس سے تو اچھا تھا آپ شادی ہی نہ کرتیں۔''

''اکیلے کیسے رہتی۔''

''نگینہ آنٹی بھی تو رہ رہی ہیں شادی کیے بغیر۔''

''میں تو اس سے بھی کہتی ہوں شادی کر لے۔''

''تاکہ وہ بھی آپ کی طرح روئیں بیٹھ کر۔''

''ایسی باتیں مت کیا کرو آئینہ۔'' ثمینہ کی آنکھیں بھر آتیں۔

''ممی پلیز! پاپا کو چھوڑ دیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ڈیوورس لے لیں۔''

''جب تمہاری شادی ہو گی اور لڑکے والے مجھ سے تمہارے باپ کے بارے میں پوچھیں گے تو میں کیا بتاؤں گی!''

''کہہ دینا ڈیوورس لے لی۔''

''ڈیوورس لینے والی عورت کو اچھا نہیں سمجھتے لوگ۔''

''چاہے ہسبینڈ اچھا نہ ہو۔''

''ہاں...... پھر بھی...... ہمارے معاشرے میں برے آدمی سے چھٹکارا لینے والی عورت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا...... گزارہ کرنے والی عورت کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔''

''پاپا اتنا تنگ کرتے ہیں آپ کو۔''

''مرد ہیں...... کر سکتے ہیں...... ہر عورت کی قسمت میں تو اچھا مرد نہیں ہوتا۔''

''اچھا ہے نگینہ آنٹی نے شادی نہیں کی۔''

''اچھا نہیں ہے...... عورت اکیلی نہیں رہ سکتی...... میں تو دعا کرتی ہوں کہ نگینہ کو شادی کے لیے کوئی اچھا آدمی ملے...... میں تو تمہارے لیے بھی ابھی سے دعا کرتی ہوں کہ جب تمہاری شادی کا وقت آئے تو تمہارے لیے کوئی اتنا اچھا لڑکا ملے کہ تمہیں خوش دیکھ کر میں اپنا سارا دکھ بھول جاؤں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے خوش دیکھ کر آپ اپنا دکھ بھول جائیں۔''

''ہو سکتا ہے میری جان...... ایک ماں اپنی اولاد کو خوش دیکھ کر اپنا ہر غم بھول جاتی ہے۔''

''آپ جب تک پاپا سے چھٹکارا نہیں لیں گی، خوش نہیں رہ سکتیں۔ آپ کے ساتھ انہوں نے آنٹی کی زندگی بھی برباد کر رکھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری زندگی بھی برباد کر کے رہیں گے۔''

''خدا نہ کرے۔''

''آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''میں، تم اور تمہاری ممی...... ہم تینوں اس شیطان سے بہت دور، امریکا چلے جائیں گے آئینہ۔'' نگینہ اسے دلاسا دیتی۔

''کب آنٹی؟'' آئینہ کے لہجے میں گونہ بیتابی ہوتی۔

''بانڈ ختم ہو جائے پھر چلیں گے۔''

اسکالرشپ پر بیرونِ وطن جانے کے لیے نگینہ نے اپنے محکمے کو واپسی پر پانچ سال تک خدمات دینے کا بانڈ بھر رکھا تھا اور اب اس مدت کے ختم ہونے میں بس کچھ ہی عرصہ رہ گیا تھا۔ وقت بھی پر لگا کر اڑتا ہے۔ آئینہ کی پیدائش کل ہی کی بات لگتی تھی اور آج وہ اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ حالات نے اسے وقت سے پہلے ہی اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنا سکھا دیا تھا۔

صفدر اپنی پر آتا تو آئینہ کو بھی نہ بخشتا مگر آئینہ اپنی ماں اور خالہ کی طرح اس کی بے جا باتوں کو سن کر ٹالنے کے بجائے دو بدو جواب دیتی۔

"یہ دونوں عورتیں مل کر تیرے کان بھرتی رہتی ہیں...... ورغلاتی ہیں تجھے میرے خلاف۔"

"کوئی نہیں بھرتا میرے کان...... نہ کوئی مجھے ورغلاتا ہے...... مجھے خود سمجھ نہیں ہے کیا...... آنکھیں ہیں، سب دیکھتی ہوں۔ کان ہیں سنتی ہوں۔"

"تیرے منہ میں اپنی زبان رکھ دی ہے ان دونوں عورتوں نے۔"

"میرے منہ میں اپنی ہی زبان ہے۔"

ایک روز صفدر نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر نگینہ کا دل بہت برا ہوا۔

"تیری آنٹی نہ ہوتی تو میں اور تیری ماں بہت اچھی زندگی گزارتے...... تیری آنٹی کی وجہ سے ہمارے گھر میں بہت مداخلت اور مسائل رہے۔"

صفدر کی بات پر نگینہ کا دل بہت دن کڑھتا رہا۔ وہ تو ثمینہ اور صفدر کے معاملات میں آسانیوں کی خواہاں رہا کرتی تھی۔ ان کے مسائل بٹانے کی کوشش کرتی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ اور ثمینہ اچھی زندگی نہ گزار سکے۔

اس نے ثمینہ سے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں اپنے لیے علیحدہ گھر لے لوں۔"

"جانتی ہوں تمہیں صفدر کی بات سے دکھ پہنچا ہے لیکن اس کی تو عادت ہے کہ وہ الٹی سیدھی بکتا رہتا ہے۔"

"آزما کر تو دیکھنا چاہیے ثمینہ...... شاید...... وہ میرے علیحدہ ہونے کے بعد تمہارے ساتھ خوش رہ سکیں۔"

"تم اتنا عرصہ باہر بھی تو رہیں تب کون سا بدل گیا تھا یہ شخص۔"

"اب تو انہوں نے گلہ کیا ہے...... ان کا گلہ دور کر کے دیکھتے ہیں کیا تبدیلی آتی ہے۔"

"کوئی تبدیلی نہیں آئے گی...... اور پھر...... یہ تو سوچو کہ تم اکیلی کیسے رہو گی؟"

"ایک نہ ایک دن تو رہنا ہی پڑے گا۔"

"کاش تمہارے لیے کوئی رشتہ......"

"اب انتظار کرنا چھوڑ دو ثمینہ۔" نگینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"اٹ از نیور ٹو لیٹ۔" ثمینہ نے کہا۔

ثمینہ کی یہ بات ایک لحاظ سے تو نگینہ کے دل کو لگی۔ سرکاری ملازمت کرتے اسے اتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ چاہتی تو اس کی ثمینہ اور صفدر سے علیحدہ رہائش کا مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ سرکاری مکان کی الاٹمنٹ آسان نہ سہی مگر کوئی نہ کوئی ذریعہ، کوئی سفارش نکال کر اپنی کیٹیگری کا نہ سہی نچلے درجے ہی کا کوئی مکان الاٹ کرایا جا سکتا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب بھی کوشش کی جا سکتی تھی۔ بقول ثمینہ اٹ از نیور ٹو لیٹ!

نگینہ نے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست جمع کروا دی اور کسی "سورس" کی تلاش میں لگ گئی۔

قدرت کی طرف سے کوئی کام ہونا لکھا ہو تو راستے

یونہی بنتے ہیں جیسے نگینہ کو سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں بنے۔ نگینہ کے اپنے ہی ادارے میں جوائنٹ اسٹنٹ افسر کی بیٹی کا داخلہ ہوا اور سرکاری مکان الاٹ کرانے کی خواہش مند اسٹاف ممبرز کی مذکورہ افسر کے پاس دوڑیں لگ گئیں۔ نگینہ بھی حاجت مندوں میں شامل تھی۔ پرنسپل نے اس کی اعلیٰ پیشہ ورانہ کارکردگی اور کچھ کچھ اس کے ذاتی حالات سے باخبری کے باعث افسرِ مذکور سے اس کی پرزور سفارش کی۔ کوئی اچھا وقت تھا اور سب سے بڑھ کر خدا کی مہربانی شاملِ حال تھی، نگینہ کو برس بھر کے اندر اندر سرکاری مکان الاٹ ہو گیا۔ صفدر کو پتا چلا تو اس نے حسبِ فطرت طعن و تشنیع شروع کر دی۔

"ہاں بھئی تیری بہن کو نہیں تو کیا ہمیں گورنمنٹ مکان دے گی رہنے کو۔" نگینہ کو سنانے کو اس نے ثمینہ سے کہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں جو آپ کو گورنمنٹ مکان دے گی..... نگینہ تو گورنمنٹ جاب کرتی ہے۔" ثمینہ بولی۔

"وہ تو اور بھی نہ جانے کیا کچھ کرتی ہوگی..... سرکاری مکان مفت میں نہیں مل جاتا..... الاٹمنٹ دینے والوں کو خوش کیا ہوگا تیری بہن نے۔" صفدر نے نیچ پن دکھایا۔

"لاحول ولاقوۃ! کیسی شرمناک باتیں کرتے ہیں آپ..... نگینہ سن لے تو!"

"میں تو چاہتا ہوں کہ وہ سنے..... تاکہ اسے پتا چلے کہ لوگ بے وقوف نہیں ہوتے، خراب عورتوں کے سارے کرتوت جانتے ہیں۔"

نگینہ جو اپنے ساتھ بہن اور اس کی فیملی کو بھی اپنے گھر میں لے جانے کا سوچ رہی تھی، صفدر کی باتوں سے کشمکش میں پڑ گئی۔ وہ تو اس کے گھر میں رہ کر بھی اپنے سفلہ پن سے باز نہیں آئے گا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خود کو چپ چاپ اس بدفطرت انسان کی بدفطرتی سے جدا کر لیتی۔ تنہا رہنے میں بھی مسائل تو ہوں گے مگر شاید اتنی ذہنی اذیت نہیں..... ثمینہ اور آئینہ جب چاہیں اس کے پاس آسکیں گی مگر صفدر ہرگز نہیں۔

☆☆☆

ثمینہ اور آئینہ کی طرف سے دل پر پتھر رکھ کر نگینہ تنہا ہی سرکاری مکان میں شفٹ ہو گئی۔ اکیلے رہنا کتنا مشکل تھا اس کا اندازہ نگینہ کو اکیلے رہنے کے بعد ہی ہوا بلکہ پہلے ہی دن.....!

پہلے دن ہی اس کے فلیٹ کے سامنے واقع فلیٹ کی رہائشی خاتون بنا دستک دیے گھر میں آگئیں۔ نگینہ اپنا مختصر سا اسباب کھول کر رکھ رہی تھی۔

"میں سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

"السلام علیکم..... بیٹھیے۔" نگینہ نے کہا مگر اگلے ہی لمحے شرمندہ ہو گئی۔ وہ انہیں بیٹھنے کو تو کہہ رہی تھی مگر انہیں بٹھانے کے لیے اس کے پاس تھا ہی کیا۔ وہ تو ایک صندوق میں اپنے کپڑے، ایک بیگ میں اپنے تمام کاغذات اور دوسرے میں اپنے زیرِ استعمال چھوٹی موٹی چیزیں ڈال کر لائی تھی یا پھر اس کا بستر تھا۔ فوم کا پرانا گدا، تکیہ، چادر، کمبل..... بس۔ اسے علیحدہ گرہستی جمانے کے لیے بہت کچھ خریدنا تھا۔

"لگتا ہے ابھی سامان نہیں آیا؟" گھر آئی پڑوسن نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

"جی..... جی....." وہ فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

"گھر والے بھی نہیں آئے ابھی؟"

"جی..... وہ....." نگینہ کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔

"چائے، کھانا کچھ بھجواؤں؟"

"جی نہیں..... بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کی کیا بات..... پڑوسیوں کا حق رشتے داروں سے زیادہ ہوتا ہے..... ہمارا اور آپ کا تو اب رات دن کا ساتھ رہے گا..... رشتے داروں سے آدمی کا کبھی کبھی ملنا ہوتا ہے پڑوسی تو ہر دکھ سکھ کے شریک ہوتے ہیں۔ کبھی مجھے ضرورت ہوگی تو میں آپ کو پکاروں گی، آپ کو ضرورت ہوگی تو آپ مجھے آواز دیں گی..... شوہر آپ کے کیا کرتے ہیں؟"

"جی..... وہ..... میں..... بغیر شوہر کے ہوں۔" نگینہ نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"اچھا!" پڑوسن چونکیں۔ "اللہ نہ کرے کوئی بات ہو گئی کیا؟" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میں..... اَن میریڈ ہوں۔" زندگی میں پہلی بار نگینہ کو اپنے غیر شادی شدہ ہونے پر اتنی گہری سبکی محسوس ہوئی۔

"اچھا اچھا۔" پڑوسن کی آنکھوں میں غیر معمولی ترحم دکھائی دیا پھر انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی ہوں گی پھر تو؟"

"جی..... میں اکیلی ہوں۔" نگینہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب!" انہوں نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"پہلے بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہ رہی تھی، اب اکیلی

رہوں گی۔'' نگینہ نے اب قدرے اعتماد سے کہا۔ جو بات پڑوسن کو کل معلوم ہونا تھی، آج ہی کیوں نہیں۔
''اچھا!'' پڑوسن نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''تو یہ گھر آپ ہی کو الاٹ ہوا ہوگا؟''
''جی ہاں۔''
''کیا کرتی ہیں آپ؟''
''گورنمنٹ کالج میں پڑھاتی ہوں۔''
''ظاہر ہے گورنمنٹ کالج ہی ہوگا تبھی تو آپ کو سرکاری مکان الاٹ ہوا ہے...... لیکن...... آپ اکیلی کیسے رہیں گی...... کسی کو ساتھ ضرور رکھیں...... کوئی بہن، بھائی، بھانجا، بھتیجا۔''
''ہم دو ہی بہنیں ہیں اور بہن کی صرف ایک بیٹی۔''
''بھانجی کو رکھ لیں اپنے ساتھ۔'' پڑوسن نے فوراً مشورہ دیا۔
''بہت چھوٹی ہے وہ اپنے ماں باپ کی...... نہیں چھوڑیں گے وہ اسے۔''
''ارے بھئی تو بہن بہنوئی کو بھی ساتھ رکھ لیں۔''
''وہ اپنا گھر کیوں چھوڑیں گے بھلا۔'' نگینہ کو پڑوسن کی اپنی ذاتیات میں غیر ضروری مداخلت کھٹکنے لگی۔
''تو آپ ہی ان کے ساتھ رہتی رہتیں...... مجھے تو یہ سوچ سوچ کر ہول ہو رہا ہے کہ آپ اکیلی کیسے رہیں گی۔'' پڑوسن حقیقتاً پریشان نظر آنے لگیں۔
''کوئی مسئلہ نہیں...... اسکالر شپ پر باہر گئی تھی دو سال وہاں بھی اکیلی ہی رہی۔'' نگینہ نے اسکالر شپ کا بتا کر انہیں رعب میں لینے کی کوشش کی۔
''باہر کی بات اور ہے...... سنا ہے وہاں تو بچے بالغ ہوتے ہی علیحدہ رہنے لگتے ہیں۔ یہ پاکستان ہے۔ یہاں تو کمبخت بھیڑیے پھرتے ہیں، یہاں عورت کا اکیلے رہنا اتنا آسان نہیں۔''
نگینہ کو پڑوسن کی مسلسل مداخلت ناگوار گزر رہی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ گزارہ اسی پڑوس کے ساتھ کرنا تھا۔ شروع ہی میں تعلقات میں ناگواری پیدا کر لینا مناسب نہ تھا سو اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر...... پڑوس اچھا ہو تو کوئی مسئلہ نہیں...... مجھے آپ سے مل کر بہت اچھا لگا ہے۔ آپ بھی تو میرے لیے بہن کی طرح ہیں۔''
''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... جب کوئی ضرورت ہو دروازہ کھٹکا دیجیے گا۔ گھر میں بس میں ہوتی ہوں، میرے

کباڑیہ

پرانا سامان خریدنے والے کباڑی نے ایک دروازے پر آواز لگائی۔
''کیوں صاحب! ہے کچھ پرانا کباڑ......''
''بیوی گھر پر نہیں ہے۔'' صاحب نے گھر کے اندر سے ہی چلاتے ہوئے کہا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ہٹل ہزارہ

شوہر اور دو بچے...... ماشاء اللہ دونوں بیٹے ہیں۔ بھاگ بھاگ کر آپ کے کام کیا کریں گے...... آپ سے پہلے جو لوگ اس گھر میں رہتے تھے ان سے بھی ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ بالکل اپنوں کے سے...... ایک ہی بیٹا تھا جو انگلینڈ نہ چلا گیا ہوتا تو شاید یہ مکان وہ لوگ اسی کے نام الاٹ کروا لیتے۔ اچھی بھلی سرکاری ملازمت تھی اس کی بھی۔ انگلینڈ جانے کے چکر میں اس نے نوکری بھی چھوڑ دی۔ ماں باپ کو اپنے ذاتی گھر میں جانا پڑا۔''
''مجھے بہت ترس آتا ہے ایسے ماں باپ پر جن کی اولاد بڑھاپے میں انہیں اکیلا چھوڑ جاتی ہے۔'' نگینہ کو موضوع بدلنے کا بہانہ ہاتھ آیا۔
''مجھے تو ایسی اولاد پر ترس آتا ہے کیا منہ دکھائیں گے اللہ کو...... اچھا خیر ہم بھلا اوروں کی فکر میں کیوں دبلے ہوں، اپنی نبیڑیں...... کوئی مسئلہ، کوئی ضرورت ہو تو میرا دروازہ کھٹکھٹا دیں بس۔''
''اور اگر دروازہ کھٹکھٹانے کا موقع نہ ہو؟'' نگینہ مسکرائی۔
''تو فون کھڑکا دیں...... میں اپنا نمبر دے دوں گی آپ کو۔''
''شکریہ۔'' نگینہ نے کہا۔
''شکریہ کی کیا بات...... پڑوس تو ہر وقت کا ساتھ ہوتا ہے...... کوئی دکھ سکھ ہو تو عزیز رشتے داروں سے پہلے پڑوسی ہی پہنچتے ہیں۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' نگینہ کا اپنا تجربۂ حیات بھی یہی تھا۔ ہمیشہ پڑوسی ہی ان کے کام آئے تھے، ماں کی زندگی میں بھی ان کے بعد بھی۔ صفدر جب ثمینہ کے ساتھ گالم گلوچ یا مار پٹائی کرتا تو پڑوسی ہی دروازے پر آ کر پوچھا کرتے تھے۔ ''خیریت تو ہے!''
ثمینہ کو اس کے خود غرض اور بے رحم شوہر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کی زندگی سے نکل آنا نگینہ کی انتہائی مجبوری نہ

بن گئی ہوتی تو وہ ہرگز ہرگز ثمینہ کو اکیلا نہ چھوڑتی۔

☆☆☆

تنہا رہنا خود نگینہ کے لیے بھی اذیت ناک تجربہ ثابت ہوا۔ دن تو جوں توں گزر جاتا مگر رات کا گزارنا مشکل ہوتا۔ تنہائی کا خوف سانپ کی طرح پھن مارے اس کے ذہن میں بیٹھا رہتا۔ موہوم سی آہٹ پر اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا۔ کھڑکی دروازوں سے کسی کے اندر آجانے کا خوف اسے بری طرح سہمائے رکھتا۔ ایک ایک کھڑکی، ہر ہر دروازہ اچھی طرح بند کر کے بستر پر جاتی مگر پھر بھی یہ وہم ستائے جاتا کہ کوئی کھڑکی، دروازہ کھلا نہ رہ گیا ہو۔ وہ بے پاؤں اٹھ اٹھ کر دیکھتی۔ رات کو گھر سے باہر گلی میں کتوں کے بھونکنے کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ رگ وپے میں سنسناہٹ تیرنے لگتی۔ ریڑھ کی ہڈی جھنجھنائے جاتی، کبھی بیرونی دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی، کبھی دروازہ کھٹکھٹائے جانے کا احساس ہوتا۔ خوف سے اس کے اعصاب شل ہونے لگتے۔ یوں لگتا دروازہ کھڑکی توڑ کر کوئی لچا لفنگا آوارہ مرد گھر کے اندر آ جائے گا اور اسے بے آبرو کر کے چلتا بنے گا۔ کچھ عجب نہیں کہ اپنا مطلب پورا کر کے اس کی گردن بھی دبا جائے۔ دنیا کو سیانوں نے ایسے ہی تو دکھوں کا گھر نہیں کہہ دیا۔ ہر شخص اپنے اپنے دکھ کی صلیب پر چڑھا ہے، سو وہ بھی تنہائی کی صلیب چڑھ گئی تھی۔

محلے میں اسے سوائے سامنے والی پڑوسن کے جو محلے بھر میں سعدیہ باجی کے نام سے معروف تھیں، کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سعدیہ باجی کے ذریعے سب کو اس کے سیاق وسباق سے آگاہی ہو گئی تھی۔ وہ گھر میں ہوتی تو آس پڑوس والوں کی نگاہیں اس کے گھر پر لگی رہتیں۔ گھر سے باہر نکلتی تو بھانت بھانت قسم کی پڑوسنوں اور ندیدے مردوں کی نگاہیں تاحدِ منظر اس کا تعاقب کیے جاتیں۔

صفدر سے چوری چھپے ثمینہ کبھی اکیلی کبھی آئینہ کے ساتھ اس سے ملنے آجاتی۔ ''تمہاری بہت فکر رہتی ہے مجھے۔'' وہ کہتی۔

''اور مجھے تمہاری فکر رہتی ہے۔''

''میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں...... تمہارا میاں انسان بن گیا ہے کیا!''

''انسان بنے یا نہ بنے میاں تو ہے...... اس کے نام کا تحفظ حاصل ہے مجھے۔''

''جہنم میں جائے ایسا تحفظ۔''

''عجیب بات ہے نگینہ کہ عورت کے سر پر مرد کے ہونے یا نہ ہونے سے عورت کی معاشرتی حیثیت پر بڑا فرق پڑتا ہے، اس کے اچھا یا برا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق نہیں...... آخر عورت کی اپنی بھی کوئی حیثیت کوئی شناخت ہوتی ہے۔''

''اکیلی عورت کی کوئی حیثیت، کوئی شناخت نہیں نگینہ۔''

''میری ہے کہ نہیں؟''

''تم مانو یا نہ مانو...... محلے کے لوگوں کو تمہارے بارے میں تجسس ضرور رہتا ہوگا۔''

''سامنے گھر والی سب کو بتا چکی ہیں۔''

''پھر بھی...... پھر بھی نگینہ...... اکیلی عورت کو لوگ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں اور اکیلی عورت اگر جوان ہو تو پھر ان کا تجسس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔''

''آئی ڈیم کیئر۔''

''بٹ آئی ڈو۔''

''تم بتاؤ...... کوئی اور راستہ تھا میرے پاس...... یا پھر میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہارے میاں کی گالیوں اور مار پیٹ میں اپنا حصہ بٹاتی رہتی۔''

''میرا نصیب نگینہ۔''

''میرا تو نہیں نا...... پھر میں کیوں خوامخواہ اذیت میں رہتی اور میری وجہ سے تم بھی۔''

''خدا کسی فرشتے کو تمہارا نصیب بنا کر بھیج دے۔''

''نہ بھی بھیجے تو میں نے اب اکیلے رہنا سیکھ لیا ہے۔''

''ایسا مت کہو...... عورت کے لیے ساری زندگی اکیلا رہنا بہت مشکل ہوتا ہے...... اب تو صفدر کی مصیبت ساتھ نہیں، یہاں اپنے آس پڑوس میں یا اپنی ساتھیوں سے کہو کوئی رشتہ بتائیں۔''

''یعنی ضرورتِ رشتہ کا اشتہار بن جاؤں!''

''کہنا سننا پڑتا ہے نگینہ۔''

''سوری! میں اتنی بے وقعت نہیں ہونا چاہتی...... شادی ہوتی ہے ہو نہیں ہوتی نہ سہی...... میں اپنی گردن میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار لٹکا کر نہیں گھوم سکتی۔''

''ساری زندگی کنواری بھی تو نہیں رہ سکتیں۔''

''بہت ہیں...... ایک میں نہیں...... سیکڑوں، ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں ہیں جو کنواری رہ کر زندگی گزار رہی ہیں اور خوش ہیں۔''

''تمہیں کیا پتا کہ خوش ہیں؟''

''مجھے پتا ہے...... آخر میں خوش ہوں کہ نہیں؟''

''نہیں ہو خوش...... تم نے بخش خول چڑھا لیا ہے اپنے اوپر۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''بہن ہوں تمہاری...... ایک ہی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے ہیں ہم دونوں نے...... تمہارے دل کی کیفیت جاننے کے لیے مجھے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی کسی سے پوچھنے پاچھنے کی...... تمہاری آنکھوں میں دیکھتی ہوں اور مجھے سب پتا چل جاتا ہے۔''

''یار! جب یہ بات ہے تو پھر اللہ پر بھروسا رکھو جیسے میں نے رکھا ہوا ہے...... میری قسمت میں شادی ہوگی تو ہوجائے گی...... نہیں لکھی ہوگی تو میں یا تم کیا ساری دنیا بھی اپنی تدبیریں لڑا لے، میری شادی نہیں ہوسکتی۔''

''قسمت پر اتنا یقین!''

''اللہ پر توکل ثمینہ۔''

ثمینہ جب بھی ان سے ملنے آتی اس کے اکیلے پن پر اپنی فکر و تشویش کا اظہار ضرور کرتی۔

صفدر کا وہی حال تھا۔ ہاتھ پاؤں توڑے بیوی کا طفیلیہ بنا وہ گھر میں پڑا رہتا۔ کھاتا اور غراتا۔ آئینہ ماں پر اس کا جبر اور ماں کی بے بسی دیکھتی تو اکثر ثمینہ سے کہتی۔

''ممی! آپ نے ایسے آدمی سے شادی کیوں کی؟''

''قسمت کا فیصلہ تھا بیٹا۔''

''میں تو ایسے آدمی سے ہرگز شادی نہ کرتی۔''

''قسمت کا کچھ پتا تھوڑی ہوتا ہے۔''

''جب آپ کو پتا چل گیا تھا کہ یہ اچھے آدمی نہیں ہیں تو آپ کو ان سے فوراً علیحدہ ہوجانا چاہیے تھا۔''

''تم کہاں سے آئیں۔'' ثمینہ اسے پیار سے دیکھتی۔

''آپ کے دوسرے شوہر سے۔''

''نہیں بیٹا...... عورت کو بس ایک ہی آدمی سے نباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''چاہے وہ ایک آدمی کتنا ہی برا اور ناقابلِ برداشت ہو؟''

''ہاں۔''

''اس سے تو اچھا ہے کہ عورت شادی ہی نہ کرے...... آنٹی کی طرح...... مزے سے اکیلی رہتی ہیں۔ اپنی زندگی گزارتی ہیں۔''

''اپنی مشکلیں وہی جانتی ہوں گی۔''

''کوئی مشکل نہیں...... اپنا کماتی ہیں اپنا کھاتی ہیں...... خوش ہیں۔''

''تمہیں کیا پتا خوش ہیں یا ناخوش؟''

''ناخوش ہونے کی کیا وجہ...... اچھا کھاتی ہیں اچھا پہنتی ہیں۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارتی ہیں۔''

''مسائل اس کے بھی ہیں بیٹا...... اکیلی عورت غیر محفوظ ہوتی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں...... آنٹی پوری حفاظت سے رہتی ہیں اپنے گھر میں۔ اپنی کھڑکیوں پر مضبوط جالی لگوا رکھی ہے انہوں نے۔''

''گھر کی کھڑکیوں پر مضبوط جالی لگوانے سے عورت محفوظ نہیں ہوجاتی۔''

''تو پھر کیسے ہوتی ہے؟''

''مرد کے حوالے سے...... تمہاری آنٹی کتنا ہی اچھا کھاپی لے اس کا بھی جی چاہتا ہوگا اس کا شوہر ہو، بچے ہوں...... آج اس کے ہاتھ پاؤں میں دم ہے کل اسے بوڑھا بھی ہونا ہے...... ہاتھ پاؤں تھک جائیں تو اپنا شوہر اپنی اولاد ہی پوچھتی ہے۔''

''آپ کو تو آپ کا شوہر جیسے بہت پوچھتا ہے نا۔''

''تم تو پوچھوگی نا۔''

''میں تو آپ کو اپنے ساتھ اتنی دور لے جاؤں گی جہاں آپ کے بی لوو ڈ شوہر کی آواز بھی آپ تک نہ پہنچ سکے۔'' آئینہ بہت پیار سے اپنی بانہیں ماں کی گردن میں حائل کردیتی۔

''یہ کوشش تو تمہاری آنٹی نے بھی کی تھی۔''

''ہاں تو جب وہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر باہر جانا چاہتی تھیں تو آپ کیوں نہیں چلی گئیں ان کے ساتھ...... دونوں مزے سے باہر سیٹل ہوجاتیں۔''

''بانڈ بھر رکھا تھا اس نے اسکالرشپ سے واپسی پر اپنے وطن میں ہی پانچ سال تک سروس کرنے کا۔''

''آنٹی کہتی ہیں سب ہوجاتا ہے...... آپ ہی راضی نہ ہوئیں ان کے ساتھ جانے کو...... اپنے شوہر کی گالیاں اور مار کھانے کا بہت شوق تھا نا آپ کو۔''

ثمینہ مسکرا دیتی۔

''زہر لگتا ہے مجھے اس شخص کے لیے آپ کا مسکرانا۔'' آئینہ کہتی۔

''اور مجھے تمہارے غصے پر پیار آتا ہے۔''

آئینہ کو باپ سے ذرا محبت نہ تھی۔ صفدر نے اس کے دل میں محبت کا کوئی جواز چھوڑا ہی نہ تھا۔ ہوش سنبھالنے کے

بعد سے اس نے باپ کے ہاتھوں ماں کا ہر طرح سے استحصال ہی ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی کمائی پر عیاشی کرتا اور غراتا بھی۔

آئینہ کے لیے سارے رشتے بس دو عورتوں کی ذات میں سما گئے تھے، اس کی ماں ثمینہ اور خالہ نگینہ۔ دونوں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتیں۔ آئینہ کو بھی نگینہ سے ماں جیسا پیار نہ سہی مگر بھانجی اور خالہ کی عموی محبت سے بڑھ کر پیار تھا۔ ماں اور خالہ کی محبت میں وہ اپنے طبقے کی کسی عام لڑکی کے مقابلے میں زیادہ مادی آسائشوں سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ اس کی کوئی خواہش رد نہ کی جاتی۔ بہترین کھانے کو ملتا۔ بہترین پہنتی، انگریزی نظام تعلیم میں پڑھتی۔ ماں اور خالہ اس کی خوشی کو مقدم جانتیں اور اس کی معمولی سی تکلیف پر بے چین ہوجاتیں۔ اتنے لاڈ پیار میں اس کا بگڑنا بعید از قیاس نہ ہوسکتا تھا مگر باپ کے رویے نے ایسا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ نہایت متوازن شخصیت کی حامل تھی۔

☆☆☆

وقت نہایت بے مروتی سے نگینہ کی جوانی کو نگل گیا۔ اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار لہلہانے لگے، جنہیں چھپانے کے لیے وہ ہر ہفتے نہایت باقاعدگی سے اپنے بالوں میں مہندی لگاتی۔ اس کے چہرے کی شادابی مرجھانے لگی تھی جسے بحال کرنے کے لیے وہ کبھی گھریلو ٹوٹکے اور کبھی بازاری نسخے آزماتی۔ اس کا چھریرا بدن گدرا گیا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگ گئی تھی۔ وہ اب اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تھی۔ موجودہ سرکاری مکان سے بڑی سرکاری رہائش گاہ لینے کی مجاز تھی مگر موجودہ رہائش گاہ ہی کو اپنے لیے زیادہ بہتر سمجھتی تھی۔ برسوں ایک ہی علاقے میں رہنے کے باعث علاقے کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے اور احترام دیتے تھے۔ محلے میں ہر شخص اسے میڈم کہتا۔ تنہا رہنے کے باوجود گزرے برسوں میں کبھی کسی کو اس پر انگشت نمائی کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ بھی جو اس محلے میں اس کے آباد ہونے کے بعد شروع شروع میں نہایت متجسس رہے تھے، اب ٹھنڈے ہوکر بیٹھ چکے تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک مضبوط کردار کی عورت تھی۔ سعدیہ باجی کے گھرانے سے اس کے ایسے مضبوط روابط استوار ہوچکے تھے جیسے اپنے قریبی رشتے داروں سے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک آواز پر سعدیہ باجی اور ان کے بچے جو خیر سے اب اپنے پیروں پر کھڑے تھے دوڑتے ہوئے آتے۔

نگینہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کی قسمت میں مجرد رہنا لکھا تھا۔ ورنہ وہ تو چاہتی تھی کہ اس کا شوہر ہو، بچے ہوں، اپنا گھر ہو جسے وہ سنوارے سجائے اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک بھرپور اور خوش و خرم زندگی گزارے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا برس۔ پتا ہی نہ چلا کہ کب اسے نوکری کرتے تیس سال گزر گئے۔ ان تیس سالوں میں دو عشرے اس نے تنہا گزارے تھے۔

تنہائی کی یہ کتھا نہایت دل شکن تھی۔ وہ اداس بھی ہوئی تھی۔ دکھی بھی۔ اس نے بیماری بھی کاٹی تھی۔ خوف بھی سہا تھا۔ آسمان پر بادل چھاتے تو اس کا دل مہیب اندھیروں میں ڈوب جاتا۔ سرما کی شامیں اس کے دل کو انجانے دکھ سے دوچار کردیتیں تو رات کا سناٹا سانپ کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے لگتا۔ تہواروں پر وہ خاموش بیٹھی یہی سوچتی رہتی کہ خوشی کیوں، کیونکر اور کس کے لیے منائے، ثمینہ اور آئینہ کو صفدر کی ناراضگی اور شور شرابے کا خوف تہوار والے دن بھی اس کے پاس آنے سے منع رکھتا۔ وہ یا تو ایک دو دن پہلے اس کے پاس ہوجاتیں یا ایک دو دن بعد آتیں۔ بقول ثمینہ تہوار والے دن تو صفدر اس پر اور آئینہ پر گھات لگا کے رکھتا تھا۔ عجیب آدمی تھا وہ۔

کثرت بے نوشی نے اس کے جسمانی نظام کو بری طرح متاثر کرکے رکھ دیا تھا۔ طرح طرح کی بیماریوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ پھیپھڑے تباہ، گردے ناکارہ، دل کمزور، بصارت ناقص اور رعشہ..... مگر فطرت وہی تھی۔

برسوں کے اعصابی دباؤ نے ثمینہ کو بھی مریض بنا دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ اور کمزور دکھائی دیتی۔ ملازمت ترک کردی تھی۔ گھر کا نظام آئینہ کی ملازمت سے چل رہا تھا۔ اس نے ابلاغیات میں ڈگری لی تھی اور ایک نجی ادارے میں ملازمت کررہی تھی۔ اپنے ہی ایک کولیگ عدنان سے اس کی ذہنی ہم آہنگی تھی اور اسی سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر صفدر اس کے بھی آڑے آرہا تھا۔ اسے عدنان کے حسب نسب پر اعتراض تھا۔ اس کے قد پر نکتہ چیں تھا مگر آئینہ کو اس کے اعتراضات کی پروانہ تھی۔ اس کا فیصلہ تھا کہ وہ عدنان ہی سے شادی کرے گی۔

”تجھے اپنے گھر میں نہیں گھسنے دوں گا میں۔“ صفدر

اسے دھمکی دیتا۔

''گھر تو آپ کا اپنا بھی نہیں ہے۔ کرائے کے مکان میں پڑے ہیں۔'' آئینہ اس کی بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتی۔ صفدر تلملا جاتا۔

''کرائے کا تو ہے، تیری خالہ کی طرح سرکاری مہمان خانے میں تو نہیں پڑا ہوں۔'' وہ او چھا وار کرتا۔

''ان سے آپ کو کیا لینا دینا...... ان میں سرکاری مہمان بننے کی اہلیت تو ہے۔''

''ہاں ہاں، اس کی اہلیت کے کیا کہنے...... اکیلی رہ کر گلچھرّے اڑاتی رہی ہے...... کوئی پوچھنے اور نکیل ڈالنے والا تھا ہی نہیں...... یہاں سے اسی لیے تو بھاگی تھی کہ میں نظر رکھتا تھا۔''

''ڈیڈی پلیز!'' آئینہ بھنا جاتی۔ خالہ کی زندگی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی...... عزت اور وقار کی داستان۔ اس نے خالہ کو ہمیشہ صاف ستھری زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ وہ اس کا دل سے احترام کرتی تھی۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ ماں کے بعد اس کے لیے دنیا میں دوسری محترم ہستی کس کی تھی تو وہ آنکھ بند کر کے نگینہ کا نام لے دیتی۔ مگر صفدر تھا کہ اس کی کردار کشی کا موقع تلاش کرتا رہتا۔ بات بے بات وہ نگینہ کا ذکر لے آتا اور الٹی سیدھی بکواس کر کے ثمینہ اور آئینہ کو چوکے دینے لگتا۔ نگینہ کے معاملے میں وہ دونوں ہی نہایت زود حس تھیں اور صفدر ان کی اس کمزوری سے آگاہ ہونے کے باعث انہیں جان بوجھ کر آزار پہنچانے کی کوشش کرتا۔

''شی از گریٹ...... اکیلی ہونے کے باوجود انہوں نے جس وقار سے زندگی گزاری ہے اس پر انہیں سیلوٹ کیا جانا چاہیے۔'' آئینہ باپ سے کہتی۔

''ہاہ!'' صفدر منہ لال کر ہنستا۔ ''سلامی کا چبوترہ بنوا اپنی خالہ کے لیے اور اس چبوترے پر اسے کھڑا کر کے تو اور تیری ماں اسے سلامی پیش کریں۔''

''ممی کے ساتھ کھڑا تو آپ کو بھی ہونا چاہیے سلامی دینے کے لیے۔'' آئینہ زیر لب مسکراتی۔

''کیوں! میں کیوں کھڑا ہوں؟'' صفدر اچھل پڑتا۔

''ممی کے شریک زندگی جو ہیں آپ...... باقی کسی معاملے میں تو ساتھ نہیں نبھایا آپ نے ان کا...... کم از کم اس معاملے میں تو ساتھ دے دیں۔ بس سلامی ہی تو پیش کرنی ہوگی خالہ کو...... جیب سے تو آپ کی کچھ نہیں جائے گا...... ویسے بھی آپ کی جیب میں ہوتا ہی کیا ہے۔''

''طعنہ دیتی ہے مجھے!'' صفدر بلبلاتا۔

''سچ کہیے اپنی جیب سے آپ نے کبھی کچھ دیا کسی کو؟''

صفدر جبڑے بھینچ لیتا۔ غرا کر آئینہ کو دیکھتا اور بڑبڑاتا۔ ''تیرے جیسی ناخلف اولاد سے تو بے اولاد رہنا بہتر تھا۔''

''اس ناخلف اولاد کی وجہ سے ہی آپ ساری زندگی اپنی بیوی کو بلیک میل کرتے رہے۔ کبھی مجھے ان سے چھین لینے کی دھمکی بھی مجھے لے کر گم ہو جانے کا ڈراوا۔''

''بکواس مت کر۔''

''سچی بات کڑوی ہی لگتی ہے۔''

''تو کچھ بھی کر لے میں تجھے اس نیچ خاندان سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔'' صفدر انگلی کھڑی کر کے اسے گھورتا۔

''جب میں شادی کرنا چاہوں گی تو آپ کیا کوئی بھی نہیں روک سکے گا مجھے۔''

''میں روکوں گا...... میں۔'' صفدر اپنا سینہ ٹھونکتا۔

''دیکھتے ہیں کون جیتتا ہے۔''

''میں...... میں جیتوں گا۔'' صفدر زعم سے کہتا۔

آئینہ مسکراتی اور صفدر دل ہی دل میں کھول کر رہ جاتا۔ آئینہ کی مسکراہٹ اسے اپنے لیے ایک للکار سی محسوس ہوتی۔ اس دھان پان سی خوش شکل لڑکی کی ماں کو اس نے ساری زندگی اپنے پاؤں تلے دبا کر رکھا تھا مگر بیٹی...... وہ تو اس کے منہ کو آتی تھی۔

☆☆☆

تنہا زندگی گزارنا نگینہ کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ نگینہ کیا شاید کسی بھی عورت کے لیے اکیلے زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے اپنے سارے کام خود کرنا پڑتے تھے۔ اپنی ہر ضرورتِ زندگی کے لیے اسے اپنی ہی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ کوئی نہ تھا اس کا ساتھ دینے اور ہاتھ بٹانے کو۔ روزمرہ سودا سلف کی خریداری سے لے کر گھریلو امور اور ہر دکھ سکھ سے نمٹنے کو وہ یکہ و تنہا تھی۔ کہنے والے تو بڑے آرام سے کہہ دیتے تھے۔ ''آپ تو اکیلی ہیں۔ کوئی مصروفیت ہوتی ہوگی نہ فکر۔'' مگر یہ وہی جانتی تھی کہ کتنی مصروفیات تھیں اور کتنی فکرات۔ گھر کے کام کاج سے ملازمت کے بکھیڑوں تک اسے تنہا ہی برسرپیکار رہنا پڑتا۔

پروفیسر کے عہدے پر ترقی ہوئی تو ترقی کی خوشخبری کے ساتھ دوسرے شہر تبادلے کا پروانہ بھی مل گیا۔ وہ مرا سان ہوگئی۔ گزرے برسوں میں جھیلی دقتیں

ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ وہ جوانی اور توانائی کا زمانہ تھا اب تو اس کے قویٰ بھی جواب دینے لگے تھے۔ نئے سرے سے لوگوں کو اپنے اکیلے پن کا خوگر بنانا اور ان کے دلوں میں بھڑکتے تجسس کو احترام میں بدلنا کارِ گراں تھا۔ عورت جس عمر کی بھی ہو، اکیلی تجسس ہی سے دیکھی جاتی ہے۔ اس تجسس کو احترام میں بدلنے کے لیے عورت کو پل صراط عبور کرنا پڑتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک پل صراط عبور کیا تھا۔ محلے میں اس کا احترام تھا۔ بچے ادب کرتے تھے۔ عورتیں محترم سمجھتی تھیں۔ مرد ہٹ کر راستہ دیتے تھے۔ وہ مطمئن تھی اور شاید کسی حد تک خوش بھی۔ ترقی ملنے پر نئے شہر اور نئے لوگوں میں جانا اس کے لیے ایک نئی زنبیل کھول دیتا۔ اس نے ترقی نہ لینے اور موجودہ عہدے پر ہی کام کرتے رہنا مناسب جانا۔ ترقی لینے سے انکار کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لوگ تو مرے جاتے تھے۔ بس نہ چلتا کہ دوسروں کی گردن پر پاؤں رکھتے گزر جائیں۔ ڈائریکٹر نے اسے بلا بھیجا۔ ترقی لینے سے انکار کا سبب پوچھا۔

"سر! میرے لیے دوسرے شہر جانا مشکل ہے۔"

"ٹرانسفر ایبل جاب ہے۔ آپ کا پروموشن کے بغیر بھی دوسرے شہر ٹرانسفر کیا جا سکتا تھا۔"

"جی، میں جانتی ہوں۔"

"تو پھر پروموشن فارگو کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

"سر! زندگی میں ترجیحات مقرر کرنا پڑتی ہیں۔ میری ترجیح اپنے ہی شہر میں رہنا ہے۔"

"اور اگر آپ کے پروموشن فارگو کرنے کے بعد بھی آپ کا دوسرے شہر میں ٹرانسفر کر دیا جائے؟"

"میں ارلی ریٹائرمنٹ کے لیے اپلائی کر دوں گی..... ملازمت کے تیس سال تو پورے کر چکی ہوں۔"

"ہوں!" ڈائریکٹر نے اسے قدرے تعجب سے دیکھا پھر کہا۔ "تو گویا آپ دوسرے شہر نہ جانے کا تہیہ کیے بیٹھی ہیں۔"

"جی بالکل۔"

"اور اگر ہم آپ کی اب تک کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو اسی شہر میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں تو؟"

"میں اسے اپنے لیے ڈیپارٹمنٹ کا بہت بڑا فیور سمجھوں گی۔"

"اوکے..... دیکھتے ہیں۔"

دوسرے شہر جانے میں قباحت کا ایک اور بڑا سبب نگینہ کے لیے ثمینہ اور آئینہ بھی تھیں۔ دنیا میں یہی تو دو قریبی رشتے تھے اس کے جنہیں وہ نہ کھونا چاہتی تھی نہ ان سے دور جانا چاہتی تھی۔ اپنے شہر میں رہتے ہوئے ان دونوں سے رابطہ تو رہتا تھا۔ ملاقات بہت جلدی جلدی نہ سہی ہفتے دو ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہو تو جاتی تھی۔ دوسرے شہر جا کر تو وہ انہیں دیکھنے ہی..کو ترس جاتی۔

خدا کی مہربانی اور ڈائریکٹوریٹ کی کرم فرمائی سے اس کی ایڈجسٹمنٹ اپنے ہی شہر میں کر دی گئی۔ پروموشن بھی مل گئی۔ عہدہ بھی بڑھ گیا۔ وہ ایک مقامی کالج کی پرنسپل مقرر کر دی گئی۔ دیرینہ پڑوسن سعدیہ باجی نے جن کے شوہر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور مکان اب ان کے بیٹے کے نام پر تھا، نگینہ کو صلاح دی۔ "بڑا گھر الاٹ کرا لیں۔"

"کیا کروں گی بڑا گھر لے کر..... مجھ سے تو یہی نہیں سنبھالا جاتا۔" نگینہ نے کہا۔

"ارے بھئی بڑے گھر میں رہنے کی بڑی شان ہوتی ہے۔"

"آپ کا پڑوس تو نہیں ملے گا مجھے وہاں۔"

"یہ تو ہے۔"

"میں یہیں خوش ہوں۔"

"خوش تو ہم بھی اسی میں ہیں کہ آپ کا ہمارا ساتھ نہ چھوٹے۔"

"تو بس پھر میں انشاء اللہ اپنی ریٹائرمنٹ تک یہیں ہوں۔"

"ویسے آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا؟" وہ چونکی۔

"شادی نہ کر کے..... خوبصورت تھیں، پڑھی لکھی تھیں، خوش اخلاق تھیں، یہ خوبیاں آپ کے بچوں کو بھی مل جاتیں تو دنیا میں کچھ اور اچھے لوگوں کا اضافہ ہو جاتا۔"

"اچھا!" وہ ہنس دی۔ "میں نے اب تک اس نکتے پر غور نہیں کیا تھا۔"

"کرنا چاہیے تھا..... خیر، اب کیا ہو سکتا ہے..... اب تو وقت گزر گیا، نہ آپ کی شادی کی عمر رہی نہ بچے پیدا کرنے کی۔"

نگینہ کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"دیکھتے ہی دیکھتے انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے..... جب آپ اس گھر میں آئیں تو تازہ گلاب کی طرح

خوبصورت تھیں۔ اب کون یقین کر سکتا ہے کہ آپ وہ تھیں۔ اب تو شاید آپ خود بھی اپنی پرانی تصویروں میں خود کو نہیں پہچان سکتی ہوں گی۔''

''ایسے ہی ہوتا ہے سعدیہ جی۔'' نگینہ ہمیشہ انہیں سعدیہ جی کہتی رہی تھی۔

سعدیہ باجی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ نگینہ کو اپنی آنکھوں کے حاشیے نم ہوتے محسوس ہوئے۔

سعدیہ باجی نے غلط نہیں کہا تھا۔ صبح کالج جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ اکثر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے ٹھٹک جاتی تھی۔ وہ تو رستہ چہرے والی نگینہ جس کی آنکھوں میں صفدر کی تمام تر زیادتیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود جگنو دمکتے تھے، خدا جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ اب تو ایک ادھیڑ عمر عورت آئینے میں دکھائی دیتی تھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بالوں کی سفیدی چھپانے کے لیے انہیں ڈائی کرنے اور کالج جانے سے پہلے اپنی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جمانے پر مجبور ہوتی۔ پھر بھی آئینہ کہتی تھی۔ ''آپ اب بھی اتنی جوان لگتی ہیں آنٹی...... ممی نے اپنی حالت تباہ کر لی ہے۔''

ثمینہ کو صفدر کی زیادتیوں نے وقت سے پہلے ہی کنارے لگا دیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کراہتی۔ آئے دن کی روگی۔ اکثر بڑے دردآمیز لہجے میں ایک شعر دہراتی۔

زندگی اتنی رائگاں تو نہ تھی
جانے کس نگر میں بھول آئی

''صفدر نگر میں اور کہاں!'' آئینہ کبھی کبھی کہتی۔

ثمینہ ایک سرد آہ بھرتی۔ اس ایک مرد نے دو عورتوں کی زندگی برباد کی تھی۔ ثمینہ کی اور نگینہ کی بھی۔ صد شکر کہ آئینہ نے اس کے جبر و استبداد کی غلامی قبول نہیں کی تھی۔

☆☆☆

ثمینہ مر گئی۔

اسی خاموشی سے جس خاموشی سے وہ زندگی جیتی رہی تھی اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس کی موت بھی نگینہ کے گھر میں ہوئی وہ اور آئینہ اس سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ نگینہ ان کے لیے کھانے پینے کا سامان فریج سے نکال رہی تھی۔ آئینہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے کو اس کے پاس آ گئی۔ جب وہ دونوں واپس کمرے میں پہنچیں تو ثمینہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں چھت پر لگی تھیں۔

''ممی! جلدی سے اٹھ جائیں۔ آج آنٹی نے آپ کی پسند کی چیز بنا رکھی ہے۔''

ثمینہ کو ماش کی دال کے دہی بھلے بہت مرغوب تھے۔

''اٹھیں ممی! کن خیالوں میں پڑی ہیں۔'' آئینہ نے ماں سے کہا مگر وہ بدستور چت پڑی رہی۔

''ممی!'' آئینہ نے اس کا شانہ ہلایا۔ ثمینہ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور تبھی آئینہ کو احساس ہوا کہ ماں کا یوں بے حس و حرکت بستر پر پڑا ہونا بے معنی بات نہ تھی۔

''آنٹی! ممی کو دیکھیں انہیں کیا ہوا ہے۔'' آئینہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں نگینہ سے جو ٹرے سے چیزیں اٹھا کر چھوٹی میز پر رکھنے میں مصروف تھی، کہا۔

نگینہ نے بہن کو دیکھا۔ بیتابانہ اس کی طرف بڑھی۔ تشویش سے اس کا جسم ٹٹولا۔ دل پر ہاتھ رکھا۔ نبض ٹٹولی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی کھلی مگر ساکت آنکھوں کو دیکھا۔ ثمینہ اپنے دنیاوی دکھوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ مریینہ کی طرح اس کی موت بھی اچانک ہوئی تھی۔

ثمینہ کی موت آئینہ کے لیے تو تھا ہی ایک ناقابلِ بیان صدمہ مگر نگینہ کے لیے ایک جانکاہ دکھ تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ آئینہ تھی مگر اسے تو خود اس صدمے کو سہنے کے لیے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ نگینہ کا دل دکھے جاتا اس خیال سے کہ اس کی محبت کرنے والی بہن دکھ بس دنیا سے بہت دکھی گئی تھی۔ سوائے آئینہ کے اسے زندگی میں کوئی خوشی نہیں ملی تھی۔ آئینہ کو نگینہ پہلے سے بھی زیادہ عزیز رکھنے لگی تھی۔

صدمے کی شدت میں کچھ کمی آئی تو آئینہ نے واشگاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ جس نے اس کی ماں کو دکھ کے سوا کبھی کچھ نہیں دیا تھا، نہیں رہ سکتی۔

''تیری خالہ نے بھڑکایا ہوگا تجھے میرے خلاف۔'' صفدر بولا۔

''میں کسی کے بھڑکانے میں کیوں آؤں گی...... جو کچھ آپ نے میری ماں کے ساتھ کیا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے...... ان کی موت سے ایک دن پہلے بھی آپ نے اس بات پر کہ وہ آپ کو نشہ پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں دے پا رہی تھیں، انہیں گالیاں بھی دی تھیں اور ہاتھا پائی بھی کی تھی۔''

''وہ ہم میاں بیوی کا معاملہ تھا۔ مجھے اس سے محبت بھی تو تھی۔''

''خاک محبت تھی۔''

''تھی...... تجھے کیا پتا۔'' صفدر رونے لگا۔

''اب آپ ساری زندگی بھی یہ بات دہراتے رہیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... میں صرف وہ جانتی ہوں جو میں نے دیکھا...... آپ میری ماں کے قاتل ہیں...... کبھی معاف نہیں کروں گی میں آپ کو۔''

''اپنے باپ کو!'' صفدر کی آواز بھرا گئی۔ ''تیرا باپ ہوں میں۔''

''بدقسمتی ہے!'' آئینہ کا لہجہ تلخ تھا۔

''دیکھ...... دیکھ میں بیمار ہوں...... ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں تجھ سے...... مجھے چھوڑ کر مت جانا۔''

''میں فیصلہ کر چکی ہوں...... ویسے بھی مجھے اس گھر سے ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔''

''خالہ کے پاس جائے گی...... ہے نا؟'' صفدر کے تیور بدل گئے۔

''نہیں۔''

''تو پھر؟'' وہ چونکا۔

''میں عدنان سے شادی کر رہی ہوں۔''

''میری اجازت کے بغیر!''

''مجبوری ہے۔''

''تو اس سے شادی نہیں کرے گی۔'' صفدر غرایا۔

''میں اسی سے شادی کروں گی۔''

''پچھتائے گی۔''

''آپ کو الزام نہیں دوں گی۔''

''بے وقوفی مت کر۔''

''اس سے زیادہ عقلمندی میں کر بھی نہیں سکتی...... آج وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے، ہو سکتا ہے کل نہ ہو۔''

''سوچ لے۔''

''سوچ لیا ہے۔''

''مجھے...... اپنے باپ کو اکیلا چھوڑ جائے گی تو؟''

''آپ نے خود اکیلا کیا ہے اپنے آپ کو۔''

''آئینہ!'' صفدر کی نگاہوں میں بلا کی بے بسی اور لہجے میں غیر معمولی التجا تھی۔

''سوری!'' آئینہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

آئینہ گھر سے چلی گئی اور نگینہ کو صفدر کی جانب سے کسی مشکل سے بچانے کے لیے اس نے عدنان سے کورٹ میرج کر لی۔

''میں آپ کی طرح اکیلی زندگی گزارنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی آنٹی۔'' اس نے نگینہ سے کہا۔

''میری دعا ہے بیٹا کہ تم خوش رہو...... ہو سکے تو باپ کی خیر خبر لیتی رہنا۔''

''یہ آپ کہہ رہی ہیں!'' آئینہ نے خالہ کو حیرت سے دیکھا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس شخص نے آپ کی بہن کی زندگی کو عذاب بنا کر رکھا تھا۔''

''وہ میری بہن کا شریک زندگی رہا ہے آئینہ اور تمہارا باپ ہے۔ میں اس تعلق کو اہمیت دیتی ہوں۔ اپنے کیے کے لیے وہ خدا کو جوابدہ ہے۔''

''سوری آنٹی! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' آئینہ نے کہا۔

''اتنی مشکل بات بھی نہیں کی ہے میں نے...... تمہارے باپ کا میری بہن سے رشتہ رہا ہے...... بہن کے مرنے کے بعد مجھے اس سے وابستہ ہر چیز اس کی یادگار محسوس ہونے لگی ہے۔ تم بھی اپنے باپ کو معاف کر دو۔''

''آپ کی طرح وسیع القلب نہیں ہوں میں۔''

''وقت تمہارے دل میں وسعت پیدا کر دے گا۔''

''مجھے اس وقت کا انتظار کرنے دیں۔''

آئینہ نے عدنان سے کورٹ میرج کر لی اور کچھ عرصے بعد دونوں انگلستان چلے گئے۔

''آنٹی! ریٹائرمنٹ کے بعد آپ بھی وہیں ہمارے پاس آ جائیے گا۔'' آئینہ نے نگینہ سے کہا۔

''دیکھوں گی میری جان۔''

''دیکھنا کیا ہے...... یہاں آپ کا کون ہے جس کے لیے آپ یہاں بیٹھی رہیں گی۔'' آئینہ بولی۔

''تمہاری اور میری ماں کی قبریں ہیں یہاں۔''

''فارگاڈ سیک آنٹی...... آپ جیسی بیس گریڈ کی افسر کے منہ سے قبر پرستی کی بات ہضم نہیں ہوتی۔''

''قبر پرستی نہیں ہے میری جان...... یہ اپنی جڑوں، اپنی زمین سے جڑے رہنے کی بات ہے...... خیر تم فکر مت کرو۔ میں تم سے ملنے اور تمہارا پیارا گھر دیکھنے کے لیے ایک بار تو ضرور آؤں گی وہاں۔''

''میں اور عدنان بہت خوش ہوں گے۔''

''میں تمہارے بچوں کے ساتھ کھیلا کروں گی۔''

''ہائے! کتنی پیاری بات کی ہے آپ نے۔'' آئینہ پھڑک اٹھی۔ ''آئی لو چلڈرن۔''

''مجھے پتا ہے۔''

''آپ کو بھلا کیوں نہ پتا ہوگا...... آپ تو مجھے الف سے ے تک جانتی ہیں...... ویسے عدنان کو بھی بچے بہت پسند ہیں۔''

"یہ میرے لیے خبر ہے۔" آئینہ کھلکھلا اٹھی پھر آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔ "فکر مت کیجیے، آپ کو مزید خبریں سناتی رہوں گی۔"

☆☆☆

آئینہ کے جانے کے بعد نگینہ کا جی اچاٹ ہوگیا۔ وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگی۔ ثمینہ کا بچھڑ جانا ہی کچھ کم وحشت ناک نہ تھا اس کے لیے کہ اب آئینہ بھی ہزاروں میل دور چلی گئی تھی۔ یہ احساس کہ اب اس شہر میں اس کا کوئی قریبی دردمند نہیں رہا تھا، اسے رہ رہ کر افسردہ کر دیتا۔

آئینہ کو انگلستان گئے دوسرا برس تھا جب محکمے نے اپنے زیرِ انتظام اداروں میں طویل عرصے سے ایک ہی مقام پر تعینات ملازمین کی بڑے پیمانے پر دوسرے مقامات پر تبادلے شروع کیے۔ سربراہِ محکمہ نے دوسرے شہر میں واقع اپنے ایک ادارے کی بگڑی حالت کو سنوارنے کے لیے نگینہ کی اعلیٰ منصبی کارکردگی کے پیشِ نظر اسے یہ ذمے داری سونپنی چاہی تو اس نے پہلے کی طرح انکار نہیں کیا۔ وہی شہر جسے نہ چھوڑنے کے لیے اس نے ماضی میں اپنی ترقی کو پسِ پشت ڈالنا چاہا تھا اب وہ اسی کو چھوڑ کر نئے شہر جانے پر آمادہ تھی۔ تردد تھا تو فقط یہ کہ کیا اسے وہاں بھی سرکاری رہائش گاہ کی سہولت میسر آسکے گی۔ خوش قسمتی سے سربراہِ محکمہ کے اثرورسوخ سے ایسا ممکن ہوگیا۔ نگینہ نے آمادگی ظاہر کردی۔ ثمینہ کی موت اور آئینہ کے جانے کے بعد اس کے لیے کوئی شہر اپنا، کوئی پرایا نہ رہا تھا۔ جہاں بھی رہتی تنہا ہی رہنا تھا۔

☆☆☆

نگینہ نے رختِ سفر باندھا اور نئے مقامِ تعیناتی پر منتقل ہوگئی۔ پختہ عمر نے اس کی جوانی کے بہت سے اندیشوں کو ختم کردیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بااعتماد تھی۔ نئے اسٹیشن پر لوگوں کو اس کے اکیلے پن کے بارے میں کچھ دن تجسس رہا پھر سب ٹھنڈے ہو کر اس اجماع پر بیٹھ گئے کہ میڈم نے شادی نہیں کی اور وہ بھری دنیا میں اکیلی ہیں۔

ملازمتی امور کو وہ پہلے بھی ضرورت سے زیادہ اہمیت اور وقت دیتی تھی، بگڑے ادارے کو سنوارنا تو اس کے لیے چیلنج ٹھہرا۔ ساتھی اکثروبیشتر ویسے ہی تھے جیسے گزشتہ مقام پر۔ نئے مقامِ تعیناتی پر آکر اسے یقین ہوگیا کہ عورتیں سارے شہروں کی ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ سابقہ ساتھیوں کی طرح اس کی نئی ساتھیوں کا اندازِ کار بھی کم وبیش یکساں تھا۔ اپنی جائے ملازمت پر ہوتے ہوئے بھی وہ کارِ منصبی سے زیادہ اپنے نجی معاملات پر نظر رکھتیں۔ ملازمتی اوقات کے دوران بھی شوہروں، بچوں اور خانگی معاملات میں سرتاپا منہمک رہتیں۔ ان کے اسٹیٹس سمبل قیمتی سیل فون کانوں سے لگے ہوتے۔ کبھی شوہر سے بات کررہی ہوتیں، کبھی بچوں کو ہدایات دے رہی ہوتیں۔ کبھی رشتے داروں اور دوستوں سے ہنسی مذاق تو کبھی گھریلو ملازمہ کو ڈانٹ پھٹکار۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ وہ ناشتا اپنی جائے کار پر آکر کرتیں۔ جن فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے لیے انہیں مٹھی بھر تنخواہیں ملتیں، عموماً انہیں نظرانداز کرکے اپنے نجی معاملات میں زیادہ دلچسپی اور سرگرمی دکھاتیں۔ شاگردوں سے زیادہ انہیں اپنے بچوں کے مستقبل کی پروا اور فکر ہوتی۔ انہیں آگے بڑھانے کے لیے کبھی یہاں فون کبھی وہاں فون۔ گھریلو ملازم کو دال خشکہ بنانے کی ہدایات تک وہ اسی وقت کے دوران جاری کرتیں جس کے لیے سرکار انہیں نہایت معقول ادائیگی کرتی تھی۔ بیشتر خواتین کا یہی حال تھا تاہم خود نگینہ کی طرح بعض اس قسم کے طرزِعمل سے ماورا بھی تھیں۔ نگینہ ایسے سراسر اول الذکر خواتین کی خودغرضی اور بے ایمانی سمجھتی تھی کہ جن اوقاتِ کار کے لیے سرکار ان خواتین کو اچھا بھلا معاوضہ دے رہی تھی، وہ اس کا ناجائز استعمال کرکے اپنی حلال روزی کو حرام کرلیتی تھیں۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ ایسی خواتین نگینہ اور اس جیسی فرض شناس خواتین کا اپنے کارِ منصبی میں دلچسپی اور انہماک دیکھ کر شرمندہ ہونے کے بجائے نہایت دیدہ دلیری سے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔ "بھئی ان کا کیا انہیں تو نہ اپنے گھر سے دلچسپی ہے نہ گھر والوں سے۔" ان کی فرض شناسی کو پاگل پن اور ایمانداری کو بےوقوفی سے تعبیر کیا جاتا۔

اپنے محکمے کی فرض شناس اور ایماندار خواتین میں نگینہ سرِفہرست تھی۔ وہ اپنے منصبی فرائض کو چاہے تدریس ہو یا ادارے کا انتظام ذمے داری نہیں عبادت سمجھ کر ادا کرتی تھی۔ جب تک تدریس پر مامور رہی شاگردوں کی محبوب ترین استاد تھی۔ پرنسپل بنی تو اعلیٰ منتظم۔ نئے مقامِ تعیناتی پر آنے کے بعد اس نے اپنے زیرِانتظام ادارے کو ہر اعتبار سے معیاری ومثالی بنانے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ چھٹی کے بعد ادارے کا چپا چپا دیکھتی پھرتی۔ تادیر دفتر میں بیٹھی کام کرتی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ نہایت ناگفتہ صورتِ حال میں اس کی نگرانی میں دیا جانے والا ادارہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہوگیا۔

تھا۔ اس کی میز پر کبھی کوئی فائل زیرِ التوا نہ رہتی۔ محکمہ اس کی صلاحیتوں کا معترف اور اس کی کارکردگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ مگر اس ناقدری کا کیا علاج کہ اس کی اپنی ساتھیوں اور بعض ہم منصب عہدے داروں کے خیال میں وہ اپنے فرائضِ منصبی کو اتنا وقت محض اس لیے دے پاتی تھی کہ "ویلی" تھی۔ ویلی بمعنی اکیلی یا تنہا!

"ارے بھئی ان کا کیا ہے...... نہ کوئی آگے نہ پیچھے...... ان کا بس چلے تو رات کو بھی دفتر ہی میں بستر لگالیں...... گھر چلاتی ہوتیں تو دیکھتے ہم کہ کس طرح شام شام تک دفتر میں بیٹھی رہتیں...... کوئی گھریلو ذمے داری ہی نہیں ان کی۔"

بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ شادی شدہ اور بڑے کنبوں والی خواتین کی طرح وہ نوع بہ نوع رشتے ناتوں کی زنجیروں میں نہ بندھی تھی۔ اسی لیے ملازمتی امور کو اس قدر وقت دے پاتی تھی مگر یہ کہنا غلط تھا کہ اس کی کوئی گھریلو ذمے داری نہیں تھی یا وہ گھرداری سے بالکل ہی فارغ و مبرا تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے تن تنہا گھر چلانا ہوتا تھا۔ کون سا کام تھا گھر کا جس سے وہ مبرا تھی۔ صفائی ستھرائی، دھلائی، کھانا پکانا، بازار سے ہر نوعیت کی خریداری۔ کوئی مہمان گھر آجاتا تو اتنا آسرا تک تو تھا نہیں اسے کہ کوئی دو پیالی چائے ہی بنا کر دے دیتا۔ اپنی احتیاط پسندی بلکہ تھوڑے سے وہمی پن کے باعث گھر میں ملازم کی علت اس نے پالی نہیں تھی کہ اس جیسے تنہا افراد کے ساتھ اکثر گھر کے ملازم ہی وارداتیں کر جاتے ہیں۔ اسے زندگی کے تمام معاملات سے تن تنہا ہی چومکھی لڑنا پڑتی پھر بھی کہنے والے اگر یہ کہتے تھے کہ اس کی کوئی گھریلو ذمے داری نہیں تھی تو ان کا "حسنِ ظن!"

دن بھر کی مصروفیت کے بعد جب وہ رات کو بستر پر لیٹتی تو اس کا انگ انگ تھکن سے دہائی دے رہا ہوتا۔ کوئی حال پوچھنے والا بھی نہیں تھا گھر میں۔ دن کی روشنی میں بیس گریڈ کی دبنگ پرنسپل کی رات کے سناٹے میں بے کسی دیدنی ہوتی۔

کبھی کبھی اپنی بے کسی اور تنہائی پر اس کا دل بہت دکھنے لگتا۔ تنہا رہنا اس کا اپنا نہیں مقدر کا فیصلہ تھا اور کسی حد تک اس کا دوش اس کے بہنوئی صفدر کو بھی جاتا تھا جو کہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ آئینہ کے انگلستان جانے کے چند ہی ماہ بعد وہ مر گیا تھا۔ اس کی موت کا علم پڑوسیوں کو اس وقت ہوا جب کئی دن تک گھر سے باہر اس کی آمدورفت معطل رہی اور گھر کے اندر سے ناقابلِ برداشت بدبو کے بھبکوں نے آس پاس رہنے والوں کا رہنا محال کر دیا۔ ایک پڑوسی نوجوان گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا تو اس کی مسخ میت بستر پر پڑی تھی۔ موت طبعی تھی۔ تکفین و تدفین ایک رفاہی ادارے نے کی۔ نگینہ کو اس کی موت کا علم آئینہ کے ذریعے ہوا جسے اہلِ محلہ میں سے اس کی ایک دوست نے بذریعہ فون اس کے باپ کی موت کی اطلاع دی تھی۔ آئینہ دو ہفتوں کے لیے پاکستان آئی پھر واپس چلی گئی۔

صفدر کی موت عبرت ناک تھی۔ رشتوں کا احترام نہ کرنے اور انہیں آزار پہنچانے والوں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اچھا رہا ہوتا تو شاید اسکی بے وارثی کی موت نہ مرا ہوتا...... شاید آئینہ آخری وقت

میں اس کے سرہانے ہوتی..... شاید داماد اس کی میت کو کاندھا دینے کے لیے موجود ہوتا۔

☆☆☆

ملازمت سے نگینہ کی سبکدوشی کا وقت آنے تک آئینہ نو سالہ فرحان اور آٹھ سالہ نبیل کی مادرانہ ذمے داریوں میں گھر چکی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نگینہ دوبارہ اپنے ہی شہر واپس جانا اور وہیں مستقل قیام کرنا چاہتی تھی۔ آدمی کتنی ہی دور نکل جائے بالآخر اپنی اصل ہی کو لوٹتا ہے۔ آئینہ کے جانے کے بعد اپنا شہر اس نے بہت دکھتے دل سے چھوڑا تھا۔ وہ زندگی میں کچھ تبدیلی چاہتی تھی۔ اپنے شہر میں جابجا ماضی کی یادیں ثبت تھیں جو رہ رہ کر اس کا دل دکھاتی رہتی تھیں مگر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پھر وہیں جانا چاہتی تھی۔ گو وہاں رہائش کا مسئلہ بھی تھا۔

"آپ ریٹائرمنٹ کے بعد ہمارے پاس آجایئے گا آنٹی..... کچھ راستہ نکال لیں گے آپ کو یہیں روکنے کا۔" آئینہ اس سے کہتی تھی۔

"نہیں بیٹا، رکوں گی نہیں..... رہوں گی میں اپنے ہی دیس میں اور اپنے شہر میں۔"

"اچھا چلیں..... آنا جانا رہنے گا..... ایک بار آئیں تو سہی۔"

"پہلے ریٹائر تو ہو لینے دو..... بہت مصروف وقت ہے یہ میرے لیے..... ریٹائرمنٹ سے پہلے میں اپنے سارے کام مکمل کر لینا چاہتی ہوں تاکہ میرے بعد ادارے کو پیچھے نہ دیکھنا پڑے۔ میں نے دیکھا ہے اداروں کے سربراہ اپنی فائلیں تو مکمل کروا کے ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ ادارے کی باقی فائلوں کی پروا نہیں کرتے..... بعد میں بے چارے کلرکوں کو فائلیں اٹھائے ان کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔"

ملازمت کا آخری عرصہ نگینہ نے غیر معمولی مصروفیت میں گزارا۔ وہ کوئی کام التوا میں یا کوئی فائل نامکمل چھوڑ کر سبکدوش نہیں ہونا چاہتی تھی۔ سبکدوشی کا مطلب ہی یہ تھا کہ آدمی اپنی ملازمت کی تکمیل پر تمام ذمے داریاں پوری کر کے ہلکے کندھوں کے ساتھ گھر واپس جائے۔

حسب قواعد اس نے اپنی پنشن کے کاغذات کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اپنی رہائش کی فکر بھی لاحق تھی۔ گو وہ اپنے شہر واپس جانے کی خواہاں تھی مگر سر چھپانے کو ٹھکانا تو وہاں بھی درکار تھا۔ ملازمت کے آخری سال اس کی ایک ماتحت لیکچرر نے ایک روز دبی زبان میں کہا تھا۔ "میڈم! آپ تو اکیلی ہیں، اس شہر میں رہیں یا اپنے شہر واپس جائیں کیا فرق پڑتا ہے..... اتنے عرصے سے یہاں رہ رہی ہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد یہیں رہیں۔"

"یہاں میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے رقیہ۔" نگینہ نے کہا۔

"وہاں کون سا ہے؟" اس نے ترت کہا۔

بات ٹھیک تھی۔

"گورنمنٹ اکاموڈیشن تو ریٹائرمنٹ کے بعد حد سے حد چھ ماہ اور میں اپنے استعمال میں رکھ سکوں گی پھر چھوڑنا پڑے گی۔"

"میڈم!" رقیہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "آپ کے تو اتنے تعلقات ہیں اگر آپ اپنا سرکاری مکان میرے نام الاٹ کروا دیں تو....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تو؟" نگینہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہم دو میاں بیوی ایک بچہ ہی تو ہیں۔ ایک کمرا ہم مستقل طور پر آپ کو دے دیں گے۔ آپ کو ادھر ادھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہماری مختصر سی فیملی کا حصہ بن کر ہمارے ساتھ ہی رہیں۔"

پیشکش نہایت معقول تھی۔

نگینہ نے وزارت ہاؤسنگ کے نام ایک زبردست جذباتی قسم کی درخواست تحریر کی جس میں اس نے اپنی طویل تدریسی خدمات کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنی مجرد حیثیت کا ذکر کیا اور لکھا کہ اس کی ایک ماتحت لیکچرر جو اس کے قبضے میں موجود سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کا استحقاق رکھتی ہے، اگر یہ مکان وزیر ہاؤسنگ وتعمیرات کے صوابدیدی اختیارات کے تحت مذکورہ خاتون کو الاٹ کر دیا جائے تو وہ اپنی بقیہ زندگی سکون واطمینان کے ساتھ اس خاتون اور اس کی فیملی کے ساتھ گزار سکے گی۔

تحریر شدہ درخواست لے کر وہ متعلقہ وزارت کے سیکریٹری سے خود ملی اور انہیں درخواست پیش کرنے کے ساتھ زبانی کلامی بھی اپنے مسئلے سے آگاہ کیا۔ سیکریٹری صاحب نے فیور ایبل ریمارکس کے ساتھ فائل جوائنٹ سیکریٹری کے پاس بھجوا دی اور نگینہ کو اطمینان دلایا کہ وزارت اسے پورا فیور دے گی۔ نگینہ بہت خوش ہوئی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد باعزت طور پر بقیہ زندگی گزارنے کی یہ صورت جو رقیہ نے اسے سجھائی تھی، اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی۔ رقیہ ایک سلجھی ہوئی خاتون تھی اور اس کے

مختصر سے کنبے کے ساتھ رہنا نگینہ کو یقیناً سہولت دیتا۔
سیکریٹری صاحب کے مثبت اور ہمدردانہ ریمارکس سے رقیہ تو نگینہ سے بھی زیادہ خوش ہوئی۔

''بس میڈم! اب آپ مطمئن ہوجائیں۔ آپ کی فائل کو میرے ہسبینڈ پرسیو کرلیں گے۔'' رقیہ نے کہا۔

''ہاں ایسے معاملات میں بندے کو فائل کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ میں تو آج کل کالج کے معاملات میں بہت معروف ہوں۔ روز روز وہاں نہ جاسکوں گی۔''

''آپ فکر ہی نہ کیجیے...... مکان آپ کے قبضے میں ہے۔ بس الاٹمنٹ مل جائے قبضے کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں...... ویسے تو پورا گھر ہی آپ کا ہوگا لیکن جو کمرا آپ اپنے پاس رکھنا چاہیں گی، وہ میں آپ کے لیے سیٹ کروادوں گی۔''

جوائنٹ سیکریٹری سے فائل ڈپٹی سیکریٹری پھر سیکشن افسر کی میز پر پہنچی۔ نگینہ نے وقت نکالا اور سیکشن افسر سے مل کر زبانی کلامی اپنے مسائل و حالات سے اسے آگاہ کیا۔ سیکشن افسر نہایت معقول انسان تھا۔ اس نے نگینہ سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں، مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ اسی رپورٹ بناؤں گا کہ سرکاری مکانات کی آؤٹ آف ٹرن الاٹمنٹ کی اگلی میٹنگ میں جو جلد ہی ہونے والی ہے، یہ مکان انشاء اللہ آپ کی کولیگ کے نام سبجیکٹ ٹو ویکیشن الاٹ کردیا جائے گا پھر آپ اور آپ کی کولیگ آپس میں طے کرلیجیے گا آپ اگر چاہیں تو اپنی ریٹائرمنٹ سے قبل بھی اس خاتون کو قبضہ دینے کی مجاز ہیں۔''

نگینہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجالائی جس نے اس کی رہائش کی یہ راہ رقیہ کے دل میں ڈالی تھی۔ اب کیا ضرورت تھی اسے اپنے سابقہ شہر واپس جانے کی۔ ایک اکیلی عورت کی زندگی جہاں عزت و سکون سے گزر جائے وہی جگہ اچھی!

☆☆☆

وزارت ہاؤسنگ کی میٹنگ ہوگئی۔ ذمے داران سے رابطہ کرنے کے باوجود نگینہ اور رقیہ کے شوہر کو فوری طور پر کچھ پتا نہ چل سکا۔ سیکشن افسر کے بقول فی الحال فیصلوں کو کانفیڈنشل رکھا گیا تھا۔

چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز ایک انجانی خاتون نگینہ سے ملنے اس کے گھر آپہنچی اور اس نے بتایا کہ نگینہ کا مکان آؤٹ آف ٹرن بنیاد پر اسے سبجیکٹ ٹو ویکیشن الاٹ کردیا گیا تھا اور خاتونِ مذکور نے اس الاٹمنٹ کو اپنے حق میں برقرار رکھنے کے لیے عدالت سے حکمِ امتناعی بھی حاصل کرلیا تھا۔

رقیہ کے شوہر نے فوری دوڑ دھوپ شروع کی۔ نگینہ بھی وزارت کے اعلیٰ عہدے داروں سے ملی مگر کچھ نہ ہوسکا۔ جس خاتون کو مکان الاٹ کیا گیا، اسے ایک صوبے کے وزیرِ تعلیم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ رقیہ اور اس کا شوہر مایوس ہوکر بیٹھ رہے۔ نگینہ کو بھی سخت مایوسی ہوئی۔ اب تو بہرحال اسے بعداز ریٹائرمنٹ اپنے ہی شہر واپسی کے لیے تیاری کرنا تھی۔

☆☆☆

نگینہ نے ملازمت اسی خشوع و خضوع کے ساتھ کی تھی جیسے کوئی اطاعت گزار بندہ اپنے رب کی عبادت کرتا ہے۔ ملازمت اس کے لیے اپنے زندہ ہونے اور اطاعت کی زندگی بسر کرنے کا احساس تھی۔ اسی لیے ملازمت سے حاصل ہونے والے مادی فوائد کی وہ بہت سے دوسروں کی طرح حرص و طمع میں نہ رہا کرتی تھی۔ وہ تو اللہ کی شکر گزار رہا کرتی تھی کہ جو وہ اسے دے رہا تھا، اس کی عطا تھی اور اس کی ضرورت سے زیادہ مگر ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے شہر واپسی کے لیے ٹی اے ڈی اے بل بناتے ہوئے اسے پالیسی سازوں کی زیادتی کا شدت سے احساس ہوا۔ یہ کیا کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے والی عورت اگر مجرد ہے تو اسے بعداز ریٹائرمنٹ اپنے ہوم اسٹیشن پر واپسی کے لیے اپنی ہم منصب شادی شدہ خاتون کے مقابلے میں تخفیف شدہ ٹی اے ڈی اے دیا جائے۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ کیا مجرد خاتون کے والدین اور بہن بھائی اس کا کنبہ نہیں ہوتے۔ کیا اس کی ضروریات اور اسبابِ زندگی بھی وہی سب کچھ نہیں ہوتا جو ایک شادی شدہ ملازم خاتون کا۔ اسے تو مخصوص تعدادی افرادِ کنبہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا کرایہ بھی ملتا تھا۔ ساتھ لے جانے والے اسباب کی حد بھی زیادہ تھی۔ سرکار کے مقررہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں اپنا ٹی اے ڈی اے بل بناتے ہوئے نگینہ کا دل اک احساسِ محرومی سے دوچار رہا۔ اپنی تمام مدت ملازمت کے دوران اس نے اپنے منصبی فرائض اکثر ہم منصب شادی شدہ خواتین سے زیادہ دلچسپی، انہماک اور ذمے داری سے سرانجام دیے تھے۔ منصبی ذمے داریوں کے سلسلے میں تو سرکار نے اسے کوئی رعایت، کوئی تخفیف نہیں دی تھی۔ سبکدوشی کے بعد گھر جانے کا موقع آیا تو پالیسی سازوں کے ذہن رسا نے سے اس کی حیثیت، اس کے اسٹیٹس کا احساس دلادیا تھا کہ وہ ایک تنہا عورت تھی۔

پالیسی ساز بھی خوب تھے۔ مراعات کے سلسلے میں ان کی اکثر پالیسیاں بھروں کو مزید بھرنے کی نقیب ہوتیں۔ حقیقی معنی میں بے گھروں کو کرائے کے گھر اور ان گھروں کا کرایہ بھی سرکار سے رو رو کر ملتا۔ جن کے ذاتی گھر تھے انہیں سیلف ہائرنگ کے نام پر مٹھی بھر بھر رقوم عطا کر کے بھروں کو اور بھرا جاتا حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پالیسی ساز ایسی پالیسی بناتے کہ گھروں والوں کو قناعت اور شکر گزاری کا احساس دے کر بے گھروں کو چھت فراہم کرنے کی سعی کی جاتی۔ مگر جب دل اپنے فائدے کی نیت میں ڈوبے ہوں اور آنکھوں پر طمع کی پٹی چڑھی ہو تو پھر ایسی ہی پالیسیاں وضع کی جاتی ہیں جن میں پالیسی سازوں کا اپنا مفاد پنہاں ہو۔

نگینہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوگئی۔

☆☆☆

ریٹائرمنٹ کے بعد حسب قواعد وہ چھ ماہ تک سرکاری مکان اپنے مصرف میں رکھنے کی مجاز تھی۔ آئینہ نے اسے مشورہ دیا کہ اس دوران وہ اس کے پاس چکر لگائے اگر اس دوران اس کا وہاں دل لگ جاتا ہے اور کچھ ایسے اسباب بن جائیں کہ وہ مستقل طور پر اسی کے پاس قیام کر سکے تو اسے اپنے شہر جا کر نئے سرے سے زندگی کے معاملات شروع کرنے کے بجائے اس کے ساتھ ہی رہنے کو ترجیح دینی چاہیے۔ بڑھتی عمر ہے، صحت اور تنہائی کے مسائل ہوں گے۔ نگینہ کو آخر عمر اپنا وطن چھوڑ کر پردیس میں رہنا پسند نہ تھا مگر آئینہ کے پاس کبھی کبھار آتے جاتے رہنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اس نے آئینہ کے پاس جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ اتنی طویل سرکاری ملازمت کے بعد کچھ آرام تو حق بنتا تھا۔ واپس آ کر اپنے ہی شہر میں سامانِ زندگی ترتیب دینے کا ارادہ تھا۔ پردیس میں حالات موافق بھی رہے تو بھی اسے بہر حال واپس آنا تھا، سرکاری رہائش گاہ کی حوالگی اور اس میں موجود اپنا سامان سمیٹنے کے لیے۔ اس نے پاسپورٹ بنوایا۔ اسکالر شپ سے واپس آنے کے بعد کبھی بیرونِ ملک جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ سابقہ پاسپورٹ نہ جانے کہاں رُل کھل گیا تھا۔ پاسپورٹ بن گیا تو اس نے انگلستان کے ویزا کے لیے درخواست دے دی۔

ویزا کے لیے اس کی درخواست ویزا دینے والوں نے اس جواب کے ساتھ رد کر دی کہ وہ چونکہ ایک مجرد خاتون ہے اور اس کے اپنے وطن میں اس کے قریبی رشتوں کی کوئی ایسی طنابیں موجود نہیں جو انگلستان سے اس کی واپسی کی ضمانت دے سکیں لہٰذا اس کی درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ ویزا اتھارٹی کے اس فیصلے کے خلاف اسے اپیل کا حق بھی نہیں دیا گیا تھا۔

ویزا ملنا اور انگلستان جانا نگینہ کے لیے موت یا زندگی کا معاملہ ہرگز نہ تھا۔ اپنے وطن سے اچھی جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے مگر جس جواز کے ساتھ اس کی ویزا درخواست مسترد کی گئی، وہ اسے جذباتی اعتبار سے نامناسب لگا۔ کیا اکیلی عورت اتنی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے کہ اسے انسانی حقوق کا علمبردار ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک بھی اپنی حدودِ مملکت میں داخلے کا پروانہ دینے سے انکار کر دے۔ وہ تو اپنی تھکن اتارنے، تنہائی بتانے اور کچھ دن آئینہ اور ان کے بچوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے کے لیے انگلستان جانا چاہتی تھی مگر وہ مملکت جس کی فرمانروا ہی ایک عورت تھی اسے ان لیے ناقابلِ اعتبار گردانا گیا تھا کہ وہ اکیلی عورت تھی۔

آئینہ کو بہت ملال ہوا۔ اس نے نگینہ سے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں آنٹی — میں یہاں کسی سالیسٹر سے مشورہ کرتی ہوں۔“

”ارے نہیں بیٹا — کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے آئینہ کو منع کیا۔ ”میں تمہارے پاس نہیں آسکتی تو کیا، تم آجاؤ کچھ دنوں کے لیے بچوں کو لے کر میرے پاس...... تم لوگوں کے پاس تو ریڈ پاسپورٹ ہے جہاں مرضی چاہے آجا سکتی ہو۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے ریڈ پاسپورٹ جنت میں داخلے کی دستاویز ہو۔“ آئینہ بولی۔

”لوگ تو یہی سمجھتے ہیں۔ ہم سبز پاسپورٹ والے پاکستانی کیسے ہی نیک نیت اور باکردار کیوں نہ ہوں مشتبہ اور مشکوک اور ریڈ پاسپورٹ والے کتنے ہی سیاہ کار کیوں نہ ہوں، لائقِ احترام...... اور سبز پاسپورٹ والی اگر میری طرح اکیلی عورت ہو تو گوری چمڑی والوں کے لیے نامعتبر!“ آخری جملے پر نگینہ کا لہجہ تلخ اور آواز درد آمیز ہوگئی۔

☆☆☆

ریٹائرمنٹ سے حاصل ہونے والے واجبات اور اپنی جمع پونجی ملا کر نگینہ نے ایک چھوٹا سا فلیٹ خریدا اور اپنی باقی زندگی سکون سے گزارنے کے لیے اپنے شہر آگئی۔ پنشن معقول مقرر ہوئی جس سے وہ نہایت عزت و آرام سے زندگی بسر کر سکتی تھی۔ البتہ اکیلا پن اس کا بہت بڑا مسئلہ تھا جس کا مداوا اس کی جوانی میں نہ ہو سکا تھا تو اب کیا ہوتا جبکہ اس کے سر میں سفیدی اور آنکھوں میں دھندلکا اتر آیا تھا۔ صبح

سے شام تک زندگی سے تنہا جو بھی لڑنا پڑتی۔ ابھی گھر کی صفائی کرنی ہے تو ابھی برتن کھنگالنا ہیں۔ کبھی واشنگ مشین پر جھکی کھڑی ہے تو کبھی چولہے کے سامنے پسینے میں تربتر، کبھی شاپنگ کرنے بازار جانا ہے تو کبھی صحت کے مسئلے کے لیے ڈاکٹر کے ہاں حاضری...... ایک کے بعد دوسرا کام...... مصروفیت ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ وہ عمر جس میں عورتیں بستر پر لیٹ کر پوتے پوتیوں سے ٹانگیں دبواتی اور اہل خانہ سے اپنے ناز اٹھواتی ہیں، اسے ہمہ وقت مشقت میں گزارنا پڑتی۔ صحت کے مسائل الگ تھے۔ بلڈ پریشر، شوگر اور ہڈیاں بھربھری ہونے کا عمل...... بیمار پڑتی تو کوئی پانی دینے والا بھی نہ ہوتا۔ کوئی نہ تھا جس سے اپنے دل کی بات کہہ پاتی۔ ہنستی تو اکیلے، روتی تو کوئی دلاسا دینے والا نہ ہوتا۔ کبھی کبھی اس خیال سے خوف آتا کہ مرگئی تو جنازہ اٹھانے والوں میں کوئی اپنا نہ ہوگا۔

دور دیس بیٹھی آئینہ تقاضا کرتی۔ ”آنٹی! آپ ایک مرتبہ پھر ویزا کے لیے اپلائی تو کر کے دیکھیں۔“

”چھوڑو بیٹا“ نگینہ کو غیروں سے اپنی دوبارہ تذلیل گوارا نہ تھی۔

ملنے جلنے والیاں مشورہ دیتیں۔ ”آپ اپنے پاس کوئی فل ٹائم ملازمہ رکھ لیں۔ گھر کے کام کاج میں آپ کا ہاتھ بھی بٹائے گی اور اس کی موجودگی سے آپ کا دل بھی بہلا رہے گا۔“

مشورہ نہایت صائب تھا مگر نگینہ سوچتی ملازمہ اگر پختہ عمر کی ہوئی تو کیا خاک ہاتھ بٹائے گی۔ اس کی اپنی طرح تھکی اور نڈھال ہوگی۔ جوان ہوئی تو بجائے خود ایک ذمے داری۔ کہاں کہاں اور کس حد تک اس کی نگرانی کرسکتی تھی وہ...... سو گزارہ بنا ملازمہ ہی بہتر...... یعنی چوہا لنڈورا ہی بھلا!

☆☆☆

ریٹائرمنٹ ہوئے تیسرا چوتھا برس تھا۔ رمضان کا مہینا تھا چودھواں روزہ...... افطار سے کچھ دیر پہلے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی جو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ رمضان میں آس پڑوس والے افطاری بھجواتے ہی تھے اور جواباً وہ بھی کبھی ایک کے ہاں تو کبھی دوسرے کے ہاں افطاری کی ٹرے کبھی بنفس نفیس، کبھی محلے کے کسی لڑکے بالے کے ہاتھ بھجواتی رہتی تھی۔ دستک سن کر وہ دروازے تک پہنچی۔ دروازے میں لگے عدسے سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا۔ دو نوجوان لڑکے سروں پر ٹوپیاں اوڑھے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ ایک نے خوان پوش سے ڈھکی ٹرے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی۔ نگینہ نے یہ سمجھ کر پڑوس سے کسی نے افطاری بھجوائی ہوگی دروازہ کھول دیا۔

ٹرے والے نوجوان نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ نگینہ نے سلام کا جواب دیا۔ نوجوان نے ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔ نگینہ نے ٹرے تھام لی۔ آناً فاناً دونوں نوجوان بجلی کی سی سرعت سے اندر آگئے۔ ایک نے دروازہ بند کیا، دوسرے نے ایک ہاتھ سے اس پر ریوالور تانتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر پہلے کی طرف بڑھا دی۔ پہلے نے ٹرے تھامی اور اپنے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے نگینہ کو آنکھیں دکھا کر خاموش رہنے اور مزاحمت نہ کرنے کا اشارہ دیا۔ وہ مزاحمت کیا کرتی، اس کا تو جسم کانپ رہا تھا۔ ریوالور والے نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور کی نال نگینہ کی پیشانی سے لگا دی۔ نگینہ کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ جسم پر لرزہ۔ یکایک خوف سے اس کے دانت بجنے لگے۔

ریوالور والے نے اسے کمرے کی سمت چلنے کا اشارہ دیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں بمشکل بیس بائیس سال کے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت رقصاں نظر آتی تھی کمرے میں لے جا کر وہ خدا جانے کیا کرتے۔ معمر سہی عورت تو تھی نا وہ۔ آبرو جسے اس نے تمام زندگی گوہر حیات کی طرح سنبھال کر رکھا تھا، اس کا قیمتی اثاثہ تھا۔ اسے کسی چیز کی فکر نہ تھی، سوائے اپنی عزت کے۔ ان کے ساتھ کمرے میں جانے کے خلاف مزاحمت کی تو ایک نے اسے اس بری طرح دھکیلا کہ لاؤنج میں رکھی میز سے ٹکرائی اور تیورا کر نیچے گر پڑی۔ گرتے ہی ٹانگ میں درد کی جان لیوا لہر اٹھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ فرش پر پڑی تھی اور اس کے منہ سے شدید تکلیف سے دوچار ہونے کا احساس ظاہر کرتی مبہم آواز نکل رہی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی۔

ریوالور والا نوجوان ریوالور تانے اس کے نزدیک کھڑا رہا۔ دوسرا پہلے ایک کمرے میں گھسا پھر دوسرے میں گیا۔ افطار کا وقت ہوچکا تھا۔ مسجدوں سے اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے گھر میں گھسے دو شیطانوں میں سے ایک موت کا فرشتہ بنا فرش پر ڈھیر اس کے تریسٹھ چونسٹھ سالہ وجود کو اپنے جوتے کی نوک سے ٹھوکا دیتے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "بڑی بی! دوسرے کمرے کی الماری کی چابی کہاں ہے؟"

"تکیے کے نیچے۔" وہ بمشکل کہہ پائی۔

دوسرے شیطان نے گھر سے اپنے مطلب کی چیزیں سمیٹیں۔ نقدی، بانڈز، زیور، موبائل فون وغیرہ۔

جاتے ہوئے ریوالور والے نے ایک مرتبہ پھر اپنے جوتے سے ٹھوکا دے کر اس کے وجود کی تذلیل کی اور غرا کر بولا۔ "آواز نکالنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گی۔"

جاتے ہوئے دونوں باہر سے دروازہ بند کر گئے۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ٹانگ کی تکلیف نے اسے اٹھنے کی اجازت نہ دی۔ فرش پر رینگتی ہوئی وہ پل صراط کا سفر طے کر کے دروازے تک پہنچی اور وقفے وقفے سے نہ جانے کتنی دیر بند دروازے پر اندر سے دستک دیتی رہی۔ مسلسل دستک سن کر پڑوس میں کسی نے باہر سے دروازہ کھولا۔ اس وقت تک وہ نیم جان ہو چکی تھی۔ پڑوسیوں نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس نے اسے اسپتال پہنچایا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ اسپتال والے ٹانگ کو پلاستر چڑھانے کے بعد اسے گھر بھیجنا چاہتے تھے مگر اس نے انتظامیہ سے استدعا کی کہ چونکہ گھر پر کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں اس لیے کچھ دن تک اسے اسپتال ہی میں رکھا جائے۔ اسے اکیلے پن سے خوف آنے لگا تھا۔

اسپتال تو نگینہ کو زیادہ دن نہیں رکھ سکا۔ بیڈز کم تھے اور مریضوں کی تعداد کہیں زیادہ۔ نگینہ نے آئینہ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کی اطلاع نہیں دی۔ وہ بے چاری اتنی دور سے کیا کر لیتی بھلا۔ خوف کی ماری نگینہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسپتال سے اپنے گھر ہی آنا پڑا۔ بے وارثی اور تنہائی کا زہر آب پیتی نگینہ کو دوبارہ چلنے پھرنے کے لیے سال بھر تک انتظار کرنا پڑا۔ اس عمر میں ٹوٹی ہڈی آسانی سے کب جڑتی ہے۔

☆☆☆

نگینہ اب اپنے گھر میں نہیں رہتی۔ خواتین کے ایک ہاسٹل میں ایڈمن افسر کے طور پر کام کرتی ہے۔ ہاسٹل میں اسے رہائش کی سہولت بھی میسر ہے۔ یہی سہولت اس کی اس ملازمت کا سبب بھی بنی۔ نگینہ اب پہلے کی طرح تحمل نہیں رہی۔ اسے پیش آنے والے حادثے نے اس کی ٹانگ ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ نفسیاتی کیفیت بھی بری طرح مجروح کی۔ اپنے بہنوئی کی بہت بڑی بڑی اور بری باتوں کو بھی چپ چاپ برداشت کر لینے والی نگینہ اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔ ہاسٹل انتظامیہ خوش ہے کہ اسے ایک سخت گیر ایڈمن افسر میسر آگئی جس سے ایڈمن کے مسائل کم ہو گئے مگر ہاسٹل میں مقیم خواتین نگینہ کی درشت مزاجی اور چڑچڑے پن سے سخت نالاں رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں نگینہ کی بدمزاجی کی وجہ اس کا غیر شادی شدہ ہونا ہے۔

اپنے روزمرہ امور سے فارغ ہو کر نگینہ جب اپنے کمرے میں جاتی ہے تو اسے اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔ رات کو سونے سے قبل ڈائری لکھنا اس کا معمول بن چکا ہے۔ اس بیاض میں وہ ایک صفحے پر لکھتی ہے۔

"فاروقی طرزِ حکومت پر اپنی حکومتوں کی بنیادیں کھڑی کرنے اور اپنے معاشروں کو متمدن اور ترقی یافتہ بنانے والی قومیں ہمیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ اپنی رعیت کی خبر گیری کے لیے راتوں کو پاپیادہ گلیوں میں گھوما کرتے تھے۔ دنیا کو پہلی فلاحی ریاست کا تصور دینے والا حکمراں خوفِ الٰہی اور جوابدہی کے احساس سے لرزاں و ترساں رہا کرتا تھا اور ایک مملکتِ پاکستان کے حکمران ہیں۔ نہ جوابدہی کا خوف نہ رعیت کی خبر گیری۔ فقط مفاد پرستی...... ہم بھیڑیوں کے معاشرے میں رہ رہے ہیں۔"

بیاض کے ایک اور صفحے پر وہ نہایت تلخی سے لکھتی ہے۔

"وقت بہت ظالم ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا...... حیرت کی بات ہے کہ میں اس عمر میں اپنا تقابل اس لڑکی سے کرنے لگی ہوں جو گھر سے بھاگ کر اور اپنے خاندان کی عزت داؤ پر لگا کر اپنی پسند کے نوجوان سے شادی کر کے لائم لائٹس میں آجاتی ہے۔ میڈیا اسے بھرپور کوریج دیتا ہے۔ حقوق نسواں کی تنظیمیں اس کی پشت پناہی کو کھڑی ہو جاتی ہیں۔ صاحبانِ اقتدار اس کے سر پر ہاتھ دھر کر مکمل تحفظ کی یقین دہانی کراتے ہیں۔ مادر پدر آزاد ترقی یافتہ ممالک اس جوڑے کو اپنے ہاں پناہ دینے کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے ہیں اور میں اکیلی عورت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ مجھ جیسی اکیلی عورت کے مسائل پر بات کر کے کسی کو کیا رنگین کہانی ہاتھ آئے گی۔"

اکیلی عورت کا دکھ کوئی نگینہ بندہ علی سے پوچھے۔